بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

زیرادارت

مولانا اسلم جیراجپوری   ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

جلد ۱۳	بابتہ ماہ جولائی سنہ ۱۹۲۹ء	نمبر ۱

فہرست مضامین

آزادی کی راہیں

باب اول نمبر ۲

مارکس اور مذہب اشتراک

مارکس کی تعلیم کے نہایت ضروری مسائل تین کہے جا سکتے ہیں :- (۱) وہ جسے تاریخ کی مادی تشریح کہتے ، (۲) اجتماع سرمایہ کا قانون ؛ (۳) معاشی طبقوں کی جنگ ۔

۱۔ تاریخ کی مادی تشریح ، مارکس کا خیال ہو کہ جماعت انسانی کے تقریبا تمام مظاہر کی اصل مادی حالات میں ہو اور یہ حالات اس کے نزدیک نظامہائے معاشی میں متشکل ہوتے ہیں۔ دستور سیاسی ، قوانین، مذاہب، فلسفے ، یہ سب اس کے خیال میں اپنے موٹے موٹے خط وخال میں اس معاشی اقتدار کے مختلف مظاہر ہوتے ہیں جو انہیں پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہو۔ یہ مارکس کے ساتھ ناانصافی ہوگی اگر کہا جائے کہ اس کے نزدیک صرف جانے بوجھے معاشی محرک ہی کو اہمیت حاصل ہو، بلکہ اس کا خیال یہ ہو کہ معیشت سیرت اور رائے کی تشکیل کرتی ہو اور اس طرح اکثر ان چیزوں کا سرچشمہ ہے جو شعور انسانی میں اس سے بالکل بے تعلق نظر آتی ہیں۔ یہ اپنی تعلیم کو بالخصوص دو انقلابوں پر عائد کرتا ہو، ایک گذشتہ اور ایک آنے والا۔ گذشتہ انقلاب منصب داری کے خلاف بورژوا کا انقلاب ہے جس کا اظہار اس کے نزدیک خصوصا فرانسیسی انقلاب میں ہوا۔ آنے والا انقلاب بورژوا کے خلاف مزدوروں یا بے مایگان کا انقلاب ہو جس سے اشتراکی دولت کا قیام عمل میں آئے گا۔ تاریخ کی ساری رو اس کے نزدیک ایک لازمی چیز ہے بطور

اس نتیجہ کے جو مادی اسباب وجود انسانی پر اثر ڈال کر پیدا کرتے ہیں۔ یہ اشتراکی انقلاب کی تلقین اتنی نہیں کرتا جتنی اس کی پیش گوئی۔ یہ سچ ہے کہ اس کے نزدیک یہ سودبخش ہوگا، لیکن اسے زیادہ تر یہ بات ثابت کرنے سے سروکار ہے کہ یہ لازماً واقع ہوگا۔ یہ جو سرمایہ داری کے نظام کی برائیاں واضح کرتا ہے اس میں بھی یہی احساس لزوم نمایاں ہے۔ یہ جن مظالم کا مجرم سرمایہ داروں کو بتاتا ہے اس پر انہیں الزام نہیں دیتا، وہ تو صرف یہ بتاتا ہے کہ جبتک زمین اور سرمایہ پر ملکیت شخصی قایم رہے گی سرمایہ دار ایک لزوم کے ماتحت مجبور ہے کہ بے رحمی سے پیش آئے۔ لیکن انکا یہ ظلم ہمیشہ جاری نہ رہے گا، کیونکہ یہ خود وہ قوتیں پیدا کرتا ہے جو آخر میں اسے تہ و بالا کردیں گی۔

۲۔ اجتماع سرمایہ کا قانون:۔ مارکس نے یہ بات بتائی کہ سرمایہ داری کا بعد دن بدن بڑے ہوتے جاتے ہیں۔ اس نے پہلے سے آزاد مقابلہ کی جگہ بڑے ٹرسٹوں کو پیدا کرتے دیکھ لیا تھا اور پیش گوئی کردی تھی کہ سرمایہ داری کاروبار کی تعداد اسی نسبت سے کم ہوتی جائیگی جس نسبت سے انفرادی کاروبار کی وسعت میں اضافہ ہوگا۔ اس کا گمان تھا کہ اس عمل سے نہ صرف کاروبار کی تعداد بلکہ خود سرمایہ داروں کی تعداد میں بھی تخفیف ہوگی۔ بلکہ اس کے بیان سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک ایک کاروبار کا مالک ایک شخص ہو۔ لہذا وہ سمجھتا تھا کہ سرمایہ داروں کی صفوں سے آدمی برابر نکل نکل کر بے مایہ مزدوروں کے گروہ میں شامل ہوتے رہیں گے اور جہاں تک تعداد کا تعلق ہے ہوتے ہوتے سرمایہ دار دن بدن کمزور ہوتے جائیں گے۔ اس نے یہ اصول صرف صنعت ہی پر نہیں بلکہ زراعت پر بھی عائد کیا تھا۔ اسے توقع تھی کہ زمینداروں کے علاقے روز بروز بڑھتے جائیں گے اور ان کی تعداد دن بدن گھٹتی جائے گی۔ یہ حالات روز بروز نظام سرمایہ داری کے عیوب اور بے انصافیوں کو زیادہ روشن

طریقہ سے پیش کرنے لگی اور اس طرح مخالف قوتوں کو دن بدن زیادہ ابھارے گی۔
معاشی طبقوں کی جنگ :۔ مارکس مزدور اور سرمایہ دار کو ایک گہرے تضاد کی صورت
میں تصور کرتا ہے۔ اس کے خیال میں ہر آدمی یا تو کلیتہً ایک ہے یا کلیتہً دوسرا اور اگر
اب نہیں تو عنقریب ہو جائے گا۔ مزدور سے جس کے پاس کچھ نہیں سرمایہ دار جس
کے پاس سب کچھ ہے بیجا فائدہ اٹھاتا ہے۔ نظام سرمایہ داری اپنے کو جوں جوں پھیلاتا
ہے اور اس کی اصلیت جوں جوں صاف ہوتی جاتی ہے ویسے ویسے بورژوا اور بے مایہ
مزدور کی مخالفت زیادہ بین ہوتی جاتی ہے۔ ان دونوں طبقوں کے اغراض چونکہ مخالف
ہیں اس لئے یہ باہمی جنگ پر مجبور ہوتے ہیں جس سے اقتدار سرمایہ داری میں اندرونی
انتشار کی قوتیں پیدا ہوتی ہیں۔ مزدور رفتہ رفتہ اپنی ذات سے بیجا فائدہ اٹھانے والوں کے خلاف
متحد ہونا سیکھ لیتے ہیں، پہلے تو مقامی حیثیت سے پھر قومی اور آخر کار بین الاقوامی
طور پر۔ جب یہ بین الاقوامی طور پر متحد ہونا سیکھ جائیں گے تو انکی فتح لازمی ہے۔
اب یہ حکم نافذ کر دیں گے کہ ساری زمین اور سرمایہ مشترک ملک ہو، بیجا فائدہ
اٹھانے کا انسداد ہو جائے گا، مالکان دولت کا ظلم اب ممکن نہ رہنے کا، اب
جماعت کی تقسیم مختلف طبقوں میں باقی نہ رہے گی، اور سب آدمی آزاد ہو جائیں گے۔
یہ سارے خیالات اشتراکی اعلان ہی میں موجود ہیں جو نہایت حیرت انگیز
قوت اور تاثیر کی تصنیف ہے جس میں نہایت جامع، اختصار کے ساتھ دنیا کی
عظیم الشان قوتیں، انکا معرکۂ جنگ اور اسکا اٹل نتیجہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب
اشتراکیت کے نشوونما میں اس درجہ اہمیت رکھتی ہے اور جن مسائل کو بعد میں
" سرمایہ " کے اندر زیادہ تفصیل اور بہت طوالت کے ساتھ بیان کیا گیا ان کا
اسقدر عمدہ بیان اس میں موجود ہے کہ اس کے خاص خاص حصوں کا علم ہر اس
شخص کے لئے لازمی ہے جو چاہتا ہے کہ اس اثر و تسلط کو سمجھے جو مارکسی اشتراک

نے مزدور طبقہ کے قائدین میں سے ایک بڑی تعداد کے ذہن اور تخیل پر حاصل کر لیا ہے ۔

یہ یوں شروع ہوتا ہے : ”یورپ کے سر پر ایک آسیب سوار ہے ، اشتراک کا آسیب قدیم یورپ کی تمام قوتیں اس آسیب کو اتارنے کے لئے باہم ایک حلافِ مقدس میں شامل ہوئی ہیں ۔ پوپ اور زار ، میٹرنک اور گیزو ، فرانسیسی انتہا پسند اور جرمن پولیس کے جاسوس ۔ وہ کونسا مخالف فریق ہے جسے اس کے بااقتدار حریفوں نے اشتراکی کہہ کر فضیحت نہ کیا ہو ؟ وہ فریق مخالف کہاں ہو جس نے خود اپنے گروہ کے زیادہ انتہا پسند فریقوں کو نیز اپنے قدامت پسند حریفوں کو اشتراکی ہونے کی ملامت نہ کی ہو ؟ “

معاشی گروہوں کی جنگ کوئی نئی بات نہیں : ”ساری موجودہ جماعت کی تاریخ طبقاتِ معاشی کی کشمکش کی تاریخ ہے “ اس کشاکش میں معرکہ ”ہر مرتبہ یا ہیئت اجتماعی کی ایک انقلابی ترتیب نو کی صورت میں ختم ہوا یا جنگ آزما طبقوں کی یکساں تباہی میں ۔“

”ہمارے عہد نے ، جو بورژوا طبقہ کا عہد ہے ، اس سماجی جنگ کو سادہ کر دیا ہی ۔ ہیئت اجتماعی بہ حیثیت کل روز بروز دو بڑے مقابل لشکروں میں منقسم ہوتی جا رہی ہے ، دو بڑے طبقوں میں جو بلا واسطہ ایک دوسرے کے مدمقابل ہیں : یعنی بورژوا (سرمایہ دار) اور بے مایہ مزدور “ اس کے بعد منصب داری کے زوال کی تاریخ آتی ہے جس کے سلسلہ میں بورژوا کا بہ حیثیت انقلابی قوت کے بیان آتا ہی ۔ ”تاریخ میں بورژوا نے نہایت انقلابی حصہ لیا ہی “ اس ناجائز فائدہ اٹھانے کے بجائے جو مذہبی اور سیاسی فریبوں کے پردہ میں ہوتا ہی اس نے کھلے بندوں ، بے حیائی سے ، براہ راست اور وحشیانہ فائدہ اٹھانا شروع

کر دیا ہو " اپنی پیداوار کے لئے روزافزوں بازار کی ضرورت بورژوا کو سارے کرۂ ارض پر لئے پھرتی ہے " سو سال سے بھی کم عرصہ کے اقتدار میں بورژوا طبقہ نے اس سے زیادہ وسیع اور عظیم پیدائشی قوتیں پیدا کر دیں جتنی تمام سابقہ نسلوں نے مل کر نہ کی تھیں " منصب داری تعلقات اب زنجیریں تھیں " " انکا توڑنا ضروری تھا - چنانچہ یہ توڑ دی گئیں " اور ایسی ہی ایک تحریک ہماری آنکھوں کے سامنے بھی جاری ہے " جن ہتھیاروں سے بورژوا طبقے نے منصب داری کے قصر کو منہدم کیا تھا وہی اب خود اس کے خلاف استعمال ہو رہے ہیں لیکن بورژوا طبقہ نے یہی نہیں کہ وہ ہتھیار تیار کر دئے ہیں جو اس کی موت کا باعث ہوں گے بلکہ اس نے وہ آدمی بھی پیدا کر دئے ہیں جو یہ ہتھیار اٹھائیں گے یعنی کارگزار طبقہ ؛ بے مایہ مزدور -

اس کے بعد مزدوروں کی ناداری کے اسباب پیش کئے گئے ہیں " ایک کام کرنے والے (مزدور) کی پیدائش کا صرف تقریبا بالکل ان ذرائع گزر پر محدود ہے جو اسے اپنے زندہ رکھنے اور اپنی نسل کو جاری رکھنے کے لئے درکار ہیں - لیکن کسی چیز کی قیمت ، اور لہذا محنت کی قیمت بھی اس کے صرف پیدائش کے برابر ہوتی ہو - لہذا جس نسبت سے کہ کام کی کراہیت بڑھتی ہے مزدوری گھٹتی ہے - یہی نہیں بلکہ جس نسبت سے کہ مشین کے استعمال اور تقسیم عمل میں اضافہ ہوتا ہو اس نسبت سے مشقت کا بار بھی بڑھتا ہو "

" جدید صنعت نے شفیق استاد کی چھوٹی دوکان کو صنعتی سرمایہ دار کے بڑے کارخانوں میں تبدیل کر دیا ہے - کارخانوں میں کھچا کھچ بھرے ہوئے مزدوروں کے انبوہ سپاہیوں کی طرح منظم کر دئے گئے ہیں - صنعتی لشکر کے سپاہیوں کی حیثیت سے یہ عہدیداروں اور حوالداروں کے ایک درجہ بدرجہ

رتب نظام کے زیر حکم ہیں۔ یہ بورژوا طبقہ اور بورژوا ریاست ہی کے غلام
ہیں بلکہ ہر دن ہر ساعت مشین کے غلام ہیں اور ان سب سے بڑھکر خود اپنے
بورژوا کارخانہ دار کی ذات کے غلام۔ یہ استبداد جس قدر کھلے الفاظ میں
منافع کو اپنا مقصد اور اپنی غایت ظاہر کرتا ہے اسی قدر چھچھورا، قابل نفرت
اور تلخ ہوتا جاتا ہے"

اس کے بعد یہ اعلان ان طبقات معاشی کی باہمی جنگ کے بڑھنے کے طریقے
بتاتا ہے "مزدور طبقہ نشو و نما کے کئی منازل سے گذرتا ہے۔ پیدائش کی گھڑی ہی
سے بورژوا سے اس کی پیکار شروع ہو جاتی ہے۔ پہلے پہل تو انفرادی حیثیت سے
مزدور مقابلہ کرتے ہیں، پھر ایک کارخانے کے مزدور، پھر ایک صنعت کے کارگذار
کسی مقام میں ان انفرادی سرمایہ داروں کے خلاف ہوجاتے ہیں جو براہ راست
ان سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ یہ بورژوا پیدائش دولت کے حالات کے
خلاف حملہ کرنیکے بجائے خود آلات پیدائش کے دشمن بن جاتے ہیں۔

اس منزل میں مزدور ابھی سارے ملک میں پھیلے ہوئے اشخاص کا ایک
بے ربط مجموعہ ہیں اور باہمی مقابلہ کے باعث منتشر۔ اگر یہ کہیں زیادہ منضبط
جماعتوں میں متحد ہوتے ہیں تو یہ خود اپنے شعوری اتحاد کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ بورژوا
طبقہ کے اتحاد کا، جو خود اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے سارے مزدور
پیشہ طبقہ کو حرکت میں لانے پر مجبور ہوتا ہے اور ابھی کچھ زمانہ تک انہیں حرکت
دینے کی قوت بھی رکھتا ہے"

انفرادی مزدور اور انفرادی سرمایہ دار کا تصادم روز بروز دو معاشی
طبقوں کے تصادم کی حیثیت اختیار کرتا جاتا ہے۔ اس پر مزدور بورژوا کے
خلاف اپنی جمعیتیں بنانا شروع کرتے ہیں (اتحادہائے صنعتی)، اجرت کا نرخ اونچا

رکھنے کے لئے یہ باہم ملتے ہیں، اپنی ہنگامی بغاوتوں کے لئے پہلے سے انتظام کرنے کی غرض سے یہ مستقل انجمنیں بناتے ہیں۔ کہیں کہیں یہ مقابلہ بلووں کی شکل اختیار کرتا ہے کبھی کبھی مزدور فتحمند ہوتے ہیں، لیکن محض عارضی طور پر۔ انکے معرکوں کا اصلی پھل انکے فوری نتیجے میں نہیں ہوتا بلکہ مزدوروں کے روز بروز وسعت پذیر اتحاد میں۔ اس اتحاد میں ان ترقی یافتہ ذرائع آمدورفت سے مدد ملتی ہے جو موجودہ صنعت نے پیدا کر دئے ہیں اور جو مختلف مقامات کے مزدوروں میں باہم تعلق پیدا کرا دیتے ہیں۔ متعدد مقامی معرکوں کو جنکی نوعیت ایک ہی تھی مرکزی حیثیت سے مجتمع کر کے معاشی طبقوں کی ایک قومی جنگ بنانے کے لئے اس تعلق کی ضرورت تھی لیکن معاشی طبقوں کی ہر جنگ سیاسی جنگ ہے۔ اور جس اتحاد کے پیدا کرنے کے لئے قرون وسطےٰ کے شہریوں کو اپنی خراب سڑکوں کے باعث صدیاں درکار تھیں وہ ریلوں کا بھلا ہو موجودہ مزدور طبقہ چند سال میں حاصل کر لیتا ہے۔ مزدوروں کی ایک معاشی طبقے میں اور لہذا ایک سیاسی فریق (پارٹی) کی شکل میں تنظیم برابر اس مقابلہ کی وجہ سے بکھر جاتی ہے جو خود مزدوروں میں باہم موجود ہے۔ لیکن یہ پھر اٹھتی ہے اور پہلے سے مضبوط تر، قوی تر، پائندہ تر ہوکر بورژوا طبقہ میں جو باہمی مناقشین ہیں ان سے فائدہ اٹھاکر یہ مزدوروں کے بعض مخصوص اغراض کو قانوناً تسلیم کرا لیتی ہے"

"بے مایہ مزدور طبقے میں عام طور پر پرانے اجتماعی حالات علامت ہی چکتے ہیں۔ مزدور بے املاک ہوتا ہے، اپنی بیوی بچوں سے اس کے جو تعلقات ہوتے ہیں ان میں اور بورژوا خاندانی تعلقات میں کوئی چیز مشترک باقی نہیں رہتی۔ موجودہ صنعتی محنت نے سرمایہ کی محکومیت، جو انگلستان اور فرانس، امریکہ اور جرمنی سب جگہ یکساں ہے اسے سیرت و خصائل قومی کے ہر ا

سے جاذبی کر دیا ہے۔ قانون، اخلاق، مذہب اس کے لئے بس بورژوا تعصبات ہیں جن کی آڑ میں اتنے ہی بورژوا اغراض پوشیدہ ہیں۔ سارے گزشتہ طبقے جو غالب آئے انہوں نے اپنی حاصل شدہ حیثیت کو اور مضبوط کرنے کے لئے ساری جماعت کو اپنی شرائط تملیک کا پابند بنایا۔ مزدور ہیئت اجتماعی کی پیدائشی قوتوں پر کسی طرح قابض نہیں ہو سکتے۔ سوائے اس کے کہ اپنے سابقہ طریق تملیک اور لہذا ہر دوسرے سابقہ طریق تملیک کو مٹا دیں۔ ان کا اپنا تو کچھ ہے نہیں جسے یہ بچائیں اور محفوظ کریں۔ ان کا مقصد ہے ملکیت شخصی کی تمام سابقہ حفاظتوں اور ضمانتوں کو تباہ کر دینا۔ تمام سابقہ تاریخی تحریکیں اقلیت کی تحریکیں تھیں یا اقلیت کے اغراض کے لئے تھیں۔ مزدوروں کی تحریک بہت بڑی اکثریت کی شعوری اور خود مختار تحریک ہے اور اسی بڑی اکثریت کے اغراض کے لئے۔ مزدوروں کا طبقہ جو موجودہ جماعت کی سب سے نیچی تہ ہے اس وقت تک نہ حرکت کر سکتا ہے نہ اپنے کو ابھار سکتا ہے جب تک کہ دفتری ہیئت اجتماعی کی ساری اوپر کی تہیں پرزہ پرزہ ہو کر فضا میں نہ اڑ جائیں ''

مارکس کہتا ہے کہ اشتراکی سارے مزدور طبقہ کے ساتھ ہیں۔ یہ بین الاقوامی حیثیت رکھتے ہیں '' اشتراکیوں پر ایک الزام یہ اور لگایا جاتا ہے کہ یہ ملکوں اور قوموں کے مٹانے کے آرزومند ہیں۔ مزدور کا کوئی ملک نہیں۔ ہم ان سے وہ چیز نہیں چھین سکتے جو وہ رکھتے ہی نہیں ''

اشتراکیوں کا سب سے پہلا مقصد مزدوروں کے ہاتھوں سیاسی قوت کا حصول ہے '' اشتراکیوں کا نظریہ ایک جملہ میں بند کیا جا سکتا ہے: ملکیت شخصی کا مٹانا ''

اس قسم کے الزامات کے جواب میں کہ اشتراک عیسائیت کا مخالف ہے تاریخ

کی مادی تشریح استعمال کی گئی ہے ": اشتراک کے خلاف مذہبی، فلسفیانہ یا عموماً مینی نقطۂ نظر سے جو اعتراضات کئے جاتے ہیں وہ زیادہ گہری تحقیق کے مستحق نہیں۔ اس کے سمجھنے کے لئے کیا کوئی گہرا وجدان درکار ہے کہ انسان کے خیالات آراء، اور تصورات مختصراً انسان کا شعور ہر اس تبدیلی کے ساتھ بدلتا رہتا ہے جو اس کے وجود مادی کی کیفیات، اس کے معاشرتی تعلقات اور اس کی جماعتی زندگی میں پیدا ہو؟"

ریاست کی طرف "اعلان" کا رویہ بیہودہ بالکل آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ "جدید ریاست کی نظامیہ بس تمام بورژوا طبقہ کے معاملات مشترکہ کے انتظام کے لئے ایک کمیٹی ہے"، تاہم مزدور طبقہ کا پہلا قدم ریاست میں حصول اقتدار ہونا چاہئے ۔" ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ مزدور طبقہ کے انقلاب میں پہلا قدم یہ ہے کہ مزدوروں کو حکمراں طبقہ بنادے، جمہوریت کا معرکہ سر کرے۔ مزدور طبقہ اپنے سیاسی اقتدار کو اس غرض کے لئے استعمال کرے گا کہ رفتہ رفتہ بورژوا طبقہ سے سارا سرمایہ چھین لے اور تمام آلات پیدائش دولت کو مرکزی حیثیت سے ریاست کے ہاتھ میں جمع کردے یعنی بطور طبقہ حکمراں منظم مزدوروں کے ہاتھ میں اور پیدائشی قوتوں کے مجموعہ کو جس قدر تیزی سے ممکن ہو بڑھائے "

اعلان آگے چل کر فوری اصلاحات کا ایک پروگرام پیش کرتا ہے جس سے اول اول تو موجودہ ریاست کی قوت میں بہت اضافہ ہوگا لیکن یہ کہا گیا ہے کہ جب اشتراکی انقلاب تکمیل کو پہنچ جائے گا تو ریاست کا وجود جس حیثیت سے ہم اسے جانتے ہیں ختم ہو جائے گا۔ جیسے انگلس ایک دوسرے موقع پر کہتا ہے کہ جب مزدور طبقہ ریاست کی قوت اپنے ہاتھ میں لے لیگا "تو ساتھ ہی معاشی طبقول

کے تمام اختلافات اور خصوصیتوں کا خاتمہ بھی کردیگا چنانچہ ریاست کا وجود بھی بہ حیثیت ریاست کے ختم ہوجائے گا۔" اس طرح اگرچہ واقعتاً مارکس اور انگلس کی تجاویز کا نتیجہ ریاستی اشتراک ہوتا ہم ان پر ریاست کو عظمت دینے کا الزام نہیں لگایا جاسکتا۔

"اعلان" ساری دنیا کے مزدوروں کو اشتراک حمایت کے لئے کھڑے ہونے کی ایک اپیل پر ختم ہوتا ہے "اشتراکی اپنے خیالات اور مقاصد کو چھپانے کو حقیر جانتے ہیں۔ یہ صاف اعلان کرتے ہیں کہ انکے مقاصد صرف اس طرح حاصل ہوسکتے ہیں کہ تمام موجودہ جماعتی حالات کو بہ جبر تباہ کردیا جائے۔ حکمراں طبقے اشتراکی انقلاب کے ڈر سے کانپیں! مزدوروں کے پاس سوائے اپنی زنجیروں کے اور کچھ کھونے کو نہیں۔ فتح کرنے کو انکے لئے ایک عالم ہے۔ تمام ممالک کے مزدورو متحد ہوجاؤ!"

اس اشتراکی "اعلان" کی اشاعت کے بعد جلد ہی روس کے علاوہ براعظم یورپ کے تمام بڑے ملکوں میں انقلاب برپا ہوا لیکن سوائے شروع شروع میں فرانس کے یہ انقلاب نہ معاشی تھا نہ بین الاقوامی۔ ہر دوسری جگہ اسے قومیت کے خیالات نے ابھارا تھا۔ چنانچہ وقتی طور پر خوف زدہ ہونے کے بعد دنیا کے حکمرانوں نے ان مخالفتوں کو ابھار کر پھر اقتدار حاصل کرلیا جو قومی خیالات میں لازماً موجود ہوتی ہیں۔ اور ایک بہت مختصر سی ظفر مندی کے بعد یہ انقلاب ہر جگہ جنگ اور ردعمل کی شکل میں ختم ہوا۔ اشتراکی "اعلان" کے خیالات شائع ہوگئے قبل اس کے کہ دنیا انکے لئے تیار ہوتی۔ لیکن اس کے مصنفوں نے ہر ملک میں اس اشتراکی تحریک کی ابتدا اپنی آنکھوں سے دیکھ لی جو روز افزوں قوت کے ساتھ آگے بڑھتی رہی ہے، حکومتوں پر روز بروز زیادہ اثر ڈال رہی ہے، جو روسی

انقلاب پر حاوی ہے شاید وہ دل و دماغ نہیں رکھتے کہ وہ بین الاقوامی قسمت حاصل کرنے کا اہل اپنے کو ثابت کر سکے چین کی طرف اعلان کے آخری حصے دنیا کے مزدوروں کو دعوت دیتے ہیں۔

مارکس کے شاہکار "سرمایہ" نے "اشتراکی اصول" کے تفصیلی حجم اور مواد کا اضافہ کیا۔ اس نے "قدر زاید" کا نظریہ پیش کیا جو سرمایہ دار کی فائدہ بیجا کے واقعی کل پرزوں کی تشریح کا مدعی ہے۔ یہ مسئلہ نہایت پیچیدہ ہے اور ہم خالص نظریات میں اسے مشکل ہی سے ایک اضافہ تسلیم کر سکتے ہیں۔ بلکہ یہ زیادہ صحیح ہوگا کہ ہم اسے تجریدی الفاظ میں مارکس کی اس نفرت کا ترجمہ سمجھیں جو اسے اس نظام سے تھی جو انسانی زندگیوں سے مادی دولت بناتا ہے۔ اور اسی معنی میں اس کے مداحوں نے اسے سمجھا ہے۔ نہ کہ بے لوث تحلیل علمی کی حیثیت سے۔ نظریہ قدر زاید کی تنقیدی تحقیق میں خالص معاشی نظریہ کی بہت سی دشوار اور مجرد بحثیں آ جائیں گی اور اشتراک کی علمی صحت یا عدم صحت پر اس کا کچھ زیادہ اثر نہیں ہوگا۔ اس لئے موجودہ کتاب کی حدود میں اس کا شامل کرنا نا ممکن معلوم ہوتا ہے۔ میرے خیال میں اس کتاب (سرمایہ) کے بہترین حصے وہ ہیں جو معاشی واقعات سے بحث کرتے ہیں جن کا مارکس کو نہایت ہمہ گیر علم رکھتا تھا۔ انہیں واقعات سے اسے توقع تھی کہ وہ اپنے چیلوں میں وہ پائدار اور غیر فانی نفرت پھونک سکے گا جو انہیں مرتے دم تک معاشی طبقوں کی جنگ میں سپاہی بنائے رکھے گی۔ اس نے جو واقعات جمع کئے ہیں وہ ایسے ہیں جو چین کی زندگی بسر کرنیوالے لوگوں کی ایک بڑی اکثریت کے لئے عموماً معدوم ہیں۔ یہ شبہ بیشتر واقعات میں اور جو معاشی نظام انہیں پیدا کر رہا ہے اس کے متعلق تسلیم کرنا چاہئے کہ یہ نہایت معیوب ہے۔ اس کے انتخاب واقعات کی چند مثالیں بہت سے اشتراکیوں کی تلخی کی تشریح کا کام دیں گی۔

۱۴ر جنوری ۱۸۶۰ء کو ناٹنگھم کے مجلس گھر میں مسٹر بروٹن چارلٹن مجسٹریٹ ضلع نے ایک جلسے کے صدر کی حیثیت سے بیان کیا کہ لیس کی صنعت سے آبادی کے جس حصے کا تعلق ہے اس میں ناداری و مصیبت کا عالم یہ ہے کہ حکومت کے دوسرے حصوں میں کیا ساری دنیا میں ایسی حالت نہ ملیگی ..... نو نو دس دس برس کے بچے اپنے میلے کچیلے بستروں سے صبح ۲، ۳ یا ۴ بجے باہر گھسیٹ لے جاتے ہیں اور انہیں مجبور کیا جاتا ہے کہ محض گزارہ پر رات کے ۱۰، ۱۱ یا ۱۲ بجے تک کام کریں۔ انکے ہاتھ پاؤں گھسے جاتے ہیں، انکی ہڈیاں سکھی جاتی ہیں۔ انکے چہرے سفید پڑ جاتے ہیں، اور انکی انسانیت اترتے اترتے بالکل پتھر کنکر کے سے جمود کی ایسی سطح پر پہونچ جاتی ہے جس کا تصور بھی تکلیف دہ ہے۔"

لندن کے ایک جیوری کے سامنے تین آدمی کھڑے ہیں۔ ایک گارڈ، ایک انجن چلانیوالا، ایک جھنڈی دکھلانے والا۔ ایک ہیبت ناک ریل کے حادثہ نے سینکڑوں مسافروں کو دوسری دنیا میں پہنچا دیا ہے۔ ملازموں کی غفلت اس حادثہ کا سبب ہے اور یہ یک آواز جیوری کے سامنے بیان کرتے ہیں کہ دس یا بارہ سال پہلے انکا کام روزانہ صرف ۸ گھنٹے رہتا تھا۔ پچھلے ۵ یا ۶ برس سے یہ بڑھکر ۱۴، ۱۸ اور ۲۰ گھنٹے روزانہ تک ہوگیا ہے اور جب چھٹیاں منانے والوں کا زیادہ زور ہوتا ہے اور تفریح کی گاڑیاں چھوڑی جاتی ہیں تو انکا کام بلا وقفہ ۴۰ یا ۵۰ گھنٹے تک چلتا ہے۔ یہ معمولی آدمی ہیں جن یا دیو تو نہیں ہیں۔ ایک نقطہ پر پہنچکر انکی محنت نے جواب دیدیا۔ ان پر جمود طاری ہوگیا۔ انکا دماغ سوچنے سے معذور ہوگیا اور انکی آنکھیں دیکھنے سے۔ ان سراپا معزز انگریز ارکان جیوری

نے حکم لگایا کہ انہیں قتل انسانی کے جرم میں عدالت بالا کے سپرد کیا جائے
اور اپنے حکم کے ساتھ ایک نرم "تنبیہ" میں یہ مقدس امید ظاہر کی کہ ریل کے
سرمایہ دار اکابر آئندہ "قوت" محنت کی کافی مقدار خریدنے میں ذرا
زیادہ فراخدل ہونگے اور اپنے ملازموں سے کام لینے میں ذرا زیادہ "امتناع"
زیادہ "نفس فراموشی" اور زیادہ "کفایت" سے کام لیں گے۔

جون ۱۸۶۳ء کے آخری ہفتہ میں لندن کے تمام روزانہ اخباروں
نے "محض زیادتی کار سے موت" کے "سنسنی خیز" عنوان کے ماتحت
میں ایک عبارت شائع کی۔ اسمیں میری این والکلے نامی ایک ۲۰ سالہ
درزن کی موت کا ذکر تھا جو ایک نہایت معزز لباس سازی کے کارخانے
میں ملازم تھی جس پر ایلیزا کا خوش آئند نام رکھنے والی ایک خاتون متصرف
تھیں۔ یہ لڑکی اوسطاً ۱۶½ گھنٹے، اور خاص بکری کے موسم میں بلا وقفہ
۳۰ گھنٹے کام کرتی تھی۔ اور اس کی رو بہ زوال قوت کو وقتاً فوقتاً شیری
یا پورٹ شراب یا کافی کی فراہمی سے دوبارہ زندہ کیا جاتا تھا۔ اس وقت
بکری کا موسم زوروں پر تھا۔ نووارد شہزادی ویلز کی آمد کی تقریب میں ناچ
ہونے والے تھے اور اسمیں جو معزز خواتین مدعو تھیں انکے لیے بال مارتے
میں شاندار لباس تیار کرنے تھے۔ میری این والکلے نے اور ۶۰ لڑکیوں
کے ساتھ بلا وقفہ ۲۶½ گھنٹے کام کیا۔ ایک کمرہ میں ۳۰ لڑکیاں کام کرتی
تھیں جس میں انکے لئے جتنے مکعب فٹ ہوا درکار تھی اس کی صرف ایک
چوتھائی پہنچ سکتی تھی۔ رات میں یہ دو دو ملکر ایک ایسی کوٹھری میں سوتیاں
جہاں دم گھٹتا تھا اور جو کمرہ خواب کو وقتیوں سے تقسیم کرکے بنائی گئی تھیں
اور یہ کارخانہ لندن کے بہترین لباس سازی کے کارخانوں میں سے تھا۔

میری این واکے جمعہ کو بیمار پڑی، اتوار کو مرگئی" اور ایلیزا خاتون کو تعجب ہوا کہ ہفتہ میں جو کام لیا تھا اسے ختم کئے بغیر ا ڈاکٹر مسٹر کیز نے جو بستر مرگ پر بہت دیر میں بلائے گئے تھے، جوری کے سامنے شہادت دی کہ "میری این واکلے آدمیوں سے بالکل بھرے ہوئے کمرہ میں بہت دیر تک کام کرنے اور ایسی کوٹھری میں سونے کیوجہ سے مرگئی جو بہت تنگ تھی اور جس میں ہوا کے جانے کا انتظام بہت خراب تھا۔" ڈاکٹر صاحب کو آداب حسنہ کی تعلیم دینے کے لئے جوری نے فیصلہ کیا کہ "متوفیہ مرگی کے عارضہ وغیرہ وغیرہ" آزادی تجارت کے حامی کابدن اور براءٹ کا پرچہ مارننگ اسٹار چلا اٹھا کہ "ہمارے سفید غلام جو کثرت مشقت سے قبر کا منہ دیکھتے ہیں اکثر خاموشی سے گھلتے رہتے ہیں اور یالآخر مرجاتے ہیں[1]"

ایڈورڈ ششم: اسکی حکومت کے پہلے سال (۱۵۴۷ء) میں ایک قانون نافذ ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص کام کرنے سے انکار کرے تو یہ اس شخص کا غلام قرار دیدیا جائے جس نے اسپر کام چوری کا الزام لگایا ہے۔ آقا اپنے غلام کو کھانے کے لئے روٹی اور پانی، ہلکی سی یخنی اور ایسا بچا کھچا گوشت دے جو اس کے خیال میں اس کے لئے موزوں ہو۔ آقا کو حق ہے کہ جس کام پر چاہے اسے مجبور کرے چاہے یہ کام کتنا ہی نفرت انگیز کیوں نہ ہو۔ اور یہ چابک اور زنجیر کی مدد سے اگر غلام دو ہفتے غائب رہے تو یہ ساری عمر کے لئے غلام ہو جائے گا اور اس کی پیشانی اور پشت پر حرف S داغ دیا جائے گا۔ اگر یہ تین مرتبہ بھاگ جائے تو مستحق موت مجرم کی حیثیت سے پھانسی دی جائے۔ آقا اسے بیچ کر سکتا ہے۔ ورثہ میں دے سکتا ہے، غلام

(۱) جلد اول صفحہ ۲۳۹ - ۲۴۰

کی حیثیت سے کرایہ پر دے سکتا ہے، بالکل جیسے کسی ذاتی چیز یا مویشی کو۔ اگر غلام اپنے آقا کے خلاف کچھ کرنے کی کوشش کریں تو بھی انہیں سزائے موت دیجائے۔ منصفان امن کو جب خبر پہنچے تو چاہیے کہ ان بدمعاشوں کو گرفتار کرا کے ان کا تعاقب کریں۔ اگر کوئی آوارہ گرد کہیں ۳ دن تک بیکار پڑا پکڑا جائے اسے اس کے مقام ولادت پر لیجانا چاہیے، لال دہکتے ہوئے لوہے سے اس کے سینہ پر حرف V کا داغنا چاہیے اور اسے زنجیروں میں جکڑ کر سڑک کوٹنے یا کسی اور کام پر لگا دینا چاہیے۔ اگر یہ آوارہ گرد غلط مقام پیدائش[۱] بتلائے تو یہ ساری عمر کے لئے اس مقام کا غلام بنا دیا جائے یعنی اس کے باشندوں اور اس کی جمیعت بلدی کا، اور اس کے جسم پر حرف S کا داغ دیدیا جائے۔ ہر شخص کو اختیار ہو کہ آوارہ گردوں کے بچوں کو مددگار کی طرح لیجائیں، تو جوانوں کو ۲۴ سال کی عمر تک اور لڑکیوں کو ۲۰ سال تک اگر یہ بھاگیں تو اس عمر تک اپنے استادوں کے غلام رہیں، ان آقاؤں کو اختیار ہے کہ اگر چاہیں تو انہیں زنجیروں میں جکڑیں کوڑوں سے ماریں۔ ہر آقا اپنے غلام کے گردن، بازو یا پیر میں ایک لوہے کا کڑا ڈالے جس سے اسے آسانی سے پہچانا جا سکے اور بھاگ نہ پائے۔ اس قانون کا آخری حصہ یہ ہے کہ بعض غریب لوگ ایسے مقامات یا ایسے اشخاص کے ملازم بنائے جا سکتے ہیں جو انہیں کھانا پینا دینے کو راضی ہوں اور انکے لئے کام فراہم کریں۔ حلقہ کے غلاموں کی یہ قسم انگلستان میں انیسویں صدی میں عرصہ تک " چکیداروں " کے نام سے قائم رہی۔"

اسی نوع کے واقعات کا صفحہ بر صفحہ اور باب بر باب، جن میں سے ہر ایک اس تقدیری نظریہ کی مثال میں پیش کیا گیا ہے جس کے یقینی دلائل سے ثابت کرنے کو

---

(۱) جلد اول صفحہ ۷۵۵، ۷۵۹

ارکس مدعی ہے ، کیسے ہو سکتا ہے کہ ہر جذبات رکھنے والے مزدور پیشہ پڑھنے والے کو آگ بولا نہ کر دے اور سرمایہ کے ہر مالک کو جس میں شرافت اور انصاف یک قلم مفقود ہی نہ ہو گیا ہو ناقابل برداشت شرم سے پانی پانی نہ کر دے۔

کتاب کے تقریباً ختم پر ایک نہایت مختصر سے باب میں جو "اجتماع سرمایہ کا تاریخی رجحان" کے زیر عنوان ہے ، مارکس ایک لمحہ کے لئے اس امید کی ذرا سی جھلک آنے دیتا ہے جو موجودہ مصیبت سے پرے کہیں بہت دور ہے۔

"جب تبدیل ہیئت کا یہ عمل قدیم جماعت کو سرتاپا پراگندہ کر چکے گا، جب کام کرنیوالے بے مایہ مزدوروں میں مبدل ہو جائیں گے اور ذرائع محنت سرمایہ میں، جب سرمایہ داری طریقہ پیدایش دولت خود اپنے پیروں پر کھڑا ہو گا، تو محنت کا مزید خدمت جماعت میں صرف ہوتا، زمین اور دیگر ذرائع پیدایش کا جماعت کے فوائد کے لئے اور لہذا مشترک ذرائع پیدائش کی حیثیت سے استعمال ہونا، نیز شخصی ملکیت رکھنے والوں کی مزید بے دخلی، یہ سب چیزیں ایک دوسری شکل اختیار کریں گی اب جس کی بے دخلی ہوگی وہ مزدور نہیں جو خود اپنے لئے کام کرتا ہے بلکہ سرمایہ دار ہوگا جو بہت سے مزدوروں سے بیجا فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہ بے دخلی خود سرمایہ داری پیدایش دولت کے مضمر بالذات قوانین سے عمل میں آتی ہے یعنی سرمایہ کے اجتماع مرکزی سے۔ایک سرمایہ دار ہمیشہ کئی کو مارتا ہے۔ اس مرکزیت یا چند کے ہاتھوں کئی کی بے دخلی کے ساتھ ساتھ روز افزوں طور پر عمل محنت کی تعاونی شکل نشو و نما پاتی ہے۔ نیز صنعت میں حکمت کا بالارادہ استعمال زمین کی باقاعدہ کاشت، آلات محنت کی تبدیلی ایسی شکلوں میں جو صرف مشترک حیثیت سے قابل استعمال ہیں۔ سارے ذرائع پیدایش کے استعمال میں اس طرح کفایت کہ نہیں صرف متحدہ اور جماعتی محنت کے ذرائع کے طور پر استعمال کیا جائے، تمام اقوام کا ایک دنیا کے بازار میں ایک دوسرے سے خلط ملط۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اقتدار

یہ داری کی بین الاقوامی نوعیت۔ جیسے جیسے اکابرین سرمایہ کی تعداد گھٹتی ہے اور
ساتبدیلی کے تمام فوائد کو غصب کرکے اپنے اجارہ میں لیتے جاتے ہیں اسکے ساتھ
ساتھ فلاکت، ظلم، غلامی، ذلت اور فائدہ بیجا کا انبار بڑھتا جاتا ہے۔ لیکن اسی
ساتھ ساتھ مزدور طبقہ کی بغاوت بھی بڑھتی ہے، ایک طبقہ ہے جس کی تعداد روز بڑھتی
ی ہے اور جو خود سرمایہ داری اور پیدائش دولت کی ضرورتوں کے اثر سے منضبط،
دا اور منظم ہے۔ سرمایہ کا اجارہ طریقہ پیدائش کے لئے زنجیر بن جاتا ہے، اس طرز
یدائش کے لئے جو اسی سے ابھرا تھا اور جس نے اسی کے ساتھ اور اسی کے ماتحت ترقی
ی تھی۔ ذرائع پیدائش کی مرکزیت اور محنت کا جماعتی استعمال اب ایسے نقطہ پر پہنچ
اتے ہیں جہاں وہ اس سرمایہ داری کے خول کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ چنانچہ خول
پھٹتا ہے۔ سرمایہ داری ملکیت شخصی کی موت کا گھنٹا بجتا ہے۔ بے دخل کرنے والے
بے دخل کئے جاتے ہیں۔"(۱)

بس صرف اسقدر۔ اس کے علاوہ شروع سے آخر تک خشک ہی سے کوئی اور
لفظ ہے جو اداسی کو دور کرے۔ اور پڑھنے والے کے دماغ پر اسی بیدردانہ دباؤ
میں اس قوت کا بڑا حصہ مضمر ہے جو اس کتاب نے حاصل کی ہے۔

مارکس کی تصنیف سے دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ اول آیا تاریخی ارتقاء کے
جو قانون اس نے بتائے ہیں وہ صحیح ہیں؟ دوم، کیا اشتراک پسندیدہ چیز ہے؟ دوسرا
سوال پہلے سے بالکل بے تعلق ہے۔ مارکس ثابت کرنا چاہتا ہے کہ اشتراک کا آنا
لازمی ہے لیکن اس کی دلیل دینے سے اسے مشکل ہی سے کچھ سروکار نظر آتا ہے کہ جب
یہ آئیگا تو اچھی چیز بھی ہوگا۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ جب یہ آئے تو اچھی چیز ہو، چاہے مارکس
کی تمام وہ دلیلیں غلط ہی ہوں جو اس نے اس کے ثبوت میں پیش کی ہیں کہ اسکا آ

(۱) جلد اول صفحہ ۷۸۸ - ۷۸۹

لازمی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ زمانہ نے مارکس کے نظریات میں سے بہتوں میں کمزوریاں ظاہر کی ہیں
دنیا کی ترقی اس کی پیش گوئی سے بیشک اتنی کافی شباہت رکھتی ہے کہ اسے نہایت غیر معمولی
دقت نظر کا آدمی ثابت کردے، لیکن اتنی شابہ نہیں کہ سیاسی یا معاشی تاریخ کو اس کی پیشگوئی
کے بالکل مطابق کرنے کے لئے کافی ہو۔ قومیت کا جذبہ، گھٹنے کا کیا ذکر، اور بڑھ گیا ہے۔
اور اس پر وہ عالمگیر رجحانات فتح نہیں پا سکے ہیں جو مارکس نے نہایت ٹھیک طور پر مالیات
میں دیکھے تھے۔ اگرچہ بڑے کاروبار اور بڑے ہوگئے ہیں اور بہت بڑے رقبہ میں اجارہ
کی منزل پر پہنچ چکے ہیں تاہم ان میں حصہ داروں کی تعداد استعدد کثیر ہے کہ ان افراد کی تعداد
جن کے اغراض نظام سرمایہ داری کے ساتھ وابستہ ہیں برابر بڑھتی گئی ہے۔ علاوہ بریں
اگرچہ بڑے کارخانے زیادہ بڑے ہوگئے ہیں تاہم ساتھ ساتھ اوسط درجہ کے کارخانے بھی
تعداد میں بڑھتے رہے ہیں اسی اثنا میں مزدور جنہیں مارکس کے خیال کے مطابق محض گذارہ
کی اس سطح پر ہی رہنا چاہئے تھا جس پر وہ انیسویں صدی کے نصف اول میں انگلستان میں
تھے۔ انھوں نے بجائے اس کے دولت کی عام فراوانی سے فائدہ حاصل کیا ہے اگرچہ اس
درجہ نہیں جتنا کہ سرمایہ داروں نے۔ اجرت کا مفروضہ قانون آہنی جہاں تک متمدن ممالک کی
محنت کا تعلق ہے، غلط ثابت ہوچکا ہے۔ اگر ہمیں آج سرمایہ دارانہ ظلم کی ایسی مثالیں
ڈھونڈنی ہوں جن سے مارکس کی کتاب بھری پڑی ہے تو ہمیں اپنے مواد کے اکثر حصے کے لئے
منطقہ حارہ کی طرف رجوع کرنا ہوگا جہاں ناجائز فائدہ اٹھانے کے لئے نیچی نسلوں کے انسان
موجود ہیں۔ پھر یہ کہ آج دنیائے محنت میں ہنرمند مزدور "رئیس" کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسکے
لئے یہ ایک سوال ہے کہ وہ سرمایہ دار کے خلاف بے سیکھے مزدوروں سے یا ان کے
خلاف سرمایہ دار سے ملے۔ اکثر یہ خود ایک چھوٹا موٹا سرمایہ دار ہوتا ہے، اور اگر انفرادی
حیثیت سے یہ خود نہ بھی ہو تو اسکا "اتحاد صنعتی" یا اس کی "انجمن احباب" تو ظن غالب
ہے کہ ہوگی۔ لہذا معاشی طبقوں کی جنگ میں وہ شدت قائم نہیں رہی۔ بجائے اس پہلے

نادار مزدور اور بہہ دار سرمایہ دار کے مریکی منطقی تضاد کے اب تو غریب اور امیر کے
درمیان مدارج ہیں بیچ کی منزلیں ہیں۔ خود جرمنی میں جو ارتودکس مارکسیت کا گھر بن گیا
تھا اور جس کی نہایت ترقی یافتہ اور طاقتور اشتراکی جمہوری پارٹی "سرمایہ" کے مسائل
کو نقلی حیثیت کے علاوہ اور ہر طرح منزل من اللہ جانتی تھی خود وہاں جنگ سے قبل زمانہ
میں تمام طبقوں کے اندر دولت کی بےحد فراوانی نے اشتراکیوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنے عقائد
پر نظر ثانی کریں اور انقلابی رویہ کے بجائے ارتقائی رویہ اختیار کریں۔ ایک جرمن
اشتراکی برنشتائین نے جو عرصہ تک انگلستان میں مقیم تھا ایک "ترمیمی" تحریک کی ابتدا
کی اور بالآخر اشتراکی پارٹی کے بڑے حصہ کو اپنا حامی بنالیا۔ ارتودکس مارکسیت کے خلاف
اس کی نکتہ چینی اس کی کتاب "ارتقائی اشتراک" میں پیش کی گئی ہے اور تمام وسعت مذہب
کے حامی مصنفین کی طرح برنشتائین کا کام بھی زیادہ تر یہ ظاہر کرنا تھا کہ خود بانیان مذہب بھی
مذہب کے مسائل پر اس درجہ سختی سے قائم نہ تھے جتنا کہ انکے متبعین۔ مارکس اور انگلز کی تحریروں
میں بہت کچھ چیزیں ہیں جو اس شدید ارتودکسی میں نہیں ملتیں جو انکے تبعین میں پیدا ہو گئی
تھی۔ علاوہ اس نکتہ چینی کے جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں ان متبعین کے خلاف برنشتائین کی
تنقید انقلاب کے مقابلہ میں نفسِ ارتقا اور تدریجی عمل کی حمایت پر مشتمل ہے۔ یہ مذہب
حریت کی اس بیجا خصوصیت کے خلاف احتجاج کرتا ہے جو اشتراکیوں میں بہت عام ہے
اور اس بین الاقوامیت کی دھار بھی کند کرتا ہے جو بلاشبہ مارکس کی تعلیم کا جزو ہے۔ یہ
کہتا ہے کہ جہاں مزدور شہری بنا تو پھر وطن کا بھی پابند ہو جاتا ہے اور اس قوم پرستی کی حمایت
کرتا ہے جس کے متعلق جنگ نے ثابت کر دیا کہ یہ اشتراکی طبقوں میں عام ہے۔ یہ یہاں تک
کہتا ہے کہ یورپی قوموں کو ممالک حارہ پر بوجہ اپنی اعلیٰ تہذیب کے حق حکومت حاصل
یہ تعلیم انقلابی امنگ کو مدھم کرتی اور اشتراکیوں کو لبرل فرقہ کا ایک بازو سے چپ بنا
ہے۔ لیکن جنگ سے قبل مزدوروں کی روزافزوں مرفہ الحالی نے خیالات کی اس نئی

سو ناگزیر بنا دیا تھا۔ آیا جنگ اس بارے میں حالات بدلیگی اس کا جاننا فی الحال ناممکن ہے۔
برنشٹائین اس عاقلانہ قول پر اپنی تصنیف ختم کرتا ہے ؛ " ہمیں مزدوروں کو اس طرح
دیکھنا ہے جیسے کہ وہ واقعتاً ہیں۔ اور یہ نہ تو اس درجہ عالمگیر طور پر نادار ہیں جیسا کہ اشتراکی
اعلان میں بیان کیا گیا تھا، نہ تعصبات اور کمزوریوں سے ایسے پاک ہیں جیسا کہ انکے درباری
ہمیں باور کرانا چاہتے ہیں "

برنشٹائین مارکسی ارتودکسی کے اس زوال کا نمائندہ ہے جو اندر سے شروع ہوا
ہے۔ سنڈکلیت کا اس پر باہر سے حملہ ہے یعنی ایک ایسے مذہب کے نقطہ نظر سے جو مارکس
اور انگلز سے زیادہ بنیادی اور انقلابی ہونے کا مدعی ہے۔ مارکس کیطرف سنڈکلی رویہ
کا پتہ سوریل کی چھوٹی سی کتاب "انتشار مارکسیت" اور اس کی بڑی تصنیف "افکار
بابتہ تشدد" جس کا انگریزی ترجمہ بہ اجازت مصنف ٹ۔ ا۔ ہیوم نے کیا ہے (مطبوعہ
۱۹۱۵ء ایلن وا بون) برنشٹائین نے جہاں تک مارکس پر نکتہ چینی کی ہے اسے بالاتفاق نقل
کرنے کے بعد سوریل ایک دوسری قسم کی نکتہ چینی شروع کرتا ہے۔ یہ بتاتا ہے (اور یہ
سچ بھی ہے) کہ مارکس کی نظری معاشیات مذہب منچسٹر سے بہت قریب ہے۔ اس نے
اپنے شباب کے زمانہ کی ارتودکس معاشیات کو بہت سی ایسی باتوں میں تسلیم کر لیا ہے جو
اب غلط ثابت ہو چکی ہیں۔ سوریل کے نزدیک مارکس کی تعلیم میں واقعی اصلی چیز طبقات معاشی
کی جنگ ہے۔ جو کوئی اسے زندہ رکھے وہ اشتراک کی روح کو ان لوگوں کی مقابلہ میں زیادہ زندہ
رکھ رہا ہے جو اشتراکی۔ جمہوریتی ارتودکسی پر حرف بحرف اڑے ہوئے ہیں۔ اس جنگ
طبقاتی کی بنیاد پر فرانسیسی سنڈکلیوں نے مارکس پر وہ تنقید پیش کی جو اس تنقید سے جس پر
ہم ابھی تک غور کر رہے تھے بہت زیادہ گہری ہے۔ ارتقار تاریخی کے متعلق جہاں تک
امر واقعہ کا تعلق ہے مارکس کے خیالات میں تھوڑی بہت غلطی ہو سکتی تھی تاہم ممکن تھا کہ
وہ سیاسی و معاشی نظام جو یہ پیدا کرنا چاہتا تھا اتنا ہی پسندیدہ ہوتا جتنا کہ اس کے متبع

فرض کرتے ہیں۔ لیکن سنڈکلیوں نے محض امر واقعہ کے بابتہ ہی مارکس کے خیالات پہ کونی نہیں کی بلکہ اس مقصد پر بھی جو اس کے پیش نظر ہے اور ان ذرائع کی عام نوعیت پر جو یہ تجویز کرتا ہے۔ مارکس کے خیالات ایسے زمانہ میں صورت اختیار کی تھی کہ جمہوریت کا وجود نہ تھا۔ اسی سال جب کتاب "سرمایہ" شائع ہوتی ہے انگلستان میں شہری مزدوروں کو پہلی مرتبہ حق رائے ملا اور شمالی جرمنی میں بسمارک نے عام حق انتخاب منظور کیا۔ فطری بات تھی کہ جمہوریت سے جو جو حاصل ہو سکتا ہو اس کے متعلق بڑی بڑی امیدیں باندھی جائیں۔ ارتھوڈکس معاشیئن کیطرح مارکس کا بھی گمان تھا کہ انسان کی رائے کم و بیش ذاتی یا اپنے طبقہ کے معاشی اغراض سے بنتی ہے۔ سیاسی جمہوریت کے طویل عملی تجربہ نے ظاہر کر دیا ہے کہ اس معاملہ میں امرار و اشتراکی دونوں کے مقابلہ میں دسرائیلی اور بسمارک فطرت انسانی کے بہتر جاننے والے تھے۔ یہ بات روز بروز مشکل ہوتی جاتی ہے کہ ریاست پر ذریعہ حریت کی حیثیت سے اعتبار کیا جائے یا سیاسی فرقوں کو اس بات کے لئے کافی قوی آلہ تسلیم کیا جائے کہ وہ ریاست کو قوم کی خدمت پر مجبور کر سکیں۔ سوریل کہتا ہے کہ جدید ریاست "ذہنیئن کی ایک جماعت ہے جس کے ہاتھ میں کچھ مراعات ہیں اور ایسے ذرائع (جنہیں سیاسی کہا جاتا ہے) جن سے یہ ذہنیئن کے ان دوسرے گروہوں کے حملوں سے اپنے کو بچا سکے جو ملازمت عامہ کے فوائد حاصل کرنے کے مشتاق ہیں۔ ان ملازمتوں کو حاصل کرنیکے لئے سیاسی فرقے بنتے ہیں اور یہ خود ریاست سے مشابہ ہوتے ہیں "۔

سنڈکلی آدمیوں کو فرقوں کے اعتبار سے نہیں بلکہ پیشہ کے لحاظ سے منظم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بس یہی طبقات معاشی کی جنگ کا صحیح تصور اور سچا طریقہ ہے چنانچہ یہ پارلیمنٹ اور انتخابات کے ذریعہ ہر سیاسی عمل کی تحقیر کرتے ہیں۔ یہ جس کارروائی کو بیشتر

---

(۱) "انتشار مارکسیت" صفحہ ۵۳

رکھتے ہیں وہ انقلابی سنڈیکیت اور اتحاد صنعتی کا براہ راست اور بلاواسطہ عمل ہے۔ سیاسی عمل کے مقابلہ میں صنعتی (معاشی) عمل کا آوازہ جنگ فرانسیسی سنڈیکیوں سے بہت دور دور پہنچ گیا ہے۔ یہ امریکہ کی "دنیا کے صنعتی مزدوروں" کی تحریک میں پایا جاتا ہے، اور برطانیہ کے "صنعتی اتحادیوں" اور گلڈ اشتراکیوں میں۔ اس کے حامی اکثر مارکس سے مختلف مقصد بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ انکا عقیدہ ہے کہ جہاں ریاست ساری طاقت رکھتی ہو فرد کے لئے کبھی کافی آزادی نہیں ہو سکتی چاہے یہ ریاست اشتراکی ریاست ہی کیوں نہ ہو۔ ان میں سے بعض سرتاسر نراجی ہیں اور ریاست کو مطلقاً معدوم دیکھنا چاہتے ہیں، دوسرے صرف اس کے اختیار میں تخفیف کرنا چاہتے ہیں۔ اس تحریک کی وجہ سے مارکس کی جو مخالفت پہلے سے نراجی طرف سے موجود تھی وہ بہت قوی ہو گئی ہے۔ ہم اگلے باب میں اسی مخالفت کی قدیم شکل سے بحث کریں گے۔

ہندوستان اور مسئلہ تعلیم

(اقتباس از ان ہیپی انڈیا مصنفہ لالہ لاجپت رائے آنجہانی)

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح — کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا!

ہندوستان میں غیر سرکاری ذرائع سے ابتدائی اور نیز اعلیٰ ادبی اور صنعتی تعلیم کی اچھی خاصی اشاعت ہوئی ہے۔ مسٹر جے این ٹاٹا آنجہانی نے اپنی دولت کا ایک معقول جز بلند پایہ سائنٹفک تعلیم کے لئے وقف کیا۔ بنگلور کا سائنس انسٹی ٹیوٹ اپنے وجود کے لئے انہیں بزرگ کا مرہون احسان ہے۔ بوس انسٹی ٹیوٹ، کلکتہ ٹیکنولاجیکل انسٹی ٹیوٹ (جس کے ساتھ نامور ماہر کیمیا سر پی۔ سی۔ رائے کا وجود گرامی وابستہ ہے) نیشنل میڈیکل کالج، یہ سب مراکز تعلیم تمام وکمال یا بڑی حد تک پرائیویٹ جدوجہد ہی کے نتائج ہیں۔ حال یہ ہے کہ بعض سرکاری یونیورسٹیاں بھی بعض پرائیویٹ اشخاص کی فیاضیوں کی بہت کچھ دست نگر ہیں ان بزرگوں میں سرگروہ اس بنرجی کا نام نامی واسم گرامی خاص طور پر لیا جا سکتا ہے۔ ہندو یونیورسٹی بنارس اعلیٰ ترین ادبی تعلیم دینے کے علاوہ ایک انجنیرنگ کالج بھی چلاتی ہے لیکن مس میو اپنے قارئین کرام کے دلوں میں اس دعوے کو نقش کرنا چاہتی ہے کہ ہندوستانی لوگ اشاعت تعلیم کے ذیل میں کچھ بھی نہیں کر رہے ہیں اور یہ کہ ہندوستانی زعمائے قوم گورنمنٹ کو مفت کا الزام دیتے ہیں کہ وہ خدمت تعلیم کے فریضہ سے تغافل برت رہی ہے ہندوستان کی تعلیمیافتہ جماعت کی اس علمی سرد مہری اور نا سپاسی کے افسانے کی بنیاد حسب معمول وہ ایک معتبر راوی کے بیان پر رکھتی ہے، چنانچہ یہ بیانات ایک زبردست لیکن خیر سے غیر معروف ومجہول الاسم بنگالی قانون پیشہ بزرگ کے اعتراضات پر مبنی ہیں جنہیں مس موصوفہ نے شرف مصاحبت بخشا اور جنہوں نے اگرچہ بیشمار روپیہ اپنی قانونی

پریکٹس کے ذریعے اپنے اہل ملک کی جیبوں سے گھسیٹا لیکن جن کو قوم کی تعلیم کی راہ میں مدت العمر ایک پیسہ دینے کی توفیق نہ ہوئی! ایسے عجیب الخلقت بزرگوں کا ہندوستانیوں کی تعلیمی بے دردی پر خون در جگر ہونا بجا بھی ہے!

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند!

لیکن آخر کار اس امر کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ تعلیم ایک ایسا کام ہے جس کی ذمہ داری جدید اصول حکمرانی کی رو سے حکومت ہی پر ہے۔ غیر سرکاری کوششیں چاہے وہ کتنی ہی وسیع اور قابل داد ہوں، زمانہ حاضر کی کسی قوم کی تعلیمی ضروریات و مہمات کی حریف نہیں ہو سکتیں! مسٹر فشر نے، جو برطانیہ کے نامور ماہر تعلیم ہیں اور جو سنین گذشتہ میں انگلستان کے وزیر معارف رہ چکے ہیں، اپنی تقریروں میں بار بار اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ دنیا کے تمام متمدن ممالک میں پبلک کی تعلیم و تربیت حکومت کا فرض عین ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ حکومت کا "فرض" بھی ہے اور "حق" بھی کہ وہ ہر حال میں اس بات پر نظر رکھے کہ شہریوں کی جس دنیا کی وہ سیاسی رہنما ہے وہ قعر جہالت میں نہ گرنے پائے! اپنے ایک پبلک اعلان میں صاحب موصوف نے جن کے خیالات مسائل تعلیم میں قول فیصل کی حیثیت رکھتے ہیں، فرمایا!

"لیکن اگرچہ حکومت نو عمر مزدوری پیشہ لوگوں کو محنت مزدوری سے منع نہیں کر سکتی تاہم اس کو طالب العلمی اور مزدوری کے مابین ایک مخصوص رابطہ و توازن قائم رکھنا چاہیئے۔ حکومت کو زیبا ہے کہ وہ تعلیم عامہ کو اپنے عقائد دینی میں داخل کرلے، لیکن ساتھ ہی اُس کا فرض ہو کہ تعلیم کے مقام بلند کی معرفت بھی حاصل کرے! اس کو معلوم ہونا چاہیئے کہ تعلیم کے معنی محض نوشت و خواند کی تعلیم نہیں ہیں بلکہ زیر تعلیم لوگوں کے صفحہ دماغ اور لوح دل پر اخلاق و سیرت انسانی کا ایک دیرپا نقش کندہ کر دینا! ایک دوسری ضرورت یہ ہو کہ قوم کے ہر بچے کے دل میں حق تعلیم کا احساس پیدا کیا جائے! تعلیم گورنمنٹ کا ناگزیر فریضہ ہے عوام الناس کے اندر علم و حکمت کی اشاعت کے مقصد عظیم کو اُسے کسی حالت میں

بھی پس پشت نہ ڈالنا چاہئے اور نہ مصارف کی کمی کا خیال ان خدمات عالیہ میں حائل ہونا چاہئے! ..... اُس کو تعلیم کا ایک ایسا ہمہ گیر نظام ترتیب دینا چاہئے جس کی امداد سے ملک کے ہر فرد کو اپنے نفس کی ان تمام قوتوں کو بروئے کار لانے کا موقع ملے جو قدرت نے اُس کے اندر ودیعت کی ہیں! ساتھ ہی اس کو مخصوص صورتوں میں غیر معمولی امداد و سرپرستی کی ضرورت کو بھی تسلیم کرنا چاہئے!"

حکومت کے "حقوق و فرائض" کی اس فہرست کو آپ سنتے ہیں! مس میو کو جا کر کوئی خبر کر دے کہ ہندوستانی شوریدہ سر لیڈر ہی نہیں جو حکومت ہند سے تعلیم عامہ کے سارے بار کو برداشت کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں بلکہ ع

این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند!

عہد حاضر کے ایک سیاست داں کی نظر میں تعلیم ملکی کا جو اہم ترین نصب العین ہے اس کے بعض اطراف کو بے نقاب کرنے کے لئے ہم مسٹر فشر کی بعض دوسری تقریروں سے ایک آدھ اقتباس اور پیش کرنا چاہتے ہیں۔ صاحب موصوف فرماتے ہیں:۔

"زمانہ حال کی ہر دلعزیز تعلیم کا نظریہ ہے کہ ملک کے ہر مرد و عورت کو فرائض شہریت کی بجا آوری کے لئے تیار کیا جائے۔ ان سب کو زندہ رہنے کا حق ہے، لیکن بعض کو اپنے ملک و ملت کی خاطر "تسلیم جان" کا فریضہ بھی ادا کرنا پڑتا ہے! ہر متنفس کو خطرۂ جہالت و ضلالت سے بچانے کی ضرورت ہے اور یہ کام حکومت کا فرض اولین ہے! واقعہ یہ ہے کہ یہ شے فرائض حکومت سے بھی اعلیٰ و ارفع چیز ہے۔ تعلیم ایک شخص کا تمدنی مطالبہ ہی نہیں ہے بلکہ بحیثیت انسان کے اُس کا ایک پیدائشی حق ہے اور ایک فطری ضرورت ہے! ہر انسانی ہستی کا ایک جائز رجحان ہے، کہ صحیفۂ قدرت میں ہر شے جو قابل معرفت ہو اس کو جانے، ہر قابل استفادہ چیز سے متمتع ہو، ہر صحیح جذبے سے لطف اندوز ہو، اور ہر بشری امید سے اپنی تسکین قلبی اور تشفی روحانی کا مقصد حاصل کرے!"

اپنی بریڈ فورڈ کی تقریر میں مسٹر فشر نے فرمایا :

"جس وقت میں نے قوم کی تعلیمی حالت کا جائزہ لیا تو میں یہ دیکھ کر سخت حیرت زدہ اور رنجیدہ ہوا ۔ اور میرا یہ خیال ہے کہ بشرو شاہدہ ہر دوسرا شخص بھی میرے اس احساس میں شریک ہوگا ۔ کہ اب بھی برطانیہ عظمٰے کے اندر لاکھوں مرد اور عورتیں ایسی ہیں جو انسانی زندگی کے اُن دلفریب عطیوں کو قبول کرنے سے معذور رہیں جو زندگی انکے سامنے پیش کرنے کے لئے تیار ہے! کتنے آدمی ہیں جو کتابوں سے کوئی لطف نہیں اٹھا سکتے ؟ کتنی بڑی تعداد ہے جو مصوری و موسیقی کی لذت بخشی سے ناآشنا ہے! الغرض بشریت کا کتنا معتدبہ حصہ ایسا ہے جن کے لئے حیات انسانی کی وہ نعمتیں ناقابل فہم ہیں جو ہمارے دل و دماغ کی تربیت سے پیدا ہوتی ہیں اور جن کے ہم گویا خالق معنوی ہیں! یہ لوگ ایک خشک میکانکی مشقت میں گرفتار رہیں، آہن و فولاد کی مشینوں سے پابزنجیر ہیں ۔ اُنکی تاریک زندگیاں شاعری کے کسی لمحہ منور سے روشن نہیں ہوتیں، انکے ادبیات کے زنگ سے آلودہ دل کسی حسن کی صیقل سے صاف نہیں ہوتے ۔ دنیا اپنے دامن میں جو عظمتیں اور شوکتیں رکھتی ہے انکا وہ خواب بھی نہیں دیکھ سکتے، ان کو اتنی دماغی دلبستگی بھی نصیب نہیں کہ جن آلات اور مشینوں کو وہ حیوانوں اور مویشیوں کی طرح چلاتے ہیں انکے متعلق اُس علمی اصول اور فلسفیانہ کلیہ ہی کو معلوم کریں جو اس انسانی صنعتی کارگاہ کے اندر بطور روح رواں کے کام کر رہا ہے ۔ الغرض اُنکی مادیت میں کوئی روحانیت نہیں، اُنکی کثافت میں کوئی لطافت نہیں، اُنکی پستی میں کوئی بلندی نہیں، اُنکی ارضیت میں کوئی سماویت نہیں، اور ان کو فطرت سادہ نے جو کچھ دیدیا ہے اُس میں اپنے انسانی عمل تخلیق سے کسی طرح کا اضافہ کرنیکی ان میں کوئی طاقت نہیں! میں اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں کہ کیا ہمارے لئے اس پر صبر کرنا ممکن ہے کہ زمین پر یہ سب چیزیں ممکن الحصول ہوں اور پھر بشریت کا ایک وسیع حصہ ان سے اس افسوسناک طریقے سے محروم رہے؟! کم از کم ہم کو اپنا موجودہ پروگرام

اس طرح ترتیب دینا چاہئے کہ مستقبل کسی حد تک ہماری ماضی کی مجرمانہ کوتاہیوں کا کفارہ پیش کر سکے، اور ہم اس وقت اس خوشگوار توقع ہی سے اپنے قلوب کو کچھ تسلی دے سکیں کہ زمین کے دورِ آئندہ میں ایک ایسی دنیا تعمیر ہو سکے گی جو انسان پر اُن "نعمتوں کا اتمام" کرے گی جو پردۂ غیب اور عالمِ امکان میں اس کے لئے منتظر ہیں!"

دار العلوم میں اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:

"وسیع مفہوم میں وہ کون کون سی چیزیں ہیں جو ہم اپنی قوم کو ملنے کے خواہشمند ہیں؟ بس یہی کہ وہ اچھے شہری بن سکیں، اپنے سارے حقوق و فرائض کو پہچانیں، صحیح الجسم ہوں اور صحیح الدماغ، اپنے تمام کاروبار و اعمال زندگی کو انجام دینے کی پوری تربیت و اہلیت رکھتے ہوں، اور اپنے فرصت کے لمحوں کو ذہنی دلچسپی اور تخلیقی لذت اندوزی میں تبدیل کرنیکا فن لطیف جانتے ہوں!"

مسٹر فشر اپنے زمانۂ خدمت میں برابر تعلیم عامہ کے غیر معمولی طور پر اہم اور ناگزیر ہونے پر زور دیتے رہے۔ انہوں نے سال بسال تعلیمی بحث کے لئے زائد از زائد رقوم طلب کیں، اور دورانِ جنگ کی نازک ترین حربی و سیاسی ضرورتوں کے مقابلے میں بھی تعلیمی مالیہ کی قطع و برید نہ ہونے دی بلکہ اُس کے تدریجی اضافے کو حسبِ معمول جاری رکھا۔ تمامی صیغوں اور سررشتوں میں کفایت و تخفیفِ مصارف کے عالمگیر نعرۂ جنگ کے مقابلے میں انہوں نے کیا ہی خوب فرمایا۔

"میں بھی کفایت ہی چاہتا ہوں، اور نیز اضافۂ آمدنی۔ لیکن سمجھ لیجئے کہ کس چیز کا؟ انسانوں کا اور انسانیت کا جو ملک کی قیمتی ترین متاع ہے اور سب سے زیادہ قابلِ قدر جنس! آج اسی "انسانی سرمایہ" کی حفاظت ہمارے پیش نظر ہے! ماضی میں یہ دولت بے بہا بُری طرح تاراج ہوئی ہے۔ لیکن اب ہم اس کی بے بدل قدر و قیمت سے ناآشنا نہیں رہ سکتے!"

بلند نفس نشر کا تعلیمی نصب العین بنیئے۔

میں مستقبل میں ایک ایسے معشر انسانی کے ظہور کا متمنی ہوں جس کے ہر فرد کو بلا قید جنس و عمر اور بدون امتیاز تمول و فقر دولت تعلیم سے استفادہ حاصل کرنے کا موقع حاصل ہوگا! موجودہ غم آگیں و خجالت آفریں صورت حال یہ ہے کہ دولتمندوں کے ہاتھ میں قلم ہے اور غربا کے ہاتھ میں کدال!"

مس میو ایک خالص برطانوی مشن پر ہندوستان آئی تھی۔ ہندوستان میں مسئلہ تعلیم پر جو گہر افشانی اس نے کی ہے اُس کے اندر یہ باطل کوشانہ روش بے نقاب نظر آتی ہے! وہ ہندوستان کی اصلاحات کی ثنا و صفت میں قدرۃً بہت رطب اللسان ہے اور اس بات پر اُس نے خصوصیت کے ساتھ بہت زیادہ زور دیا ہے کہ اصلاح یافتہ کونسلوں میں جبکہ چند دیگر امور کے علاوہ تعلیم عامہ کا شعبہ بھی صیغہ جات منتقلہ میں داخل کر دیا گیا ہے تو اب بھی اگر ملک میں رفتار تعلیم سست اور نشر علوم و معارف کا حلقہ تنگ رہے تو اُس کے لئے اہل ہند کو اپنے ہموطن وزرائے تعلیم ہی کا ممنون احسان ہونا چاہئے! مس میو نے ان الفاظ میں اپنے خبث باطن اور اپنے جہل مرکب دونوں کا ثبوت دیا ہے! اُس کو خبر نہیں کہ صوبجاتی حکومتوں میں طریق کار کیا ہے! وہ ہندوستانی وزراء کی بے بسی کو دیکھنے سے قاصر نہیں رہ سکتی تھی بشرطیکہ وہ باونی تامل ان سیاسی تماشاگاہوں کی جنگ ہائے زرگری کو دیکھنا چاہتی۔ ہندوستان کے ملت پرست عناصر "اصلاح یافتہ" کونسلوں میں صیغجات منتقلہ و غیر منتقلہ کے درمیان غیر مساویانہ و غیر منصفانہ تقسیم زر پر مسلسل و پر زور احتجاج کرتے رہے ہیں۔ میدان تعلیم کے اندر وزراء کوئی حقیقی اقدام ترقی کرنے سے معذور محض ہیں، اس لئے کہ روپیہ انتظامی کونسلوں کے ممبروں کے ہاتھ میں ہے جو سیاہ و سفید کے مختار ہیں اور وزراء ہر وقت انکے دست کرم کے محتاج رہتے ہیں۔ گورنمنٹ ہند کا وہ عجیب و غریب نظام حکومت جو امپیریل سروس کے موقے

تازے میگنوں کے لئے بیک جنبش قلم ایک کرور روپیہ کے فرید عطیہ کا اعلان کرسکتا ہو اور جو سالانہ اسّی کرور روپیہ کا گنج قارونی فوج پر بہاتا ہے، وہ اُس وقت پراگندہ دل اور تہیدست ہوتا ہے جبکہ تعمیر قومی کے ان کارہائے نافعہ کے لئے رقوم کے تعین کا موقع آتا ہے جو غریب ہندوستانی وزرار کے سر تھوپے گئے ہیں!

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی   چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہمکو عبث بدنام کیا!

مسٹر رچی، گورنمنٹ ہند کے کمشنر تعلیم کا پیام امید سنئے:

"مرکزی اور نیز صوبجاتی حکومتوں کی محدود مالیات کو دیکھتے ہوے ملک کے اندر مستقبل قریب میں کسی عاجلانہ تعلیمی انقلاب پیدا کرلینے کی امید قطعاً خارج از بحث ہے!"

ہم انگلستان کی سی قسمت کہاں سے لائیں جس کے مایہ ناز فرزند فشر نے ملک کے سامنے پیہم اعلانات کئے کہ جنگ کے زمانے میں بھی تعلیم قومی کی راہ میں جو رقم صرف ہوگی وہ ایک "زر محفوظ" اور ایک "تاجرانہ لاگت" ہوگی! جس کے ضائع ہونیکا کوئی خوف نہیں ہے۔ تخفیف اخراجات کے ہمہ گیر شور شغب اور جنگ عظیم کی قیامت آفریں رستخیز کے درمیان وہ پورے سکون خاطر اور خوش انجامی کی کامل امید کے ساتھ کثیر المصارف اور گراں بار تعلیمی بحثوں کی ترتیب و تیاری میں مشغول تھا! یہ فیاض منش برطانوی عاشق تعلیم شاید خودکشی کرلیتا اگر ہندوستان کی وزارت تعلیم کی کرسی پر متمکن ہوکر وہ مسٹر رچی کی زبان فیض ترجمان سے یہ دانش فروشانہ موعظت سنتا کہ:

"تعلیم عام کی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے کوئی مختصر راستہ نہیں ہے جس پر ملیغار کرکے ہم اُس تک جا پہنچیں!"

مسٹر فشر نے تعلیمات کے موضوع پر جو ارشادات فرمائے ہیں وہ اہل ہند کیلئے خاص توجہ کے مستحق ہیں۔ اس لئے کہ ہندوستان و برطانیہ کے آئینی تعلق کو مدنظر رکھتے

وہ ہندوستان کے لئے مخصوص طور پر کارآمد ہو سکتے ہیں۔ اس بارے میں ہر دوسرے ملک کے کسی اور ماہر تعلیم کے مقابلہ میں مسٹر فشر کے افکار و تجاویز زیادہ مشعل راہ بن سکتے ہیں فشر سلطنت کا وہ زبردست تعلیمی مرشد اعظم ہے جس نے اُن تعلیمی حقایق اور اُن تعلیمی کلیوں کو اپنے مخاطبین کے سامنے پیش کیا ہے جو ہر خود دار اور ترقی دوست ملک کے لئے یکساں طور پر موزوں ہیں۔ آہ! ہم ہندوستانی اپنے وطن کے اندر اپنے کاروان تعلیم کے خود سالار کارواں نہیں ہیں! ہمارے صوبجاتی وزرائے تعلیم کی ہستی ہمارے لئے اور بھی تلخ کامیوں اور حسرت آفرینیوں کا سبب ہے: صیغہ تعلیم کی باگ ان کے ہاتھ میں ہے، اور خزانۂ عامرہ کی کلید سرکاری رکن مجلس منتظمہ کی گرفت میں! اس صورت حالات کی ستم ایجادی قابل داد ہے!

از صحن خانہ تا بلب بام، ازانِ من — وز سقف خانہ تا بہ ثریا، ازان تو!

اقوام عالم کے مختلف جدید العہد نظامات تعلیم کے مطالعہ کے بعد مسئلہ تعلیم قومی کے باب میں بعض اہم کلیات کا استخراج کیا جاسکتا ہے جو حسب ذیل ہیں:

(۱) قوم کا صیغہ تعلیم اُس کے عسکری سررشتہ مدافعت وطنی کا ہمسر و ہم رتبہ ہو آخر الذکر اگر چمن ملت کی بیرونی خاردار چار دیواری ہے تو اول الذکر اُس کے اندرونی گل و ثمر کی بہار ہے! ایک ترقی یافتہ قوم کی اشتہائے عالیہ کی غذا علوم و معارف ہی ہیں! قوم کے بام عروج پر پہنچنے کے لئے سب سے زیادہ یقینی نردبان ترقی تعلیم ہی ہے!

(۲) قومی تعلیم کا بار گراں پرائیویٹ حوصلہ مندیوں کے دوش پر اٹھانے کی کوشش کرنا ناممکنات کو عملی جامہ پہنانے کی سی ہرزہ کاری ہے! اس میں شک نہیں کہ قومی تعلیم کے جہاز کی ناخدائی قوم کے رہنماؤں کے ہاتھ میں ہونی چاہئے، لیکن ملک کا سارا خزانہ اور صیغہ مالیات کی کنجی انکے دوسرے ہاتھ میں ہونے کی بھی اتنی ہی ضرورت ہے!

(۳) یہ خیال کہ حکومت کو صرف ابتدائی تعلیم کی پرائیویٹ سرگرمیوں کی اچھی

مالی امداد سے سرپرستی کرنی چاہئے زمانے کے ساتھ رخصت ہوگیا ہے۔ تازہ ترین اور صحیح ترین نظریہ یہ ہے کہ گورنمنٹ کا فرض تعلیم کی اولین منازل کی دستگیری پر ختم نہیں ہوجاتا۔ قوم کی اقتصادی و مادی مرفہ حالی کا انحصار ایک کامیاب صنعتی و حرفتی تعلیم پر ہے اور ان مہمات سے سرکاری خزانہ ہی عہدہ برآ ہوسکتا ہے ایک دوسرا فریضہ حکومت کا اعلیٰ تعلیم بھی ہے۔ یہ جسم قومی کے اندر وسیع دل اور بلند دماغ پیدا کرتی ہے۔ ملک کے اندر ایسے زعمائے قوم جو قومی مشکلات و خطرات کی آزمائشوں میں ملک کے لئے "سالک باخبر" بن سکیں، اعلیٰ تعلیم ہی وجود میں لاسکتی ہے اور ایسے مخصوص افراد اسی شجر طیبہ کے گل و ثمر بنکر قوم کے ہاتھ آسکتے ہیں۔ پس تعلیم کا یہ شعبہ اس اہم ترین قومی ضرورت کے لئے بھی ناگزیر ہے۔

(۴) تعلیم کا یہی مفہوم نہیں ہے کہ قوم کے بچوں کو معمولی نوشت و خواند اور حساب و کتاب کے ابتدائی اصول سے آشنا کرکے چھوڑ دیا جائے۔ اس کے مقاصد اس سے براصل زیادہ بلند اور وسیع ہیں؛ اس کے اندر قوم کے ہر نونہال کی جسمانی نشوونما، دماغی تنویر افکار، اخلاقی تہذیب نفس، اور روحانی تزکیۂ قلب سب ہی داخل ہے!

(۵) ملک کے ہر بچے کی ایسی تربیت جو اس کو قوم کا ایک فرزند رشید، ریاست کا ایک مفید شہری، دنیا کا ایک کامیاب آدمی، انسانیت کا ایک قابل فرد، اور عالم کا ایک شاندار انسان بنادے بغیر اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتی کہ اس کار عظیم کو حکومت اپنے سارے وسائل مال اور اپنے جملہ ذرائع عزم و ہمت کے ساتھ اپنے ہی کندھوں پر اٹھائے!

ادبیات ایران کی ترقی میں

سلطان محمود غزنوی کا حصّہ

یہ مقالہ مولوی حسین حسان صاحب ندوی متعلم جامعہ ملیہ نے گزشتہ سال یوم تاسیس کے موقع پر شعبہ تاریخ کیطرف سے پیش کیا تھا۔ ہم اسے تین نمبروں میں شائع کریں گے پہلے دو نمبروں میں وہ حصہ جس میں ادب فارسی کی نشو و نما سلطان محمود غزنوی سے پہلے دکھائی گئی ہے اور تیسرے نمبر میں وہ حصہ جس میں سلطان کے ادبی ذوق اور اس کی علم دوستی کا ذکر ہے۔

ایران کی موجودہ زبان دراصل زمانہ مابعد اسلام کی پیداوار ہے اس سے پہلے جو زبان رائج تھی وہ پہلوی یا دری وغیرہ اس کی مختلف شاخیں تھیں۔ ایران میں جب اسلامی فتوحات کا سیلاب آیا تو قدرتی طور پر عربی زبان بھی تمام ملک پر چھا گئی یہانتک کہ حجاج بن یوسف کے زمانہ میں ایران کے تمام دفاتر بھی فارسی سے عربی میں ہوگئے چنانچہ اس زمانہ میں ایرانیوں کی جتنی تصانیف ہیں تقریباً سب عربی میں ہیں اہل عجم نے عربی میں اس قدر دسترس حاصل کر لی کہ خود عرب انکا مقابلہ نہیں کر سکے۔ اسلام کے مایہ ناز مشاہیر امام ابو حنیفہ، نظام الدین طوسی، امام بخاری، امام مسلم، امام غزالی، سیبویہ، جوہری، ابو علی سینا، قطب الدین رازی، قطب الدین شیرازی، عبدالقاہر وغیرہ سب ایرانی عجمی تھے، ابن مقفع ایرانی الاصل تھا جس نے عرب میں تربیت پائی اسکی سی علمی و ادبی قابلیت کے لوگ، خود عرب کی سرزمین میں بھی بمشکل پیدا ہو سکے۔ اسکی بعض کتابوں دررۃ الیتیمہ۔ کلیلہ و دمنہ وغیرہ کا جواب باوجود سخت کوشش کے عربوں سے بن نہیں پڑا۔

علاوہ بریں ایک بڑا سبب ایران میں عربی زبان کی ترویج کا یہ ہوا کہ ایرانی زبان علمی حیثیت سے تقریباً تہی مایہ تھی، چند مذہبی اور تاریخی کتابیں اس کے علمی یا ادبی لٹریچر کی کل کائنات تھیں۔ برخلاف اس کے اسلام نے تھوڑی مدت میں ادب و دانش کے سرمایہ میں بہا قدر ترقی اور علم و فن کی شاخ میں وہ تنوع اختراعات اور جدتیں پیدا کر دیں کہ ایک ایران پر کیا منحصر ہے تمام قوموں کو اس کے سامنے اپنا قدیم لٹریچر بے وقعت اور ہیچ نظر آنے لگا۔ دوسری تیسری صدی ہجری میں جہاں جہاں اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں اسلامی علوم و فنون نے مفتوحہ اقوام کے علوم و فنون کی درخشانی کو بالکل ماند کر دیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ مصر اندلس، افریقہ وغیرہ کی اصلی زبانیں رفتہ رفتہ فنا ہو گئیں اور آخر کار عربی نے انکی جگہ لے لی غرضکہ عربی زبان نے ایرانی دل و دماغ پر بھی کچھ اس طرح تسلط حاصل کر لیا تھا کہ اگر دو ایک صدی تک اور یہی حالت رہتی تو دوسرے ممالک کی طرح ایران کی زبان کا حشر بھی نہایت دردناک ہوتا لیکن یہ صورت حال کچھ زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکی۔ تیسری صدی ہجری میں بغداد کی خلافت کو زوال شروع ہوا۔ بڑے بڑے صوبے خود مختار ہو گئے اور نئی نئی حکومتیں قائم ہو گئیں [illegible] کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ عربی زبان کا آفتاب اقبال بھی ڈھلنا شروع ہوا اور رفتہ رفتہ ایرانی امراء و سلاطین اور ایرانی علما نے بھی اپنی زبان کی جانب توجہ کی لیکن دو صدیوں سے برابر عربی زبان کا سکہ رائج تھا اس لئے قدیم فارسی میں عربی الفاظ اس کثرت سے گھل مل گئے تھے کہ اصلی زبان بالکل متغیر ہو چکی تھی اور عربی و فارسی

---

(۱) فارسی زبان کا جو سرمایہ عربی زبان میں آیا اُس میں منطق، فلسفہ، ہیئت، ہندسہ کا پتہ نہیں ملتا یہاں تک کہ نہایت کدو کاوش سے کسی فارسی حکیم کا نام بھی معلوم نہیں ہوتا حالانکہ یونانی حکما بطلمو، ارسطو افلاطون، بقراط اور جالینوس کا نام بچہ بچہ کی زبان پر ہے اسکی وجہ اسکے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ اسلام کے زمانہ سے پہلے فارسی کا ذخیرہ اکثر برباد ہو چکا تھا (رسائل شبلی صفحہ ۱۰)

لی اس آمیزش سے ایک نئی زبان تیار ہوگئی تھی اور اگرچہ فارسی زبان سے عربی الفاظ کو نکال ینے کی بہت کچھ کوششیں ہوئیں لیکن ظاہر ہے کہ اس میں کامیابی کیونکر ممکن تھی، فردوسی اس بدوجہد میں سب سے پیش پیش ہے شاہنامہ میں عربی الفاظ لانے سے اس نے بہت احتراز یا ہے پھر بھی اسے اس میں پوری کامیابی نہ ہوسکی۔ اور اب بھی یہی مخلوط زبان جدید تغیرات کے ساتھ ایران میں مروج ہے۔

فارسی شاعری کی ابتدا۔

ایران میں شاعری کی ابتدا کب سے ہوئی؟ یہ مسئلہ بہت مختلف فیہ ہے بعض مورخین ا خیال ہے کہ زمانہ قبل اسلام میں شعر شاعری کا وجود ہی نہ تھا بعض کا خیال ہے کہ شعر تھا لیکن زن سے خالی تھا۔ بعض ایرانی تذکرہ نویسوں نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قدیم شعرا کی شاعری عربوں کے غلبہ کی وجہ سے ضائع ہوگئی۔ اس لئے کہ عربوں نے محض مذہبی تعصب کی بناء پر ایران کے کتب خانوں کو جلا ڈالا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانیوں کا تمام سرمایہ علم و ادب ہمیشہ کے لئے خاک میں مل گیا اور قدیم فارسی شاعری بھی اسی آتش تعصب کی نذر ہوئی۔ لیکن اس خیال کی لغویت کو مولنا شبلی رسائل شبلی میں اچھی طرح ثابت کرچکے ہیں[1] شعرالعجم[2] میں بھی ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

> "اسلام نے ملکی زبان سے کبھی کچھ تعرض نہیں کیا حضرت عمر کے زمانے سے حجاج بن یوسف کے زمانہ تک تمام دفاتر فارسی زبان میں تھے حجاج کے زمانے سے عربی میں ہوگئے۔ لیکن ملک کی اصلی زبان وہی رہی ..... اور جب خود فارسی زبان

---

(۱) رسائل شبلی بعنوان "اسلامی کتب خانے" صفحہ ۳۶-۳۷-۳۸۔ و بعنوان "تراجم" صفحہ ۲۱۰ و ۲۱۱

(۲) شعرالعجم حصہ اول صفحہ ۲

سے کسی قسم کے تعصب کا اظہار نہیں کیا گیا تو فارسی شاعری نے کیا گناہ کیا تھا۔
بہرحال یہ خیال بہت مضحکہ خیز ہے کہ فارسی لٹریچر کی بربادی کا سبب مسلمان ہیں یہ محض قومی اور وطنی عصبیت کا نتیجہ اور دل کی خلاقی ہے۔ شاعری کے متعلق ایک خیال یہ بھی ہے کہ ایران میں شاعری مذہبًا ممنوع تھی، المعجم میں اس کے متعلق ایک روایت بھی پائی جاتی ہے۔ مگر وہ نہ روایتًا قابل استناد ہے اور نہ درایتًا قابل تسلیم۔

اس مسئلہ پر مولنا عبدالرحمن صاحب مصنف مراۃ الشعر نے بھی اپنی تحقیقی رائے لکھی ہے جو اس قابل ہے کہ ناظرین کے سامنے پیش کیا جائے آپ "قدیم فارسی اور شعر" پر تبصرے کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

. . . کوئی کہتا ہے کہ فارسی میں شعر تھا لیکن وزن سے خالی تھا میں سمجھتا ہوں یہ عرب فاتحین کی رائیں ہیں اولًا انہیں مغالطہ ہوا سمجھے کہ فارسی شعر میں وزن نہیں ہے اور چونکہ خود اُنکے نزدیک وزن ضروری تھا اس لئے بعض نے کہدیا کہ فارسی میں شعر ہی نہیں اور یہی دوسرا مسلک بن گیا۔ عربی فارسی کتابوں میں کہیں کہیں فارسی شعروں کا تذکرہ ہے لیکن اس قدر مجمل ہے کہ اس سے صاف و صریح نتیجہ نکالنا آسان نہیں۔ لیکن میں اس اجمال و قرائن و قیاس سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ فارسی میں شعر تھا مگر اس میں عربی کی طرح وزن حقیقی اور لازمی نہ تھا، بیشتر وزن غیر حقیقی تھا اور عرب چونکہ وزن حقیقی کے عادی جب سننے والوں نے سنا تو اپنے شعر کے مقابلہ میں ناموزوں پایا، عاری از وزن کہدیا یہی نقلًا قابل تسلیم معلوم ہوتا ہے اور یہی مقتضائے عقل بھی ہے ورنہ سمجھ میں نہیں آسکتا کہ جس قوم کے جشنہائے عیش و عشرت کی آجتک عالم میں دھوم ہے جس کی کوئی بزم کوئی محفل نغمہ و سرود سے خالی نہ ہوتی تھی جس کی عبادت و پرستش میں بھی زمزمہ و سرود کو دخل نہ تھا جس کی مٹی ہوئی تہذیب کے

بھی چار مصرعے کا حصہ اور ترانہ جیسے متعدد دلفریب انواع شعر کے لئے باقی چھوڑے جس کی خوش مذاقی و نازک خیالی ہمیشہ مسلم رہی جس کی ذہانت وطباعی کا ارسطو نے اعتراف کیا جس کی طاقت وتہذیب ایران و روم سے ٹکراتی اور ہندوستان کو دباتی رہی جس کے سیاسی وتجارتی تعلقات ان لوگوں سے رہے جن کے ہاں ہومر اور والمیک جیسے شاعر پیدا ہوئے اس قوم میں از ابتدائے عروج تا انتہائے زوال شاعری نہ پیدا ہو اور اسلامی فتوحات کے بعد عرب کے صد سالہ اختلاط سے اسی قوم میں شعر وشاعری اس طرح پھیلے کہ بن میں آگ لگ جائے۔ اور ہر طرف شعلے ہی شعلے نظر آئیں یہ کیونکر سمجھ میں آجائے۔

کوئی شک نہیں کہ مولانا کی فیصلہ کن تحریر بہت کچھ غور وتوجہ کی مستحق ہے مصنف نے جس مجتہدانہ انداز میں اپنا فیصلہ صادر فرمایا ہے وہ لائق ستائش ہے لیکن پھر بھی اگر ایک جویائے حق کو تسکین نہ ہو تو غالباً مولانا بھی اسے اس بات کا حق دیں گے کہ وہ تحقیق کا قدم اور آگے بڑھائے۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے قدیم ایرانی تذکرہ نگاروں کی تقلید میں کسی نہ کسی نہج سے سارا لزام عربوں ہی پر رکھا ہے کہ وہ چونکہ وزن غیر حقیقی کے عادی تھے اس لئے انہوں نے فارسی کی بے وزن شاعری دیکھ کر سرے سے ایرانی شاعری ہی سے انکار کر دیا۔ لیکن یہ دعویٰ نقلی ثبوت کا بھی محتاج تھا جو افسوس ہے کہ کہیں نظر نہ آیا ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کسی قسم کی غیر موزوں شاعری تھی جسے تسلیم کرنے سے اس طرح انکار کر دیا گیا۔ اور پھر اس انکار کا اس قدر ناگوار اثر پڑا کہ وہ شاعری ہی سرے سے ناپید ہو گئی۔ اور آج قدیم شاعری کا ایک شعر بھی محفوظ نہیں۔ یہ امر ہم پہلے گوش گزار کر چکے ہیں کہ قدیم فارسی لٹریچر کا کوئی کارنامہ ہمارے سامنے موجود نہیں، ہمارے سامنے ایران کی کوئی قدیم تصنیف ہے تو وہ اوستا ہے۔ یہ زرتشت کی تصنیف یا وحی آسمانی ہے جو اس پر نازل ہوئی

ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اوستا زرتشت کا کلام ہی نہیں اور بعض کے نزدیک صرف
باب (گاتا) اصل ہیں اور ۲۱ باب الحاقی ہیں لیکن یہ ایک علٰحدہ بحث ہے اور ہمارے
موضوع سے خارج اسلئے ہم سردست اس میں پڑنا نہیں چاہتے اور تسلیم کئے لیتے ہیں کہ ساری
کتاب زرتشت کی لکھی ہوئی ہے ہمارا خیال ہے کہ یہی ایک کتاب کسی قوم کی دماغی ترقی، طباعی
بلند خیالی اور ذہانت کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ لیکن آئیے ہم آپ کو بتائیں ایک
یورپین مستشرق کا اس کے متعلق کیا خیال ہے، پروفیسر براؤن "اوستا" پر تبصرہ کے دوران
میں تحریر فرماتے ہیں کہ

"تاریخی حیثیت سے یا زرتشت کے عقائد کا مرقع اور قدیم مذہب کی مقدس یادگار
ہونیکے لحاظ سے یہ کیسی ہی کارآمد کتاب ہو مگر نہ تو یہ خوشگوار ہے اور نہ دلکش ہے
اپنی نسبت تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایک طرف قرآن کو جوں جوں پڑھتا جاتا ہوں
لطف بڑھتا جاتا ہے اور شوق سے اسکا مطالعہ اور اس کے سمجھنے کی کوشش
کرتا ہوں دوسری طرف اوستا کا مطالعہ بدمزگی اور تنغص پیدا کرتا ہے اور
یہ کیفیت مزید مطالعہ کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے کچھ لوگ تحصیل زبان تحقیق مذاہب
دریافت آثار قدیمہ کی غرض سے اور بعض لوگ الہامی کتاب سمجھکر بھی اسے
پڑھ تو لیا کرینگے۔ مگر مجھے تو یقین نہیں کہ اس کا ترجمہ خواہ کیسا ہی دلچسپ کیا
جائے معمولی طبیعت کے کتب بیں جو کتابیں دلچسپی کے لئے پڑھا کرتے ہیں
شروع سے آخر تک پڑھنے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے"

صرف یہی نہیں بلکہ زرتشت کے مرنے کے کچھ ہی دنوں بعد خود زرتشتی عالموں اور موبدوں
کے لئے یہ ایک لاینحل معمہ بنکر رہگیا۔ نظام الملک طوسی نے مزدک کی بحث میں لکھا ہے۔

مزدک گفت مرا فرستادہ اند تا دین زرتشت تازہ گردانم کہ خلق معنی ژند و اوستا
فراموش کردہ اند ۔۔۔۔۔۔ موبدان گفتند در ژند و اوستا سخنان است کہ

ہر سخن وہ معنی دارد و ہر حرفے و دانائے را در و قسطے و تعبیرے ۔

مولانا مسلم عظیم آبادی نے اس سے جو نتیجہ نکالا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

اس کا سبب تاخت اسکندری کے علاوہ ایرانی طرز تحریر کا نقص اور اہل ایران کی علم سے بے نیازی تھا۔ عہد اسکندری سے حکمت یونان کی جو کچھ روشنی ایران میں پہنچنے لگی تھی۔ وہ بھی بہت جلد حکومت ایران کے زوال کے ساتھ زائل ہوگئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایران مختلف زمانوں میں مختلف تمدنوں کے زیر اثر رہا اسی طرح طرز تحریر بھی بدلتا رہا۔ پہلے آرامی پھر سینی، اور پھر پہلوی اسی کا نتیجہ تھا زبان میں عجیب خلط ملط ہوگیا، اوستھا کا مختلف زبانوں میں ترجمہ در ترجمہ ہوا شرحیں لکھی گئیں۔ مگر پھر بھی اصل خشکل آسان نہ ہوسکی اسی اغلاط کی وجہ سے زبان میں یہ خرابی پیدا ہوگئی۔ لکھتے کچھ تھے اور پڑھا کچھ اور جاتا تھا، مثلاً زنا کو آن۔ ملکان اور ملکا کو شہنشاہ بن کو ازلحمہ کو نان بسرہ کو گوشت وغیرہ وغیرہ ابن مقفع کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایران میں پانچ مختلف زبانوں اور سات مختلف رسم الخط کا خلط مبحث تھا ہر طبقہ کے لئے علیحدہ علیحدہ زبانیں مخصوص تھیں۔

ایسی تحریر اور طرز تحریر جس کی اس قدر ناگفتہ بہ حالت ہو ہم نہیں سمجھ سکتے کہ کیونکر کسی لٹریچر کی حامل ہوسکتی تھی، شاعری کو بھی اسی پر قیاس کر لیجئے فاضل مولف "مراۃ الشعر" اپنے قیاسی دلائل کے سلسلہ میں فرماتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جس کی مٹی ہوئی زبان نے بھی جامہ چگامہ اور ترانہ جیسے الفاظ باقی چھوڑے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذکورہ الفاظ قدیم ایرانی زبان کے بقایا ہیں۔ غالباً مولانا آزاد کا بھی یہی خیال ہے لیکن مولانا مسلم عظیم آبادی اس کے متعلق فرماتے ہیں:۔

ایرانیوں کی حب وطنی نے انہیں ہمیشہ غیر مخلوط خالص پارسی کے شیوع کا

متنی اور ساعی رکھا ہے ..... محمد صالح دربار شاہجہانی کا مصنف تھا
اس نے اپنی ایک کتاب "عمل صالح" میں عربی اصطلاحات عروض کی جگہ
خالص پارسی اصطلاحات گھڑی تھیں جسکا نمونہ یہ ہے۔

قصیدہ کے لئے چکامہ ۔ غزل کے لئے چامہ
ردیف " بساوند ۔ وزن شعر " دم
نثر " پراگندہ نظم " پیوستہ
تخلص " داغ

ایرانیوں کی خوش مزاجی نازک خیالی اور ذہانت وطباعی سے کسے انکار ہے
اس حقیقت کو بھی ہم آشکارا کر چکے ہیں، کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ایرانیوں نے
عربی ادب اور علوم وفنون حتی کہ مذہب کی بھی خود عربوں سے زیادہ خدمت کی لیکن اس
سے یہ نتیجہ نکالنا آسان نہیں کہ اسلام کے غلبہ سے پہلے ایران خود بھی علوم وفنون کا مرکز
تھا جناب مسلم عظیم آبادی ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں۔

"فارسی روایات کے مطابق سکندر نے جب ایران فتح کیا تو مجوسیوں کی دینی
کتابیں تلف کر دیں، باقی کتب فلسفہ، نجوم، طب، زراعت وغیرہ وغیرہ
ڈھونڈھ ڈھونڈ کر اسکندریہ اور یونان اٹھوا لے گیا اس طرح ایران کی جو کچھ متاع
علم تھی مرکز علم کو منتقل ہو گئی پانچ صدیوں کی گھٹا ٹوپ تاریکی نے قدرۃً عجم کا
دماغ کند بنا کر اسے وحشت وجہالت کی پستی میں گرا دیا۔ اور علوم وفنون تو الگ
رہے، مذہب بھی بھلا بیٹھے۔ ساسانی عہد میں بعض اولوالعزم بادشاہوں نے
احیاء علوم کی کوشش کی مگر وہ نسبتہً ایسی حقیر ہے کہ مصر ویونان کے مقابلہ
میں انکا نام نہیں لیا جا سکتا۔ مزمن جہالت کے علاوہ خط کی دقت نے پارسی
علوم کو پنپنے نہیں دیا۔ جس دن مالدار زبان عربی نے اپنے وسیع خزانے

سے انکو لغات ہوئے۔ اور لغات کے ساتھ آسان خط مہیا کر دیا۔ اُنکے دماغ
کی مہر ٹوٹ گئی۔ اور زبان چل پڑی، خود قرآن شریف ایک عظیم الشان لٹریچر
ہے عربی شاعری کے اعلیٰ نمونے اُنکے سامنے آئے "

ایک مستند فارسی تذکرہ نویس لکھتا ہے۔

چوں آفتاب ملت حنیفی و دین محمدی سایہ بر دیار عجم انداخت لطیف طبعان
فرس را با فضلائے عرب اتفاق محاورہ پدید آمد و از انوار فضائل ایشاں اقتباس
کردند و با سالیب لغت عرب وقوف گرفتند۔ و اشعار مطبوع آبدار حفظ کردند
بغور آں فرو رفتند و بر حقائق بحور و دوائر آں اطلاع یافتند و ہم بر آں منوال
نتائج فضلائے کہ نتائج طبع ایشاں بود یا فتن گرفتند۔

(قلعہ دہلی کے)

میوزیم پر ایک عام نظر

پچاس سال سے زیادہ عرصہ ہوتا ہی کہ ۱۸۶۸ء میں دہلی میونسپل بورڈ کے زیر اہتمام ٹاؤن ہال کے کسی کمرہ میں ایک میوزیم قایم ہوا تھا جس کے بانی ایف ایچ کوپر ڈپٹی کمشنر دہلی تھے، مگر اس میوزیم کی بنیاد کسی خاص مقصد کے ماتحت نہیں رکھی گئی۔ نہ تو یہ کوشش تھی کہ دنیا کی تمام چیزیں جو آج عجیب سمجھی جاتی ہیں یا کل سمجھی جائیں گی، مہیا کیجائیں اور نہ چیزوں کو جمع کرتے وقت یہ خیال پیش نظر تھا کہ اس میں وہی چیزیں لائی جائیں جو کسی خاص مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوں۔ قدیم بدھ کے مجسموں کے ساتھ ساتھ جے پور کی مورتیاں، فنون لطیفہ کی نادر اشیا کے ساتھ ساتھ بچوں کے کھلونے اور اسی قسم کی صدہا چیزیں تھیں جس سے یہ میوزیم معجون مرکب بن گیا تھا، چنانچہ ایک موقعہ پر محکمہ آثار قدیمہ کے ایک فاضل افسر نے جب اس میوزیم کو دیکھا تو فرمایا کہ یہ میوزیم ایک (Howling Wilderness) وحشت ناک جنگل ہے موصوف کے یہ الفاظ بے شبہ ہمارے اس مفہوم کی کافی توضیح اور اصل حقیقت کا انکشاف کرتے ہیں، میوزیم کی یہ شکل کچھ تو ان اسباب سے اور نیز اس وجہ سے بھی کہ کوئی ماہر فن منتظم میوزیم کو ایسا میسر نہ آیا کہ وہ اس کی باقاعدہ تشکیل پیش کرسکتا، سنہ ۱۹۰۱ء میں محکمہ آثار قدیمہ کیطرف سے موجودہ وائسرائے لارڈ کرزن کی توجہ میوزیم کیطرف مبذول کرائی گئی، مگر اس درخواست کا بجز اس کے کوئی نتیجہ نہ ہوا کہ اس کا کام محکمہ کے سپرد کردیا گیا۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں سر جان مارشل نے (جو محکمہ آثار قدیمہ کے ڈائرکٹر تھے) یہ تجویز پیش کی کہ نوبت خانہ یا نقار خانہ میں ایک تاریخی عجائب خانہ ہو جس میں دہلی قلعہ کی

تاریخ سے متعلق چیزیں رکھی جائیں، لارڈ کرزن نے اس تجویز کو پسند کیا لیکن اس مرتبہ بھی ۱۹۰۰ء تک کوئی عملی قدم نہ بڑھایا گیا بے توجہی اور بے پروائی کے اس عالم میں یہ پرانا عجائب خانہ ٹوٹ گیا اور اس کی جگہ کوئی نیا عجائب خانہ بھی نہ قائم ہو سکا ۱۹۰۰ء میں اس پرانے میوزیم کے ٹوٹ جانیکے بعد ارباب نظم و نسق کچھ ہوش میں آئے اور جنرل مارشل کی پرانی تجویز اس سال زیر عمل آنا شروع ہوئی ۔ غیر متعلق چیزیں جو اس جدید میوزیم کے دائرہ مقاصد سے باہر تھیں وہ دوسری جگہوں پر جہاں وہ رکھی جا سکتی تھیں بھیج دی گئیں ، بدھ کے قدیم مجسمے اور نیز اسی قسم کے دوسرے بت لکھنؤ اور لاہور کے عجائب خانہ میں جینیوں کے تین بت متھرا میں اور علاوہ انکے اسی قسم کی دوسری چیزیں بھی ادھر اُدھر منتقل کر دی گئیں اور از سر نو ۱۹۰۹ء میں تاریخی اشیاء کا ایک عجائب خانہ نوبت خانہ (قلعہ میں) میں قایم کیا گیا ، اور ابھی دو سال بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ قلعہ کی ایک دوسری عمارت ممتاز محل میں یہ عجائب خانہ منتقل کر دیا گیا ، اس عجائب خانہ میں جیسا کہ بتایا جا چکا ہے زیادہ تر قلعہ دہلی سے متعلق تمام چیزیں بہم پہنچائی گئی ہیں کچھ تو شاہان دہلی کے اسباب اور سامان ہیں جو کسی نہ کسی طرح ہاتھ آئے کچھ انکے اور انہیں کے متعلقین کے آلات اور ہتھیار ، کچھ تاریخی پتھر جن پر کندہ کی ہوئی تحریریں ہیں، کچھ شاہی مہریں ہیں اور کچھ فرامین اور اسناد ، تصویریں بھی ہیں زیادہ تر شاہان مغلیہ اور انکے درباریوں کی ، قلعے کے اندر اور باہر کی عمارتوں کے نقشے بھی ہیں جن میں سے اکثر شاہی عمارتیں یا ان سے متعلق دوسری عمارتیں ہیں، قدیم مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابیں ہیں جو کسی کی کل شاہی کتب خانہ سے متعلق تھیں اور بہترین خطاطوں کے خوشخطی اور خوشنویسی کے نمونے بھی جن میں سے اکثر کا تعلق قلعے سے ضرور تھا ۔ یہ سب چیزیں نو حصوں میں تقسیم کی گئی ہیں ، فرنیچر[1] اور نیز دیگر سامان ، ہتھیار[2] اور آلات ، مہریں[3] اور کتابت ، فرامین[4] اور اسناد ، پینٹنگ[5] اور عکسی تصاویر ، نقشہ[6] ، قلمی تصویریں ، قدیم[7] مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابیں[8] ، بہترین[9] خطاطوں کے خوشنویسی کے نمونے ،

یوں تو تاریخی حیثیت سے ان میں کی ہر ہر چیز اپنی جگہ پر کوئی نہ کوئی خصوصیت ضرور رکھتی ہے، مگر باوجود اس کے بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو اپنی نوعیت میں زیادہ عجیب یا تاریخی حیثیت سے زیادہ اہم ہیں، شاہی اسباب اور سامان کا وہ تاریخی اور قیمتی قالین جو اپنی صنعت و بناوٹ میں بے مثل ہے اور جس کو کسی دلی کے آخری تاجدار کے زیر دست ہونیکا شرف حاصل تر تھا آج تقریباً اسی حال میں باقی ہے، اور اسی بادشاہ کا وہ زرق و برق لباس بھی جس سے اس زمانہ کے طرز لباس اور پوشش کا پتہ چلتا ہے، زینت محل کے بعض سونے اور موتیوں کے زیورات بھی موجود ہیں اس سکشن کی زیادہ عجیب و غریب چیز جو میوزیم کی زینت ہے وہ اورنگزیب کا فلٹر ہے جس کو وہ اپنے شاہی دورے پر استعمال کرتے تھے جہاں صاف پانی ملنے کا امکان نہ ہوتا وہاں پانی اس فلٹر میں بھر دیا جاتا اور صاف ہوکر اس کے باریک سوراخوں سے باہر گرتا، یہ فلٹر صرف پتھر کے ایک ہی ٹکڑے سے بنایا گیا ہے، جس پر یہ عبارت کندہ ہے۔

"آب متعطر سنگ صافی اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی ۱۰۸۰ھ"

ہتھیار اور آلات میں زیادہ تاریخی اہمیت رکھنے والی علی مردان خاں کی تلوار ہے۔ تلوار پر سنہری نستعلیق حروف اور فارسی زبان میں دو عبارتیں کندہ ہیں، ایک دستہ کے سطح پر اور دوسری پشت پر، پشت پر یہ عبارت کندہ ہے، "ایں شمشیر خاص از حضور عباس خلد اللہ ملکہ و سلطانہ بخانہ زاد علی مردان خاں سرفرازی یافت"

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تلوار فارس کے بادشاہ عباس صفوی کیطرف سے (جن کا عہد حکومت ۱۵۸۵ء سے ۱۶۲۹ء تک رہا ہے) علی مردان خاں کو ملی تھی، علی مردان خاں جنکا اصل نام علی مردان بیگ ہے گنج علیخاں کے بیٹے تھے۔ گنج علیخاں شاہ عباس صفوی کے وفادار نوکر تھے انہیں ارجن بابا کا خطاب بادشاہ کی طرف سے دیا گیا اور یہ پہلے کرمان کے پھر قندھار کے حاکم بنائے گئے، باپ کی وفات پر علی مردان خان کو خان بابا ثانی کا خطاب مرحمت ہوا تھا، لیکن اس کے کچھ سال بعد شاہ عباس صفوی کی جگہ پر انکے پوتے گدی پر

شکن ہوئے ۔ علی مردان خاں نے اُنکی بیجا سختیوں سے ملول ہوکر شاہجہاں کو قندھار کا علاقہ سپرد کر دیا اور خود دہلی شاہجہاں کے ہاں پناہ گزیں ہوئے یہاں اُنکی بڑی آؤ بھگت ہوتی شاہجہاں کی طرف سے امیرالامرار کا خطاب ملا اور اس حالت میں جبکہ وہ پناہ گزیں تھے یہ تلوار ہندوستان بھیجی گئی ۔ پھر دن علی مردان خاں کے پاس تھی کہ اس کے بعد یہ تلوار نواب اودھ سعادت علیخاں کے قبضہ میں آئی جنہوں نے اس پر ۱۲۱۲ھ میں یہ عبارت کندہ کرائی ۔

یا علی العلی

وزیرالملک نواب سعادت علیخاں بہادر ۱۲۱۲ھ

شاہجہاں کی بھی ایک تلوار مع نیام اور پیٹی کے موجود ہے جو اپنی حیثیت سے زیادہ مشہور ہے اس کے دستے پر ۹۹ نام خدا کے سنہرے حرفوں میں لکھے ہوئے ہیں ایک اور عبارت سنہرے حرفوں میں کندہ ہے جس سے شاہجہاں کی تلوار ہونیکی تصدیق ہوتی ہے ۔

عبارت : لاالہ الااللہ محمدالرسول اللہ

ہست ایں شمشیر خاص ثانی صاحبقران شاہ غازی بادشاہ بحروبر شاہجہاں ل ۱۰ م س ا ن ۲۸ نصرت بخش

نصرت بخش کے متعلق عام خیال ہے کہ یہ اس تلوار کا نام ہے ، ایک خنجر ہے جو شاہ طہماسپ شاہ ایران کا ہے یہاں رکھا ہوا ہے اس پر جو عبارت کندہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مظفر شاہ کاشانی کا بنایا ہوا ہے ۔

عمل مظفر کاشانی

فیضی کا لکھا ہوا ایک کتبہ جس کا پتھر ایک قدیم مسجد سے لایا گیا ہے بڑی تاریخی اہمیت رکھتا ہے ۔ یہ مسجد جو اب بالکل شکستہ حالت میں پڑی ہے دلی دروازہ سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر واقع ہے ۔ یہ مغل طرز کی بنی ہوئی ہے اور اس کے بانی صدر جہاں شیخ عبدالنبی تھے جو شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ کی اولاد سے تھے اور اکبر کے دربار میں بڑا ممتاز درجہ

رکھتے تھے، یہ کتبہ اسی مسجد کا ہے جس کی لمبائی ۳ فٹ ۶ انچ اور چوڑائی ۱ فٹ ۱۰ انچ ہے عربی قطعہ فیضی کا کہا ہوا خط نسخ میں کندہ ہے جس سے فیضی کی عربی شعر گوئی کی حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے اور مسجد کی تاریخی نوعیت کا بھی۔

فی زمان الخلیفۃ الاکبر — ایداللہ ذاتہ النفاع
قد بنی بقعۃ مقدسۃ — مثلہا لایکون فی الاتطاع
شیخ الاسلام زائر الحرمین — شیخ اہل الحدیث بالاجماع
شیخ عبدالنبی نعمانی — معدن العلم منبع الانفاع
سال تاریخ این بنا فیضی — سال العقل قال خیر بقاع

شاہی فرامین اور اسناد میوزیم کی اہم ترین چیزوں میں سے ہیں۔ تاریخی حیثیت سے انکا ہر ہر نقطہ قابل مطالعہ ہے، اور خصوصیت کے ساتھ ان مورخین کے لئے جو ہندوستان کی تاریخ لکھنے کا ارادہ رکھتے ہوں تصویروں میں علاوہ شاہان دہلی کی ان تصویروں کے جو مختلف وقتوں اور مختلف حیثیتوں سے بنائی گئی ہیں ایک ایرانی خاتون کی تصویر قابل دید ہے، یہ تصویر معین مصور کی بنائی ہوئی ہے، مصور نے سادگی اور بھولے پن کا نقشہ تصویر میں نمایاں کیا ہے جس سے یہ تصویر حددرجہ دلکش اور جاذب ہوگئی، ایک اور تصویر جس میں افیونیوں کی ایک صحبت دکھائی گئی ہے حددرجہ مضحک ہے دیکھتے ہی بے ساختہ ہنسی آتی ہے، ان لوگوں کی صورت ڈراونی ہے، گردن تپلی تپلی، ہڈیاں اُبھری ہوئی، گال پچکے ہوئے حقہ ہر ایک کے سامنے رکھا ہوا ہے پینک میں اونگھ رہے ہیں اور منہ سے حقہ لگا ہوا ہے بعضوں کے سر اونگھتے اونگھتے زمین تک پہنچ چکے ہیں، اور اسی بیہوشی کی حالت میں بدن کا کچھ حصہ بھی کھل گیا ہے، غالب اور کبیر داس کی تصویریں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ اور نظام الدین اولیا اور دوسرے صوفیائے کرام کی تصویریں اچھی کھینچی گئی ہیں، اکبر شاہی کا ایک جلوس بھی جس سے اکبر کے شان و شوکت کا اظہار ہوتا ہے

ہت خوب دکھایا گیا ہے ایک اور تصویر بہادر شاہ ثانی آخری تاجدار دہلی کی ہے جب کہ وہ
تر مرگ پر ہیں، یہ تصویر بہت موثر ہے۔

قلمی کتابوں میں جو سب کی سب شاہی کتب خانے سے متعلق تھیں خصوصیت کے ساتھ
رآن کا ایک نسخہ جو باعتبار اپنی قدامت اور عمدہ کتابت کے ایک امتیازی شان رکھتا ہے
رنی اور نسخ خط کے درمیان لکھا گیا ہے شروع کے دو صفحے سنہرے حرفوں میں ہیں حاشیہ رنگ
نگ کے بیل بوٹوں سے آراستہ کیا گیا ہے، شاہنامہ فردوسی کا ایک قدیم اور مصور نسخہ (دو
بلدوں میں) جو شاہی کتب خانہ کی خاص کتاب تھی یہاں موجود ہے۔ ایک اور قلمی نسخہ بخاور
ماں کی بیاض ہے اس میں کچھ تو خود انہیں کے کہے ہوئے اشعار اور کچھ مستند شعرائے فارسی
کے کلام کا اچھا خاصہ ذخیرہ جمع کیا گیا ہے یہ کتاب ۱۰۹۱ھ کی لکھی ہوئی ہے، جس کے لکھنے والے
ختلف مشہور خطاط ہیں، میوزیم کا ایک اور دلچسپ شعبہ وہ ہے جس میں مشہور اور ممتاز پرانے
اتبوں کی خطاطی کے نمونے ہیں ان خطاطوں کے ناموں کی فہرست جن کی تحریریں میوزیم
یں محفوظ رکھی گئی ہیں طویل ہے، لیکن خاص طور پر عبدالرحیم فرمان نویس، میر علی تبریزی، عرب
براز ی، میر علی الکاتب، میر محمد باقر قابل ذکر ہیں۔ عبدالرحیم[1] فرماں نویس کے ہاتھ کا ایک
رمان عمدہ نستعلیق خط میں لکھا ہوا میوزیم میں محفوظ ہے۔ فرمان پر ۱۰۲۵ھ کی تاریخ پڑی ہوئی
ہے۔ خط نستعلیق کا عمدہ نمونہ میر[2] علی تبریزی کا بھی ہے، عرب شیرازی کی لکھی ہوئی ایک دعائیہ

بدالرحیم جہانگیر کے دربار کا خاص فرماں نویس تھا جو آقا عبدالرشید مشہور خطاط کے شاگرد
ھے اور فرمان میں دوسرے خطاطوں کی نسبت سے انکے خط میں متانت زیادہ ہوتی تھی،
نبریں قلم کا خطاب ملا تھا

میر علی تبریزی کا امیر تیمور کے زمانہ کے مشہور خطاط تھے۔ خط نستعلیق کے متعلق کچھ اصول انہوں نے
، جس سے انکی کافی شہرت ہوئی اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ یہ خط نستعلیق کے موجد تھے۔

نظم(۱) ہی جو خط نستعلیق کا عمدہ نمونہ ہی یہ عبداللہ قطب شاہ آخری حکمران گولکنڈہ کے لئے ۱۰۹۴ھ میں لکھی گئی ہے۔

میر علی(۲) الکاتب کا بھی خوشنویسی کا ایک نمونہ موجود ہے اور میر محمد(۳) باقر کا بھی۔

یہ ایک مجمل خاکہ ہی میوزیم کے اس مفصل نقشے کا جو ہم ناظرین کی خدمت میں پیش کر چاہتے ہیں۔ انشاءاللہ ہم ہر حصے پر الگ الگ نظر ڈالیں گے اور ان تمام تاریخی جواہر پاروں کا ایک ایک کرکے جائزہ لیں گے جو اس خزانے میں محفوظ ہیں۔

---

(۱) نظم:- تا بود بر سپہر گردندہ — در جہاں بادشاہ عبداللہ
ماہ تاباں و مہر تابندہ — دشمن شاد باد باغم و آہ

(۲) میر علی الکاتب ہرات کے سادات سے ہیں باپ کا نام محمود ہے، یہ میر علی سلطان کے شاگرد ہیں عربی فارسی کے اچھے عالم اور شعر گوئی میں بھی باکمال تھے انہوں نے اپنا تخلص مجنوں رکھا تھا، کچھ دن بخارا میں سکونت اختیار کرنیکے بعد اودہر آدہر مختلف مقامات میں گھومتے رہے، یہ ایک مشہور خطاط تھے انکے زمانے کی جو بہترین تحریریں اب ملتی ہیں عام طور پر انہیں کی طرف منسوب کیجاتی ہیں، چنانچہ غلام محمد ہفت قلمی اپنی کتاب تذکرہ خوشنویساں میں انکے خط کی تعریف میں لکھتے ہیں

..... گلشن خط را رنگ و بوے تازہ و رونق بے اندازہ دادہ مشام عالم را از ریاحین و ریاحین خط خود معطر ساخت و در اصول و صفا از ہمہ خوب تر نوشت،

انکی منظوم خطوط سبعہ جس کو کہ سلطان مظفر کے صاحبزادے کے لئے کیا تھا بہت مقبول ہوئی

(۳) میر محمد باقر عالمگیر کے خوشنویس ہیں، بادشاہ کو انکا خط بہت پسند تھا جیسا کہ اکثر رقعات میں اسکا تذکرہ کیا ہے، عالمگیر انکو استاد اور والا جاہ کے لقب سے سرفراز فرماتے تھے۔ غلام محمد نے انکے خط کی تعریف اپنے ان الفاظ میں کی ہی۔

خط ایں عزیز بسیار شیریں و دلچسپ و مضبوط بنظر در آمد۔

مذاہب اسلامی کی ابتدا

مسلمانوں کی معاشرت اور ان کے عقاید کے مختلف تغیرات کو مدنظر رکھتے ہوئے بعض علمی حلقوں
اکثر یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ مذاہب اسلامی کا نشو و نما چند خارجی اثرات کے ماتحت ہوا۔ ممکن
بعض لوگ اس رائے کو پسند کریں اس لئے کہ بدعات و فتن کے ظہور اور مختلف فرقوں کی ضلالت
بے راہ روی کی توجیہ کے لئے یہ ایک عمدہ نظریہ ہے لیکن ہمارے نزدیک اس قسم کے عاجلانہ
وضات علمی تحقیقات کے لئے کسی طرح بھی موزوں نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مذاہب
می میں بے شمار خارجی عناصر موجود ہیں مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کی ابتدا بھی خارجی اثرات
یہ ہے۔ اگر اس دلیل کو صحیح مان لیا جائے تو اس کا یہ مطلب ہو گا کہ تمدن اسلامی کا آغاز بھی
ی اثرات سے ہوا۔ تمدن اسلامی میں ان اجزا کی کمی نہیں جو کسی نہ کسی بیرونی سرچشمے سے ماخوذ
ں بایں ہمہ کوئی شخص بھی اسلامی تہذیب و تمدن کی جدت و بداعت سے انکار نہیں کر سکتا۔ یہ
ل ممکن ہے کہ کسی تحریک میں خارجی عناصر موجود ہوں اور وہ خارجی تہذیبوں کے زیر اثر رہی ہو
ن یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا اصلی سرچشمہ خود اسی کی ذات میں پوشیدہ ہو۔ بعینہٖ یہی کیفیت مذاہب
امی کی ہے۔ واقعات پر جس قدر غور کیا جائے اُسی قدر یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ مذاہب
امی کی ابتدا ان داخلی اسباب کی بنا پر ہوئی جو دین اسلامی میں از خود رونما ہو گئے تھے۔ کچھ ان
قدرتی سوالات کی وجہ سے جو انسانی طبائع میں ہمیشہ موجود رہتے ہیں اور کچھ اس ربط و ضبط کے
ث جو جماعت اسلامی کے مختلف اور متضاد عناصر میں پیدا ہوا۔ علاوہ ازیں یہ کیونکر ممکن تھا کہ جب
خود ملت اسلامیہ کے داخلی شئون اور تعلیمات قرآنی کے اندر اصولی اور عقلی مباحث کا امکان نہ ہوتا
ن خارجی اثرات کی بنا پر اسلامی دینیات کا آغاز ہو جاتا۔ خارجی اثرات نے بعض مذہبی تحریکات پر
نقش چھوڑا ہے اور ایک حد تک ان کی تشکیل میں حصہ لیا ہے لیکن ان کا موجب نہیں ہوئے

پھر جن اثرات کو ہم 'خارجی' قرار دیتے ہیں ان میں سبھی خارجی نہیں۔ اگر بعض مسلم اقوام نے اپنے فطری رجحانات کے مطابق چند دینی مسائل کی ابتدا کی تو اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ مسائل جماعت اسلامی کے غور و فکر کا نتیجہ نہیں تھے۔ اگر عرب ان افکار سے ناآشنا تھے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ دینیات اسلامی کا نشو و نما عربوں ہی کے حصے میں نہیں آیا تھا نہ یہ ضروری تھا کہ مسلمانوں کی توجہ صرف انہی مسائل پر ہوتی جو عربی مذاق کے مطابق تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں اس امر کو بھی مدنظر رکھنا چاہئے کہ جب اسلام کا ظہور ہوا تو دنیا علم و حکمت سے خالی نہیں تھی۔ ضرور تھا کہ دنیائے قدیم کا یہ علمی ترکہ مسلمانوں کی ذہنی سرگرمیوں میں کوئی نہ کوئی حصہ لیتا۔ لہذا دیکھنا یہ ہے کہ جماعت انسانی کے عقلی اور مذہبی مسائل نے اس زمانے میں کیا صورت اختیار کی۔ اس سے ہمیں یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ قدیم افکار کا کس قدر حصہ خود بخود اسلام میں منتقل ہو گیا لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ اس سے اسلامی دینیات کے آزادانہ نشو و نما میں کوئی فرق نہیں آتا۔ باعتبار زمانہ اسلام کا ظہور ایک خاص وقت پر ہوا اور اس وقت آب و گل کا جو بھی سرمایہ موجود تھا اس سے اسلام نے اپنی زبردست قوت تخلیق کی بدولت ایک نیا عالم تعمیر کیا۔ یہی وہ جانفزا تحریک تھی جس سے دنیائے قدیم کے مردہ جسد میں ایک نئی روح پیدا ہوئی اور جس نے آگے چل کر مسلمانوں کی عنان توجہ علم و عمل کی مختلف ضروریات کی طرف موڑ دی۔ مسلمانوں کی تمام سرگرمیوں میں اسی ایک جذبے کی کارفرمائی ہے۔ بغیر اس کے نہ مشرق کی مردہ اور تارک عمل اقوام میں زندگی کی کوئی حرکت پیدا ہو سکتی تھی نہ یونانی افکار اور ایرانی ادارات میں اس قدر قوت باقی رہ گئی تھی کہ کسی جدید اور زبردست روحانی تحریک کے بغیر ان کو از سر نو زندہ کیا جا سکتا۔ بہرکیف اسلام کی ذہنی تاریخ کے مطالعہ میں ان علمی اور عملی محرکات کو نظرانداز نہیں کرنا چاہئے جو اسلام کی اندرونی قوت کا نتیجہ تھے اور جنہوں نے اسلامی افکار و آراء کے نشو و نما میں مختلف اسباب کی حیثیت اختیار کی۔ اسی اعتبار سے ہم مذاہب اسلامی کے متعلق چند ایسے حقائق کی طرف اشارہ کریں گے جن سے ان کی ابتدا و آغاز کا مسئلہ صاف ہو جائے گا۔

مدینہ منورہ میں ابتدا ہی سے دینیاتی بحثوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ

شروع شروع کے یہ سب مسائل فقہی بحثوں سے متعلق تھے لیکن اس زمانے میں بھی ہم حضرت عائشہ صدیقہ
رضی اللہ عنہا اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کو معراج کے بارے میں ایک دوسرے سے مختلف الرائے
پاتے ہیں[۱]۔ یہیں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے قضا و قدر کے متعلق سوالات کئے جاتے
تھے اور ان کا آپ نے جواب بھی دیا[۲]۔ عربوں کے عملی رجحانات کے باوجود ان میں اس قسم کے مباحث
پیدا ہو جانا کوئی تعجب انگیز امر نہیں۔ لیکن اگر شروع شروع میں ان پر زیادہ زور نہیں دیا گیا تو محض
اس لئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقی اثر کی بدولت ان کے دلوں پر مذہب کی حقیقت کچھ
اس طرح جاگزیں ہو گئی تھی کہ اگر ان کے ذہن میں اس قسم کا کوئی سوال پیدا بھی ہوتا تھا تو ایمان و اعتقاد
کے متعلق کسی موشگافی کی نوبت نہیں آتی تھی۔ پھر عرب اپنے قومی اور اجتماعی مسائل میں اسطرح منہمک
تھے کہ اس وقت نظری امور پر غور کرنے کا موقعہ ہی نہیں تھا۔ باوجود اس کے یہ بالکل ممکن تھا کہ خود
عرب ان تمام مباحث کی طرف توجہ کرتے جو کسی عقیدے کے تسلیم کر لینے سے از خود پیدا ہو جایا کرتے
ہیں۔ اسلام سے پہلے عربوں کی زندگی نہایت سادہ تھی لیکن وہ اپنے گرد و پیش کے افکار سے بے خبر
نہیں تھے۔ تمام قدیم اقوام کی طرح عرب بھی تقدیر کے قائل تھے[۳]۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم

---

[۱] شبلی، الکلام، حصہ اول صفحہ ۱۴۔ حضرت عبد اللہ بن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے معراج میں خدا کو
دیکھا تھا۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں ہرگز نہیں دیکھا تھا۔

[۲] سید امیر علی، 'Spirit of Islam' بحوالہ احتجاج الطبرسی۔ امیر المومنین سے ایک روز قضا و قدر کے
متعلق پوچھے گئے۔ آپ نے فرمایا قضا کے معنی ہیں احکام الٰہی کا اتباع اور گناہ سے اجتناب اور قدر کا مطلب ہے پاکیزہ
زندگی بسر کرنے کی صلاحیت...... نہ یہ کہو کہ انسان مجبور ہے ...... اور نہ یہ کہ قادر ہے، ملاحظہ ہو دسواں باب صفحہ ۱۰، تا ۱۴۹۔

[۳] تمام قدیم اقوام کی طرح عرب بھی تقدیر کے قائل تھے۔ ان کی قدیم شاعری...... کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ظہور اسلام
سے پہلے انہوں نے چاروناچار قسمت کے سامنے سر جھکا رکھا تھا۔ ان کے نزدیک انسان تقدیر کے ہاتھ میں محض ایک کھلونا
تھا۔ تعلیمات اسلامی سے ان کے ذہن میں ایک انقلاب پیدا ہوا...... اور انہیں اخلاقی ذمہ داریوں (دیکھو صفحہ آئندہ)

ہوتا ہے کہ کس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہلی عربوں میں یہ خیال پیدا کیا۔ اور یہ وہ خیال ہے جس کی جاہل سے جاہل شخص سے لیکر بڑے سے بڑے عالم کو ہمیشہ ضرورت رہیگی۔ کہ قضائے الٰہی کے اٹل اور غیر متغیر نظام کے ساتھ انسان کی ذاتی نجات اس کے اپنے عمل سے وابستہ ہے۔ اس سے طبائع میں جدوتوکل کے دوگونہ خصائص پیدا ہوئے اور عربوں نے محسوس کیا کہ جس چیز کو وہ اپنی مجبوری کا ایک ناگوار سبب سمجھتے تھے وہی اُن کے لئے امید اور قوت کا سب سے بڑا سرچشمہ ثابت ہوا۔ لیکن خیالات کا یہ انقلاب جس تیزی کے ساتھ رونما ہوا تھا اُس کے سبھی متحمل نہیں ہو سکے۔ احادیث کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بعض متجسس یا نفاق انگیز طبائع جبر و اختیار کے اس ظاہری تضاد سے کچھ بہت زیادہ مطمئن نہیں ہوئیں۔ یہ لوگ حکم الٰہی کے متعلق طرح طرح کے شبہات ظاہر کرتے تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انہیں بڑی سختی کے ساتھ فہمائش کی کہ قضائے الٰہی سے انکار کرنا کسی مسلمان کے لئے زیبا نہیں لیکن ان حدیثوں میں بھی جن میں وجوب تقدیر کی شدت کے ساتھ حمایت کی گئی ہے انسان کی اخلاقی ذمہ داری پر برابر زور دیا گیا ہے۔ کسی نے رسول اللہ صلعم سے پوچھا "یا رسول اللہ مشرکین کی اولاد کا انجام کیا ہوگا؟ آپ نے فرمایا اس کا انحصار ان کے اعمال پر ہے[1]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارک میں اگرچہ اس امر کو پسند نہیں کیا جاتا تھا کہ لوگ دین کے معاملے میں غیر ضروری غور و فکر سے کام لیں لیکن اس قسم کے سوالات کو بالکل روکا بھی نہیں جاتا تھا لہٰذا اگر شہرستانی نے دینی مباحث کی ابتدا ان اسباب سے کی ہے جو عہد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق رکھتے ہیں تو یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ تاریخ مذاہب اسلامی کے اس جلیل القدر مصنف نے لکھا ہے:۔

"امت (اسلامیہ) میں تمام شبہات منافقین کے شبہات سے پیدا ہوئے جب انہوں

(صفحہ گزشتہ) کا احساس ہوا۔ Spirit of Islam صفحہ ۱۰۴، دسواں باب بالخصوص ملاحظہ ہو۔

[1] بخاری۔ کتاب القدر۔

نے رسولؐ کے اوامر و نواہی پر اظہارِ رضامندی نہیں کیا۔ غیر ضروری باتوں میں خیال آرائی کی اور ایسی چیزوں کے متعلق سوالات کئے...... جن سے انہیں روکا گیا تھا۔ جیسا کہ حدیث ذوالخویصرۃ التمیمی سے ظاہر ہوتا ہے جس نے آنحضرت صلعم سے کہا تھا "اے محمدؐ! عدل کر تو عدل نہیں کرتا۔ آپ نے فرمایا اگر میں عدل نہیں کرتا تو پھر کون عدل کریگا۔ اس پر بھی اس لعین نے اپنے سوال پر اصرار کیا اور کہا کیا تو ایسی ہی تقسیم سے اللہ کی خوشنودی چاہتا ہے[1]۔ یہ صریح خروج ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ جو کوئی سچے امام پر اعتراض کرتا ہے خارجی ہو جایا کرتا ہے۔ لیکن اس سے بڑا خارجی کون ہوگا جس نے سچے رسول پر اعتراض کیا۔ کیا یہ نص صریح کے مقابلے پر اپنی ذاتی عقل کا قیاس نہیں ہے؟ آنحضرت نے فرمایا اس شخص سے ایک ایسی قوم پیدا ہوگی جو دین سے کوئی تعلق نہیں رکھیگی......

یہی کیفیت منافقین کے اُس گروہ کی تھی جس نے (غزوۂ) احد میں کہا تھا "ھل لنا من الامر من شیءٍ[2]" پھر ان کا یہ کہنا کہ اگر ایسا ہوتا (لوکان لنا من الامر شیء[3]) تو ہم یہاں قتل نہ ہوتے[4]۔ اور ان کا یہ کہنا کہ اگر ہمارا کچھ اختیار رہتا تو نہ ہم مرتے نہ قتل ہوتے[5]۔ کیا یہ صریحاً قدر نہیں ہے؟ اسی طرح مشرکین کا ایک گروہ کہتا تھا کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم اس کے سوا اور کسی کی عبادت کرتے[6]۔ پھر ایک گروہ کا یہ کہنا کہ کیا ہم اسے کھلائیں جسے اللہ کھلانا نہیں چاہتا[7]۔ کیا یہ صریحاً جبر نہیں ہے؟ منکرین

---

[1] بخاری: استتابۃ المرتدین والمعاندین، باب قتل الخوارج والملحدین۔

[2] "کیا ہمارا بھی کچھ اختیار ہے؟" قرآن مجید، سورۃ آل عمران، آیت ۱۵۳

[3] قرآن مجید، سورۃ آل عمران، آیت ۱۵۳

[4] ما قتلنا ھٰھنا ۔ قرآن مجید۔ سورۃ آل عمران، آیت ۔ ۱۵۳

[5] لو کانوا عندنا ما ماتوا وما قتلوا ۔ قرآن مجید، سورۃ آل عمران، آیت ۔ ۱۵۵

[6] لو شاء اللہ ما عبدنا من دونہ من شیء ۔ قرآن مجید، سورۃ النحل، آیت ۔ ۳۵

[7] انطعم من لو یشاء اللہ اطعمہ ۔ قرآن مجید، سورۃ یٰسین، آیت ۴۷

کا ایک اور گروہ تھا جس نے اللہ تعالیٰ کے جلال اور اس کے تصرفات افعال میں بحث کی تھی کہ قرآن میں یہ کہہ کر ان کا رد کیا گیا کہ ویرسل الصواعق فیصیب بہا من یشاء وہم یجادلون فی اللہ و ھو شدید المحال[1] اور یہ سب کچھ اس زمانے میں ہوا جب ابھی آنحضرت صلعم صاحب قوت و شوکت اور صحیح و سالم تھے۔ لیکن منافق ...... اسلام کا اقرار کرتے ہوئے مسلمانوں کو دھوکا دیتے تھے یوں کبھی کبھی ان کے باطنی نفاق کا اظہار رسول اکرم کے افعال و اعمال پر نکتہ چینی کی صورت میں ہو جایا کرتا تھا۔ اسی سے شبہات پیدا ہوئے تھے[2]

ہمیں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ ہر وہ شخص جس کے دل میں شبہات پیدا ہوتے تھے ضروری نہیں کہ منافق ہی ہو۔ بہرحال اس عبارت کے بعد علامہ موصوف نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ان اجتہادی اختلافات کا تذکرہ کیا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد رونما ہوئے یعنی (۱) واقعۂ قرطاس، جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت میں دوات و کاغذ طلب کیا تو حضرت عمر نے کہا آپ پر تکلیف کا غلبہ ہے۔ ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے (۲) جیش اسامہ کا معاملہ جو دوران مرض میں مرتب ہوا اور اس امر میں تذبذب تھا کہ رسول اللہ صلعم کو حالت مرض میں چھوڑ کر کوچ کریں یا نہیں۔ (۳) جب آنحضرت صلعم کا انتقال ہوا تو حضرت عمر نے کہا کہ آپ عیسیٰ علیہ السلام کی طرح آسمان کی طرف اٹھائے گئے ہیں (۴) اس امر میں بھی اختلاف تھا کہ آپ دفن کہاں کئے جائیں مکہ میں یا مدینہ میں یا بیت المقدس میں (۵) مہاجرین و انصار نصب امام کے معاملے میں متفق الرائے نہیں تھے (۶) حضرت فاطمہؓ وراثت کی دعویدار تھیں لیکن اس کے جواب میں یہ حدیث پیش کی گئی کہ ہم نبی ہیں ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا (۷) آغاز خلافت کے ساتھ ہی یہ سوال پیدا ہوا کہ جن لوگوں نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کیا ہے ان کا قتل جائز ہے یا نہیں (۸) حضرت عمر کی جانشینی پر بھی اعتراض

---

[1] وہ بھیجتا ہے بجلیاں اور ان میں سے جسے چاہتا ہے پکڑ لیتا ہے اور وہ اللہ کے معاملے میں جھگڑتے ہیں اور اللہ بڑا صاحب قوت ہے۔ قرآن مجید، سورۃ رعد، آیت ۱۳

[2] شہرستانی: الملل والنحل، حاشیہ کتاب الفصل فی الملل والاہواء والنحل لابن حزم، جزو اول، صفحہ ۱۸-۱۹۔

ہوا لیکن حضرت ابوبکر نے کہا میں نے جو کچھ کیا ہے امت کی بھلائی کے لئے کیا ہے (۹) حضرت عمر کے بعد پھر اختلاف رونما ہوا حتیٰ کہ لوگوں نے حضرت عثمان پر اتفاق کیا لیکن ......آپ نے حکم ابن امیہ ......کو واپس بلالیا۔ ......حضرت ابوذر غفاری کو ربذہ میں جلاوطن کر دیا ......عبداللہ بن سعد کو پناہ دی ......اپنی لڑکی کی شادی مروان میں حکم سے کی اور اسے افریقہ کے مال غنیمت کا ایک خمس دیدیا ......عبداللہ بن عامر کو بصرہ میں عامل بنایا ...... (۱۰) امیرالمؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہد میں ......طلحہ اور زبیر (رضی اللہ عنہما) نے بیعت کے بعد خروج کیا ......صفین کا واقعہ پیش آیا ......خوارج نے جنگ کی ......عبد اللہ بن سبا اور اس کی جماعت سے بدعت وضلالت کی ابتدا ہوئی اور رسول اللہ کا یہ کہنا صحیح ہوا کہ علی کے محب غالی اور مبغض دونوں جہنم میں جائیں گے۔ علامہ موصوف کہتے ہیں اس کے بعد اختلاف کی دو قسمیں ہوگئیں۔ وہ اختلافات جن کا تعلق امامت سے تھا اور اصولی اختلافات۔[۱]

لیکن ان اجتہادی اختلافات میں بھی کہیں کہیں اصولی اختلافات کی جھلک نظر آجاتی ہے۔ حضرت عمرؓ رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوت نہیں ہوئے بلکہ عیسیٰ علیہ السلام کی طرح آسمان پر تشریف لے گئے ہیں جہاں سے آپ چالیس روز کے بعد واپس آجائیں گے۔ شیعوں کی ایک جماعت کے عقیدۂ الرجعۃ سے کس قدر مشابہ ہے۔ البتہ ابوالفداء نے حضرت عمر کا نام نہیں لیا۔ اس کا بیان ہے کہ ایک جماعت نے آنحضرت صلعم کی موت سے انکار کیا۔ وہ لوگ کہتے تھے آنحضرت صلعم کیونکر فوت ہو سکتے ہیں۔ آپ ہم پر شاہد ہیں آپ فوت نہیں ہوئے بلکہ عیسیٰ علیہ السلام کی طرح آسمان پر اٹھا لئے گئے ہیں۔[۲] بخاری میں یہ روایت مذکور نہیں لیکن یہ الفاظ موجود ہیں کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا لوگو میری بات سنو محمد صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوگئے تو حضرت عمر نے ایسا محسوس کیا گویا انہوں نے اس آیت کو پہلی مرتبہ سنا " وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل۔ افائن مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم۔[۳] یہاں تک کہ وہ غش کھا کر پڑے

---

[۱] شہرستانی صفحہ ۲۰۔۲۲۔ [۲] ابوالفداء: المختصر فی اخبار البشر جزو اول صفحہ ۱۵۲۔

[۳] قرآن مجید سورۃ آل عمران ۔ آیت ۱۴۴

پھر یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا " خدا تعالیٰ آپ پر دو موتیں جمع نہیں کریگا[1] اس سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت صلعم کی وفات پر ایک جماعت کے دل میں واقعی یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ آپ فوت نہیں ہوئے[2]۔
بہرکیف ان روایات سے اس امر کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ قدیم خیالات دلوں میں موجود تھے اسی طرح حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا دولت اور ملکیت دولت کے متعلق اختلاف کرنا ایک زبردست معاشی اور اصولی بحث کا پیش خیمہ ہو سکتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض لوگوں نے طرح طرح کے سوالات کئے ہیں اور اگرچہ آنحضرت صلعم نے کثرت سوال کو پسند نہیں فرمایا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی روش بھی یہی رہی لیکن طبائع میں ہر قسم کے خیالات جمع ہو رہے تھے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد تو ان کا دائرہ اور بھی وسیع ہو تا گیا۔ اعلام الموقعین میں ابن قیم لکھتے ہیں:۔

> آنحضرت صلعم نے ' اغلوطات ' سے منع فرمایا۔ ابوبکر ابن ابی شیبہ کہتے ہیں مجھ سے عیسیٰ ابن یونس نے اوزاعی سے اسناد کے ساتھ ایسی ہی روایت کی ہے۔ چنانچہ اوزاعی کا خیال ہے کہ اغلوطات سے مراد "صعاب المسائل" ہیں۔ اور ولید بن مسلم نے اوزاعی سے اوزاعی نے عبد اللہ بن سعد بن عبادہ بن قیس الصابحی سے اور عبد اللہ ...... نے معاویہ بن ابی سفیان سے روایت کی ہے کہ وہ معاویہ کے پاس مسائل کا ذکر کر رہے تھے کہ معاویہ نے کہا کیا تم جانتے ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشکل مسائل سے منع فرمایا ہے۔ ابو عمر کہتے ہیں ...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوالات کو ناپسند فرمایا اور آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ قیل وقال اور کثرت سوال کو پسند نہیں کرتا ...[3]

---

[1] بخاری: کتاب المغازی، باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم ووفاتہ

[2] حاشیۃ السندی:۔ "بخاری کا یہ کہنا کہ عمر بن الخطاب لوگوں سے باتیں کرتے تھے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ حضرت عمر لوگوں سے یہ کہتے تھے کہ آنحضرت فوت نہیں ہوئے اور روایت ہے کہ آنحضرت صلعم فوت نہیں ہوں گے جبتک کہ اللہ منافقین کو ہلاک نہیں کر دیگا" ملاحظہ ہو حاشیہ بخاری، مطبوعہ مصر، جزء ثالث صفحہ ۶۵۔ [3] (دیکھو صفحہ آئندہ)

ان عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ دینی مباحث کی داغ بیل زمانہ مشورہ ہی میں پڑ چکی تھی ۔ لہذا اگر ہم ان واقعات کی بنا پر یہ خیال قائم کریں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے اربعہ رضی اللہ تعالے عنہم ہی کے زمانے میں اختلافات کی بہت کافی گنجائش تھی تو غیر مناسب نہیں ہوگا ۔ بہرکیف تھوڑے ہی عرصے کے بعد جب سیاسی اور اجتماعی تفرقوں کی بنا پر مسلمان شیعی، خارجی اور اموی جماعتوں میں منقسم ہو گئے تو یہ اختلافات بھی خاموشی کے ساتھ کام کرتے رہے اور بنو امیہ کے غلبے کے ساتھ پوری شدت سے منظر عام پر آگئے ۔ شیعی اور خارجی جماعت میں سب سے بڑا مسئلہ امامت کا تھا لیکن خوارج نے قضیۂ تحکیم کے ساتھ ایک طرح سے عقائد و اعمال کی باہمی نسبت کا مسئلہ بھی چھیڑ دیا تھا ۔ ان کا خیال تھا کہ کتاب الٰہی کے سوا کسی اور کو اپنا حکم بنانا گویا کتاب کا انکار کرنا ہے ۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی جماعت کی یہ غلطی تھی کہ انہوں نے قرآن کو چھوڑ کر عمرو بن عاص اور ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کو حکم مانا ۔ اس سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ جو شخص گناہ کا ارتکاب کرتا ہے کافر ہو جاتا ہے[۱] ۔ پھر ان فرقوں کی تشکیل و تنظیم سے وہ اصولی اور فروعی مباحث نہایت تیزی کے ساتھ رونما ہوتے گئے جو آگے چل کر متعدد دینی مسائل کا مرکز بننے والے تھے ۔ چنانچہ خوارج کے نعرہ ان الحکم الا للہ اور شیعوں کی امامت منصوص کے ساتھ بنو امیہ میں قدیم عربی خیالات کے ساتھ قسمت کا عقیدہ از سر نو جاگزیں ہو رہا تھا ۔ امت اسلامیہ میں تفریق پہلے ہی رونما ہو چکی تھی ۔ سیاسی اور اجتماعی انقلابات نے مذاہب اسلامی کے نشو و نما کو اور زیادہ آسان کر دیا ۔ یہی خیال مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے علم الکلام میں ظاہر کیا ہے ۔ اختلافات عقائد کے مختلف اسباب بیان کرنے کے بعد انہوں نے لکھا ہے :-

> اختلاف عقائد کے اگرچہ یہ سب اسباب فراہم تھے لیکن ابتدا پالیٹکس یعنی ملکی ضرورت سے ہوئی ۔ بنو امیہ کے زمانے میں چونکہ سفاکی کا بازار گرم رہتا تھا ۔ طبیعتوں میں شورش پیدا ہوئی

(بقیہ صفحہ گزشتہ) ابن قیم الجوزی ، اعلام الموقعین ، جزو اول ، صفحہ ۳۸ ۔

[۱] قرآن مجید ، سورۃ مائدہ آیت ۴۴ : و من لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکفرون ۔

لیکن جب کبھی شکایت کا لفظ کسی کی زبان پر آتا تھا تو فرماں روایان حکومت یہ کہہ کر اُسے چپ کرا دیتے تھے کہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کی مرضی سے ہوتا ہے ہم کو دم نہیں مارنا چاہئے۔ آمنا بالقدر خیرہ و شرہ۔ حجاج بن یوسف کے زمانہ میں جو ظلم و ستم ہوتا تھا معبد جہنی ایک شخص تھا جس نے صحابہ کی آنکھیں دیکھی تھیں اور دلیر اور راست گو تھا۔ وہ امام حسن بصری کے حلقۂ درس میں شریک ہوا کرتا تھا۔ ایک دن اُس نے امام صاحب سے عرض کی کہ بنو امیہ کی طرف سے قضا و قدر کا جو عذر پیش کیا جاتا ہے کہاں تک صحیح ہے۔ امام صاحب نے کہا "یہ خدا کے دشمن جھوٹے ہیں" وہ پہلے سے بنو امیہ کی زیادتیوں پر طیش میں بھرا ہوا تھا۔ اب علانیہ بغاوت کی اور جان سے مارا گیا۔

معبد کے بعد غیلان دمشقی نے اس خیال کو ترقی دی۔ وہ حضرت عثمان کا غلام تھا اور محمد بن حنفیہ سے بیک واسطہ تعلیم پائی تھی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز جب خلیفہ ہوئے تو اُس نے ایک نہایت آزادانہ خط لکھا اور بنو امیہ کے مظالم پر توجہ دلائی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اسے بلا بھیجا اور شاہی توشہ خانہ کے نیلام کی خدمت سپرد کی وہ بر سر عام نیلام کرتا تھا اور پکار پکار کر کہتا جاتا تھا "یہ وہ مال و اسباب ہے جو ظلم اور جبر سے حاصل کیا گیا تھا" اس وقت اسلام کی قدیم سادگی بہت کچھ باقی تھی تاہم توشہ خانہ میں پچیس ہزار جرابیں نکلیں۔ غیلان نے کہا سبحان اللہ اس ظالم کی کچھ حد ہے کہ عوام فاقے کرتے تھے اور ہمارے فرمانروا تیس تیس ہزار جرابیں توشہ خانہ میں رکھتے تھے ...... ہشام بن عبدالملک ...... غیلان کی گستاخیاں آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ تخت نشینی کے ساتھ اس کو طلب کیا اور بغاوت انگیزی کے جرم میں اس کے ہاتھ پاؤں کٹوا دیئے ...... آخر اسی جرم میں جان سے مارا گیا۔

اسی زمانہ میں جہم بن صفوان پیدا ہوا۔ وہ بھی امر بالمعروف کے اسی جرم پر قتل ہوا۔ لیکن یہ لوگ خالی نہیں گئے اور امر بالمعروف کا مسئلہ زیادہ پھیلا اور اس قدر زور پکڑا کہ ایک گروہ کثیر ...... بالآخر معتزلہ کے لقب سے پکارا گیا ...... [illegible] میں جب ولید ثانی تخت نشین ہوا تو اس فرقہ کا شمار ہزاروں سے گذر کر چکا تھا یہاں تک کہ خود خاندان بنی امیہ میں یزید بن الولید نے

یہ مذہب اختیار کیا ...... اس کے طرفداروں میں ایک عمرو بن عبید تھا جو مذہب معتزلہ کا بہت بڑا امام گزرا ہے۔

گو معتزلہ نے اگرچہ جبر و قدر کے مسئلہ پر توجہ دلائی لیکن جب ایک دفعہ کسی وجہ سے خیالات میں حرکت پیدا ہوئی تو بڑھتی گئی یہاں تک کہ بنو امیہ کا دور ختم نہیں ہوا تھا کہ خلق قرآن، تنزیہ و تشبیہ، صفات باری وغیرہ کی بحثیں چھڑ گئیں اور ...... چند ہی روز میں بیسیوں فرقے قائم ہوگئے۔[1]

واقعات کے مطالعے سے بھی اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔ جس طرح شیعوں کی امامت معصوم کے خلاف خوارج میں امام کی ذات کے متعلق انتہائی جمہوریت کا خیال پیدا ہوا۔ اسی طرح جب بنو امیہ نے اپنی ہر زیادتی کے لیے قضا و قدر کا عقیدہ پیش کرنا شروع کیا تو اہل بیت اور شیعیان اہل بیت نے انسان کی اخلاقی ذمہ داری پر زور دیا۔ سیاسی اعتبار سے یہ مختلف عقائد ان مختلف جماعتوں کیلئے کس قدر موزوں تھے۔ حامیان بنو امیہ کے ساتھ ہی ارض شام میں مرجیہ کا ظہور ہوا جن کی یہ رائے تھی کہ گناہ سے کفر لازم نہیں آتا۔ یہ دوسرا حربہ تھا جو شیعی اور خارجی جماعتوں کے خلاف اہل شام کو میسر آیا۔ یہی وجہ ہے کہ مورخین کے نزدیک یہ فرقہ اس زمانے کے سیاسی حالات کا ایک قدرتی نتیجہ تھا[2]

---

[1] شبلی: علم الکلام، حصہ اول، صفحہ ۱۶-۱۹

[2] شہرستانی: الملل والنحل، حاشیہ کتاب الفصل، صفحہ ۱۱۰-۱۰۹۔ رجا کے دو معنی ہیں تاخیر اور عطاء امید لیکن مرجیہ کا اطلاق اول الذکر پر ہوتا ہے اس لئے کہ انہوں نے عمل کو نیت پر مؤخر رکھا۔ البتہ دوسرے معنوں میں یہ مطلب ہوگا کہ مرجیہ جو کہتے تھے کہ ایمان کے ساتھ معصیت کوئی ضرر نہیں پہنچاتی جیسے کفر کے ساتھ اطاعت بیکار ہے۔

دربار دمشق میں جس سے کسی شیعہ یا خارجی کو اتفاق نہیں ہو سکتا تھا خیالات کا جو عالم تھا ان کیلئے ان کے عقائد اس قدر موزوں تھے ...... ان کو اپنے وقت کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا ...... دولت امویہ کے ساتھ مرجیہ کا بھی خاتمہ ہوگیا اس لئے کہ اب اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔[3] براؤن: تاریخ ادبیات ایران جلد اول صفحہ ۳۰۰۔

محدثین نے بھی ان عقیدے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا[1]۔ جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں یہ واقعات تھے جو مسلمانوں کے ذہنی اضطراب سے مل کر طرح طرح کے دینیاتی مباحث کا موجب ہوئے۔ مرجیہ اور قدریہ یا معتزلہ کی بنا نہ مسیحی اثرات کا نتیجہ تھی جیسا کہ فان کریمر نے ظاہر کیا ہے[2] نہ یہ محض عجمی اقوام کی اسلام دشمنی تھی جسے غلطی سے ابن حزم نے تمام اصولی اختلافات کا باعث قرار دیا ہے۔ علامہ موصوف فرماتے ہیں:-

> دین اسلامی میں اکثر فرقے اس لئے پیدا ہوئے کہ وسعت سلطنت اور دوسری اقوام پر غلبہ اور برتری کے اعتبار سے ایرانی تمام اقوام سے افضل تھے۔ وہ اپنے آپ کو احرار اور ابنا کہتے تھے اور دوسروں کو غلام۔ لیکن جب ان کی سلطنت عربوں نے چھین لی جو اہل ایران کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے تو یہ ان کے لئے ایک عظیم الشان مصیبت تھی۔ لہذا انہوں نے دین اسلام میں رخنہ اندازی شروع کی لیکن اللہ تعالیٰ نے حق کا بول بالا کیا[3]۔

اب یہ کیونکر ممکن تھا کہ ہر ایرانی محض اس ارادے سے اسلام قبول کرتا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اسلام میں کوئی فتنہ برپا کر سکے۔ یہ کہنا کہ کسی ایرانی نے خلوص نیت سے اسلام قبول نہیں کیا ایک ایسا مبالغہ ہے جسے کوئی شخص تسلیم نہیں کرے گا۔ علاوہ ازیں اسلام نے جس عظیم الشان مذہبی تحریک کی بنا رکھی تھی اس کا یہ تقاضا تھا کہ متمدن دنیا اپنے معتقدات پر ایک مرتبہ پھر نظر ثانی کرتی۔ اس لحاظ سے مسلمانوں کا ہر طبقہ اپنی مخصوص دشواریوں کو حل کر رہا تھا اور اس کے ساتھ عقائد اسلامی میں نئے نئے خیالات سرایت کر رہے تھے۔ یہ اسلام ہی کی ہمہ گیر روح تھی جس نے مسلمانوں کی ہر علمی اور عملی تحریک کے لئے نقطۂ آغاز کا کام دیا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ کس طرح امت اسلامیہ کے داخلی شئون سے دینی مباحث کا آغاز ہوا۔ مسلمان علما نے نہ عیسائیوں کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا نہ وہ کسی ایرانی

---

[1] صحیح مسلم کتاب الایمان۔ کنز العمال جز اول باب فی ذم القدریہ والمرجیہ۔ شبلی، علم الکلام، جز اول صفحہ ۲۶۔

[2] تمدن اسلامی پر ایک نظر Culturgeschichtliche Streifzüge

[3] ابن حزم، کتاب الفصل فی الملل والاہواء والنحل جز ثانی صفحہ ۱۱۱

سازش کے زیر اثر تھے ۔ دراصل وہ تمام خیالات جو مذاہب اسلامی کی تہ میں کام کرتے رہے ہیں اس وقت کے اخلاقی اور ذہنی ماحول میں موجود تھے ۔ جب ان کا تصادم تعلیمات قرآنی سے ہوا تو نئے نئے مباحث کا آغاز ہوا ۔ ہمیں اس امر سے انکار نہیں کہ ان خیالات کا بہت سا حصہ مذاہب اسلامی میں مل گیا اور ان سے مسلمانوں کے اکثر فرقے متاثر بھی ہوئے لیکن دینیات اسلامی کا نشو و نما ایک آزادانہ تحریک تھی جو از خود مسلمانوں کے اندر رونما ہوئی ۔ جس طرح مدینہ منورہ میں فقہی مذاہب کا آغاز ہوا اور مسلمانوں نے ایک غیر معمولی ذہانت کے ساتھ قرآن و حدیث، فقہ و تفسیر، لغت، نحو، ادب اور تاریخ وغیرہ علوم کی طرف توجہ کی ـــــ یاد رہے کہ ان کا یہ علم کسی بیرونی سرچشمے سے ماخوذ نہیں تھا ـــ اسی طرح دینی مسائل کی ابتدا ہوئی ۔ اسلام کے اولین فقہا اور محدثین کے ساتھ ہمیں ان بزرگوں کے نام بھی ملتے ہیں جنہوں نے مذہب کے معاملے میں غور و فکر سے کام لیا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے امام جعفر الصادق (رضی اللہ عنہ) کی بدولت مسلمانوں میں ایک نہایت ہی خوشگوار ذہنی تحریک کا آغاز ہو رہا تھا[1] ۔ امام حسن بصری کو بیک وقت صوفی اور عالم دینیات خیال کیا جاتا ہے ۔ بنو امیہ کے عقیدۂ "تقدیر" کے متعلق ان کی جو رائے تھی وہ معبد جہنی کے واقعے سے ظاہر ہو سکتی ہے[2] ۔ مسلمانوں کی یہی ذہنی سرگرمیاں تھیں جو ان کے سیاسی اور اجتماعی تفرقات اور مختلف مسلم اقوام کے افکار و آرا سے مل کر مذاہب اسلامی کا سنگ بنیاد ثابت ہوئیں ۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ تمام وہ ارتجاعی اور ملحدانہ تحریکیں جو اسلام کے خلاف پیدا ہوئیں خواہ وہ زرتشتی عقائد کا نتیجہ ہوں یا مانویت اور یونانیت کا، وہ سب کی سب مذاہب اسلامی کی ابتدا سے مؤخر تھیں ۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب ہم ان خیالات کی طرف توجہ کریں جن سے بظاہر اس امر کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ مذاہب اسلامی کا نشو و نما مسیحی اور ایرانی اثرات کے ماتحت شروع ہوا ۔

---

[1] ملاحظہ ہو "ہسٹری آف اسلام" اور ابن خلکان، وفیات الاعیان ۔

[2] ملاحظہ ہو ابن خلکان جز اول ۔

انگلستان کا ایک فاضل مستشرق لکھتا ہے :-

اسلامی دینیات کا نشو و نما ...... آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد شروع ہوا جب تک آپ زندہ تھے ...... ظاہر ہے کہ کوئی نظام دینیات قائم نہیں ہو سکتا تھا ...... بحیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی بدعات کی ابتدا مبہم سی ہے ...... قدیم اہل الاہوا کے متعلق ہمیں کچھ نا تمام سے قصص ملتے ہیں ...... بایں ہمہ تاریخ کے اس دھندلکے میں دو فرقوں کا پتہ چلتا ہے جن پر اس زمانے کے تاریخی واقعات اور فلسفیانہ ضروریات کا بہت کافی اثر تھا۔ ان میں سے ایک مرجیہ ہے دوسرا قدریہ ...... خوارج اور شیعہ بنو امیہ کو کافر سمجھتے تھے .... لیکن مرجیہ کہتے تھے کہ بنو امیہ مسلمانوں کے فی الواقعہ (de facto) خلفاء ہیں اور توحید کے قائل ...... لہٰذا مسلمانوں کا فرض ہے کہ ان کی اطاعت کریں .... معلوم ہوتا ہے اس طرح مرجیہ کی ابتدا ہوئی - گویا سیاسی اعتبار سے وہ خوارج کے تشدد فی الدین کے مخالف تھے۔

قدریہ کا ظہور ذہن انسانی کے ایک عقلی اقتضا کا نتیجہ تھا - افراد و اقوام کو خدا کے حکم مطلق اور انسانی عمل کی آزادی میں جو تضاد نظر آتا ہے اسی سے انکی منکرانہ زندگی کا آغاز ہوتا ہے - یہی کیفیت اسلام کی تھی ...... جب تک مسلمان اللہ کی راہ میں لڑتے رہے ان کے خیالات پر خدا کے حکم مطلق کا عقیدہ حاوی رہا[۱] ...... اسی فرقے کے بانیوں میں سے ایک معبد الجہنی تھا جو سنہ ۸۰ھ میں الحاد کے جرم میں مقتول ہوا (اس کے بعد مصنف نے معبد الجہنی اور امام حسن بصری کی اس گفتگو کا ذکر کیا ہے جس کی طرف اس سے پہلے اشارہ ہو چکا ہے) ...... تھوڑے ہی عرصہ کے بعد فرقہ بندی کا رجحان پیدا ہوا ...... مرجیہ اور قدریہ کا خاتمہ ہو چکا تھا لیکن ان کا کچھ حصہ کٹر اسلام میں مل گیا اور کچھ ایک جدید فرقے میں .... اس فرقے کا آغاز بھی حسن بصری کی طرف منسوب ہے جن کی ذات معلوم ہوتا ہے اس زمانہ میں تمام

---

[۱] کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ جب خانہ جنگی کا آغاز ہوا تو انہیں اخلاقی ذمہ داریوں کا احساس ہوا - نیازی۔

تھیں یہ مرکز تعلیم کا مرکز تھی۔ کسی نے آپ سے پوچھا ...... مرجیہ اور وعیدیہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ مرجیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی مسلمان سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو جب بھی وہ مسلمان ہی رہتا ہے لیکن وعیدیہ کہتے ہیں کہ وہ کافر ہو جاتا ہے ...... پیشتر اس کے کہ امام موصوف کچھ جواب دیں عمرو بن عبید یا واصل ابن عطا دونوں میں سے کسی نے کہا کہ اس کی حیثیت دونوں کے بیچ میں ہو گی۔ ایسا شخص نہ مسلمان ہو گا نہ کافر ...... اس کے بعد وہ امام صاحب کے حلقے سے الگ مسجد کے ایک دوسرے حصے میں چلا گیا تاکہ وہاں اپنے خیالات کو باقاعدہ بیان کر سکے ...... اس پر امام صاحب نے اپنے اس شاگرد کے متعلق کہا اعتزل عنا اور اس طرح اس نئے فرقے کا نام معتزلہ ہوا ...... اس سے پتہ چلتا ہے کہ دوسری صدی ہجری میں ایک ایسی جماعت موجود تھی جو ...... قرآنی عقائد کو عقل سے سلجھا رہی تھی۔[1]

سطور بالا سے ہمارے پچھلے بیانات کی تجربی تصدیق ہو جاتی ہے لیکن اس قدر لکھنے کے بعد مسٹر میکڈانلڈ مستشرقین کے اس مفروضہ نظریے سے مجبور ہو کر جو اسلام کے نشو و نما کو مسیحی افکار کا نتیجہ ٹھہراتے ہیں لیکن جس کی تائید میں وہ کسی تاریخی شہادت کو معقولیت کے ساتھ پیش نہیں کر سکتے اس امر کا ثبوت بہم پہنچانے کی کوشش کی ہے کہ مرجیہ اور قدریہ کا ظہور مسیحی اثرات کے ماتحت ہوا۔ مسٹر میکڈانلڈ کہتے ہیں :-

> مرجیہ اور قدریہ کے نشو و نما میں ہم دینیات یونانی کیتھولک (بازنطینی) اور شامی مذہب کی [illegible] کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ یہ امر قابل غور ہے کہ شیعہ اور خوارج کی سیاسی جماعت کا ظہور عرب، عراق اور ایران میں ہوا لیکن خاص مذہبی بدعات کی ابتدا سب سے پہلے شام اور بالخصوص دمشق میں ہوئی جو اموی خلفا کا مستقر تھا ...... دولت امویہ نے بہت سی باتوں

D. B. Macdonald Muslim Theology

[1] حصہ دوم باب اول صفحہ ۱۳۰ - ۱۳۱ -

میں عرب قبل اسلام کے خیالات کو اختیار کر لیا تھا...... ان کے زمانہ میں مرجئیہ ... بیک
اموی خلیفہ کا خزانچی تھا۔ مرجئین کے بعد یوحنا اس کے بیٹے یوحنا کو ملا...... جو یونانی
کلیسا کا آخری امام ہے۔ اسی کے ہاتھوں یونانی دینیات کی تکمیل ہوئی...... اس کی
اور اس کے شاگرد تھیوڈر ابوکرا کی تحریروں میں اسلام پر مناظرانہ رسالے موجود ہیں جنکو
اس انداز میں لکھا گیا ہے گویا عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان بحث ہو رہی ہے۔ اسمیں
کوئی شک نہیں کہ اس سے اس زمانے کے خصائص کا اظہار ہوتا ہے۔ مرجیہ اور قدریہ اور
یونانی کلیسا اور یوحنائے دمشقی کے خیالات میں جو مشابہت پائی جاتی ہے اس کی تشریح
کی یہی ایک صورت ہے۔[1]

اب بغیر اس امر پر غور کئے کہ ازمنۂ قدیم کی وہ مسخ شدہ عیسائیت جس میں ہر طرح کے مشرکانہ
تخیلات کام کر رہے تھے اور جس کے پیروؤں کی ساری زندگی دن بدن دنیاوی صورت اختیار کر رہی
تھی ذات الٰہی اور خود مذہب کے متعلق ان اعلیٰ اور ارفع تخیلات کا کیونکر موجب ہو سکتی تھی جو اسلام
کے ساتھ ظہور میں آئے مسٹر میکڈانلڈ نے حمایت مذہب کے جوش میں یوحنائے دمشقی کی تحریروں کو
ضرورت سے زیادہ اہمیت دینے کی کوشش کی ہے۔ اسلام سے پہلے دنیا کے قدیم مذاہب اور بالخصوص
عیسائیت کی حالت جس قدر ناگفتہ بہ تھی سب کو معلوم ہے۔ عیسائیت کے اس خوفناک انحطاط اور
اس کی انتہائی پستی کو دیکھتے ہوئے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ فرض نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے کسی طرح
اسلام یا فرقہ ہائے اسلامی متاثر ہو سکتے تھے۔ بایں ہمہ مسٹر میکڈانلڈ کا خیال ہے کہ:-

بحیثیت مجموعی اگرچہ یہ مسئلہ مزید تحقیقات کا محتاج ہے لیکن یونانی دینیات نے اسلام پر جو
اثر ڈالا ہے اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ صرف یہ امر کہ دونوں نے ذات و

---

1. B. Macdonald, Muslim Theology لے
فصل سوم، باب اول، صفحہ ۱۳۲-۱۳۱

> صفات الٰہی کے مسئلے پر جس قدر زور دیا ہے اس بات کا بہت کافی ثبوت ہے۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانان مغرب بالخصوص علمائے اسپین کے خیالات میں جو تشدد پایا جاتا ہے وہ فلسفیانہ اور آگسٹائنی اثرات کا نتیجہ ہے۔[1]

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مسٹر میکڈانلڈ نے واقعات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی بلکہ دو چیزوں کی ظاہری اور سطحی مشابہت سے بلا وجہ ایک کو اس کی علت اور دوسری کو اس کا نتیجہ قرار دیا حالانکہ دو چیزوں میں مشابہت کا موجود ہونا اس امر کا ثبوت نہیں کہ ان میں سے کوئی ایک دوسری سے ماخوذ ہے۔ تاریخی حقائق علت و معلول کے اس مفروضہ رشتہ کے اور بھی مخالف ہیں۔ گزشتہ صفحات میں ہم یہ ظاہر کر چکے ہیں کہ جبر و قدر اور دوسری بحثوں کا آغاز کیونکر ہوا۔ باعتبار زمانہ یہ سب بحثیں عہد امویہ سے مقدم تھیں۔ فان کریمر نے لکھا ہے کہ عقیدۂ 'قدر' کی بنا ان دو عیسائی علما نے ڈالی جو دمشق میں رہتے تھے اور شب و روز عربوں سے میل جول رکھتے تھے یعنی یوحنائے دمشقی اور تھیوڈور ابو کارا۔[2] اس امر کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ مسلمانوں میں یہ خیالات مشرقی کلیسا سے بہت پہلے رونما ہو چکے تھے اور معبد جہنی یوحنائے دمشقی کا معاصر تھا لیکن دمشق کی کسی مسیحی جماعت سے ربط و ضبط رکھنے کی بجائے امام حسن بصری کے حلقہ درس میں شریک ہوتا تھا ہم فان کریمر اور مسٹر میکڈانلڈ کے مناہج تحقیق کے ماتحت یہ فرض کر لینے میں کہیں زیادہ حق بجانب ہیں کہ مشرقی کلیسا کے یہ خیالات اسلامی اثرات کا نتیجہ تھے۔ بہرکیف اس امر سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ خوارج اور شیعہ جماعتوں کے ظہور میں کسی مسیحی یا غیر اسلامی اثر کا حصہ نہیں بلکہ یہ آویزش خلافت کے داخلی شئون کا ایک قدرتی نتیجہ تھا۔ لہٰذا اگر شیعی اور خارجی فرقوں کے مقابلہ میں مرجیہ اور قدریہ کا

---

[1] D. B. Macdonald, Muslim Theology
فصل سوم، باب اول، صفحہ ۲۳ - ۱۲۲

[2] فان کریمر، تمدن اسلامی پر ایک نظر۔

ظہور ارض شام میں ہوا تو اس لئے نہیں کہ یوحنائے دمشقی یا تھیوڈور ابوکارا کا قیام دمشق میں رہتا تھا بلکہ اس لئے کہ ارض شام کا یہ قدیم شہر خلفائے امویہ کا مرکز تھا اور ان کے جور و استبداد اور "جبری" رجحانات کے خلاف اگر احتجاج ہو سکتا تھا تو یہیں اور یہیں یہ لوگ خوارج کے اُن سخت اور متشددانہ خیالات کے خلاف جو احساس معصیت سے پیدا ہوئے اپنے انجام کو امید و اطمینان کی نظر سے دیکھتے ہوئے "رجا" پر زور دیکتے تھے۔ لیکن یہ خیال کرنا کہ یہ خیالات صرف دمشق تک محدود تھے غلطی ہوگی ۔ مدینہ منورہ کے بعد اگرچہ دنیائے اسلام کا سیاسی مرکز دمشق ہوا لیکن ملت اسلامیہ کی ذہنی اور علمی مرکزیت کوفہ اور بالخصوص بصرہ کے حصے میں آئی تھی۔ یہیں مسلمانوں کی منفرق جماعتیں ـــ بالخصوص عرب اور ایرانی ـــ اپنی گزشتہ روایات اور باہمی ربط و ضبط کی بدولت مختلف مسائل کی طرف متوجہ ہوئیں اور یہیں سے عقیدہ "قدر" کی رو معبد جہنی کے ساتھ شام میں پہنچی ۔ رفتہ رفتہ مذہب اعتزال نے ایک باقاعدہ فرقہ کی صورت اختیار کی اور آگے چلکر جب مسلمان علما کے ایک طبقے نے فلسفہ و حکمت کے مطالعہ کے بعد اپنے آپ کو "حکما" کے نام سے موسوم کیا تو عقیدہ اور عقل کے باہمی تضاد کو دور کرنے کے لئے علم کلام کی بنیاد پڑی۔ اسکی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مذاہب غیر سے ربط و ضبط کی وجہ سے مسلمانوں نے اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں اسلام پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہوں انکا جواب دینے کی کوشش کی جائے ۔ یہ مختصر کیفیت ہے مذاہب اسلامی کی ابتدا اور ان کے نشو و نما کی معلوم ہوتا ہے خود مسٹر میکڈانلڈ بھی نادانستہ طور پر ان حقائق کو محسوس کر رہے تھے اس لئے کہ اپنے گزشتہ خیالات کے اظہار کے بعد انہیں فوراً اس امر کو تسلیم کرنا پڑا کہ :۔

"مسلمان عیسائی علما کی تحریروں کا مطالعہ نہیں کرتے تھے ۔ دراصل یہ خیالات باہمی ربط و ضبط اور بحث و مباحثہ میں منتقل ہو رہے تھے۔ یوحنائے دمشقی کے رسالے کی ترتیب بھی سے اس امر کا پتہ چلتا ہے جس کی عبارت یوں ہے کہ اگر عرب تم سے یہ کہے تو اس کے جواب میں یہ کہنا ......"[۱]

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں :-

"یونانی فلسفہ ، ارتشتیت ، مالویت ، مراد ان کی قدیم وثنیت ، یہودیت ، عیسائیت یہ سب چیزیں فضا میں موجود تھیں اور اپنا اثر ڈال رہی تھیں"

بالفاظ دیگر یہ سب خیالات اس وقت کے ذہنی اور مذہبی ماحول میں موجود تھے اور طبعاً تھے ... پہلے ہی سے اس امر کی بہت کافی گنجائش ... تھی کہ اگر کوئی جدید مذہبی تحریک پیدا ہو تو وہ از ... ان خیالات کی طرف توجہ کریں۔ لیکن ان خیالات کے ابھرنے کے لئے جو افراد و اقوام کے ... میں ایک غیر شعوری صورت اختیار کر چکے تھے کسی شدید محرک کی ضرورت تھی۔ لہذا جان جی ...

D. B. Macdonald, Muslim Theology (مترجمہ ...) ... سوم ، باب اول ، صفحہ ١٢٣

خوش قسمتی سے میرے پیش نظر کتب خانہ جامعہ کا وہ نسخہ تھا جو زندان بہاولپور میں مولانا محمد علی مرحوم کے ... مطالعہ رہ چکا ہے۔ مولانا کے محترم نے مسٹر میکڈانلڈ کے اس جملے پر یہ نہایت ہی صحیح خیال ظاہر کیا ہے کہ "خیالات ... ہی سے فضا میں موجود تھے ... یوحنائے دمشقی کو غالباً مسلمانوں کی تبلیغی سرگرمیوں کی مخالفت منظور تھی جس کے ... میں مسلمانوں نے ایک اور نظام "مسئولاسطیت" مرتب کیا۔ مولانا کی اصل عبارت یہ ہے :-

The ideas were in the air the commonplaces the times. What John of Damascus did perhaps w... to prepare a defence of the proselytising activit... of the Mussalmans and Mussalmans in s... built up another system of scholastics.

D. B. Macdonald, Muslim Theology ... سوم ، باب اول ، صفحہ ١٢٤ -

مسلمانوں کی داخلی زندگی میں نئے نئے انقلابات رونما ہوئے اسی لحاظ سے یہ تمام افکار منظر عام پر جلوہ گر
ہوتے گئے۔ اس طرح اس ساری بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مذاہب اسلامی کا ظہور اور اُن کی
تشکیل و انضباط کسی مسیحی یا ایرانی اثر کا نتیجہ نہیں تھا۔ نہ اس کے اسباب و علل کے لیے ہمیں کسی
غیر اسلامی سرچشمے کی تلاش کرنی چاہیئے۔ اسلامی دینیات اور اس کے مختلف مذاہب کی بنا ایک
آزادانہ تحریک تھی جو از خود رونما ہوئی کچھ اس غور و فکر کی گفتگو سے جس کا آغاز مدینہ منورہ ہی میں
ہو گیا تھا اور کچھ عرب اور نو مسلم اقوام کے باہمی اختلاط و ارتباط کی وجہ سے جس سے مسلمانوں کے
اندر ایک جدید ذہنی تحریک کا آغاز ہوا۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ اسلامی دینیات اور اس کے مختلف مذاہب
خارجی افکار سے متاثر ہوئے ہیں بلکہ ایک حد تک یہ افکار ان کے محرکات بھی ثابت ہوئے ہیں
لیکن محض اس لیے کہ جس دنیا میں اسلام کا ظہور ہوا تھا اس میں قدیم افکار اور ادارات
موجود تھے۔ جب ان قدیم افکار و ادارات کا تصادم اسلامی تعلیمات سے ہوا تو ان کا ایک حصہ
اسلام میں مل گیا اور باقی یا تو ہمیشہ کے لیے محو ہو گئے یا اپنا دھندلا سا نقش مذاہب اسلامی پر
چھوڑ گئے۔

عینک فروش

ڈاک گاڑی اپنی پوری رفتار سے چل رہی تھی مجھے معمولی سواری گاڑی کی رفتار سے بھی وحشت ہوتی ہے اور ڈاک گاڑی کی تیزی پر تو اختلاج ہونے لگتا ہے اکثر خیال آتا ہے کہ اگر خدانخواستہ میرے سفر کی سمت غلط ہو تو جتنی تیز یہ گاڑی چلے گی اتنا ہی میں منزل مقصود سے دور ہو جاؤں گا۔ پھر سوچتا ہوں کہ یہی صورت زندگی کے سفر کی ہے سست گام راہ رو اگر غلط راہ بھی اختیار کرے تو دن بھر میں منزل سے زیادہ دور نہ ہٹے گا لیکن مسافر جو برق رفتار مرکب پر سوار ہے۔ راہ سے بے راہ ہو جائے تو دم بھر میں خدا جانے کہاں جا پہنچے گا۔ عقل کہتی ہے کہ یہ منطق غلط ہے۔ تیز چلنے والا تیزی سے واپس بھی آسکتا ہے جو شخص قدم گن گن کر رکھتا ہے اسے آدمی دور سے لوٹنا پڑے تو جانے میں جتنی دیر لگی اتنی ہی آنے میں لگے گی۔ کس کی مجال ہے کہ ریاضی کی اس مساوات سے انکار کرے مگر کوئی یہ بتائے کہ پچھلے مہینے جب میں دلی سے لاہور جانا چاہتا تھا اور غلطی سے بمبئی کی ڈاک میں بیٹھ کر جھانسی جا پہنچا، جہاں آٹھ گھنٹے تک واپسی کے لئے پسنجر بھی نہ ملی اس وقت یہ مساوات کہاں چلی گئی تھی۔ اس وقت میں ریاضی سے سر پھوڑتا یا منطق کو کوسا کرتا۔ ریاضی اور منطق کی صحت مسلم مگر زندگی میں انکا استعمال اتنا سہل نہیں جتنا لوگ سمجھتے ہیں ہر تیز چلنے والی ڈاک گاڑی کی رفتار سے ڈر لگتا ہے۔ میرا سر چکراتا ہے طبیعت بے قابو ہو جاتی ہر بات پر غصہ آتا ہے۔ ہر شخص سے لڑنے کو جی چاہتا ہے۔ اس کے لئے منطقی دلیل یا ریاضی کی مساوات کی کوئی ضرورت نہیں۔

میں پہلے درجے کے ایک چھوٹے سے ڈبے میں بیٹھا تھا جس میں آمنے سامنے صرف دو نشستیں تھیں میرے علاوہ تین مسافر اور تھے۔ ان میں سے ایک پہلی نظر میں

موٹے معلوم ہوتے تھے، دوسری نظر میں اس سے بھی زیادہ موٹے اور تیسری نظر میں یہ انکشاف ہوتا تھا کہ گو انکی آنکھیں کھلی ہیں اور منہ بھی کھلا ہے مگر وہ سو رہے ہیں۔ یہ بزرگ میرے سامنے کی پوری بنچ پر پھیلے ہوئے بیٹھے تھے اور جب کبھی میں نظر اٹھاتا تھا مجبوراً انکے چہرے کی زیارت ہوتی تھی۔ مجھے انکے مٹاپے سے اور انکے یوں بے ساختہ سونے سے بڑی کوفت ہوتی تھی اور جب یہ سوتے سوتے جوش میں آکر خراٹے بھی لینے لگتے تھے تب تو بے ساختہ جی چاہتا تھا کہ بقیہ دو مسافروں کی مدد سے انہیں اٹھا کر کھڑکی سے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ دروازے سے باہر پھینک دوں۔

میں بنچ کے ایک سرے پر تھا اور میرے داہنے ہاتھ پر ایک نوجوان بیٹھے تھے جن کے چہرے سے کسی گہرے صدمے کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ انکے لب خشک تھے، چہرے کا رنگ زرد تھا اور آنکھوں کی بے حالی سے دل کی بے چینی ٹپک رہی تھی۔ بنچ کے دوسرے سرے پر ایک پیر مرد نیم دیسی نیم انگریزی وضع کے تشریف فرما تھے جنہیں میں نے اکثر ریل میں سفر کرتے دیکھا تھا۔ انکے ساتھ ایک چمڑے کا ہینڈ بیگ تھا جس پر ان کا نام اور پتہ لکھا ہوا تھا۔ میں نے اس سے پہلے کئی بار اسے پڑھنے کی کوشش کی تھی مگر چونکہ یہ کھٹکا رہتا تھا کہ وہ میرے اس خلاف تہذیب تجسس کو نہ دیکھ لیں اس لئے کبھی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ آج موقع پاکر میں نے اتنا معلوم کر لیا کہ وہ عینک کے ایک مشہور کارخانے کے ایجنٹ ہیں۔ نام دوسری طرف تھا اسے نہ پڑھ سکا۔

میں خود ریل میں باتیں نہیں کرتا اور چاہتا ہوں کہ کوئی نہ کرے۔ اسی لئے حتی الامکان خالی درجے میں بیٹھا کرتا ہوں۔ مگر ڈیوڑھے درجے میں خالی ڈبہ تقدیر ہی سے ملتا ہے۔ آج میرے ساتھ تین مسافر تھے مگر بظاہر ان میں سے کسی سے یہ اندیشہ نہ تھا کہ زیادہ باتیں کریگا۔ سامنے کی بنچ والے خواہ مخواہ مرد آدمی کا شمار تو اس وقت حیوان ناطق کی ذیل میں تھا ہی نہیں۔ رہے وہ دونوں حضرات جو میری بنچ پر تھے ان میں سے نوجوان تو بیچارے

ذن و ملال کی تصویر بنے ہوئے تھے اور پیر مرد عینک فروش کسی کتاب کے مطالعے میں
رق تھے۔ اس سمے میں اطمینان سے بیٹھا گاڑی لڑنے، پل ٹوٹنے، آدمیوں کے گرنے
کچلنے، مرنے کے تصور سے اپنے دل کو دہلانے اور پریشان کرنے کا سامان کر رہا تھا۔

گاڑی . . . . . اسٹیشن پر رکی۔ باہر کی چہل پہل کے اثر سے ہمارے چھوٹے سے
حلقے میں بھی کچھ حرکت پیدا ہوئی۔ ہمارے نوجوان رفیق گھبرا کر اس انداز سے اٹھے
یا یہیں اترنا چاہتے ہیں، مگر جب انھوں نے کھڑکی کے پاس جا کر اسٹیشن کا نام پڑھا
کسی قدر مایوسی کے ساتھ آکر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ موٹے مسافر نے بھی گاڑی ٹھہرتے ہی
نکھ کھولی اور بیٹھے ہی بیٹھے اسٹیشن کی طرف مڑ کر گردن کھڑکی میں سے نکالی۔ انہوں نے اس کوہ
واز سے جو شاید ذبح کے وقت انجن کے گلے سے نکلتی ہو کئی سودے والوں کو بلایا اور
ھوڑی دیر میں ان کی بنچ کے ایک کونے میں مٹھائی پوری، کباب، دہی بڑے، ککڑی
ردہ الم غلم کا ایک ڈھیر لگ گیا۔ میں سمجھا کہ شاید انہیں کئی دن تک مسلسل سفر کرنا ہے
ساتے انہوں نے یہ ذخیرہ جمع کر لیا ہو لیکن جب انہوں نے نیت باندھ کر کھانا شروع کیا تو میرے
یکھتے دیکھتے چند منٹ میں وہ سارا سامان رسد ان کے صندوق شکم میں جا کر غائب ہو گیا۔ کھانے
ے فارغ ہو کر انہوں نے ایک بڑا سا لوٹا اٹھایا اور منہ سے لگا کر ایک سانس میں خالی کر دیا
آستین سے منہ پونچھا، ڈکار لی، گاڑی کی دیوار کے سہارے سے پھیل کر بیٹھ گئے۔
میں بند کر لیں اور چشم زدن میں جہاں سے آئے تھے وہیں پہنچ گئے۔

میں اس روح فرسا نظارے کو دیکھ کر دل میں کڑھ رہا تھا کہ گاڑی چلی اور پیر مرد
جو اب تک برابر مطالعے میں مصروف تھے دفعتہً کتاب بند کر دی اور نوجوان مسافر کی
ف مخاطب ہو کر کہنے لگے "آپ کہاں تشریف لیجا رہے ہیں" یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ
ے یہ بات بیحد ناگوار ہوئی۔ مغربی تہذیب میں اگر مجھے کوئی اصول پسند ہے تو یہ کہ جس شخص
ہ تعارف نہ ہوا اس سے بے ضرورت گفتگو کرنا جائز نہیں۔ میرا جی چاہا کہ ان سے پوچھوں

آپ کو ایک اجنبی سے اس طرح سوال کرنے کا کیا حق ہے مگر خیال ہوا کہیں وہ یہ نہ کہہ بیٹھیں کہ تمہیں دخل در معقولات کا کیا حق ہے اس لئے میں خاموش ہو رہا لیکن دل میں دعا مانگتا تھا کہ وہ نوجوان پیرمرد   کی اس جسارت پر ناپسندیدگی کا اظہار کریں۔ مگر نوجوان نے ڈوبی ہوئی آواز میں صرف اتنا کہا "کیا عرض کروں کہاں جا رہا ہوں" اب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ گفتگو کا سلسلہ چلا اور دیر تک چلا۔ غصہ تو مجھے ضرور آیا مگر اسی کے ساتھ یہ اشتیاق بھی تھا کہ نوجوان کی اس شکستہ دلی اور مایوسی کی وجہ معلوم ہو بظاہر تو میں منہ پھیر کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا مگر کان ان دونوں کی گفتگو پر لگے تھے۔

"آپ بہت اداس معلوم ہوتے ہیں"

"جی ہاں کچھ ایسی ہی پریشانیاں ہیں"

"آخر معلوم تو ہو وہ کونسی ایسی بات ہے جس نے آپ کو شگفتگی کے موسم میں پژمردہ کر دیا ہے۔ میری اس بے تکلفی کو معاف کیجئے میں بے فائدہ دوسروں کے حالات کا تجسس نہیں کرتا۔ آپ سے یہ سوال اس لئے پوچھتا ہوں کہ شائد آپ کی کچھ مدد کر سکوں"

"میں آپ کی اس بزرگانہ شفقت کا شکر گزار ہوں مگر میری مدد دنیا میں کوئی نہیں کر سکتا"

"آپ کیوں میرا حوصلہ پست کرتے ہیں اپنی سی کوشش تو کرنے دیجئے"

"جب آپ کی کوشش ناکام ہوگی تو حوصلہ اور زیادہ پست ہوگا"

"نہیں ایسا نہیں۔ راہ سعی میں پیروں کا تھک جانا اس سے اچھا ہے کہ آرزوئے سعی میں دل ڈوب جائے"

"شاید ہو مگر میرا تجربہ اس کے خلاف ہے میں تو اسی سعی ناکام کا کشتہ ہوں۔ اب سعی، کوشش، عمل کے نام سے کانپتا ہوں۔ آپ نے دریافت کیا تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ میں وہاں جاتا ہوں جہاں انسان دنیا کے فساد و شر سے ایمن زندگی کی

کشمکش سے محفوظ امن و عافیت سے دن گزار سکتا ہے، جہاں نہ اسے اپنے بھائیوں کی غفلت، جہالت، پستی ہمت کے منظر آنکھوں سے دیکھنا پڑیں گے اور نہ انکی ناچاقی و ناشکر گذاری، احسان فراموشی، کینہ پروری کے زخم سینے پر کھانا پڑیں گے، جہاں نہ وہ اپنی قوم کے تنزل کے احساس سے تڑپے گا اور نہ اسکی اصلاح کی کوشش کرکے پچھتائے گا۔ میں آبادی سے دور پہاڑوں پر جا رہا ہوں کہ وحدت کی سو میاں سے ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑوں خلوت کے دامن میں بکھری ہوئی طبیعت کو سمیٹوں، باہر کی دنیا سے آنکھ بند کرلوں اور اندر کی دنیا کو آنکھ کھول کر دیکھوں"

"مگر یہ تو معلوم ہو کہ ہماری دنیا نے آپ کا کیا بگاڑا ہے جو آپ اس سے اس قدر بیزار ہیں؟"

"سنئے صاحب میرے لئے دنیا ہندوستان ہے اور یہی ہو سکتا تھا یہی وہ زمین ہے جس میں میری زندگی کی جڑیں پھیلی ہوئی ہیں اور یہیں میرا شجر حیات پنپ سکتا تھا اب آپ یہ پوچھئے کہ ہندوستان نے میرا کیا بگاڑا ہے۔ اس کا میں جواب دیتا ہوں مگر میرا دل یہ کہانی کہتے دکھتا ہے اور آپ کا دل اسے سن کر دُکھے گا۔ آہ اس بدنصیب ملک نے مجھ سے وہ دولت چھین لی جو زندگی کا سہارا ہے یعنی عقیدہ اور امید اور مجھے وہ چیز دیدی جو موت کا پیام ہے یعنی انکار اور مایوسی۔ جب میں نے اپنے آپ کو دل و جان سے اس کی خدمت کے لئے وقف کیا تھا۔ اس وقت میرا سینہ عقیدے کے نور سے معمور تھا اور میرا دل امید کے ولولے سے لبریز۔ مجھے یقین تھا کہ ہندوستان والوں میں ایمان ہے، خلوص ہے درد ہے، قابلیت ہے ذہانت ہے، جفاکشی ہے، صبر ہے، استقلال ہے، صرف ہمت، عزم اور جوش کی کمی ہے مجھے امید تھی کہ یہ چیزیں ذرا سی کوشش سے پیدا ہو جائیں گی جس طرح مستوں کے لئے ایک الاپ، دیوانوں کے لئے ایک ہو شعلہ ندا کے لئے ایک اشارہ کافی ہے اسی طرح ہندوستانیوں کے لئے صرف ایک ترانہ امید ایک

نعرۂ مستانہ چاہئے ۔ یہ آواز کانوں میں پہنچتے ہی وہ اُٹھ کھڑے ہوں گے غلامی کا طوق اُتار کر پھینک دیں گے جہالت کی بیڑیاں توڑ کر رکھ دیں گے ۔ اور پھر ہندوستان میں ایک عظیم الشان تمدن کی بنیاد پڑے گی جو ساری دنیا کے لئے باعث حیرت اور قابل تقلید ہوگا ۔ یہ تھا میرا عقیدہ، یہ تھی میری امید "

" مگر افسوس کیا سمجھا تھا اور کیا نکلا ، تصور اور واقعے میں اتنی نسبت بھی تو نہ تھی جتنی چیزیں اور اس کے سائے میں ہوتی ہے ۔ میں اور مجھ جیسے دوسرے تکلیفیں اٹھا اٹھا کر یا جھیل کر سارے ملک میں پھرے کہ سوتوں کو جگائیں رہ نوردوں کو رہنماؤں کا پیام پہنچائیں کچھ سونے والے اٹھے کچھ مسافروں نے آگے قدم بڑھایا ۔ ہمارا دل خوش ہوا ، ہماری ہمت بڑھ گئی ۔ مگر یہ اطمینان عارضی تھا کیونکہ راہ کی دشواریوں نے چلنے والوں کے چھکے چھڑا دیئے اور اس پر ستم یہ ہوا کہ کچھ رہنما راہزن نکلے اور کچھ راہ سے نابلد ۔ ان میں سے بعض اپنے پیروؤں کو لوٹ کر چل دیئے اور بعض ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے اور اس پر جھگڑنے لگے کہ دائیں کو مڑیں یا بائیں کو آگے بڑھیں یا پیچھے ہٹیں ۔ یہ نتیجہ ہوا سالہا سال کی کوشش کا، یہ پھل ملا مدتوں کی ریاضت کا ۔ میرا تو یہ دیکھ کر جی چھوٹ گیا ہاتھ پیر شل ہو گئے زبان بند ہو گئی افسردگی دل و دماغ پر مسلط ہو گئی یاس رگ و پے میں سرایت کر گئی ۔ میں نے سمجھ لیا کہ یہ ہندوستان ہمیشہ غفلت کی نیند سوتا رہے گا ۔ غلامی کی ذلت اٹھاتا رہے گا ۔ مجھ میں یہ جانکاہ نظارہ دیکھنے کی تاب نہیں اس لئے میں آبادی سے منہ موڑ کر کوہ و بیابان کیطرف جا رہا ہوں تاکہ کم سے کم اپنی روح کو اس ذلت اور پستی سے بچاؤں اور تزکیۂ نفس وتصفیۂ قلب کے ذریعے سے معرفت اور نجات حاصل کر لوں "

مجھے خوشی تھی کہ نوجوان کی آنکھوں سے فریب ہستی کا پردہ اُٹھ گیا ہے لیکن یہ افسوس تھا کہ اس پر بجائے طیش کے یاس کا غلبہ ہو گیا ہے ۔ میں تو اسے یہ رائے دیتا کہ دنیا سے پیچھا چھڑانے کی جگہ دنیا کے پیچھے پڑ جائے ، سست قدم رہ نوردوں کو ملامت کرے اور جھوٹے رہنماؤں کا

کی تلقین کرے۔ بہرحال میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ پیر مرد پر اس گفتگو کا کیا اثر ہوا اس لئے میں نے ذرا سا مڑ کر کنکھیوں سے اُن کے چہرے کو دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ ایک لمحے تک مجھ ہمدردی کے، افسوس کے، دُکھ کے آثار نظر آئے۔ مگر فوراً ہی یہ کیفیت جاتی رہی اور وہی سکون و اطمینان اور خفیف سا تبسم جو پہلے تھا پھر نظر آنے لگا۔ انہوں نے نوجوان سے مخاطب ہو کر کہا :۔

"میں نے آپ کی داستان بہت غور سے سنی اور میرے دل پر اس کا بڑا گہرا اثر ہوا مگر ایک بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ جب آپ کا جذبہ محبت سچا تھا تو آپ نے انجام کی فکر کیوں کی۔ پروانہ جس کی فطرت میں جلنا ہے کامیابی اور ناکامی سے غرض نہیں رکھتا شمع جس کی سرشت میں گھلنا ہو یاس اور امید کی پابند نہیں ہوتی۔ مستی میں یہ ہشیاری کیسی؟ دیوانگی میں یہ تدبر کیوں؟ آپ کی طرف سے سعی اور خدا کی طرف سے اتمام۔ آپ نے اپنا کام کرتے کرتے خدا کے کام کی فکر اپنے سر کیوں لے لی"

"جناب انسان کو جس نے عشق دیا ہے اُسی نے عقل بھی دی ہے اور تدبر و تعقل تفکر کی تاکید بھی کی ہے۔ انسان نہ پروانہ ہے کہ حسن سوزندہ کی ایک جھلک دیکھ کر دیوانہ وار جل مرے اور نہ شمع کہ عشق سوزاں کی ایک ادا پر گھل گھل کر مرمٹے۔ اُس کی مستی ہوشیاری کے سہارے چلتی ہے اُس کی دیوانگی دانائی کے پروں پر اڑتی ہے۔ عشق انسان کے دل میں شوق منزل پیدا کرتا ہے، اور ذوق سفر۔ عقل اُسے راہ سجھاتی ہے، اور اس کے لئے زادراہ فراہم کرتی ہے۔ میرا جذبۂ محبت تو خیر جیسا کچھ ہے میں جانتا ہوں لیکن میری عقل یہ کہتی ہے کہ ملک و قوم کے پنپنے کی کوئی امید نہیں تو اپنی روح کو بچاؤ اور اس کی بالیدگی کا سامان کرو"

"الحمد للہ کہ آپ عقل کے قائل ہیں اور اُسے عشق کا دست و بازو سمجھتے ہیں ورنہ ہمارے اہل حال کے یہاں تو عقل بیچاری راندۂ درگاہ ہے اس لئے کردہ عشق کی ضد

کی باقی ہے۔ آپ نے جو کچھ ابھی فرمایا اس کے سبب سے گفتگو میں بڑی آسانی ہو گئی۔ عقل کا قدم درمیان رہے تو باہمی مفاہمت ممکن ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ آپ کی شکایت زندگی سے مایوسی اور گوشۂ خلوت کی طلب عقل پر مبنی ہے یا محض جذبات کے رد عمل کا نتیجہ ہے۔ پہلے اس بات کو لیجئے۔ آپ کی باتوں سے یہ معلوم ہوا کہ آپ کو مایوسی خدا سے نظامِ عالم اور قانونِ زندگی سے نہیں بلکہ انسانوں سے ہے، اپنے ملک کے انسانوں سے آپ کو یہ بدگمانی نہیں کہ دنیا میں سعی اور عمل، خلوص اور ایثار، پامردی اور استقلال کا پھل نہیں ملتا بلکہ یہ گمان ہے کہ آپ کی قوم ان چیزوں سے محروم ہے۔ آپ کے دل میں یہ وسوسہ نہیں کہ رحمتِ ایزدی مستحقوں کو نہیں پہچانتی یا جان بوجھ کر ان سے روگردانی کرتی ہے بلکہ یہ خدشہ ہے کہ آپ کے بھائی اس رحمت کے مستحق نہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ اس اتھاہ مایوسی سے بچے ہوئے ہیں جو روح کے لئے دائمی موت ہے۔ مگر یہ دوسری قسم کی مایوسی یعنی اپنے ملک اور اپنی قوم کی طرف سے ناامیدی جو آپ کے سر پر مسلط رہتی ہے یہ بھی کچھ کم مہلک نہیں اگر سچی ہو۔ مگر مجھے یقین ہے کہ یہ سچی اور پائدار مایوسی نہیں بلکہ ایک عارضی افسردگی ہے جو جوش کی حد سے بڑھ جانے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ اگر آپ تاریخِ عالم کا مطالعہ کریں تو معلوم ہو کہ قوموں کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کا اندازہ ہفتوں اور برسوں سے نہیں قرنوں اور صدیوں سے کیا جاتا ہے۔ ہندوستان بلکہ ایشیا کی پچھلی نصف صدی کی تاریخ آپ کو یہ بتائے گی کہ اکثر قوموں میں خصوصاً مسلمانوں میں ایک عام بیداری پیدا ہوئی ہے۔ دنیا کے اہلِ الرائے اس پر متفق ہیں کہ یہ لوگ خوابِ غفلت سے چونک اٹھے ہیں۔ ان کی رگوں میں زندگی کا خون جو اب تک منجمد تھا پھر گردش کر رہا ہے۔ انہوں نے راہِ عمل پر چلنا بلکہ دوڑنا شروع کر دیا ہے۔ ٹھوکریں کھاتے ہیں گر پڑتے ہیں پھر سنبھل جاتے ہیں تھک کر بیٹھتے ہیں مگر پھر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

کوئی اس کا دعوےٰ نہیں کر سکتا کہ اسے انجام کا یقینی علم ہے جس سے

لامات پر حکم لگا تا ہے اور علامات سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ترقی کی لہر جو اٹھی ہے یہ اب
کنے والی نہیں۔ یہ لوگ جو اس راہ پر گامزن ہیں بہت بھٹکیں گے بہت نشیب و فراز دیکھیں
ے مگر کسی نہ کسی دن منزل پر ضرور پہنچیں گے مسلسل کوشش کبھی رائگاں نہیں جاتی زندگی
ا یہ قانون ہے، دنیا کا یہ دستور ہے خدا کا یہ وعدہ ہے۔

آپ جس تحریک کی ناکامیابی کو رو رہے ہیں وہ ایک بڑے سلسلے کی کڑی تھی اس کا
نا کمزور تھا جب زندگی کے جھٹکے پڑے تو ٹوٹ گئی۔ اس پر فریاد کرنا نادانی ہے اور اس
سلسلے کو ناتمام چھوڑنا بزدلی ہے۔ لوہے کو کچھ دن آگ میں تپنے اور ہتوڑے کی چوٹ کھانے
یجئے کہ وہ فولاد بن جائے پھر کڑی میں کڑی پڑتی جائے گی سلسلہ بڑھتا چلا جائے گا اور
ڑنے والوں کے چھکے چھوٹ جائیں گے۔"

"خدا آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ تو اس وقت میرے حق میں مسیحا ہو گئے۔ آپکی
ں کا جو اثر دل پر ہوا ہے اس کا پورا اندازہ تو بعد میں ہوگا مگر اس وقت معلوم ہوتا ہے
ے تیز بخار مدت کے بعد اترا ہو۔ مایوسی کی کیفیت میرے دل سے تقریباً بالکل جاتی رہی
امید کا ایک ہلکا سا رنگ چھا گیا۔ مگر یہ تو فرمائیے کہ میں اب کیا کروں؟ جو قصد کر چکا ہوں
ے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا مگر یہ خیال ہوتا ہے کہ صحرا نوردی کی ایک مدت معین کروں
اسے پورا کر کے واپس آؤں۔ آپ فرماتے ہیں کہ لوہے کو فولاد بنانا چاہئے لیکن لوہا
نگ آلودہ ہو تو اس پر صیقل کرنے کی ضرورت ہے اور اس کی صورت یہی نظر آتی ہے کہ
ان کچھ دن تنہائی میں ریاضت کرے۔ دنیا کی آلائشوں میں رہ کر تو یہ کثافت دور
ں ہوتی۔"

"آپ کا یہ حسن ظن جو میرے حق میں اور خود اپنے حق میں ہے صحیح نہیں۔ آپ کا
گر اثر ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ خود آپ کی طبیعت میں مرض کو دفع کرنے کی قوت
و تھی اور ایک ذرا سا سہارا ڈھونڈھتی تھی۔ آپ کی مایوسی اگر دور ہوئی ہے تو اس

کی وجہ یہ ہے کہ اس کے پیچھے سیکڑوں برس کی ریاضت تھی اور ایک لمبی سی چوٹ کی منتظر تھی۔ میں نے طبیب کا کام نہیں کیا بلکہ ایک معمولی تیمار دار تھا۔ اب رہا آپ کا یہ خیال کہ آپ تنہائی کی زندگی میں محض اپنی قوت سے تزکیۂ نفس کی منزلیں طے کر لیں گے یہ بہت بڑا دھوکہ ہے۔ جس منزل کو آپ ابتدائی منزل سمجھتے ہیں یہ آخری منزل ہے، خلوت کے سکون کا انعام اسی کو ملتا ہے جو جلوت کے امتحان میں پورا اتر چکا ہو۔ لوہے کا زنگ وہی زندگی کی آگ دور کر سکتی ہے جو اسے فولاد بناتی ہے۔ اس کے بعد کہیں وہ وقت آتا ہے کہ فولاد جلا پاتے پاتے شیشہ بنے۔ جو خام کار ابتدا میں تنہائی اختیار کرتے ہیں ان کے دل کا زنگ دور نہیں ہوتا بلکہ ہوائے نفس سے اور گہرا ہوتا جاتا ہے۔ وہ ادنیٰ خواہشات و جذبات کی مستی کو نشۂ معرفت، غرور نفسانی کو تسکین روحانی خودی کو خدا سمجھنے لگتے ہیں خدا تک پہنچنے کا کوئی چھوٹا سا راستہ نہیں۔ ہر سالک کو زندگی اور دنیا کی سنگلاخ راہوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ بیشک اس راہ میں راہزن بھی ہیں مگر اسی کے ساتھ راہنما بھی ہیں ہر انسان اپنا اور دوسروں کا راہزن ہو سکتا ہے مگر راہنما بھی ہو سکتا ہے۔ یہی خیر و شر کا امکان زندگی ہے۔ یہی دنیا ہے۔ کمزور طبع اس دوگدے سے کانپتے ہیں مگر مضبوط دل اسی میں یکسوئی و ہوشمندی نکالتے ہیں۔ آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ آپ کو کیا کرنا چاہئے میں مفصل جواب دیتا مگر وقت کم ہے۔ یہ اسٹیشن جو آنے والا ہے اسی پر مجھے اترنا ہے۔ وہ دیکھئے سگنل گذر گیا۔ اب صرف چند منٹ باقی ہیں اس لئے میں آپ کے سوال کے جواب میں ایک شاعر کے چند شعر پڑھتا ہوں جس نے زندگی کے راز کو سمجھا بھی اور اپنی زبان میں سمجھا بھی دیا۔ سنئے۔

کاٹتے دن زندگی کے [illegible] کی طرح ‏— جو صدا رہتے ہیں چوکس پاسبانوں کی طرح
سختی سے کتنا کرتے ہیں محنت سے کنارہ نہیں ‏— جھیلتے ہیں سختیوں کو سخت جانوں کی طرح
رحم و ملامت پر ہیں کرتے عشق کو غفلت کا ‏— نفس پر رکھتے ہیں کوڑا حکمرانوں کی طرح

شادمانی میں گزر سکے اپنے آپ سے تہیں
غم میں ہنستے ہیں شگفتہ شادمانوں کی طرح

رکھتے ہیں تسکیں جوانی میں بڑھاپے کے سوا
ہنستے ہیں جو نہال پیری میں جوانوں کی طرح

پاتے ہیں اپنوں میں غیروں سے سوا بیگانگی
پر ملا سکتے ہیں اک کا یگانوں کی طرح

آس کھیتی کے پنپنے کی انہیں ہو یا نہ ہو
ہیں لگے پانی دیئے جاتے کسانوں کی طرح

کام سے کام اپنا ان کو گو ہو عالم نکتہ چیں
سہتے ہیں تہمیں اُستادوں میں دانوں کی طرح

طعن شن شن احمقوں کے سنتے ہیں دیوانہ وار
دن بسر کرتے ہیں دیوانوں میں سیانوں کی طرح

لیجئے وہ اسٹیشن آ گیا۔ اب میں جاتا ہوں خدا حافظ۔ میں آپ سے یہ نہیں پوچھتا کہ آپ نے اپنا قصد بدلا یا نہیں کیونکہ جب میں نے آپ کو خدا کی حفاظت میں دے دیا تو مجھ کو کیا ضرورت کیا اور میں پوچھنے والا کون۔ آیئے مصافحہ کر لیجئے۔ خدا حافظ۔

یہ کہہ کر پیر مرد نے اپنا ہینڈ بیگ سنبھالا اور گاڑی سے اُتر کر چل دیئے۔ مجھے بھی اس اسٹیشن پر اتر کر گاڑی بدلنا تھا۔ میری گاڑی سامنے کھڑی تھی مگر صرف پلیٹ فارم درمیان میں تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ذرا ٹھہر کر کسی طرح یہ معلوم کر لوں کہ نوجوان کا ارادہ کیا ہے مگر اتنے میں میری گاڑی نے سیٹی دی اور میں مجبوراً اترا اور دوڑ کر بڑھا اسی میں ایک دوسرے درجے کے ڈبے میں گھس گیا۔ چلتے چلتے میں نے دیکھا کہ نوجوان سر جھکائے گہری فکر میں ڈوبے بیٹھے ہیں اور دوسرے مسافر کھڑکی سے سر نکالے بیٹھے لکھن شہزادی میں چلنے والے کو پکار رہے ہیں۔

نمودِ سحر

از مولوی سید ابو محمد ثاقب صاحب کانپوری

اے نمودِ صبح اے رنگینیٔ دورِ حیات
تیری لطف انگیزیوں میں غرق ہے یہ کائنات

تو نے آکر بھر دیا پھولوں میں حسنِ تازگی
تو نے ہر غنچے میں اک روحِ تبسم پھونک دی

تو نے ہر ذرے کو رشکِ مہرِ تاباں کر دیا
یعنی حسنِ شاہدِ فطرت کو عریاں کر دیا

منتشر ہے سارے عالم میں ہوائے مشکبار
صرف گلشن ہی نہیں آئینہ ہے ہر کوہسار

اے نمودِ صبح تجھ سے ہے بہارِ کائنات
حسنِ فطرت کو ہے تیری وجہ سے حاصل ثبات

وہ ستاروں کا تبسم اور وہ حسنِ انتشار
وہ نسیمِ صبح کا تھم تھم کے چلنا بار بار

وہ طیورِ صبح خواں کی زمزمہ پردازیاں
سبزۂ خوابیدہ کی وہ بار بار انگڑائیاں

چاندنی میں جھومنا سبزے کا وہ مستانہ وار
کیف پرور کس قدر ہیں یہ اداہائے بہار

وہ ہوائے سرد، وہ جنگل، وہ رنگینی تری
کوہساروں کی ہوا ہے برف میں ڈوبی ہوئی

ڈوبتے تاروں کا چشموں میں وہ دلکش انعکاس
گویا مخمل پر ستارے جڑ دئے ہیں پاس پاس

آسماں کو صبح کی سرخی نے رنگیں کر دیا
یا طلا ہو گئی ہے دہر کی ساری فضا

وہ ترنم ریز نغمے وہ وفورِ بےخودی
اور وہ طاری ہر اک دل پر سرورِ بےخودی

اک ترانہ بن گئی ہے باغ کی ساری فضا
طائروں کی نغمہ پیرائی ہے کیسی دلربا

شذرات

محمد عنایت اللہ صاحب کا چندہ بابت ممبری اردو اکادمی وصول ہوا ہے۔ مگر ان کا پتہ دفتر سے گم ہوگیا ہے۔ وہ براہ مہربانی اپنے پتے سے دفتر کو جلد اطلاع دیں تاکہ رسالہ بنام اُنکے نام جاری کردیا جائے اور جو کتاب تیار ہونیوالی ہے وہ تیاری کے بعد بھیجی جائے۔

یہ جولائی کا نمبر ستمبر کے پہلے ہفتہ میں قارئین کرام کی خدمت میں پہنچ جائے گا۔ اگست کا نمبر بھی انشاء اللہ ستمبر کی ابتدائی تاریخوں میں چھپ جائے گا۔

اردو اکادمی نے منجملہ اور کاموں کے ایک یہ کام بھی اپنے ذمے لیا ہے کہ یورپ اور امریکہ کے مستشرقین نے جو کتابیں اسلامی علوم اور اسلامی تمدن کے متعلق لکھی ہیں ان میں سے منتخب کتابوں کے ترجمے اردو زبان میں شائع کرے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک کتاب "عربوں کا تمدن" شائع ہوچکی ہے اور دوسری "سیرۃ نبوی اور مستشرقین" عنقریب شائع ہونیوالی ہے۔ بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ ان کتابوں کا ترجمہ اردو میں شائع کرنا مفید نہیں کیونکہ انکو پڑھ کر ہندوستان کے مسلمان مذہب اسلام اور تاریخ اسلام کو یوروپ والوں کی نظر سے دیکھنے لگیں گے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جس مصلحت کی بنا پر اردو اکادمی نے یہ کام شروع کیا ہے اُسکی تشریح کردیجائے تاکہ اکادمی کے ارکان کو اس مسئلے پر رائے قائم کرنے میں آسانی ہو۔

پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ آج کل مستشرقین کا عام رویہ اسلامی تمدن کیطرف سے

کیا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ یورپ میں اسلام پر کتابیں لکھنے والے کلیسا کے آلۂ کار تھے انکا مقصد یہ تھا کہ جس طرح ممکن ہو اسلام کو بدنام کریں چاہے اس میں ہزاروں سے بنیاد افسانے گھڑنا پڑیں اور سچائی کا خون ہو جائے۔ مگر اب رنگ بدل گیا ہے۔ اب مستشرقین کے گروہ پر کلیسا کا مطلق اثر نہیں بلکہ مذہب کا بھی کم ہے۔ اب انکا مقصد عموماً یہ ہوتا ہے کہ حتی الامکان مسلمانوں کے قدیم اور جدید تمدن کی سچی تصویر پیش کریں۔ ان کی تصنیف وتالیف کی محرک ہمیشہ یہی علمی تحقیق کی لگن نہیں ہوتی بلکہ کبھی کبھی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اپنی قوم کے لوگوں کو اسلام اور مسلمانوں سے واقف ہونے کا موقع دیں تاکہ اسے مسلمانوں سے معاملت کرنے میں، ان پر سیاسی غلبہ پانے اور ان سے تجارتی فوائد بٹورنے میں آسانی ہو۔ بہرحال خواہ ان کا مقصد تحقیق علمی ہو یا افادی دونوں صورتوں میں وہ بڑی محنت اور کاوش سے سچے حالات معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مگر یہ لوگ بھی انسان ہیں اور دور دراز ملکوں، غیر زبانوں اور اجنبی قوموں سے پوری واقفیت حاصل کرنا انکے لئے مشکل ہے اس لئے یہ اپنی تصانیف میں غلطیاں بھی کرتے ہیں خصوصاً مذہب اسلام کی اصل روح کو سمجھنے میں بڑی ٹھوکریں کھاتے ہیں کیونکہ عام طور پر ان میں خود اپنے مذہب کی روح بھی نہیں ہوتی بلکہ سرے سے مذہبیت کے متعلق انکے تصورات بہت ناقص ہوتے ہیں تاہم یہ لوگ عموماً بہت قابل ہوتے ہیں اور بہ سعی عرقریزی کر کے کتابیں لکھتے ہیں اس لئے ان کتابوں سے وہ طالبان علم جو ان غلطیوں سے دھوکا نہ کھائیں، بڑے فوائد حاصل کرسکتے ہیں۔

اردو اکادمی چاہتی ہے کہ اُردو داں طبقے کے ہاتھوں میں انکی کتابوں کے ترجمے پہنچائے۔ انگریزی داں طبقہ انکی کتابیں مدت سے پڑھتا ہے لیکن چونکہ اس کے اکثر افراد

اسلامی علوم کے اصلی ماخذوں سے بالکل بیگانہ ہوتے ہیں، انہیں ان کتابوں پر آنکھ بند کرکے ایمان لے آتے ہیں۔ مگر اردو داں طبقہ میں وہ علماء بھی موجود ہیں جو اسلامیات پر عبور رکھتے ہیں اور ان کتابوں کو تنقید کے معیار پر پرکھ کر انکے حسن و قبح سے پڑھنے والوں کو آگاہ کرسکتے ہیں تاکہ وہ ان سے مفید معلومات حاصل کریں اور انکے غلط نتائج کو قطع نظر کرلیں۔

اس کا اہتمام کیا گیا ہے کہ جو کھلی ہوئی غلطیاں ان کتابوں میں ہوں انکی ترجمہ کرنے والے خود تصحیح کردیں لیکن پورا حق تنقید ادا کرنا ماہرین فن کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے۔ ان کی تنقیدوں کو شائع کرنے کے لئے رسالہ جامعہ حاضر ہے اور ان میں سے وہ تحقیقات اور ایرادات جو وقیع اور اہم ہوں کتابوں کے دوسرے ایڈیشن میں شامل کئے جاسکتے ہیں بلکہ یورپ کی زبانوں میں ترجمہ کرکے مصنفوں کو یا ان کتابوں کے شائع کرنے والوں کو بھیجے جاسکتے ہیں۔

مگر عربوں کے تمدن پر جو تنقیدیں شائع ہوئی ہیں ان میں سوائے رسالہ معارف کی تنقید کے اور کسی سے اکادمی کو کوئی مدد نہیں ملی۔ اس میں بعض ایرادات قابل تسلیم تھے اور ماننے کے لئے اکادمی تنقید نگار کی شکر گزار ہے۔ مگر افسوس ہے کہ انداز تحریر میں ناگوار مناظرہ کا رنگ (مناظرہ صرف مصنف ہی نہیں بلکہ مترجم سے بھی) آگیا تھا اور مترجم نے اس کا جو جواب رسالہ جامعہ میں شائع کیا اس میں بھی یہ رنگ غالب تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ جواب اکادمی کی طرف سے نہ تھا جامعہ میں یہ اسی حیثیت سے شائع ہوا جیسے کسی اور رسالہ میں شائع ہوتا۔ جناب مدیر معارف اسے معارف میں شائع کرنا چاہتے تھے مگر افسوس ہے کہ ان کا پیام جب پہنچا تو یہ مضمون چھپ چکا تھا۔ ”ج“ میں بھی اس مضمون پر ایک نوٹ لکھا گیا ہے

اور آئندہ نمبروں میں کتاب پر مفصل تنقید لکھنے کا وعدہ کیا ہے۔ جناب مدیر سچ کے نزدیک معارف کی تنقید ضرورت سے زیادہ نرم ہے کیونکہ اس میں ہذیان سرائی کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا ہے اور "جامعہ ملیہ اسلامیہ" اور "تحقیق" کو دادین کے اندر نہیں لکھا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ جناب مدیر "جامعہ ملیہ" کے متعلق جو کچھ لکھتے ہیں اسمیں نہ تو عالمانہ تنقید کا رنگ ہوتا ہے نہ دوستانہ نصیحت کا، نہ مرشدانہ ہدایت کا بلکہ مخالفانہ طنز کا۔ حالانکہ یہ اصلاح کا کوئی مفید طریقہ نہیں نصیحت کا اثر جب ہوتا ہے کہ وہ خلوص سے کیجائے اور چاہے تلخ ہو مگر ترش نہ ہو۔ طنزیہ کلمے لوگوں کے دلوں میں ایک طرح کی ضد پیدا کرتے ہیں۔ جناب مدیر سچ بیکار دوسروں کو اس امتحان میں ڈالتے ہیں جس میں وہ خود کبھی پورے نہیں اترے۔

فہرست مضامین رسالہ "جامعہ" بابتہ جلد ۱۲

از جنوری تا جون ۱۹۲۹ء

ادب

افسانہ

ڈراما

اجتماعیات

شذرات۔

مضمون نگاران "جامعہ" بابتہ جلد ۱۲ از جنوری تا جون ۱۹۲۹ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی

جلد ۱۳	بابتہ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۲۹ء	نمبر ۴

فہرست مضامین

شمالی و وسطی کی حکومتیں

عہد نبوی سے پیشتر

سنہ [illegible] میں قاہرہ کی سرکاری یونیورسٹی میں مشہور اطالوی مستشرق گویدی ([illegible]) نے عرب قبل اسلام پر چار بیش بہا لکچر دئے تھے جو سنہ [illegible] میں فرانسیسی زبان میں ایک کتاب کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں ([illegible]arabie Antéislamique)

ہم جامعہ ملیہ کی اردو اکادمی کے لئے ان لکچروں کا ترجمہ کر رہے ہیں جو انشاء اللہ عنقریب مکمل ہو جائے گا۔ فی الحال ناظرین "جامعہ" کی خدمت میں اُس کتاب کے باب اول کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ امید ہے کہ بنظر پسندیدگی و دلچسپی دیکھا جائیگا۔

(سید حسن برنی)

جب اہل عرب کا تذکرہ ہوتا ہے، تو ہمارا خیال خود بخود بانی اسلام، عہد خلافت کی ابتدائی فتوحات، اور خود خلافت کی طرف جاتا ہے، جو اہل مشرق و اہل مغرب دونوں کے نزدیک عروج و شوکت کا ایک خواب پیش کرتے ہیں۔ ہم عرب قبل اسلام کو بآسانی فراموش کر جاتے ہیں، اور یہ ہماری غلطی ہے۔ جنوبی عرب کے تمدن کا جس کا زمانہ کتبات کے رو سے مسیح سے آٹھ سو برس پہلے تک پہنچتا ہے، ذکر چھوڑ کر، وہ حکومتیں جو صحرا کے کناروں پر قائم ہوئی تھیں، اور شمال و مشرق اور جزیرہ نمائے عرب کے وسط میں واقع تھیں، اور جہاں عرب کی قوم کو استقلال و نشو و نما حاصل ہوا، اسلام کی شاندار تاریخ میں حقیر تصور کئے جانے کے لائق نہیں ہیں۔ سپٹی میوس اودیناتو [illegible] (Odenathus) جس نے سنہ [illegible] میں شاپور اول کو مغلوب کیا تھا، اور جو کہ شہنشاہ [illegible] کا شریک سلطنت تھا، ... اگر [illegible] کے قیاصرہ میں شمار ہوتا اور کسی نہ کسی طرح [illegible]

[illegible] عرب [illegible]
[illegible]
[illegible] کے ایک بڑے حصے کو فتح کر لیا۔ اس کا اصل عربی نام اذینہ تھا اور اس کی
بیوی مشہور زینوبیا کا نام عربی اسم زینب کی مسخ شدہ شکل ہے۔ عرب کی روایت میں اس عورت کا نام زباء ہے، لیکن وہ دراصل اذینہ کے ایک سپہ سالار کا نام ہے۔ اذینہ اور زینب کے لڑکے وارث کا نام اتھینوڈورس Athenodoro یعنی عطائے اتھینیا (دیوی) تھا، جو کہ فی الواقع اس کے اصلی عربی نام وہب اللات یعنی عطائے لات (وہب بمعنی ہبۃ) کا ترجمہ ہے۔ اور جس کے معنی یہ ہیں کہ اس لڑکے کو لات نے اس کے والدین کو بخشا تھا۔ لات کی پرستش بطور ایک معبود کے عرب میں بکثرت متداول تھی۔

قدیم عرب کی تاریخ پر، جیسا کہ عام طور پر تمام دیگر ممالک کی تواریخ کا حال ہے۔ اس کی جغرافیائی ہیئت کا بہت اثر پڑا ہے۔ عظیم صحراؤں نے جو کہ شمال و جنوب میں اس جزیرہ نما کو شام و بابل سے علیحدہ کرتے ہیں اس کے باشندوں کو دشمنوں کے حملوں اور ان کی زبان اور قومی خصائل کو تبدیلیوں سے محفوظ رکھا۔ کلدانیہ کی زبان، جیسا کہ ہم اسے ان تحریرات کے ذریعے سے جو شاید مسیح سے چار ہزار برس پہلے ہیں، جانتے ہیں، باوجود اس قدر قدامت کے سامی زبان کی قدیم شکل کو پیش نظر رکھتے ہوئے، بعض اہم تبدیلیاں اختیار کر چکی ہے، حالانکہ عربی زبان نے چھٹی صدی عیسوی میں بھی اپنی نحوی ہیئت کے بعض حصوں مثلاً فعل میں قدیم زبان سے بہت کم بعد حاصل کیا ہے اس کا باعث عربوں کی علیحدگی اور آزادی ہے۔ جب سے اسلام کے بعد عربوں کا دوسری قوموں سے واسطہ پڑا، ان کی زبان میں بھی کم و بیش بعض اہم تبدیلیاں وقوع میں آئیں۔ یہ صحیح ہے کہ آشوریا کے تاریخی کتبات میں سناخرب، اسرحدان، اشور بنی پال اور بخت نصر کی فتوحات کا ذکر ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان آشوری اور کلدانی سرکاری بیانات کو پورے طور پر اعتبار کی نظر سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ بہرحال یہ فتوحات محض حملوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان حملہ آوروں کی حکومت محض

[illegible] جہاں [illegible] کی [illegible] [illegible]
[illegible] جانے کے زیادہ مستحق ہیں [illegible] [illegible]
بہت سے الفاظ سینا کے وادی مکتب میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ ان [illegible] سے عربی [illegible]
نظر سے بہت کم معلومات دستیاب ہوتی ہے، لیکن وہ زبان کے نقطۂ نظر سے قیمتی [illegible]۔ یہ
زبان شمال کی اصلی عربی معلوم ہوتی ہے، یا زیادہ صحیح یہ ہوگا کہ چند قسم کی زبانیں مخلوط تھیں، جو
ایک طرف تو نبطی بولتے تھے اور دوسری طرف اہل عرب۔ ان زبانوں کی تین قسمیں ہیں: صفائی
لحیانی، اور ثمودی۔ سب سے اخیر قسم اُس مشہور جماعت میں متداول تھی جنہیں اہل عرب آل ثمود
کہتے ہیں۔ ایک مختصر کتبہ جو ثمودی زبان میں لکھا ہوا ہے، اور حال ہی میں دستیاب ہوا ہے
سب سے پہلا کتبہ ہے جس میں تاریخ دی گئی ہے۔ یونانی و رومی مصنفوں کے ذریعہ سے بھی ہم
آل ثمود کے متعلق کافی واقفیت رکھتے ہیں۔ رومیوں کی عربی فوج میں ثمودیوں کا ایک خاص
دستہ ملازم تھا، جسے رومی "Equites saraceni Thamudeni" یعنی "لشکر سواری
ثمودی" کہتے تھے۔

اس شمالی قسم زبان کی ایک خاص خصوصیت حرف "اَل" کی شکل ہے، عبرانی زبان
میں "ال" کی جگہ "ھا" آتا ہے۔ "فرس" (گھوڑا) حرف معرفہ شامل کرکے "ہافرس" ہوگا۔
ان کتبات میں سے ایک کتبہ جو صفائی زبان میں ہے بتاتا ہے کہ حانی بن سلام نامی ایک شخص
نے ایک گھوڑا ایک دوسرے شخص حنائی نامی سے پانچ بینا میں خریدا
"اَغذم حَنائی ہافرس بخمسۃ اَمنی (؟) مانی (؟)" ایک اور شخص انعم بن قاحش "الس" مال
غنیمت کا تذکرہ کرتا ہے جو اُس نے جنگ نبط کے سنہ میں حاصل کیا تھا۔
وغنم سنت حرب نبط
یہ کتبہ اُس سنہ کی وجہ سے جو اُس میں پایا جاتا ہے اہم ہے۔ یہ تاریخ اغلباً (شہنشاہ)
تراجن کے عہد میں سنہ ۱۰۶ء سے تعلق رکھتی ہے۔ بیسیوں کتبے اکثر ان الفاظ پر ختم ہوتے [illegible]

[illegible] سلطنت [illegible] برخلاف اس کے [illegible] [illegible] پر [illegible] علم نہیں [illegible] کوششیں کی عرب کو فتح کرنے کی [illegible] ایک کوشش قیصر آگسٹس کے زمانے میں کی اور اس میں بھی وہ سراسر ناکام رہے۔ آئلیوس گالوس (Aelius Gallus) نے جو عرب کے جنوبی حصوں تک پہنچ گیا تھا، مسریابا (مارب) کا محاصرہ کر لیا، لیکن بالآخر اسے اس محاصرہ کو چھوڑ دینا پڑا، اور ایک لشکر جرار میں سے جس کا پورا اہتمام کیا گیا تھا، وہ صرف معدودے چند افراد کو مصر واپس لے کر پہنچ سکا۔

جس چیز کا شمال کے عربوں پر اثر پڑا وہ ایک آہستہ، لیکن واقعی حملہ تھا، یہ حملہ مذہبی خیالات اور ہمسایہ ممالک یعنی مغرب میں بازنطینی سلطنت اور مشرق میں ساسانی سلطنت کے برتر تمدن کا تھا۔ ایک زمانے میں جسے گذرے ہوئے مدتیں ہو چکی تھیں، اُن حکومتوں پر بھی جو کہ یمن میں قائم تھیں، ان سلطنتوں کے ایسے اثرات پڑے تھے۔ اپنی حکومتوں کی بنیاد ڈر جانے پر شمال و جنوب کے عربوں نے ایک نظم و نسق قائم کر لیا تھا لیکن اس سے انہیں اپنی آئندہ ترقی میں بڑی مدد ملی۔ یہ حکومتیں حیرہ اور غسان اور وسط جزیرہ نما میں کندہ کی تھیں ہم مختصر طور پر ان حکومتوں کی تاریخ کے اہم واقعات ان روایتوں سے اخذ کر کے جو ششم صدی مسیحی کی ابتدا سے شعرا و مورخین عرب کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی ہیں پیش کریں گے۔ عربی زبان کے قدیم ترین تحریری اسناد اس صدی کے آغاز سے بیشتر کی نہیں ملتیں۔ اور یہ زمانہ بقول رینان (Renan) جنود مسربیل کا "عہد ذہبیہ" ہے

یہیں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ہم اب ایسی عربی زبان سے بھی واقف ہیں جو اشعار جاہلیت سے زیادہ قدیم کہی جا سکتی ہے۔ حوران میں جو دمشق کے جنوب و مشرق میں واقع ہے [illegible] حجاز کے شمالی اقطاع تک اخیر صدی عیسوی کے نصف دوم میں بعض ایسے کتبات دستیاب ہوئے ہیں جو اس قدیم عربی میں لکھے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ عربی زبان ادبی

"... فلات سلام"

ان الفاظ کی تعبیر اس طرح کی گئی ہے: ... کے بدلہ سلام ... ان ... میں ... نامی معبود کبیر کا ذکر ہے۔ لیکن جو چیز توجہ کی مستحق ہے وہ یہ ہے کہ کتبات ایک ایسے رسم الخط میں کندہ کئے گئے ہیں، جو کہ جنوبی عرب کے حروف سے وابستہ ہیں، نہ کہ آرامی حروف سے جو کہ پنجم صدی قبل مسیح سے دریائے فرات کے تمام اقطاع میں مروج تھے یہ معمولی واقعہ ہمیں یہ نتیجہ نکالنے کی اجازت دیتا ہے کہ ہمارے سنہ مسیحی کے ابتدائی زمانے میں عرب کے تمدن کا خاص مرکز جنوب یعنی یمن میں تھا اور اسکا اثر عرب کی شمالی آبادی تک پہنچا ہوا تھا۔

اب ہم اُن حکومتوں کیطرف متوجہ ہوتے ہیں جو عرب کے شمال میں قائم ہوئی تھیں، بالخصوص حیرہ

حیرہ دراصل ایک سریانی لفظ ہے، جس کے معنی "محدود قطعۂ زمین" یا "فوجی کیمپ" کے ہیں۔ اسکا تلفظ بجائے حِیرہ (بالکسرہ) حَیرہ (بالفتح) تھا۔ وہ محل وقوع کے لحاظ سے اچھے مقامات میں سمجھا جاتا تھا اور اس کی ہوا اتنی عمدہ تصور کیجاتی تھی، کہ ایک مثل مشہور تھی کہ حیرہ میں ایک دن گذارنا، سال بھر دوائیں کھانے سے بہتر ہے۔ ان عمدہ حالات کیوجہ سے حیرہ میں کثیر اور مرفہ الحال آبادی جمع ہوگئی تھی، جس میں سب سے زیادہ قبیلہ تنوخ کے عرب تھے جو خیموں میں رہتے تھے۔ انکے بعد عباد تھے جو مختلف عیسائی قبائل سے تعلق رکھتے اور زیادہ تر شہر کی اصلی آبادی میں رہتے تھے۔ انکے علاوہ اور بعض قبائل تھے جو ان سے اتحاد رکھتے تھے عباد کے معنی "بندگان" ہیں۔ پورا نام شاید عباد اللہ یا ممکن ہے "عباد المسیح" یعنی غلامانِ مسیح ہوگا۔ یہ نام غالباً انہوں نے خود ہی اختیار کیا تھا، تاکہ اُس کے ذریعے سے وہ بددین اور بت پرست آبادی پر جو اُنکے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اپنا تفوق جتائیں۔

ہم حکومت حیرہ کے عہد اولیٰ کے متعلق کوئی یقینی بات نہیں جانتے حسب معمول اس کی ابتدا کے متعلق بھی دیگر حکومتوں اور شہروں کی طرح بجائے تاریخ کے افسانے سے سابقہ پڑتا ہے

عدی بن ربیعہ کا عشق رقاش کے ساتھ جو کہ شاہ جذیمۃ الابرش کی بہن تھی، جذیمہ کی ابن زباء کی
محبت، عدی کی اپنے بھتیجے عمرو بن عدی سے محبت اور ملکہ زباء سے بڑے مقابلے
جو کہ حیرہ یا منگ کے نام سے موسوم کرتے ہیں، یہ سب افسانوں کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ان میں جو
تاریخی واقعات کہ جو ان میں مخلوط ہو کر رہ گئے ہیں، علیحدہ کرنا نہایت دشوار ہے۔ پھر بھی بجز
خاندان لخمیہ یا بنو نصر کے ہم حیرہ کی تاریخ سے بہتر طور پر واقف ہیں۔ حیرہ کے شاہی خاندان
کی ابتدا تیسری صدی عیسوی کے نصف دوم میں قرار دیجا سکتی ہے۔ لیکن پہلا بادشاہ جو ہمارے
زمانے تک کسی قدر شہرت رکھتا ہے، امراء القیس اول ہے۔ اس لئے کہ یہ وہی بادشاہ ہے جس کی جانب
اس کتبہ کو منسوب کیا جا سکتا ہے جو کہ علاقہ نمارہ (واقع وسط شام) میں موسیو دی سو
(M. Dussaud) کو تھوڑا عرصہ ہوا دستیاب ہوا ہے۔ یہ کتبہ جو کہ عجائب خانہ لوور
(Louvre) واقع پیرس (فرانس) کے عظیم الشان ذخیرہ میں شامل ہو چکا ہے، دو قسم کی
اہمیت رکھتا ہے۔ تاریخی و لسانی۔ یہ کتبہ ان الفاظ کے ساتھ شروع ہوتا ہے:۔

"تی نفس مرلقیس بر عمرو ملک العرب کلہا"

یعنی "یہ مرالقیس (امرالقیس) پسر عمرو بادشاہ جملہ عرب کی قبر ہے"، یہ عبارت قدیم عربی
زبان میں ہے لیکن اس میں باہر کے الفاظ بھی شامل ہیں۔ مثلاً نفس بمعنی سنگِ مزار (یا لوح) بر
بجائے بن، بمعنی پسر۔ لیکن یہ الفاظ اس عہد اور اس ملک کی بول چال کی زبان کی بجائے
ادبی اور نیز تحریری زبان کو پیش کرتے ہیں جو کہ ہمیشہ آرامی زبان کے زیر اثر رہی۔ ایک ہی قوم
کے لکھنے اور بولنے کی زبان میں اس قسم کا فرق پایا جانا تعجب انگیز نہیں ہے۔ یہی کیفیت نبطیوں کی
ہے جو کہ عرب قوم سے تھے چونکہ ان کی مادری زبان اس وقت لکھی نہیں جاتی تھی اس وجہ سے
ان کے کتبات ایک طرح کی آرامی زبان میں پائے جاتے ہیں، لیکن اس میں جا بجا عربی زبان مخلوط ہے۔
شاہ امراء القیس یا امر القیس جس کے مزار پر یہ کتبہ لگا ہوا تھا، اپنے آپ کو تمام عرب کا بادشاہ
کہلاتا ہے۔ وہ بنو قبائل اسد نزار اور ان کے اعوان نیز قبیلہ مذحج کا بادشاہ تھا۔ اس نے شامر کے

شہر نجران [illegible]
شاہ [illegible]
نجران عرب جنوبی کا ایک مشہور شہر تھا۔ اس کتبہ کی تحریر نبطی خط میں ہے، لیکن اس میں بعض قابل توجہ خصوصیتیں پائی جاتی ہیں مثلاً لام الف جو کہ عربی کے لام الف (لا) سے قطعاً مطابق ہے جس چیز سے اس کتبہ کی قیمت بہت بڑھ جاتی ہے وہ اُس کی تاریخ ہے جو اس میں درج ہے اس کتبہ کے دستیاب ہونے سے قبل بعض فضلا مثلاً آلش ہورن (E. Olshausen) اور کوسین دے پرسیوال نے امرءالقیس اول کا عہد حکومت چوتھی صدی عیسوی کے ابتدائی زمانے میں قرار دیا تھا، اور عربی روایتوں میں متفقہ طور پر اُسے عمرو کا بیٹا بیان کیا گیا ہے۔ ان باتوں کو دیکھتے ہوئے تاریخ حیرہ کے متعلق یہ امور مسلم سمجھنے چاہئیں کہ نمارہ (Namara) کے کتبہ میں جس امرءالقیس کا ذکر ہے وہ عربی روایات کا بادشاہ امرءالقیس ہے، اور اُس کی وفات کی یقینی تاریخ ۷ دسمبر ۳۲۸ء شاہان حیرہ کے سنین کو متعین کرنے کے لئے ایک نہایت اہم نقطۂ آغاز ہے۔

امرءالقیس اول کے پرپوتے نعمان اول نے بہت زیادہ شہرت پائی۔ یہاں تک کہ عرب کی شاعری اور کم و بیش فسانہ آمیز نوعیت کی تاریخ میں اسکا نام بہت کچھ زندہ اور رائج رہا۔ اُس کے ماتحت سواروں کے دو دستے تھے جن میں سے ایک "دوسر" اور دوسرا "الشہبا" کہلاتا تھا۔ نعمان کے لئے ان منتخب دستوں کی اہمیت اُن لڑائیوں میں جو ہمسایہ قبائل عرب سے ہوئیں اور جن میں سواروں کا ممتاز حصہ ہوتا تھا محتاج بیان نہیں ہے۔ حیرہ کی بادشاہی یقینی طور پر ساسانیوں کے زیر اقتدار تھی، حتیٰ کہ یزدجرد اول [illegible] نے اپنے بیٹے بہرام (گور) کو تربیت کے لئے نعمان کے سپرد کیا تھا۔ قصر خورنق [illegible] کی تعمیر سے جو نعمان نے بنوائے تھے، اُس کی حکومت کو ادبی امتیاز حاصل ہو گیا [illegible] یقینی طور پر ایرانی زبان کا لفظ ہے اور اُس لفظ کی اصلی صورت خورنق [illegible]

[illegible] تھی ... یہ محل فن تعمیر کے عجائبات میں سے تھا جسے ایک رومی معمار سنمار نامی نے بنایا تھا۔ روایت ہے کہ اس محل کے بالائی بام پر جہاں نعمان اپنے خیال و عیش کے خواب دیکھ رہا تھا، یکایک اس کے دل میں ایک اندوہناک خیال پیدا ہوا، اور وہ یہ تھا کہ "یہ جو کچھ بھی ہے آج تو سب میرا ہے، لیکن کل یہ سب دوسرے کا ہوگا" اس خیال کا لانا تھا کہ اس نے دنیا کو ترک کر دینے کا تہیہ کر لیا، اور اپنی بقیہ زندگی خلوت و عبادت میں گذاری۔ نام آور پادشاہوں کے قصے جن میں معاً دنیا چھوڑ دینے اور گوشہ نشینی اختیار کر لینے کا ذکر ہے، اور بھی بکثرت مشہور ہیں، مثلاً نعمان کی طرح حبش کے پادشاہ "کالب" کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یمن کے پادشاہ کو مغلوب کرنے اور کمال عروج کو پہنچ جانے کے بعد وہ راہب ہوگیا تھا۔ علاوہ ازیں عرب مصنفین تو یہاں تک بیان کرتے ہیں کہ سقراط و افلاطون بھی اخیر عمر میں زاہدانہ گوشہ نشین بن گئے تھے۔

نعمان بت پرست تھا، اس نے مذہب عیسوی کے خلاف جبر و تشدد سے کام لیا، اور عربوں کو شمعون نامی ولی (S. Simeon) کے پاس جانے اور اس کا وعظ سننے کی ممانعت کر دی۔ لیکن وہ ولی اسے خواب میں نظر آیا، اور اس کو سخت کلمات سے یاد کیا، اور کئی بار عصا سے مارا۔ نعمان نے بالآخر حیرہ میں عیسائیوں کو اپنے مراسم مذہبی ادا کرنے کی اجازت دیدی۔ اس کی تائید عرب مصنفوں کی شہادت سے بھی ہوتی ہے۔ اس واقعہ کی ایک اور بھی اہمیت ہے، وہ یہ کہ مذہب عیسوی کا استحکام اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ عباد نے جو کہ حیرہ کی مسیحی آبادی تھے، منتخب اور سربرآوردہ عربوں پر بہت بڑا اثر ڈالا۔

نعمان کا جانشین تقریباً ۴۱۸ء میں منذر اول اس کا بیٹا ہوا جو کہ تقریباً ۴۶۲ء تک حکمران رہا۔ یونانی (رومی) و سریانی مصنفین اسے الاموندار وس (Alamoindaros) منذر (بفتح ذال) لکھتے ہیں، لیکن عرب ہمیشہ سے اس کے نام کو اسم فاعل المنذر کی شکل میں لکھتے رہے ہیں۔ نعمان میں بعض غیر معمولی قابلیتیں پائی جاتی ہیں اور اس کے عہد میں حیرہ کی حکومت

نے اس وقت کے واقعات میں نمایاں حصہ لیا۔ اس نے موبدان ایران کو بہرام گور کو مجبوراً تاج شاہی پہنانے پر مجبور کیا حالانکہ انہوں نے بہرام گور کو نظرانداز کرکے اور ساسانی شاہزادہ کو تخت نشین کر دیا تھا۔ بعض عرب مصنفوں نے لکھا ہے کہ بہرام گور کو تخت شاہی حاصل کرنے میں منذر کے باپ نعمان نے مدد دی تھی۔ اس طرح اس واقعہ کی دو مختلف روایتیں ہیں۔ لیکن تواریخ کی مطابقت کی رو سے دوسری روایت صحیح نہیں ہے منذر نے بہرام گور کی مدد اس کامیاب جنگ میں بھی کی تھی جو کہ بازنطینی سلطنت کے مقابلہ میں ہوئی تھی۔ لیکن منذر کی فوج پر مغاہراس غالب آگیا، اور انہیں یہ خوف ہوا کہ وہ گھر گئے ہیں۔ اس خوف سے وہ دریا میں جا گھسے، اور اُن میں سے اکثر دریائے فرات میں ڈوب کر مر گئے۔ یہ واقعہ سنہ ۴۲۱ء میں پیش آیا۔

حیرہ کے بادشاہ اُس کے بعد سے ساسانیوں اور بازنطینیوں (رومیوں) کی لڑائیوں میں برابر حصہ لیتے رہے۔ نعمان ثانی منذر کا پوتا، سنہ ۵۰۳ء میں جنگ خبور (Khabur) میں جو کہ بمقام سرسیوم (Carcesium) ہوئی تھی مارا گیا۔ حیرہ کے بادشاہوں میں بلاشبہ سب سے زیادہ ممتاز منذر ثالث تھا، جو سنہ ۵۰۵ء میں پچاس برس حکومت کرنے کے بعد مرا۔ پروکوپ (Procopius) نے لکھا ہے کہ وہ نہایت ذہین اور بڑا زبردست سپہ سالار تھا۔ جسٹن (Justin) (سنہ ۵۱۸ء) کے عہد کو چھوڑ کر ساسانیوں اور بازنطینیوں میں صلح بہت کم رہی، اور منذر سوم جنگ میں ہمیشہ نمایاں حصہ لیتا رہا۔ اُس نے دو سرداروں کو گرفتار کر لیا۔ تو جسٹن نے حیرہ کے چھوٹے سے بادشاہ کے پاس اپنے سفیر بھیجنے میں اپنی بے عزتی نہ سمجھی، اور اس سے بلاشبہ اس کا منشا یہی تھا کہ اس کے دونوں سپہ سالار رہا ہو جائیں اُسی زمانے میں منذر کے پاس یمن کی سفارت بھی آئی تھی۔ قباد کے زمانہ میں بھی منذر نے جنگ میں خاص طور پر نمایاں حصہ لیا، رومیوں کی سلطنت میں کئی بار لشکر کشی کی، لیکن ہمیشہ ان کے تعاقب سے بچ کر نکل آیا۔

اسی زمانے میں سلطنت بازنطینی کی سرحد پر ایک دوسری عرب حکومت نے اتنی قوت حاصل کرلی تھی کہ وہ ہیرہ کی حکومت کی حریف بن سکے، اور سامانیوں اور انکے زبردست حملوں کے مقابلہ میں سلطنت بازنطینی کی مدد کرے۔ یہ غسان کی حکومت تھی۔ اس حکومت کے ابتدائی عہد کی تاریخ حیرہ کے ابتدائی تاریخ کی طرح افسانہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ غسانی جنوبی عرب سے آکر بصری کے علاقہ میں مقیم ہوئے تھے۔ وہاں انہیں دیگر عرب قبائل پہلے سے آباد ملے، اور کچھ مدت تک وہ اُن قبائل کے مطیع و منقاد رہے۔ چوتھی صدی عیسوی کے اواسط میں ثعلبہ بن عمرو کو سلطنت بازنطینی کی طرف سے اس علاقہ کی امارت سپرد ہوئی، جو آگے چلکر غسان کی پادشاہت ہوگئی۔ یہ اختیارات بعد میں خاندان جفنہ کے امراء کے ہاتھ میں منتقل ہوگئے لیکن یہ بات چہارم صدی عیسوی کے نصف اخیر میں حاصل ہوئی کہ تاریخ میں غسانی بطور سلطنت بازنطینی کے معاونین کے نظر آتے ہیں۔ ستمبر ۳۷۳ء میں غالباً شاہ حارث دوم کی وفات کے بعد اُس کی بیوی ماریہ یا ماویہ نے غسان حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ ایک روایت کی روسے اُس جنگجو اور فہمند ملکہ نے سلطنت بازنطینی کو مجبور کردیا کہ وہ اُس ملکہ سے صلح کی جویا ہو ماریہ اس شرط پر صلح کے لئے راضی ہوئی کہ موسیٰ نامی ایک مسیحی ولی بطور بڑے پادری کے اُس کے ملک میں بھیجدیا جائے گا۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب عیسوی نے اس ملک کے عربوں میں کتنی ترقی پیدا کرلی تھی۔ لیر عرب کس حد تک رفتہ رفتہ بت پرستی سے ہٹ کر برتر مذہب قبول کرنیکی طرف مائل ہورہے تھے۔

بعض شاہان حیرہ و غسان، بالخصوص "جفنہ ثانی" کا ایک انوکھا لقب "محرّق" تھا۔ اس نام کے معنی وہی لئے جاتے ہیں جو عربی زبان کی روسے ہوتے ہیں، یعنی "ایک ایسا شخص جو کہ تیز آگ میں جلاتا ہے"۔ بعض شاہان حیرہ کے متعلق جن کا یہ لقب ہے، ایسی حکایات بھی بیان کیجاتی ہے جس سے اس اسم کی توجیہہ ہوجائے۔ لیکن ان حکایات کا ماخذ فی الواقع لفظ محرّق اور اس کے معنی ہیں۔ اسی طرح "معلقات" کے لفظ سے جو کہ سات مشہور نظموں

کے لئے مخصوص ہو۔ وہ روایتیں ماخوذ ہیں، جن کی رو سے بیان کیا جاتا ہے کہ [illegible]
تھیں لیکن علامت معرفہ "ال" کی عدم موجودگی سے واضح ہوتا ہے کہ عربی نام [illegible]
کسی دیوی یا کسی افسانے کے سورما (ہیرو) کا نام ہے۔

چھٹی صدی عیسوی کی مدت میں غسان کی حکومت نے سب سے زیادہ شوکت حاصل کر لی۔ یہی زمانہ حکومت حیرہ کے اقبال کا بھی تھا۔ اس کے بعد سے دونوں حکومتوں میں تصادم ہونا ناگزیر ہو گیا۔ دو حریف سلطنتوں، یعنی ایران و روما کے ماتحت ہونے کی وجہ سے وہ اس پر مجبور تھیں کہ وہ بعض اوقات باوجود چند روزہ ظاہری صلح کے ایک دوسرے سے اظہار نفرت کریں۔ جبلہ ثالث یا حارث الاکبر کی منذر ثالث سے جنگ ہوتی رہی جس میں جبلہ مغلوب ہوا۔ اسی جبلہ کی بیوی مریم تھی، جس کے کان کے بندوں میں دو اتنے بڑے موتی جڑے تھے کہ ہر ایک کبوتر کے انڈے کی برابر تھا۔ لیکن غسان کا سب سے بڑا بادشاہ اور حیرہ کا سب سے بیدرد دشمن حارث پنجم تھا، جو کہ حارث الاکبر اور مریم کا بیٹا تھا۔ قیصر جسٹینین (Jostinion.) نے اُسے بطریق بنا دیا تھا جس کی وجہ سے اُسے بلند ترین مرتبہ حاصل ہو گیا تھا اور معاصرین اُسے بادشاہ (Banilios) کے لقب سے ملقب کرتے تھے۔ یہ لقب کبھی کبھی ماتحت امراء کے لئے بھی استعمال ہوتا تھا۔ جسٹینین نے سرحد کے پاس کے عربوں کی قیادت بھی حارث کے ہاتھوں میں دے دی تھی، اور اس طرح حیرہ کے بادشاہوں کے جو کہ سلطنت ایران کے رعایا تھے مقابلہ میں ایک قوت قائم کر دی گئی۔

حارث خامس، اور منذر ثالث دو ایسی شخصیتیں ہیں جو چھٹی صدی عیسوی میں عربوں کی تاریخ میں خاص طور پر ممتاز نظر آتی ہیں۔ منذر اپنے حریف (حارث) پر اکثر چھاپے مارتا رہتا تھا۔ [illegible] میں اس نے حارث کے بیٹے کو جنگ میں گرفتار کر کے عزیٰ پر قربانی چڑھا دیا۔ ایسے معاملات میں وہ بالکل وحشی تھا۔ لیکن دس برس بعد وہ مغلوب ہو گیا۔ عربوں کی روایت میں اس جنگ کے دوران میں تین سخت لڑائیاں پیش آئیں، بعض جگہ سے [illegible] پہلی لڑائی بہت عرصہ بعد وقوع میں آئی۔ منذر (جون [illegible] میں) [illegible]

[illegible] سے [illegible] ستونوں کے قاصر [illegible]
[illegible] جنگ [illegible] معلوم ہوتی ہے [illegible] جاتی ہے۔ حلیمہ حارث کی
بیٹی کا نام معلوم ہوتا ہے جسے اس کے باپ نے حکم دیا تھا کہ وہ عطر "خلوق" سے چیدہ بہادروں
کے جسم [illegible] "وادی حلیمہ" یا "معرکہ حلیمہ" کا ذکر قدیم شعرا کے کلام میں، جو اکثر اس
کے متعلق ہماری معلومات کا ذریعہ ہیں" آتا ہے۔ "الشعر دیوان العرب" اشعار اہل عرب کا
محافظ خانہ ہیں۔ ایک شاعر ابن ابی الرعلاء (؟) غسان کے بادشاہوں اور دیگر بہادر مقتولان جنگ
کی اس طرح مدح کرتا ہے :-

"جو مر گئے اور خاموش ہیں وہ مرے ہوئے نہیں، بلکہ اصلی مرے ہوئے وہ
لوگ ہیں جو باوجود زندہ ہونے کے مردہ ہیں :-

لیس من مات فاستراح بمیت　　　انما المیت میت الاحیاء

۵۶۳ء میں اپنے حریف کی موت سے بارہ برس بعد حارث قسطنطنیہ گیا، اور اس عرب سردار کا نظارہ رومیوں پر اثر ڈالنے والا ہوا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک رومی نے جسٹینین کو ڈرانے کے لئے کہا "ہوشیار ہو جا! حارث آتا ہے!"

چھٹی صدی عیسوی کے اختتام پر حکومت ہائے حیرہ و غسان کا زوال شروع ہوا۔ عمرو بن منذر ثالث اپنے باپ کی جگہ ۵۶۲ء میں تخت نشین ہوا۔ وہ مستعد لیکن وحشی تھا۔ شعرا نے بھی اسے برا لکھا ہو۔ چبھتی ہوئی ہجو میں اکثر انہوں نے اسے "محرق" یعنی تیز آگ میں جلنے والے کا لقب دیا ہو۔ مشہور شاعر طرفہ اس کے ظلم کا شکار ہوا۔ ایک متداول روایت کی رو سے بادشاہ نے اسے اور اس کے چچا متلمس کو عمان بھیجا، اور وہاں کے عامل کو ایک خط لکھا، جو ہومر Homer کے اشعار کے دو کلموں سے شروع ہوتا تھا، اور اس میں ان دونوں کے قتل کر ڈالنے کا حکم درج تھا۔ متلمس نے اس خط کا مضمون پڑھ لیا اور اپنی جان بچالے گیا، لیکن طرفہ مارا گیا۔ عمرو بن منذر نے اپنی سعیدی کا ثبوت قیصر روم کے مقابلہ میں دیا۔ یہ امر شبہ سے خالی ہے کہ قیاصرہ روحۃ الصغریٰ

شاہان حیرہ کو باضابطہ ایک رقم ادا کرتے تھے اور اس کے بدلے میں شاہان حیرہ کی مدد کی جاتی
وقتاً فوقتاً ساسانیوں کے مقابلے میں رومیوں کے مقبوضوں پر غیر خواہ داد بغاوتی مطلوب تھی
جسٹنین ([illegible]) اس نذرانے جس طریقہ کو دور کر دینا چاہتا تھا لیکن عمرو نے فوراً باج تجی
ماتحت رعایا، غسانیان، کے خلاف جنگ شروع کر دی۔ بالآخر عمرو کی کوتاہ نظری اس کی
موت کا باعث ہوئی۔ اس نے ایک معلقہ کے مشہور مصنف عمرو بن کلثوم کی توہین کی تھی۔
اس نے عمرو کو اپنے ہاتھ سے قتل کر ڈالا۔ تغلبی شاعر اخنس اپنے چچاؤں کی اس طرح تعریف

"یہ وہ ہیں جنہوں نے بادشاہوں کو قتل کیا، اور بادشاہوں کی بیڑیوں کو توڑ ڈالا"

Co.mbus. or -Combigge
عمرو کا جانشین قابوس یا قابوسیس
ہوا، جو باوجود اپنی بہادری کے جس کا بلا شبہ بعض عرب مصنفوں نے انکار کیا ہے غسانیوں
کے خلاف جنگجوئی میں ناکام رہا۔ ۵۸۰ء میں نعمان ثالث ابو قابوس تخت نشین ہوا۔ اکثر
شعرائے عرب نے اس کا ذکر کیا ہے، اور وہ حیرہ کا سب سے مشہور بادشاہ ہوا ہے۔ لیکن فی الواقع
وہ سب سے بہتر نہیں ہے۔ وہ اپنے بھائی اسود کے مقابلہ میں عدی بن زید کی مدد سے جو کہ خسرو
پرویز کے دربار میں نہایت ذی اقتدار شخص تھا تخت نشین ہوا۔ نعمان کے بعد اپنے محسن کے
خلاف اسے شبہات پیدا ہو گئے اور اس نے اسے قتل کر ڈالا لیکن فوراً ہی خسرو کا اعتماد
اس پر سے اٹھ گیا، اور خسرو نعمان کو ایک دشمن نہ کہ رعایا کی نظر سے دیکھنے لگا۔ خسرو نے
نعمان کو گرفتار کر لیا اور سبت (Sabat) میں مرنے تک مقید رہا۔ اس کی موت کے
متعلق ایک روایت تو یہ ہے کہ وہ طاعون میں مرا اور دوسری روایت یہ ہے کہ اسے زہر دیا گیا،
تیسری روایت ہے کہ ہاتھی کے پیروں میں کچلوا دیا گیا۔ خسرو اپنے دشمنوں کو اکثر یہ سزا دیتا تھا۔
شاعر سلمہ بن جندل کہتا ہے:۔ نعمان نے عرصہ تک خوشنما خیموں کے نیچے پناہ پائی، لیکن
اپنی زندگی ایک ایسی چھت کے نیچے گزاری جو ہاتھیوں کے لئے بنی تھی۔ اس طرح خاندان
کا خاتمہ ہوا۔ اس کا جانشین ایاس بن قبیصہ قبیلہ طے سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ وہ طے کے

لیکن ... سے وابستہ تھا۔ یہ سچ ہے کہ اس حکومت کی وقعت اس سے کم نہیں کی جا سکتی کہ اس کا
ایرانی عہدہ دار مقرر ہوا، جو اس کی حکومت کی باگیں اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا۔ بہر حال منذر ثالث کا
شاندار اور پائدار زمانہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگیا اور حیرہ صرف ایک معمولی صوبہ بن کر رہ گیا۔

نعمان کی وفات کے کچھ ہی عرصہ بعد ۶۱۰ء میں ذو قار کی جنگ ہوئی جس میں عربوں بالخصوص بکر بن وائل نے ایرانی فوج کو شکست دی اس لڑائی نے عربوں کے لئے گویا ان عظیم الشان فتوحات کا جو انہیں ایرانیوں کے مقابلہ میں بعد میں حاصل ہوئیں دروازہ کھول دیا۔

غسانیوں کا زوال حیرہ کی طرح جلد ہی شروع ہوگیا۔ حارث ششم نے جو کہ حارث اعظم (حارث پنجم) کا جانشین تھا، ۵۸۳ء کے قریب زمانہ میں عین اباغ کی جنگ میں منذر چہارم کے مقابلے میں چند بار کامیابی حاصل کی، لیکن غسانیوں کی یہ چھوٹی سی حکومت خود بھی تباہ ہوگئی۔ عمرو چہارم ان بڑے شاعروں کی بدولت جو کہ اس کے دربار میں باریاب ہوتے تھے اور جنہوں نے بادشاہ عمرو کے جانشینوں کی مدح سرائی بھی کی ہے، زیادہ مشہور ہے۔ عمرو چہارم کے جانشینوں کے نام اس قدر زیادہ تعداد میں ملتے ہیں کہ انہیں دیکھکر یہ خیال ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض معاصر ہیں، اور ایسے حکمراں نہیں ہیں جن کے تحت سارا رقبہ ملک تھا۔ ان بادشاہوں کا لقب ہنوز "خیر الفتیان" یعنی "بہترین مردمان" ہے۔ جلد ہی وہ ایسے لوگوں سے جو بظاہر ان سے زیادہ حقیر لیکن فی الواقع زیادہ قوی تھے مغلوب ہو جاتے ہیں، اور اسلامی فتوحات کے سلسلہ میں غسانیوں کی بادشاہت ختم ہو جاتی ہے۔

اب ہم چند کلمات اس تیسری حکومت کے متعلق اور کہنا چاہتے ہیں جس کا تذکرہ ہم نے اوپر حیرہ اور غسانیوں کے ساتھ کیا ہے۔ یہ کندہ ہے، جو پانچویں صدی عیسوی کے اخیر اور چھٹی صدی عیسوی کے آغاز میں جزیرہ نمائے عرب کے وسط میں قائم ہوئی، اور جس کے بادشاہوں میں مشہور شاعر امرؤ القیس شامل ہے۔

حجر آکل المرار اس حکومت کا بانی بتایا جاتا ہے۔ وہ جنوب کے رہنے والے حمیریں

... کی وجہ سے اُنکے ... نہیں ہو سکتا ... کا ... ہے ...

... کا سمجھنا چاہیے جیسا کہ ... کا ... ہوں کے ... کا ... حارث ... کے ... کی

کندہ کا ایک زبردست حریف حیرہ تھا۔ کندہ کے ایک بادشاہ حارث بن عمرو نے ... کی ...
تھا حیرہ کے ایک حصہ پر تسلط حاصل کر لیا تھا۔ وہ ... حیرا اور ... انبار میں رہا کرتا تھا۔ لیکن
منذر نے جلد بالادستی حاصل کر لی۔ ۵۲۹ء میں اُس نے حارث پر حملہ کر کے اُسے بھگا دیا۔ اور محض
فتح پر اکتفا نہیں کی، بلکہ کندہ کے بعض امرا و سرداروں کو جو کہ جنگ میں قید ہو گئے تھے۔ ذبح
کرا دیا۔ یہ وحشیانہ فعل امرأالقیس کے حسب ذیل اشعار جمیلہ کا محرک ہوا۔ امرأالقیس اپنے باپ کی کامیابی
و ناکامی کو کبھی نہیں بھولا:۔

الا یا عین بکی لی شنینا | وبکی لی الملوک الذاہبینا
اے میری آنکھ جلتے ہوئے آنسو بہا | اور شاہان رفتہ کے لئے رو
ملوکا من بنی حجر بن عمرو | یساقون العشیۃ یقتلونا
وہ بادشاہ جو کہ حجر بن عمرو کی اولاد تھے | اور جو قتل ہو کر رات کے آغوش میں پہنچ گئے ہیں
فلو فی یوم معرکۃ اصیبوا | ولکن فی دیار بنی مرینا
یہ صحیح ہے کہ وہ میدان جنگ میں مارے گئے | لیکن (ہائے کہاں؟) دیار بنو مرینا میں (جو کہ دشمن ہیں)
تظل الطیر عاکفۃ علیہم | وتنتزع الحواجب والعیونا
پرندے اُن (کی نعشوں پر) ہر وقت سایہ کر رہے ہیں۔ اور اُنکے ابرو اور آنکھوں کو اُن سے علیحدہ کر رہے
ہیں (یعنی کھائے جاتے ہیں)

کندہ کی بادشاہت بھی جلد ہی تباہ ہو گئی۔ حارث کے لڑکوں سلمہ اور شرحبیل میں
خانہ جنگی چھڑ گئی۔ شرحبیل کلاب میں مارا گیا۔ اس کے پس پردہ متعدد قبائل کی عداوت پوشیدہ
تھی۔ ان قبائل نے اسلام سے پیشتر ایام جاہلیت کی مشہور ترین جنگیں اور لڑائیاں چھیڑ دیں۔ امرأالقیس
نے اپنے اجداد کا انتقام لینے اور کندہ کی بادشاہت کو واپس لینے کی کوشش کی۔ وہ قیصر ...

[illegible] کی مدد حاصل کرنے کے لئے قسطنطنیہ گیا۔ اُسے امید تھی کہ حیرہ کا قریب ہونے کے باعث روما الصغریٰ کا قیصر اُسے مہربانی کی نظر سے دیکھے گا۔ لیکن یہ سب بے سود ثابت ہوا۔ کندہ کی بادشاہت ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی

باوجود اپنی چند روزہ میعاد حیات کے یہ بادشاہت عربوں کے مستقبل کے لئے غیر اہم ثابت نہیں ہوئی۔ آکل المرار کے عصائے حکومت کے نیچے اتنے قبائل عرب کا مجتمع ہوجانا ہمارے خیال میں جزیرہ نما کے وسطی قبائل کے ایک ہی سردار کے ماتحت مجتمع ہونے کی پہلی مثال ہے۔ یہ اُس تحریک کی تمہید نظر آتی ہے، جو کہ ایک صدی بعد بانی اسلام کے زیر اثر مختلف قبائل کے مجتمع ہونے کا باعث ہوئی۔ البتہ ہنوز وہ مذہبی پہلو مفقود تھا، جس نے اسلام کو ایسی عظیم الشان قوت بخشی۔ کندہ کی حکومت محمد صلعم کی وفات کے بعد قبائل عرب کی "ردت" کے زمانہ میں ختم ہوگئی۔ کندہ کی تباہی تو بہر حال ہونی تھی۔ لیکن اُس کے حالات پر غور کرنے سے یہ ایک نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک صدی میں عربوں نے حکومت کا نظام قائم کرنے میں کس حد تک ترقی کر لی تھی۔

حیرہ کے شمال میں اس طرح تین حکومتیں تھیں جنہوں نے عرب کی حکمرانی بانٹ رکھی تھی جن قبائل نے کہ ان حکومتوں کے قائم کرنے میں حصہ لیا وہ اکثر جنوبی عرب سے تعلق رکھتے تھے۔ کہا جاسکتا ہے کہ اُنکے خروج کی وجہ سے اُنکے ہمراہ تمدن کے اصول جن سے کہ شمال کے بادیہ گرد کم و بیش بےخبر تھے، اشاعت پذیر ہوگئے۔ عرب بالخصوص حیرہ و غسان کے عرب ایران و روما الصغریٰ کی جنگوں میں شریک رہتے تھے۔ اُنہوں نے قریب رہ کر ان دونوں سلطنتوں کے تمدنوں کو دیکھا۔ انہوں نے جنگی تجارب حاصل کئے اور اپنے زمانے کے فن حرب کے بہترین اساتذہ سے جنگی تعلیم حاصل کی۔ اس کی عربوں کے لئے جو اہمیت آگے چل کر ثابت ہوئی۔ اُسکا بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے یہ ایک طرح کی بیداری تھی، جو کہ آغاز اسلام کی

فتوحات کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ یہ خیال کہ خالد اور مثنیٰ یا ابو عبیدہ یا عمرو بن العاص اپنے قائم کے پیدا

ہوئے اور یکے بعد دیگرے دوں کی حالت سے باقاعدہ سپاہیوں کی جماعت میں بدل گئے

بالکل غلط ہے۔ عربوں کی ترقی ان کی فطری اور ادبی قوتوں میں تھی، جیسا کہ ہم آگے چل کر

دکھلائیں گے، یکساں نمایاں تھی۔

کتابخانه و مطبع بروخیم - طهران

انگلیسی‌دانها آگاه باشند

جلد اول فرهنگ جامع انگلیسی بفارسی تالیف آقای س. حییم که کتابخانه بروخیم مشغول

طبع آن بود از طبع خارج شد - این جلد دارای ۶۷۰ صفحه، هر صفحه دارای دو ستون و هر ستون دارای

۳۴ سطر میباشد - تعداد لغت و اصطلاح این فرهنگ تقریباً بشصت هزار بالغ میشود. صحت ترجمه لغات

زیبائی طبع، استحکام صحافی، و ارزانی قیمت است که این فرهنگ مفصل را بر فرهنگ‌های دیگر که

در خانه و خارجه بطبع رسیده ترجیح میدهد.

قیمت جلد اول ۳ تومان، برای اشخاصیکه هر دو جلد را پیش خرید میکنند ۵ تومان. پس از طبع

جلد دوم قیمت آن ۶ تومان خواهد بود.

جلد دوم در تحت طبع و شش ماه بعد از این تاریخ منتشر میشود. مخارج پست هر جلد در داخله

ایران ۲ قران و برای خارجه ۳ قران و نیم است

طهران ۱۵ امرداد ۱۳۰۸

مَن کی موج

(۱)

کل میرے ایک دوست نے کہا "دیکھو یہ پھول کتنا خوبصورت ہے۔" میں نے سنا اور نفرت سے منہ پھیر لیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد اُس نے ایک آدمی دکھایا اور کہا "یہ بڑا نیک ہے۔" میں پھر ادھر سے پلٹ گیا۔ لوگ خوبصورت، نیک، اچھا، بُرا اور اسی قسم کے لفظ بولتے ہیں، اور خوش ہوتے ہیں۔ میں انھیں سنتا ہوں تو رنجیدہ ہوتا ہوں۔ جیسے ہی میرے کانوں میں "خوبصورت" کی آواز آتی ہے، ویسے ہی اندر والا کہتا ہے کہ "پھر بدصورت بھی ہوگا!" جیسے ہی میں "نیک" سنتا ہوں، اندر والا پوچھتا ہے "پھر تو بد بھی کہیں ضرور ہوگا۔" اگر میں پرندہ ہوتا تو نیک، بد، حسین، کریہ غرضکہ سب اسمارِ صفات کی سطح سے اوپر اُڑ جاتا..........

میرے ایک دوست نے کہا "پاک اور عقلمند ہو، تو دنیا کو دس گنا زیادہ فائدہ پہونچے۔" میں نے کہا "تو پاکی کو دور کر دے اور عقل مندی کو ہٹا دے تو دنیا کو بیس گنا زیادہ فائدہ پہونچے۔" وہ خفا ہو گیا۔ وہی اسمائے صفات! کل میں ایک دکان پر گیا، وہاں دیکھا کہ ہر چیز پر رنگ برنگ کی چٹھیاں لگی ہوئی ہیں، جن پر قیمتیں لکھی ہیں۔ کیا انسانوں پر بھی چٹھیاں لگانے کی ضرورت ہے؟ پھر اسمائے صفات کیوں؟ اچھا کیوں؟ برا کیوں؟ نیکی کیوں؟ بدی کیوں؟ ایمانداری، بے ایمانی، فیاضی، کنجوسی، یہ سب کس لئے؟

میں نے ایک فقیر سے کہا: "لوگ فیاض ہوتے تو اچھا تھا!" اس نے مجھے بہت بُرا بھلا کہا۔ پھر میں نے ایک امیر سے کہا: "لوگ فیاضی کی تعریف نہ کرتے، تو اچھا تھا۔" اس نے

مجھے اپنے مکان سے نکلوا دیا۔ وہی اسمائے صفات انگلی پکڑے گلی گلی پھرتی کھڑی ہیں، پھر
دکھائی گئی، ہر صفت نیکی، فیاضی، ہمدردی، احسان، ظلم، کنجوسی، سب پہلے پیدا ہوئے، پھر ان کو
نام دیئے گئے۔ دریا سیدھا بہتا ہو، دیواریں کھڑی کر دو تو دریا الجھ جائے گا۔ اسی طرح دیواریں
کھڑی کرتے جاؤ، تو دریا پانی کی بھول بھلیاں بن جائے گا۔ یہی نام کا پھیرا صفت بندی، درجہ
بندی، اسم بندی، سب دراصل دیوار بندیاں ہیں۔ سیدھے راستے سے بہت کم لوگ بھٹکتے ہیں۔
کسی کو نیک مت کہو، کوئی برا نہ ہوگا۔ کسی کو سخی مت کہو، کوئی کنجوس نہ ہوگا۔ تیغ کی خواہش چھوڑ دو،
مکانوں سے پہرا ہٹا لو، چور ڈاکو غائب ہو جائیں گے۔ بہادری مٹا دو، بزدلی بھی مٹ جائے گی۔
حکم اٹھا لو، عدول حکمی نہ ہوگی، اچھی صفتیں اٹھا لو، بری صفتیں آپ جاتی رہیں گی۔ دنیا ان
دیواروں کو کیوں پسند کرتی ہے؟

من کی روشنی! یہ بڑی چیز ہے۔ میں اندھیری رات بھی ہو تو من کی روشنی میں سیدھا
اپنے گھر چلا جاتا ہوں۔ میرے دوست کے گھوڑے کا بھی یہی حال ہے۔ کل میں نے گلی میں رنگ
برنگ کی قندیلیں روشن کیں، فوراً پرچھائیں پڑنے لگیں، اور گھوڑا بدکنے لگا۔ رنگین روشنیاں نہ ہوتیں
تو رنگین پرچھائیاں بھی نہ ہوتیں۔ دوست نے پوچھا "یہ کیا کرتے ہو؟" میں نے کہا، اسمائے
صفات پیدا کرتا ہوں، نتیجہ تم دیکھ لو۔ رنگین قندیلیں اچھی صفتیں ہیں، پرچھائیاں بری صفتیں۔
اس کا نام مٹا دو تو اس کا نام بھی نہ رہے۔ من کی صاف سفید روشنی سنسار کے ہیر پھیر کے لئے
کافی ہے۔ دیکھیں اس پہیلی کو کون بوجھتا ہے؟

---

(۲)

"دنیا بدل رہی ہے"

کل اتفاقاً یہ الفاظ مجھے سنائی دیئے۔ میں حسب دستور اپنے مکان کے دروازے پر

[illegible] مزدوروں نے لکڑی اور بانس کا ایک بڑا اونچا مچان بنایا ہے۔ بدن [illegible] بھاری بھاری پتھر سر پر رکھے ہوئے اس مچان پر چڑھ رہے تھے۔ میں انہیں دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا...... میں سوچ رہا تھا کہ کیا اس مکان، اس مچان، ان مزدوروں کی طرح ہم سب اس سنسار میں اپنی بلندی دوسروں کی بلندی کے لئے بناتے ہیں؟...... کیا آتش بازی کی ہوائی کی طرح ہم سب محض اس لئے اوپر اُڑتے ہیں کہ نیچے والے ہمیں دیکھکر خوش ہوں؟......" اتنے میں میرے کان میں یہ الفاظ پڑے:

"دنیا بدل رہی ہے"

میں نے مڑکر دیکھا۔ میرا دوست ہاتھ میں ایک اخبار لئے ہوئے کھڑا تھا، آنکھوں میں چمک، ہونٹوں پر ویسی ہی ہنسی جیسی بالک سپنے میں ہنستے ہیں ــــ کہنے لگا:۔ "جانتے ہو یہ کیا بن رہا ہے؟ یہاں بے تار کی خبر رسانی کا اسٹیشن ہوگا۔ ولایت کے گانے، امریکہ کی تقریریں یہاں سنائی دینگی ــــ دنیا بدل رہی ہے"

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ میں جب کبھی "بیسویں صدی" "نیا زمانہ" "نئی دنیا" "نئے خیالات" اور اسی سانچے کے ڈھالے ہوئے دوسرے الفاظ سنتا ہوں، تو بے اختیار ہنس دیتا ہوں، میں نے جواب دیا "ہاں! پُرانی آتما نیا روپ لے رہی ہے، پُرانے چھلکے پر نیا چھلکا نکل رہا ہے، لیکن گودا وہی ہے جو ویدوں کے زمانے سے پہلے تھا" میرے دوست نے اپنی عادت کے موافق بڑے زور سے قہقہہ لگایا۔ کہنے لگا "تم نے تو دنیا تج دی ہے، جگ کے اُلٹ پھیر تم کیا جانو؟ کل صبح زبردستی تم کو اپنے ساتھ لے چلوں گا، تب تم کو معلوم ہوگا کہ ہماری دھرتی کروٹ لے رہی ہے یا نہیں؟" یہ کہا اور ہنستا ہوا چلا گیا ــــ

میں دور تک اسے دیکھتا رہا۔ کیسے بے فکر اور بھولے لوگ ہیں؟ ایک جیب میں ولایتی سونا ہے، دوسرے میں دیسی کسوٹی۔ اُسے اس پر کستے ہیں، زرد لکیر دیکھکر اسے کندن سمجھتے ہیں

اصل بدلنا کچھ اور ہے! میں پہچان گیا ہوں اور ترقی پسندی کی آڑ میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ وہ آگے تو
پاؤں کے کچھے، اسی طرح اپنی ترقی پسندیوں کا بھاری بوجھ پیٹتے اور پیٹتے جا رہے تھے!

آج پھر دوست مجھے دن بھر شہر میں ادھر اُدھر پھراتا رہا۔ اس نے مجھے نئی نئی عمارتیں دکھائیں، پرانے اینٹ پتھر کے نئے استھان! پرانی آتما کے نئے چولے!! "یہ نئی سڑک ہے، اس پر ٹریم چلے گی"...... "یہ نیا بنک گھر ہے"۔ "یہ نئی دوکان ہے" "یہ نئے قسم کا مدرسہ ہے" ...... خدا معلوم کیا کیا بتاتا رہا، اور باتیں کرتا رہا۔ وہ بہت خوش تھا، جیسے لڑکیاں ہنس ہنس کر اپنی سہیلیوں سکھیوں کو پرانی گڑیوں کے نئے زیور دکھاتی ہیں۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آنکھیں نئے نئے روپ دیکھ رہی تھیں، کانوں میں اس کی آواز آ رہی تھی لیکن اندر والا گھڑی کی ٹک ٹک کی طرح یہ کہہ رہا تھا "اصلی بدلنا تو کسوٹی کا ہے" جب تھک گیا تو کہنے لگا "اب بھی قائل ہوئے کہ نہیں! شانتی اور بدل رہا ہے، دنیا بدل رہی ہے" میں ٹھنڈی سانس بھر کر چپ ہو گیا۔

سامنے ایک حلوائی کی دکان تھی، ترازو ہاتھ میں لئے ہوئے کچھ تول رہا تھا۔ میں اپنے دوست کا ہاتھ پکڑ کر اسے وہاں لے گیا۔ حلوائی سے کہا:

"لالہ! دنیا بدل رہی ہے، تم اپنے باٹ بدل دو" ہنسنے لگا۔ کہا "ہمارے یہاں اسی کا چلن ہے، گاہک نہیں مانتے ......" پھر ایک بزاز کے یہاں گئے، کپڑا ناپ رہا تھا۔ میں نے کہا "اپنا گز نہیں بدل دیجئے" اس نے منہ پھیر لیا.......

راستے میں ایک سپاہی ملا، اُس کے ساتھ ایک بھلا مانس تھا، ہاتھ میں ہتکڑی، آنکھ میں شرافت! میں نے کہا "جمعدار صاحب! اسے کیوں پکڑا ہے؟" کہنے لگا "اس نے اپنے بھوکے بچوں کے لئے آٹا چرایا ہے" میں نے کہا "کیا کوتوال صاحب نے چوری کا معیار ابھی نہیں بدلا؟" وہ مجھے بُری نظروں سے گھورتا ہوا چلا گیا۔ سچا اصول اندر ہی کا چلن ہوتا ہے!

مجھے بھی دو روپے پکڑا کر ایک مکان میں جا پہنچے، ایک کواڑ کے تختے پر چڑھے ہوئے ٹین پر میں لکھا ہوا تھا "سیٹھ اشرفی لال کا یتیم خانہ" ہزاروں یتیم اور بچے جمع تھے۔ زبردستی کے یتیم! کام کے نکمے!! میں نے داروغہ سے پوچھا "بھائی! انہیں خیرات کیوں دیتے ہو؟" کہنے لگا "نیک کام ہے، سیٹھ کی دیا معلوم ہوتی ہے، فیاضی ہے۔" نیک کام! دیا!! فیاضی!!! سب وہی پرانے سانچے، کیا واقعی دنیا بدل رہی ہے۔

پرانے باٹ، پرانا گز، پرانا قانونی معیار، پرانا اخلاقی معیار! دنیا میں ہر طرف وہی پرانی کسوٹی! اور اندر سے آتما کی وہی پرانی گھڑی کی سی ٹک ٹک "اصلی بدلنا تو کسوٹی کا ہے" ۔۔۔ میں نے اپنے دوست کی طرف غور سے دیکھا، اس نے آہستہ سے کہا "معلوم ہو گیا، اب لوٹ چلو۔"

دھرتی آئے دن نیا سونا اگلتی ہے، سنسار اپنا روپ نت نیا بدلتا ہے، پرانے باٹ گھس گئے، پرانے گز چھوٹے ہو گئے، بہت سے پرانے جرم ہلکے ہو گئے، پرانی نیکیاں، بدیاں بنیں، پرانی بدیاں نئے سانچوں میں ڈھلیں، پھر دنیا انہیں کیوں نہیں بدلتی؟ بالکوں کی طرح ٹوٹے ہوئے کھلونوں کو کلیجے سے کیوں لگائے ہوئے ہے؟ ست جگ کے ست کو کلجگ میں بھی ست کیوں جانتی ہے؟ ایک یتیم خانہ بنا کر دس کی بنیاد کیوں رکھتی ہے؟ آج سانپ کی رکھشا کر کے کل نیولا کیوں پالتی ہے؟ .... نئے کندن کے لئے نئی کسوٹی کیوں نہیں ڈھونڈھتی؟ وہی حلوائی کی بات:

"گاہک نہیں مانتے"

اب میرا دوست دھرتی کی کروٹ کا قائل نہیں رہا، میں اس سے کبھی کبھی ہنسی سے پوچھتا ہوں "دنیا کب بدلے گی؟" اس سوال کو سن کر اس کی حالت بدل جاتی ہے۔ آنکھیں پھیل کر ایسی ہو جاتی ہیں جیسے کوئی شام کے دھندلکے میں دور کی چیز دیکھ رہا ہو، وہ بہت دیر

مگر اس سے جواب دیتا ہے:

جب تک آئیں گے:

(باقی آیندہ)

غزل

جناب دل شاہجہانپوری

جو پائے حقیقت ہوں عالم سے بیگانہ
دل اُن کا کعبہ ہے رُخ جانب بتخانہ

تاثیر بیاں بڑھ جائے اے گردش پیمانہ
ساقی کو سنانا ہے افسانہ در افسانہ

ہر ذرے میں درپردہ اک شعلہ بھڑکتا ہے
اے اہل نظر دیکھو خاکستر پروانہ

پردے سے عیاں ہو کر پردے میں نہاں ہوجا
چھا جائیگی خود غیرت اے جلوۂ جانانہ

ہے مشرب رنداں میں انداز طلب یہ بھی
ہر گردش ساغر پر اک نعرۂ مستانہ

جب صاعقہ لہرائے حد جادۂ منزل کی
چل وادیِ ایمن تک سن طور کا افسانہ

یوں جل کے سر محفل تصویر وفا کھینچی
پھرتی ہے نگاہوں میں جانبازیِ پروانہ

حالات الم کہکر بیمار نے دم توڑا
آخر کا یہی ٹکڑا تھا حاصل افسانہ

کیا جانئے کہاں موجیں کھینچے لئے جاتی ہیں
پہنچا ہی دیں ساحل تک اے ہمت مردانہ

دنیا بحقیقت میں آزاد تعین ہیں
ہم نے کبھی ٹکرایا کعبہ سے نہ بتخانہ

اک مست ابھی اے دل کہتا ہوا گذرا ہے
صد زہد بیک جرعہ نذرے میخانہ

ڈراما کیا چیز ہے؟

میں ہندوستانی اکادمی کی فرمائش سے برنارڈ شا کے ناٹک سینٹ جون کا ترجمہ کر رہا ہوں اور اس پر مقدمہ بھی لکھ رہا ہوں۔ یہ اس مقدمے کا پہلا خاکہ ہے جو مکرمی جناب ڈاکٹر تارا چند صاحب سکریٹری ہندوستانی اکادمی کی اجازت سے جامعہ میں شائع کیا جاتا ہے۔

(۱)

آرٹ کی تعریف — قبل اس کے کہ ہم ڈراما کی ماہیت سے بحث کریں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آرٹ کی مختصر سی تعریف کر دی جائے۔ آرٹ کا لفظ اب اردو زبان میں کثرت سے استعمال ہونے لگا ہے لیکن اس کا کوئی واضح مفہوم ہم لوگوں کے ذہن میں نہیں ہے۔ اصل میں یہ دو مختلف معانی پر حاوی ہے

(۱) وہ تخلیقی قوت جس کے ذریعے سے انسان مادی اشیا یا ذہنی تصورات کی تشکیل اس طرح کرتا ہے کہ وہ حسین بن جاتی ہیں، یعنی ان میں ایک خاص ترتیب، تناسب یا توازن پیدا ہو جاتا ہے اور وہ شائق جمال کے ذوق کو جو ہماری طبیعت کا فطری خاصہ ہے تسکین دیتی ہیں۔ مثلاً مصوری یعنی وہ قوت جس کے ذریعے سے سطح کاغذ پر دلکش اور خوشنما نقوش بنائے جاتے ہیں۔

(۲) وہ چیزیں جو اس قوت تخلیق کے محسوس مظاہر ہیں تصویر، نغمہ، شعر وغیرہ دوسرے الفاظ میں آرٹ صناع کے کمال کو بھی کہتے ہیں اور ان مصنوعات کو بھی جن میں یہ کمال ظاہر ہوتا ہو۔

غرض آرٹ ایک طرح کی صنعت ہے لیکن اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا اصل مقصد افادی یا اقتصادی نہیں ہوتا بلکہ جمالیاتی ہوتا ہے یعنی وہی ذوق جمال کو تسکین دینا۔ اس کے لئے

یہ ضروری نہیں ہے کہ موضوع صنعت خود حسین ہو بلکہ حسن طرز ادا کی خوبی اور دلکشی سے پیدا ہوتا ہے البتہ یہ شرط ہے کہ موضوع میں تناسب اور ہم آہنگی سے فنکارانہ تشکیل پانے کی صلاحیت موجود ہو اب چاہے صناع اس کی عکسی تصویر پیش کرے یا اس میں اپنے تخیل سے رنگ آمیزی کرے۔

آرٹ زندگی کی دوسری قدروں یعنی مذہب اخلاق یا علم و حکمت وغیرہ کے مقابلے میں اپنا ایک مستقل وجود رکھتا ہے لیکن ان سے بے تعلق نہیں ہوتا۔ مثال کے لئے شعر کو لیجئے۔ اس کے ناقص یا کامل ہونے کا معیار مذہب اخلاق اور علم سے بالکل الگ ہوتا ہے۔ شعر میں ہم جو چیز ڈھونڈھتے ہیں اور جس سے شاعری کی جان سمجھتے ہیں وہ روحانی معرفت یا اخلاقی بصیرت یا علمی حقیقت نہیں بلکہ خیالات اور الفاظ کی خوشنمائی ترتیب، ہم آہنگی، روانی اور دلکشی ہے جس کے ذریعے سے شاعر کا تخلیق حسن کا شوق اور شعر فہم کا مشاہدۂ جمال کا ذوق پورا ہوتا ہے یہ سچ ہے کہ شعر کا موضوع انسانی زندگی اور عالم فطرت کا ہر جلوہ ہے اس لئے اس میں کبھی کبھی مذہبی عقیدت کا اظہار یا نیکی کی تلقین یا علمی حقائق کی تعلیم بھی ہوتی ہے لیکن مخصوص شاعرانہ رنگ میں جس میں خیالات کا وزن اتنا نہیں ہونے پاتا کہ طرز ادا کی سبک روی میں خلل پڑے۔

آرٹ سب سے زیادہ موثر اس وقت ہوتا ہے جب اسکا موضوع انسان کی زندگی اس کے جذبات، اس کے خیالات، اس کی آرزوئیں اور اس کے کام ہوتے ہیں۔ بعض فنون لطیفہ مثلاً موسیقی، نقاشی، سنگتراشی وغیرہ میں ہمیں انسانی زندگی کے کسی ایک پہلو کی جھلک دکھائی دیتی ہے لیکن ادب کے بعض شعبوں مثلاً شعر، ناول، ڈراما وغیرہ میں کبھی کبھی زندگی کا مجموعی مرقع نظر آتا ہے۔ جو ہمارے لئے نہایت دلچسپ ہے اور جس کا اثر ہمارے دل پر بہت گہرا اور بہت دیرپا ہوتا ہے۔ یہ مرقع بظاہر ایک شخص یا چند اشخاص کی زندگی کا ہوتا ہے۔ لیکن اس میں کچھ ایسی قوت محرکہ پنہاں ہوتی ہے کہ انسان کا تصور ساری نوع انسانی کی زندگی پر پھیل کر اس میں یوں جذب ہو جاتا ہے جیسے سمندر میں کنکری پھینکنے سے

[illegible] ہر شخص [illegible] ان کی [illegible] پہلی [illegible] وقت میں محو ہو جاتے۔ یہ عنصر تعریف میں
[illegible] کی نظر آرٹ کے اکثر شعبوں میں پایا جاتا ہے لیکن اس کا اظہار پوری طرح
ڈراما میں ہوتا ہے۔

(۲)

ڈراما بحیثیت آرٹ کے ایک شعبے کے | ڈراما یونانی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مصدر δραω ہے جس کے معنی ہیں کر کے دکھانا۔ یہ ادب کی اس صنف کا نام ہے جس کے ذریعے سے انسانی زندگی کے واقعات محض بیان کئے جانے کے بجائے کر کے دکھائے جا سکیں۔ ڈراما میں شاعر کو جو قصہ بیان کرنا ہوتا ہے اسے چند اشخاص کی گفتگو کے پیرائے میں بیان کرتا ہے اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ ان اشخاص کا بھیس بدل کر انکی گفتگو اور انکے کاموں کو دہرائیں تاکہ دیکھنے والوں کو سارا ماجرا آنکھوں کے سامنے گزرتا نظر آئے۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ بہت دلپذیر اور موثر ہے اور ادب کے کسی اور شعبے کو یہ بات نصیب نہیں ہو سکتی۔

پہلے ڈراما شاعری کا ایک جزو سمجھا جاتا تھا اور ہمیشہ نظم میں لکھا جاتا تھا لیکن رفتہ رفتہ اس نے ایک مستقل ادبی صنف کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اب اس کے لئے نظم کی شرط نہیں رہی بلکہ نظم میں ڈراما لکھنے کا رواج بہت کم ہو گیا ہے۔

ڈراما اور ناول میں یہ بات مشترک ہے کہ دونوں انسانی زندگی کے مختلف جلوے دکھاتے ہیں۔ لیکن ناول کا اثر صرف تخیلی مشاہدے پر پڑتا ہے اور ڈراما کا حسی مشاہدے پر بھی۔ ناول میں مصنف دوسروں کی سرگذشت بیان کرتا ہے مگر ڈراما میں وہ خود اشخاص کو گفتگو کرنے دیتا ہے اور انہی گفتگو میں ان کی جذبات، انکے خیالات، ان کی سیرت ان کا عمل غرض ان کی ساری زندگی دکھاتا ہے۔ ناول لکھنے والا آزاد ہے کہ اپنی کہانی کو سو صفحے میں لکھے یا ہزار صفحے میں کیونکہ ناول پڑھنے والے کے لئے وقت کی کوئی پابندی نہیں مگر ڈراما لکھنے والے کو یہ اندازہ کرنا پڑتا ہے کہ قصہ [illegible] ڈھائی تین گھنٹے میں دکھایا جا سکے۔ اس سے زیادہ یا اس سے کم نہ ہو

ناول میں واقعات [illegible]

وقت کے طول کو صرف تخیل کے سامنے پیش کر سکتا ہے مگر ڈرامہ میں قصہ [illegible]
پڑتا ہے کیونکہ یہاں وقت کے طول کا مشاہدہ کرانا ہے۔ ناول میں ایک شخص کے پیدا ہونے سے
لے کر اس کے مرنے تک کے حالات تفصیل سے بیان کئے جا سکتے ہیں مگر ڈرامہ میں چند دنوں
یا چند ساعتوں کے واقعات میں اس کی زندگی کی مکمل تصویر دکھانی پڑتی ہے۔ غرض بمقابلہ ناول
کے ڈرامہ میں کہیں زیادہ پابندیاں اور دشواریاں ہیں۔ یہاں بہت محدود ذرائع سے کام لیکر
بہت گہرا اثر پیدا کرنا ہے اس لئے نہایت واضح مشاہدے، صحیح قوت انتخاب اور موثر طرز ادا
کی ضرورت ہوتی ہے۔ فرض کیجئے کوئی شخص اکبر اعظم پر ایک ڈرامہ لکھتا ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ وہ
اکبر کے سوانح حیات پر اتنا عبور رکھتا ہو اور اس کا تصور اتنا واضح ہو کہ قصہ لکھتے وقت اس بادشاہ
کی ساری زندگی متحرک تصویروں کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر جائے۔ اب اس کی
قوت انتخاب کا کام ہے کہ ان میں سے چند تصویریں چھانٹ لے جو اتنی موثر اور اتنی معنی خیز ہوں
کہ دیکھنے والا ان کے بیچ کے خلو کو آسانی سے پر کر سکے اور اسے پورا سلسلہ نظر آ جائے۔ ظاہر ہے کہ
ان تصویروں کو دکھانے کے لئے اس کے پاس صرف دو ذریعے ہیں گفتگو اور عمل، انہیں دونوں
چیزوں کے ذریعے سے اُسے اکبر اور اُس کے زمانے کے لوگوں کی سیرت، اُنکے جذبات و خیالات
اُنکے اغراض و مقاصد، اُن کے آپس کے تعلقات، اُن کی باہمی کشمکش، ان کی کامیابی اور ناکامی
کا نقشہ کھینچنا ہے۔ اس لئے وہ ایسے الفاظ اور ایسے اعمال اختیار کرے گا جو چشم و گوش کو فوراً
متوجہ کرلیں، ادراک میں سما جائیں دل میں بیٹھ جائیں، وہ اس کا بھی خیال رکھے گا کہ گفتگو اور عمل
میں صحیح تناسب قائم رہے۔ جہاں تک اسٹیج کے ذرائع اور اثر آفرینی کے اصول اجازت دیتے ہیں
وہ واقعات کو عمل کے ذریعے سے دکھائے گا لیکن جب ان کو دکھانا ناممکن یا نامناسب ہو تو ان کا
ذکر گفتگو میں لے آنے پر اکتفا کرے گا۔ غرض اس کی کوشش یہ ہوگی کہ اس کے ناٹک کا پڑھنے والا
دو گھنٹے کے مطالعے میں اور اس کا تماشا دیکھنے والا تین چار گھنٹے کے تماشے میں اکبر [illegible]

[illegible] لیکن واضح رہے کہ ڈراما کو آرٹ کے معیار پر پہنچنے کے لئے [illegible] ایک نظر ڈالی ہے جو سب سے زیادہ ضروری ہے۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ [illegible] عمومیت [illegible] دکھانا یعنی انفرادیت میں عمومیت پیدا کرنا ڈراما کا اہم ترین مقصد ہے اس لئے جس ناٹک کا ذکر اوپر کی مثال میں ہے وہ کامیاب اس وقت کہلائے گا جب اس میں اکبر اور اس کے ساتھیوں کے حالات اس طرح دکھائے جائیں کہ دیکھنے والے پر زندگی کے گہرے راز جو اکبر میں اور نوع انسانی کے ہر فرد میں مشترک ہیں کھل جائیں۔

ابتک ہم نے ڈراما پر بحیثیت آرٹ کے ایک شعبے نظر ڈالی ہے اور یہی اس کی اصلیت ہے جیسا ہم پہلے کہہ چکے ہیں اس کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے ذوق مشاہدہ کو انسانی زندگی کا دلکش جلوہ دکھا کر تسکین دے۔ اس سے ضمنی طور پر کسی خاص اخلاقی، سیاسی، معاشی نظریے کی تبلیغ، اعام اصلاح اور تعلیم کا کام بھی لیا جا سکتا ہے اور ہمیشہ لیا گیا ہے۔ لیکن اس کا مناسب طریقہ یہ ہے کہ اس ضمنی مقصد کے لئے کھلی ہوئی کوشش نہ کیجائے بلکہ وہ تماشے کے لطف کے ساتھ پردے پردے میں حاصل ہو جائے۔ اگر اصلاحی یا تعلیمی رنگ غالب آگیا تو پھر ڈراما ڈراما نہیں رہتا بلکہ ایک اخلاقی قصہ بن جاتا ہے اور خالص آرٹ کے دائرے سے باہر ہو جاتا ہے۔

(۳)

ڈراما کے بنیادی عناصر ڈراما دو بنیادی عناصر سے مرکب ہے جو مساوی اہمیت رکھتے ہیں (۱) قصہ (۲) اشخاص۔

ڈراما کے قصے کے لئے یہ شرط ہے کہ اس کے واقعات بہت موثر اور جاذب نظر ہوں، ہر چیز کرکے دکھائی جا سکے، کوئی جزو ایسا نہ ہو کہ مصنف کو الفاظ میں سمجھانے یا بیان کرنے کی ضرورت ہو۔ قصے کے کچھ اجزا خصوصاً ایسے جن کے دیکھنے سے کراہت ہو اگر عمل کے ذریعے نہ دکھائے جائیں بلکہ اشخاص کی گفتگو میں انکا ذکر آئے تو کوئی حرج نہیں لیکن ایسے حصے ڈراما میں جتنے کم ہوں اچھا ہے، کیونکہ جب کوئی ناٹک تھیٹر میں دکھلایا

جب آپ تو دیکھنے والے سامنے قصے کو آنکھ سے دیکھنا چاہتے ہیں [illegible] ان سے [illegible]
انہیں اطمینان نہیں ہوتا۔

قصے کو زیادہ دلچسپ اور دلنشین بنانے کے لئے ضروری ہو کہ واقعات کا رخ بالکل سیدھا اور یک رنگ نہ ہو بلکہ اُن کا رجحان کم سے کم دو مختلف سمتوں میں ہو، تاکہ دیکھنے والے کو آخری سین تک یہ اشتیاق رہے کہ انجام کیا ہوگا۔ اس اثر کو گہرا کرنے کے لئے ڈراما میں دو یا زیادہ قوتوں کی باہمی نزاع اور کشمکش دکھائی جاتی ہے خواہ یہ مجرد قوتیں مثلاً تقدیر، تدبیر نیکی اور بدی وغیرہ ہوں یا اشخاص اور جماعتیں ہوں۔

سب سے اہم بات جو ہم پہلے کہہ چکے ہیں یہ ہے کہ قصے کے واقعات سے عمومیت ظاہر ہو یعنی دیکھنے والے پر یہ اثر پڑے کہ زندگی کے جو نشیب و فراز، قصے کے اشخاص کو پیش آئے ہیں وہ دنیا میں سب کو پیش آیا کرتے ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہو تو ڈراما محض تھوڑی دیر کے لئے ہمیں متوجہ کر سکے گا اور ہمارے دل پر اس کا کوئی گہرا نقش نہ بیٹھنے پائے گا۔

اشخاص کی اہمیت ڈراما میں ناول سے اور افسانے کی دوسری اصناف سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ یہاں مرقع کی مرکزی تصویر انسان کی ذات ہو اور خارجی دنیا محض پس منظر کا کام دیتی ہے۔ عالم فطرت کے جلوے دکھائے جاتے ہیں انکا مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کے آئینے کے لئے زنگار کا کام دیں۔ اور چونکہ ڈراما کو فوری اور قوی اثر پیدا کرنے کے لئے ہر نقش میں گہرا رنگ بھرنے کی ضرورت ہو اس لئے اشخاص کی سیرت میں بھی تازگی اور زندگی پیدا کرنے میں خاص اہتمام کرنا پڑتا ہے۔

ڈراما نگار کے لئے اشخاص کی اندرونی زندگی کی واضح اور جاذب نظر تصویر کھینچنا جتنا ضروری ہو اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ اُسے اس کی اجازت نہیں کہ ناول لکھنے والوں کی طرح کسی شخص کی نفسی کیفیات کی تحلیل اپنی طرف سے کر سکے۔ اس کے اشخاص خود اپنی گفتگو اور اپنے عمل سے اپنی سیرت کا اظہار کرتے ہیں۔ اس اظہار کے لئے مناسب موقعے پیدا کرنا ایک دوسرے [illegible]

جائے اور مختلف اشخاص کی زبانی ان کی گفتگو سے ہر ایک کے دل کی گہرائی پر روشنی پڑے، ان میں باہمی کشمکش پیدا کرے لیکن ان کی خصوصیات اپنی صحیح ابھر آئیں یہی ڈراما نگاری کا کمال ہے۔

مگر اس سے بھی زیادہ کمال یہ ہے کہ اشخاص میں انفرادیت کے ساتھ ساتھ جو اُن کی ناگزیر صفت ہے ایک طرح کی عمومیت پیدا کیجائے۔ شخص یا کیرکٹر کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ اپنی سیرت میں جداگانہ اور مخصوص صفات رکھتا ہو جو اُسے دوسروں سے ممتاز کریں۔ ڈراما نویس مجبور ہے کہ اکثر صورتوں میں اس شان کو قائم رکھے۔ لیکن اسی کے ساتھ اُس سے یہ بھی توقع کیجاتی ہے کہ وہ اپنے قصے کے اہم اشخاص کو کسی طبقے، کسی جماعت یا پوری نوعِ انسانی کے نمائندوں کی حیثیت سے پیش کرے تاکہ اُس کی مثال دوسروں پر بھی صادق آسکے۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے مختلف تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ جن کا ذکر آگے آئے گا۔

اوپر کے صفحوں میں ڈراما کے بنیادی عناصر کا عام حیثیت سے ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن ڈراما کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں اور ہر قسم میں یہ عناصر ایک خاص صورت اختیار کرتے ہیں اس لئے ان سے کسی قدر تفصیلی بحث کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اقسام ڈراما کے ذکر کے سلسلے میں ان پر جدا جدا نظر ڈالی جائے۔

(۴)

ڈراما کی قسمیں | ڈراما کے قصے کا پڑھنے والوں اور دیکھنے والوں کے احساس و جذبات پر جو عام اثر پڑتا ہے اُس کے لحاظ سے اس کی دو قسمیں ہیں (۱) المیہ (۲) فرحیہ۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ ڈراما میں جذبات پر بہت گہرا اثر ڈالنا ہوتا ہے تاکہ تھوڑی سی دیر میں دیکھنے والے کا احساس و مشاہدہ کافی لطف اندوز ہو سکے۔ جس طرح انسان کے سارے جذبات میں احساس کی دو بنیادی کیفیتوں راحت و الم میں سے کوئی کیفیت ضرور موجود ہوتی ہے اسی طرح ڈراما کے پڑھنے یا دیکھنے سے جو جذبات پیدا ہوتے ہیں اُن میں بھی راحت یا الم کا

کت مرتب ہوتا ہو۔ کبھی ڈراما زندگی کا تاریک پہلو دکھاتا ہو اور دیکھنے والے کے دل پر رقت طاری ہو
کے ساتھ حسرت والم کی کیفیت طاری کر دیتا ہے۔ کبھی فرحناک پہلو کا منظر دکھاتا ہو اور انسان کو خوش
ہی نہیں بلکہ مسرور بھی کرتا ہو۔ یوں تو ہر ڈرامے میں یہ دونوں رنگ موجود ہوتے ہیں لیکن کسی میں
ایک غالب ہوتا ہے اور کسی میں دوسرا۔ جس ڈرامے میں الم کا رنگ زیادہ گہرا ہو وہ المیہ کہلاتا ہو
جس میں راحت کا ہو اسے فرحیہ کہتے ہیں۔ بعض وقت المناک اور فرحناک عناصر کا پلہ برابر
ہوتا ہے۔ ایسے ڈراما کو ہم المفرحیہ کہہ سکتے ہیں اور اسے ایک تیسری قسم قرار دے سکتے ہیں لیکن
زیادہ رواج ڈراما کی دو ہی قسموں نے پایا ہے۔ اس لئے ہم صرف انہیں ذکر کریں گے۔

المیہ | جو شخص شاہدۂ نفس سے کام لیتا ہے وہ جانتا ہے کہ الم کا جذبہ راحت سے زیادہ قوی
گہرا اور دیرپا ہوتا ہو۔ راحت و مسرت سے انسان کے جسم و روح پر ایک مستی سی چھا جاتی ہے
ایک نشہ سا مسلط ہو جاتا ہے اس لئے اس کا احساس کسی قدر کند ہو جاتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ
انتہائی خوشی کے عالم میں انسان کو اپنی کچھ خبر نہیں رہتی۔ اور جب یہ کیفیت گذر جاتی ہے تو اسے
ہوش آتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتنا خوش تھا۔ برخلاف اس کے الم حس اور ادراک کو اس
قدر تیز کر دیتا ہے کہ انسان کو اس کی ہر خلش، ہر کسک، صاف محسوس ہوتی ہے۔ جب تک ہم کسی
جسمانی یا روحانی کرب میں مبتلا رہتے ہیں۔ اس کا احساس ہمارے دل پر چھایا رہتا ہے کسی دوسرے
احساس کو ابھرنے نہیں دیتا۔ اس لئے ڈراما کی دو خاص قسموں میں سے المیہ اثر کے لحاظ سے
فرحیے سے بہت بڑھا ہوا ہے چنانچہ پہلے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ڈراما کا اصل آرٹ المیے میں ظاہر
ہوتا ہے اور فرحیہ محض ایک دل بہلانے کا کھلونا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خیال مبالغے پر مبنی تھا اور
جدید زمانے میں غالباً شیکسپیر کے فرحیوں کے دیکھنے کے بعد اہل نظر اسے بدلنے پر مجبور ہوئے
لیکن اس میں اب بھی کسی کو کلام نہیں ہو سکتا کہ دنیا کی ہر زبان میں بہترین ناٹک تقریباً
سب کے سب المیے ہیں۔

المیے کے پڑھنے یا دیکھنے سے جو کیفیت لوگوں کے قلب میں پیدا ہوتی ہے اس میں

سب سے پہلا ان حسرت ناک واقعات ہیں لیکن ان کے ساتھ خوف و حیرت، ہمدردی اور تعریف بھی پیدا ہوتی ہے۔ بجز اس کے محض رنج و مصیبت کی تصویر ہو جس کے دیکھنے سے سوائے غم اور اندوہ افسوس اور رقت کے اور کوئی اثر دل پر نہ ہو وہ المیہ نہیں بلکہ میلوڈراما (رقت انگیز ڈراما) کہلاتا ہے۔ کسی شرابی کا شراب خوری کی بدولت، تباہ ہو جانا، کسی جواری کا قمار بازی کے پیچھے گھر بار لٹا دینا، ایسے واقعات ہیں جنہیں دیکھ کر رنج ہوتا ہے تکلیف پہنچتی ہے لیکن سوائے ان لوگوں کے جن کی طبیعت میں غیر معمولی درد ہو کسی کو ان بدنصیبوں سے ہمدردی نہیں ہوتی اس لئے یہ واقعات میلوڈراما کے موضوع ہو سکتے ہیں مگر المیے کے نہیں۔ کسی بیمار کے جسمانی یا دماغی آلام، کسی مفلس کی فاقہ کشی کی مصیبت دیکھنے والوں کے دل میں افسوس کے ساتھ ہمدردی کے جذبات بھی پیدا کرتی ہے لیکن بجائے خود تعریف کی مستحق نہیں اس لئے جو قصہ محض ان چیزوں کے ذکر پر مبنی ہو اس میں المیے کا رنگ پیدا نہ ہوگا۔ المیے کی شان یہ ہے کہ اس کا ہیرو بلند ہمت اور بلند سیرت ہو اس پر کوئی ایسی مصیبت پڑے جو دل میں رعب اور دہشت پیدا کرتی ہو، جس میں خود ہیرو کا قصور نہ ہو یا ہو بھی تو نیک نیتی سے، وہ ہمت اور شجاعت سے اس مصیبت کا مقابلہ کرے، مگر آخر میں مغلوب ہو کر ہلاک یا تباہ ہو جائے۔ مثال کے لئے شیکسپیر کا المیہ آتھیلو لے لیجئے۔ آتھیلو ایک عرب نسل کا سپاہی ہے جو وینس کی جمہوری ریاست میں سپہ سالاری کی خدمت پر مامور ہے۔ وینس کے ایک امیر کی لڑکی ڈیسڈیمونا اس پر عاشق ہو جاتی ہے اور آتھیلو بھی اس کی محبت میں وارفتہ ہو جاتا ہے۔ باوجود ڈیسڈیمونا کے باپ کی مخالفت کے وینس کے فرمان روا ڈیوک کے حکم سے ان دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔ آتھیلو کا ایک بدنفس ماتحت ایاگو کچھ کینہ پروری کی وجہ اور کچھ مقتضائے طبیعت سے اس کے دل میں یہ شبہ پیدا کر دیتا ہے کہ ڈیسڈیمونا ایک اور فوجی افسر کیسیو سے ناجائز محبت رکھتی ہے۔ ایاگو کی شیطانی چالوں سے، آتھیلو کا یہ شبہ یقین کے درجے تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ ڈیسڈیمونا کو قتل کر دیتا ہے اور اس کے بعد خود بھی جان دیدیتا ہے۔
اس ڈراما کو پڑھئے تو آپ دیکھیں گے کہ آتھیلو کی بہادری، بلند حوصلگی، عالی ظرفی، سادگی

اور ڈیسڈیمونا کا حسن، اس کا بھولا پن، اس کی محبت، عفت، وفاداری، ہم سب کو ابتدا سے موہ لیتی ہیں اور ہم ہیرو اور ہیروئن سے سچی محبت اور ان کا سچا احترام کرنے لگتے ہیں۔ پھر رقابت کا جذبہ جو آتھیلو کے سینے میں جہنم کی آگ کی طرح بھڑکتا ہے اور اس کے جسم و روح کو جلائے ڈالتا ہے ہماری طبیعت میں ایسی گہری دہشت پیدا کرتا ہے جو شاید سخت سے سخت جسمانی اذیت کا منظر دیکھ کر بھی نہ پیدا ہوتی۔ آتھیلو جس جواں مردی اور عالی ظرفی سے اس جذبے کو دبانے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے دیکھ کر ہم بے اختیار اس کی تعریف کرتے ہیں، مگر آخر میں جب ہم پر یہ دردناک حقیقت کھلتی ہے کہ اس دنیا میں آتھیلو کا سا ہیرو غصے اور غلط فہمی کا شکار ہوتا ہے ڈیسڈیمونا کی سی ہیروئن اپنے چہیتے اور چاہنے والے شوہر کے ہاتھوں بےگناہ قتل ہوتی ہے تو ہم رنج و الم، افسوس اور ہمدردی کے جوش سے بیتاب ہو جاتے ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ ہم پر ایک پراسرار رعب چھا جاتا ہے، ایک گہری عبرت طاری ہو جاتی ہے اور یہی المیے کی جان ہے۔

المیہ لکھنے میں یہ اثر مختلف طریقوں سے پیدا کیا جاتا ہے کبھی اس کا ہیرو باوجود اپنی اعلیٰ سیرت کے کسی خلقی کمزوری یا غلط فہمی کے سبب خود اپنی تباہی کا باعث ہوتا ہے، کبھی وہ مافوق الافراد یا فوق الفطرت قوتوں کے ہاتھ میں کھلونا بن کر ہلاک ہوتا ہے اور کبھی اس کے پیش نظر دو متضاد مقاصد یا نصب العین ہوتے ہیں جن میں سے وہ ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دے سکتا اور اسی کشمکش میں مارا جاتا ہے۔

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ ڈراما کا ایک بڑا اہم عنصر عمومیت ہے یعنی قصے کو اس طرح بیان کرنا کہ ایک خاص شخص کی زندگی پر عام انسانی زندگی کا قیاس کیا جا سکے۔ اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے ڈراما لکھنے والے بہت سے ذرائع اختیار کرتے ہیں۔ ایک ذریعہ یہ ہے کہ قصے کا ہیرو بادشاہ یا کوئی اور بلند مرتبہ شخص بنایا جائے جس کا انجام ایک پورے ملک یا پوری قوم کی زندگی پر اثر ڈالے اور سارے انسانوں کے لئے سرمایہ عبرت ہو یا پھر اس کی ذات ایک علامت

ریالٹی جمہوری ہو جس سے پوری نوع انسانی یا کسی پوری قوم مراد لی جا سکے۔ مثلاً گوئٹے کے ڈرامے فاؤسٹ کا ہیرو اہل مشرق کی نظر میں انسان کی روح کی علامت سمجھا ہے اور اس کی تمنائے آزادی نوع انسان کی اس ابدی آرزو کی علامت ہے کہ وہ عالم مجاز سے نجات پا کر عالم حقیقت تک پہنچے۔

دوسرا ذریعہ یہ ہے کہ قصے کے ہیرو پر جو مصیبت آئے اس کا ذمہ دار مافوق الفطرت قوتوں مثلاً تقدیر کو یا دیوتاؤں کو یا شیطانی روحوں کو قرار دیا جائے۔ اس سے قصے کے پڑھنے والوں کو یہ احساس ہوتا ہے کہ ان قوتوں نے جن کا اثر سب انسانوں پر عام ہے جو ایک شخص کے ساتھ کیا وہی سب کے ساتھ کر سکتی ہیں۔ جدید زمانے میں لوگ ان چیزوں کے قائل نہیں اس لئے ڈراما نویس عموماً ان کی جگہ وراثت سے کام لیتے ہیں یعنی کسی شخص کی مصیبتوں کا ذمہ دار اس کے اسلاف کے موروثی اثر کو قرار دیتے جیسے ابسن کے ڈرامہ "خبیث روحیں" کے ہیرو کا جو افسوسناک انجام ہوا وہ اس روگ کی بدولت ہوا جو اس نے اپنے باپ سے ترکے میں پایا تھا۔

تیسرا ذریعہ یہ ہے کہ ڈراما کے اصل قصے میں ڈراما نویس ایک ضمنی قصہ بھی داخل کر دیتا ہے اس میں وہی افسوسناک واقعات جو اصل قصے میں پیش آئے تھے کسی قدر اختلاف کے ساتھ دہرائے جاتے ہیں مثلاً شیکسپیر کے کنگ لیر میں جو ناشکر گذاری کا برتاؤ لیر کی بیٹیاں لیر کے ساتھ کرتی ہیں وہی گلوسٹر کے بیٹے گلوسٹر کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس تکرار کا اثر دیکھنے والوں پر یہ پڑتا ہے کہ نیکی کا بیج بونا اور بدی کا پھل پانا کچھ لیر ہی کے لئے نہ تھا بلکہ دنیا میں سبھی کو یہ دن دیکھنا پڑتا ہے۔ المیے کے قصے کی یہ عمومیت عبرت کے اثر کو بڑھاتی ہے مگر رنج و الم کے اثر کو گھٹا دیتی ہے۔ مصیبت کا کوئی منظر دیکھتے وقت اگر یہ احساس پیدا ہو جائے کہ یہ حالت زندگی میں ہر شخص پر گذرتی ہے تو خلش الم کی کھٹک بہت کچھ کم ہو جاتی ہے اور آرٹ کے نقطۂ نظر سے المیے میں اس کی بہت ضرورت ہے۔ آرٹ جو کیفیت دلوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے المیہ اس کی

گنجائش نہیں کہ کوئی جذبہ خواہ کتنا ہی دائم ہو یا راحت و مسرت ہی کیوں نہ ہو اس میں جمالیاتی رنگ نہیں ہوتا جس سے تناسب اور موزونیت لازمی ہے مگر فریاد کی کوئی لے نہیں ہے۔ نالہ پابندِ نے نہیں ہے اور وہ فریاد اور استغاثہ ہے آرٹ سے بڑھ کر ہو مگر آرٹ نہیں کیونکہ وہ سننے والے کے دل کے تاروں کو چھیڑتا تو ہے مگر اس طرح کہ ان سے ہم آہنگ نغموں کی جگہ بے سری صدائیں نکلتی ہیں۔

اسی وجہ سے باکمال المیہ نویس مصیبت اور تکلیف کے مناظر بہت بڑھا کر یا بہت دیر تک نہیں دکھاتے اور جو کچھ دکھاتے بھی ہیں اس کے المناک اثر کو کم کرنے کے لئے یا تو موسیقی سے کام لیتے ہیں جس کا ابھی ذکر ہوا ہے یا بیرونی عظمت اور شجاعت پر زور دے کر ایک تسکین کا پہلو نکالتے ہیں یا طرز بیان میں تشبیہ و استعارے کی لطافت و ندرت اور دوسری شاعرانہ خوبیاں پیدا کرنے میں غیر معمولی اہتمام کرتے ہیں تاکہ خیال کسی قدر بٹ جائے۔

اس سے ایک نتیجہ یہ نکلتا ہی کہ المیہ لکھنے کے لئے بہ مقابلہ نثر کے نظم زیادہ مناسب ہی اور یہ بڑی حد تک صحیح ہی۔ عہد قدیم میں المیہ ہمیشہ نظم میں لکھا جاتا تھا۔ جب سے نثر میں لکھنے کا رواج شروع ہوا اسی وقت سے ادب میں المیے کا معیار بھی کم ہونے لگا چنانچہ نثر میں اعلیٰ درجے کے طربیے بہت کثرت سے ہیں مگر المیے معدودے چند ہی ہیں ان میں سے غالباً سب سے بلند درجہ گوئٹے کے فاؤسٹ کا ہی۔ گوئٹے نے اپنے زمانے کے مذاق سے متاثر ہو کر فاؤسٹ کو نثر میں لکھا لیکن اسمیں گیتوں اور سنگیتوں کے نام سے نظم کا حصہ بہت کافی ہے اور خصوصاً زیادہ المناک ٹکڑے سب کے سب نظم میں ہیں اور جتنے اچھے المیے نثر میں ہیں ان کا مقصد زیادہ تر اخلاقی اور اصلاحی ہے۔ جمالیاتی عنصر ان میں بہت کم ہے۔ (باقی)

دلّی کا اوکھا پن اور بھبن

میر باقر علی صاحب مرحوم دلی کے آخری داستان گو تھے۔ سات مہینے ہوئے انکا انتقال ہو گیا۔ جن لوگوں نے انکی داستان سنی ہے۔ ان کا دل اب تک دلی کی اصلی زبان کی گھلاوٹ اور حلاوت کے مزے لیتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ان کا سارا کمال تقریر میں تھا تحریر میں وہ بات نہیں ہے۔ لیکن تقریر تو مرحوم کے ساتھ گئی اب تو جو کچھ ہے تحریر ہی ہے۔

یہ مضمون میر صاحب مرحوم نے ہمدرد مرحوم میں شائع ہونے کے لئے دیا تھا مگر کسی وجہ سے چھپ نہ سکا ہم اسے قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ ممکن ہو کہ بہت پڑھے لکھے حضرات میر صاحب کی زبان میں مین میکھ نکالیں یا ان کے فلسفے پر ناک بھوں چڑھائیں لیکن وہ یاد رکھیں کہ اگر انہوں نے مرحوم کی زبان پر حرف گیری کی تو انکی روح جنت سے کہے گی "یہ ہماری زبان ہے پیارے" اور اگر انکے فلسفیانہ مسائل پر معترض ہونے تو جواب ملے گا "شرم باید مدرسہ کہ بردہ"

میں دلی کا رہنے والا ہوں بچپن سے بڑھاپا آیا لیکن میری سمجھ میں تو نہیں آیا کہ دلی کی جونک کیا ہو۔ شہر تو سبھی بنتے بھی ہیں بگڑتے بھی ہیں۔ بن گئے بن گئے بگڑ گئے بگڑ گئے مگر ہا وری دلی تیری ادائیں کہ سبھی قوموں نے تیرے چکر کاٹے ہتھوڑا نے برکتا کی مسلمانوں نے طواف کئے اب انگریزوں نے بھی بسا دیا تو ذرا چین سے کونے میں گھونگھٹ نکالکر بیٹھیں لیکن بیٹھتا کیسا اب پھر اپنے بناؤ میں لگی ہوئی ہیں اور کیوں نہ بناؤ کریں کہ دلی کی جوانی بڑھاپا اپنے ہاتھ سے جب بڑھاپے سے جی گھبرایا اور اکتایا پھر نئے سرے سے جوانی نکالی اور کسی وضعدار کی تلاش شروع کی لیکن دلی کی اب کی دفعہ اس کو خدا نظر بد سے بچائے

جمالی پھیکی ہے اور جوبن پھٹا پڑتا ہو۔ ہیں کسی عاشق کی چھاتی پہ بال جو دلی کی گلی گلی جا بجا [illegible]
ابھر آئی ہیں انکی طرح [illegible] آثار [illegible] دیکھے دلی [illegible] کی ہے تو [illegible] ہی ہے [illegible]
اس ست عصی اور ہر جائی سے [illegible] کے نام اپنے [illegible] کے زمانے میں [illegible] سیری
تغلق آباد، عادل آباد، جہاں پناہ، فیروز آباد، پرانا قلعہ، شاہجہاں آباد غرض [illegible] کے ناموں
سے پکاری گئی اور اب سے تو کمال ہی کیا ہے چونکہ نئی نویلی ہیں تو نام بھی نئی دلی رکھا گیا ہے۔
ایک دفعہ دنیا کی تارک ہو کر سو دو سو برس تک ایسی لاپتہ ہوئیں کہ کوئی مورخ بھی پتہ نہ لگا سکا
اور [illegible] کے بعد سے جو مجھ جیسے دلی میں آباد ہیں انہوں نے یہ ارادہ کر لیا ہے کہ سو دو سو برس
کے واسطے ہم دلی والے بھی ایسی گمنام زندگی بسر کریں کہ کوئی ہمارا نام بھی نہ جانے کہ دلی میں
کون کون آباد تھے خیر جو چاہیں سو کریں دلی والے ہیں اپنے افعال کے مختار ہیں۔ لیکن ایسوں کے
واسطے دلی نے بھی کہدیا ہے کہ تم جیسا میں چاہتی ہوں ویسے نہ ہو تو میں بھی تمہارا نام نہ بدل دوں
تو مجھے دلی نہ کہنا ورنہ دلی نے بادشاہ پیدا کئے عالم بنائے خلیق بہادر سپاہی ایماندار کاریگر نمک خوار
اگر اس زمانے کے واقعات لکھوں تو مضمون کا طومار ہو جائے گا۔ صرف ایک [illegible] کا تذکرہ
پیش کرتا ہوں ناظرین اندازہ فرمالیں گے۔ شاہجہاں نے جب لال قلعہ بنانے کا ارادہ کیا تو استاد
حامد مستری کو بلا کر نقشہ دیا اور فرمایا کہ جلد یہاں قلعہ بنادو استاد حامد مستری نے عرض کی بہتر اب
یہ حال عرض کروں کہ آج کل علما اور مشاہیر عالم نے تو قلعہ کے واسطے [illegible] فرمایا اور
شاہجہاں کا دماغ تو ماتا ہوا ہے یہ جمنا کے کنارے کیوں ڈوبا یہ بحث نہایت فلسفیانہ ہے گر طویل
اور نہایت [illegible] کہ شاہجہاں نے یہی جگہ کیوں پسند کی تھی اس وقت [illegible] نہ تھے بات یہ
ہے کہ دلی گرم جگہ ہے اور یہاں کی زمین شور ہے شاہجہاں نے وہ جگہ پسند کی جہاں سے جمنا
سیکڑوں برس سے شورہ دھو دھو کر لے گئی گو زمین نمناک ہو لیکن آپ [illegible] کہ شاہجہاں
کے قلعہ کو تین سو برس گذرے اور پتھر بھی سنگ سرخ لگا ہے کہ جو [illegible] جاتا ہے
لیکن شاہجہاں کا قلعہ جوں کا توں کھڑا ہے۔ مس سے مس نہیں ہوا [illegible] کی اور

[illegible] کر بیٹھ ہوئے بڑا بڑا اکھڑ دن ہوئے ان میں نئی شروع ہوگئی اس
واسطے [illegible] کہ پتھر کو ٹھوک بجا کر کان سے لیتی۔ اب سنئے کہ تمام قلعہ کا پتھر لگیا
اور [illegible] سو دو برس گذر گئے اور استاد حامد کا پتہ نہ لگا تو شاہجہاں نے حکم دیا کہ دوسری
بنیادیں [illegible] بنیادیں کھدنی شروع ہوئیں تو استاد حامد نے حاضر ہو کر آداب بجایا بادشاہ نے
فرمایا [illegible] تھے تو استاد حامد نے دست بستہ عرض کی کہ حضور کا شوق تو مقتضی اس امر کا تھا کہ
قلعہ شام تک بن جائے اور نکھوار بنا دیتا لیکن سو دو سو برس کے بعد دیواریں شق ہوتیں۔ بال پڑتے
تو اس وقت کے لوگ کہتے کہ بادشاہوں کے ایسے نمک حرام نوکر تھے کہ اپنے فائدے کے واسطے
جلد از جلد ایسی بودی عمارت بنائی اب خادم نے نیو کو چھوڑا برساتیں پڑیں پانی بھرا جہاں کے
نیو کو جھونا تھا جھومی دبنا تھا دبی اور یہ پتھر دو برس تک برسات میں بھیگے جاڑے میں سکڑے
گرمی میں پھیلے جس کو ٹوٹنا تھا ٹوٹا تڑقی لگنی تھی تڑقی لگی اب نکھوار شام تک قلعہ بنا دیتا ہے۔
یا تو دلی والے ایسے تھے اور اب جو مجھ جیسے آکر آباد ہوئے تو انہوں نے ایمانداری انصاف
خدا ترسی کاریگری وغیرہ کو پرانا سمجھ کر اور یہ کہکر چھوڑ دیا کہ پرانی باتوں کو کیوں کام میں لائیں وہ
اگر معاملے کے صاف تھے تو ہم معاملہ کیوں صاف رکھیں۔ جو جو واقعات میں دیکھ رہا ہوں
اگر دو چار واقعات بھی لکھوں تو طول ہوگا۔ غرض دلی یوں ہی کروٹیں بدلتی رہتی ہے۔ اسی
طرح سے دلی کی اللہ بخشے ایک بتول تھیں اور انکی بھی تمام عادتیں قریب قریب ایسی ہی تھیں جیسے
دلی کی۔ اب یہ جوان ہوئیں تو انکی شادی ہوئی اللہ نے فرزند نرینہ عطا فرمایا یہ اپنے بچہ کی محبت
میں دیوانی تھیں بعض انسان بعض حیوانوں میں اولاد کی محبت کا مادہ زیادہ ہوتا ہے
اتفاق سے بچہ کا باپ مرگیا اب جو بڑے کو آیا اس نے افسوس کیا کہ افسوس اس سن میں اولوتھی
اس نیک بخت کو بچہ کا یتیم بنا ناگوار گذرا اس نے عدت کے اندر ہی نکاح کر لیا وہ خاوند بھی تھا
[illegible] ہوگیا اب [illegible] اس نے پھولوں کے دوسرے ہی دن نکاح کیا اور اس خاوند
کی [illegible] سے بھی باز رکھا غرض وہ بھی مرا اسی طرح اس نیک بخت نے سات

مکان ہے کہ جب سے انسان [illegible] جہاں بھی ہو آئے ان سے ضرور کچھ کرنا [illegible]
تو وہ دے گی لیکن میں اپنے پر کچھ ستم کہ وہاں بیٹھ بیٹھے تو رہوں گی۔ دلی کی اردو کی دو ایک [illegible]
مشکل ہے۔ دلی نے اردو زبان بنائی اور اس میں بھی تمام زبانوں سے بڑھ کر اپنا سکہ دکھایا۔ دنیا
میں جتنی زبانیں ہیں وہ وہاں کے رہنے والوں نے اپنے جذبات کا اظہار کرنے کے واسطے معمولی
بسیط سے جملے بنائے ان کا نام زبان ہو گیا لیکن دلی نے اردو کے گوہر سخن کے واسطے دو ایسے
زخار اور ناپیدا کنار تلاش کئے اور وہ دونوں دریا کون سے دریا ہیں ایک سنسکرت اور دوسرا
عربی اور یہ دونوں دریا وہ دریا ہیں کہ جن سے تمام دنیا کی زبانیں سیراب ہیں یہی وجہ ہے کہ اردو
کسی زبان سے پیچھے رہنے والی نہیں معلوم ہوتی علاوہ اس خوبی کے یہ زبان امانت دار ایسی ہے
کہ جس زبان کا جو لفظ لیتی ہے اس کو اپنے گھر میں ایسا اچھوتا رکھتی ہے کہ اس کی شکل و صورت میں
کوئی خرابی نہیں آنے دیتی جیسا وہ لفظ اپنے گھر میں تھا اسی طرح سے اردو میں رہتا ہے اور لفظوں
ہی پر کیا موقوف دلی میں جو آیا اس کو دلی نے ایسا آرام و آسائش سے رکھا کہ دنیا کے کاموں
سے اس کو کوئی غرض ہی نہ رہی لیکن ایسا کیوں ہوا آپ غور فرمائیں کہ ہندوستان مثلث نما
ملک ہے اگر بفرض محال آپ ہندوستان کو کاٹ چھانٹ کر گول بنالیں تو دلی قریب قریب مرکز ثابت
ہوگی اور اور مرکز کو گو ہم کسی متحرک جگہ ٹھہر کر یہ سمجھ لیں کہ ہم ساکن ہیں مگر کیا سکون ہوگا ہرگز نہیں۔

اور دلی میں تو مرکز ہونے کی وجہ سے حقیقی سکون ہے یہاں جو آیا ایسا ساکن ہوا کہ
دنیا نے اس کے نام کو بھی حرکت نہ دی کہ دلی میں فلاں فلاں آباد تھے۔ دلی نے بہت سے
نکاح کئے لیکن اس شرط پر کہ میں یہاں سے کہیں نہ جاؤں گی۔ اگر دلی کے نئے دولہا کو یہ بات
بھی گوارا نہ ہوئی تو دلی ذرا کھسکیں اور کہا بس چنانچہ اب کی دفعہ بھی بنے بنائے گھر کو چھوڑا۔
...... لال حویلی ہر طرح کے آرام کا نشیمن تھی اور کیسی عمارت جو سونے کے پانی سے گندی
ہوئی اور جواہر کے ریزوں سے چنی ہوئی۔ اور ہر نگینہ جواہر کا جہاں جڑا ہوا تھا اس سے معلوم
ہوتا تھا کہ معمار قدرت نے اس نگینہ کو یہیں کے واسطے بنایا ہے مثلاً ایک پتھر کسی [illegible]

[illegible] ہو کر وقت میں [illegible] ہو [illegible] ہر

[illegible] ہوں [illegible] ہی دیکھے ہیں یہ دونوں باتیں دکھائی ہیں جو نہیں [illegible] اس خوبی سے کہ ہر ایک بیر وشتہ [illegible] روز ذرا لوگ پلک کا الٹ جاننے والا ہی کہہ سکتا ہے اور اس [illegible] سے بے مانت دار جل جاتی ہے۔ عقب حمام جتنی خوبیاں حمام میں ہونی مناسب ہیں سب موجود حمام کشادہ ہو روشن ہو معتدل ہو پانا ہوا اور گنبد کے بیچ میں سے کبھی کبھی ٹھنڈی ہو ہر پانی کی چھینٹے لیکن ایک حمام سب مزاجوں کے موافق نہیں ہوتا ہر شخص کے مزاج کے موافق بنایا جاتا ہے حمام کا فرش دیواریں نہ ٹھنڈی ہوں نہ گرم حوض کا پانی آتا گرم ہو جو بدن پر سیال نہ معلوم ہو چنانچہ اس حمام کا پانی آٹھ پہر چونسٹھ گھڑی یکساں رہتا تھا دیوان خاص کی تو ایسی خوبی تھی کہ جس کے بیان سے زبان قاصر۔ کسی شاعر نے مجبور ہو کر لکھ دیا کہ۔ شعر۔

اگر فردوس بر روئے زمین است   ہمین است و ہمین است و ہمین است

تخت طاؤس اپنی خوبیاں اپنے منہ سے بول رہا تھا ایران میں جو اس کی درد سا ہوئی یہ تخت اپنی اُس عزت کو جو دلی میں تھی اُس کو یاد کر کے آٹھ آٹھ آنسو رو رہا ہے دونوں آنکھوں سے ساون کی جھڑی اور بھادوں کی بھرن ہے کہ برس رہی ہیں برسات میں مور کو مستی ہوتی ہے اور پر کھل آتے ہیں لیکن یہ بیچارہ ٹنڈ منڈ پر نچا دلی کی طرف ٹڈیاں بھرتا ہے تو چوٹ کھاتا ہے اس وقت یہ دوہا حسرت و یاس زبان سے نکل جاتا ہے۔ دوہا۔ نا موسے پنکھ نہ پاؤں جل میں ابھکھ پیا دور۔ اُڑ نہ سکوں گر گر پڑوں رہوں بسور بسور۔ اور کبھی کہتا ہے آ رے کہ پنچھی

لیکن سب پر وبال اڑا نہیں جاتا۔ میزان عدالت اب بھی یہ کہہ رہی ہے کہ یہاں کسی زمانے میں عدالت تھی اور نہر سعادت خاں اسی کے نیچے بہہ کر یہ بتا رہی ہے کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں شیر و بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے جھروکہ جہاں بادشاہ بیٹھ کر جمنا کی موجیں اور [illegible] کا نظارہ کرتا تھا۔ دیوان عام موتی مسجد مہتاب باغ جل محل ساون بھادوں [illegible] کی کہانیاں یہ کہہ رہی ہیں اس وقت بتا تھا کہ جب دلی یہاں آباد نہ تھی بلکہ اُس زمانے

کی دلی کا ہے وہ دہلی دروازہ کے سامنے دلی میں سب سے مشرقی سمت اور جمنا کے کنارے
دلی کو آباد ا صاحب نے کو برا دیکھ کر شرم سے زمین میں دھنسا دیا۔ جہاں دلی آباد تھی اس
زمانے میں بنجارے ناچ وغیرہ کیا کرتے تھے اور جہاں لال قلعہ اس وقت ہے بنجاروں کا پڑاؤ
تھا یہاں کنواں نہ تھا ایک بنجارے نے کنواں کھدوا دیا اس وجہ سے بنجاری کنواں کہتے
ہیں۔ اب کی دفعہ دلی نے نہایت پھونک پھونک کر قدم رکھے ہیں کیونکہ ہر دفعہ کی بربادی سے
دلی کا بھی دل اکتا گیا ہے اور مدت کی پیشین گوئی کا خیال آگیا۔ کسی نے یہ پیشین گوئی کی ہے کہ۔
نو دلی دس بادلی قلعہ وزیر آباد۔ آٹھ دلیاں تو میں نے گنوائی ہیں اب نویں دلی کی بنیاد
ہمارے شہنشاہ نے رکھی لیکن یہ بنیاد بدلی اور اب دسویں دلی رائے سینا میں آباد ہو رہی
ہے بادشاہ بادشاہ ہوتا ہے وہ کسی قوم یا مذہب کا ہو لیکن بادشاہ ہے۔ شاہی بنیاد یہاں
سے بدلی اب کچھ اسباب اس پیشین گوئی کے ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ قلعہ وزیر آباد آباد ہو لیکن
یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وزیر آباد نشیب میں واقع ہوا ہے اور نشیب کی آب و ہوا مرطوب اور دلی
کی عادت شمال کی طرف کھسکنے کی ہے اور دلی ہی بیچاری پر کیا موقوف ہے فیصدی پچانوے شہر
شمال کی طرف بڑھ رہے ہیں وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ شمال ٹھنڈا اور جنوب گرم اس وجہ سے طبیعت
شمال کی طرف جاتی ہے۔ ہونے والی بات کو خدا ہی جانتا ہے لیکن پیشین گوئی یہ خبر دیتی ہے کہ
وزیر آباد آباد ہو اور اس کی آبادی کو قیام و دوام ہو دلی کئی دفعہ بدلی اور آباد ہوئی جو آیا
اس نے دلی کی اکھیڑ پچھاڑ کی اور اب کے تو یوں سے بیٹھے بٹھائے دلی نے اپنا گھر چھوڑا اس کی
وجہ میرے خیال میں تو یہ آتی ہے کہ جیسے دلی والوں نے غدر کے بعد دلی کو ایسا چھوڑا کہ
دلی نے تنگ آ کر یہاں کی بود و باش چھوڑ دی پہلے دلی کو دلی والوں پر ناز تھا اور اب تو دلی
والوں نے جمنا کے کنارے وہ الٹی گنگا بہائی کہ دلی پانی پانی ہو کر شرم سے ڈوب گئی ایسا کیا
گھر چھوڑا اپنوں سے منہ موڑ پردیسیوں سے دل لگا بیٹھی اب دلی والوں کو مناسب ہے کہ
جیسے اب بعد از شہر میں اپنے آپ کو دلی کے رہنے کے قابل بنائیں اور نہ تعلق کا دروازہ کھول کر

[illegible] ہیں [illegible] سنا ہے کہ تغلق آباد کے کھنڈر پکار رہے ہیں دنیا میں آئے ہیں سر پٹک کر بیٹھ
گئے لیکن یہ اکڑ تان تھی کہ دلی دروازے سے اندر سر پر بوجھ نہیں رکھتے تھے کسی نے پوچھا کہ یہ
کیا تو تغلق آباد والے جواب دیتے ہیں کہ میاں دلی ہماری تھی اب اگر دلی ہم سے بدل گئی تو بدل گیا۔
لیکن ہم اس کے آگے کیوں گردن جھکائیں ایسے موقعے کے واسطے کسی نے خوب کہا ہے کہ۔ رسی تو
جل کے خاک ہوئی پر بل نہ گیا۔ اب دلی ایسے دلی والوں کی طرف منہ بھی نہیں کرتی۔ وہ پانی
ملتان گئے۔ ورنہ دلی ایسی مسافر نواز تھی کہ جو دلی میں آیا دلی نے اسے اپنے میں جذب کر لیا۔
دلی کی خاص بات مرکز ہونے کے لحاظ سے عجیب ہے آپ اجمیری دروازے سے ذرا باہر نکلیں
تو آپ اجمیر کا رنگ دیکھیں گے اور لاہوری دروازے سے پنجاب اپنا پتہ دیتا ہے۔ کشمیری دروازہ
کشمیر کی جھلک دکھاتا ہے ذرا جمنا پار ہوئے تو پورب نظر آتا ہے۔ غرض دلی اپنی وضع کی پابند
ایسی ہے کہ اپنی چال سے باز نہیں آتی۔ انسان تو ذکی الحس ہے۔ آپ پودوں کو ملاحظہ فرمائیں
ہم نے لکھنؤ کے خربزے کا دلی میں بیج بویا تو اس سال دلی میں جو خربزہ پیدا ہوا ہر خربزے کا رنگ
قد مزا قریب قریب ویسا ہوا اب دلی کے پیدا ہوئے خربزے کا بیج بویا تو رنگ قد مزا کچھ
بدلا اور تیسرے سال کے خربزے کو دلی نے اپنے رنگ میں رنگ لیا وہی چال دار، قد بڑا
دل موٹا اور پھیکا پیدا ہوا۔ لیکن دلی کے خربزے بیچنے والوں نے آواز پکارا کہ شکرے میٹھے
یعنی شکرے کھاؤ تو میٹھے۔ پہلے دلی ہی کے خربزے میں نے کھائے ہیں اچھے میٹھے خوشبودار
ایک خربزہ گھر میں آیا بال بچے چھک گئے اور بیج رہا۔ دلی میں قدرت نے مسلمانوں کو بادشاہ
اور ان داتا بنا کر بھیجا تھا۔ اس وقت دلی نے اپنے مہمانوں کی وہ آؤ بھگت کی طرح طرح کی
دلچسپیاں پیدا کیں اچھے اچھے باکمال پیدا کئے بڑے بڑے بہادر بنائے اور خلیق ایسے کہ
چار دانگ عالم میں مشہور کہ دلی والوں کو ہندوستان نے سراہا کاریگر ایسے بنائے کہ جاہل
تھے مگر انکے دماغ کام کر رہے تھے۔ بسنتھ میں سے دھری بندوقیں چل رہی تھیں اور ان
بندوقوں کا نام بے دھری میر ٹھ کے کارتوس کی وجہ سے فوج نے رکھا تھا یہ بندوقیں تا نجنگی

زمین سے نکلتی نہیں اب ضد ہوا تو یہاں نہیں اب جو نکلتی ہیں بیکار ہو گئیں تو بادشاہ سے عرض
کی بادشاہ نے تمام شہر کے پارہ دیں جو کاریگر تھے ان کو بلایا اور فرمایا کہ جو قلمیں بیکار ہیں اب کیا کریں
کاریگروں نے دست بستہ عرض کی کہ حضور یہ کیا بات ہے حضور کے اقبال سے اب بند وبست ہوا
یکھکر کاریگروں نے کاغذ کے پٹاخے بنائے جو بچے تنچوں میں رکھکر چھوڑتے ہیں۔ اس زمانے میں
قدرت کی خاص نظر رحمت دلی پر تھی اب جب دلی والوں نے اپنے آپ کو بھولا اور یہ نہ سمجھا کہ قدرت
نے ہم کو کیسا مالا مال پیدا کیا ہے لیکن ہم نے اس کی کسی نعمت سے کام ہی نہیں لیا۔ تو قدرت
کی رفتار سست ہو اس وجہ سے کہ کوئی کسر نہ رہجائے پھر جب قدرت ہاتھ ڈالتی ہو تو کچھ ٹھکانا
ہی نہیں۔ یا تو یہ شہر ایسا تھا کہ جس کی تعریف ناممکن تھی یا اب دلی کے پہاڑ بدلے زمین بدلی
آخر بدلا کیا کچھ نہیں۔ مجھ جیسے دلی والوں نے تمام خوبیوں سے اپنے آپ کو بال بال بچا رکھا ہو
اور لطف یہ ہو کہ آپ دلی میں ایک شے کھانے کی پینے کی برتنے کی چاندی سونے کی ڈھونڈیں
تو ملنا مشکل۔ اب چاندی والوں کا کیا قصور ہے چاندی خود تو سفید ہے لیکن جو شے اسے مس
کرتی ہے وہ سیاہ ہو جاتی ہے۔ کاریگر تو کاریگر ہیں انہوں نے بھی چاندی سے کہا کہ تو ٹھہر اگر
تجھ کو کالا کر کے نہ چھوڑا تو نام نہ پایا۔ چاندی بیچاری ہلکی ہونے کی وجہ سے اتنی شریف ہے کہ
تولہ بھر چاندی میں آپ ایک ماشہ تو چاندی لیں اور گیارہ ماشہ میل تو چاندی تیزاب کے اجال
پر سفید نظر آئے گی۔ اب کاریگروں نے سونے کو دیکھا کہ یہ ظالم تو ہمارا کہنا مانتا ہی نہیں کہ تولہ
بھر سونے میں ایک رتی میل ملاتے ہیں اور وہ میل رتی بھر اپنی جھلک دیتا ہے تو کاریگر بولے
اچھا ہم بھی تیرا قائم مقام بناتے ہیں چنانچہ چاندی اور تانبا ملا کر سونے کا ہم شکل بنایا اور منحوس
نام رکھا۔ اگر ہم اب بھی نہ سنبھلے اور نہ سمجھے تو ہماری صورتیں بھی بدل جائیں گی کہ شریف اور
پاجیوں کے باوا آدم الگ الگ نہ تھے بد اعمالیوں نے شکلیں بدل دیں اللہ رحم فرمائے۔

ہندوستان، فن طب کا اصل مولد

"ہندوستان کے فن طب و جراحت" پر ایک مضمون دو نمبروں میں اب سے کچھ عرصہ پیشتر اسی رسالہ "جامعہ" میں شائع ہو چکا ہے۔ آج عنوان بالا سے کیپٹن پی جانسٹن ہینٹ نامی ایک انگریز مصنف کے نہایت فاضلانہ اور پُراز معلومات خطبہ کا خلاصہ ترجمہ پیش کیا جاتا ہے، جو انگلستان کی مشہور رائل سوسائٹی آف آرٹس کے ہندوستانی شعبہ کے زیر اہتمام ابھی حال میں پڑھا گیا ہے۔ ہندوستان کی گذشتہ قدیم تاریخ کے متعلق اب تک عام طور پر یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ یہ ایک تاریکی و ظلمت اور وحشت و جہالت کا دور رہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اگر کسی علم کا کبھی کوئی چرچا تھا تو وہ فلسفہ و الہیات کا تھا۔ مضمون بالا سے یہ اندازہ ہوگا کہ ہندوستان نے اپنے قدیم زمانے میں سائنس میں بھی اسی قدر ترقی کی تھی جس قدر فلسفہ میں۔ فن طب اور اس کی مختلف شاخوں میں اس نے اس قدیم زمانے میں جو کمال پیدا کیا تھا، اس سے آج کی جدید سے جدید تحقیقات و معلومات بھی کچھ بہت آگے نہیں ہیں۔

سعید

ہندوستان کی تاریخ کا آغاز ہندوستان کی تہذیب کا آغاز کب سے ہوتا ہے؟ اس کے متعلق بحث کرنے کا یہاں موقع نہیں اور واقعہ یہ ہے کہ باوجود تمام تحقیق و تدقیق کے حقیقت پھر بھی اسی قدر مستور ہے۔ یہ کوئی تقریباً سوا سو سال کی بات ہے کہ بعض اہل مغرب نے سنسکرت زبان کے مطالعہ کی طرف توجہ کرنی شروع کی اور اگرچہ اس وقت سے دفتر کے دفتر آرین قوم کی اصل کے متعلق لکھے جا چکے ہیں پھر بھی یہ اطمینان کسی طرح نہیں ہو سکتا کہ ہم کسی صحیح حقیقت تک پہونچ گئے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ آرین قوم وسط ایشیا کے کوہستانی علاقے سے پیدا ہوئی، بعضوں کا خیال ہے کہ ان کا مولد جرمنی کا شمالی علاقہ یا ناروے اور سویڈن کا خطہ ہے۔

تاہم ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ سب سے قدیم ویدوں کی تاریخ تقریباً ۲۰۰۰ سال قبل مسیح ہوگی۔ ہڑنی [illegible] کا اس بات [illegible] اور بنجے [illegible] کا یہ خیال ہے، کہ ۲۰۰۰ سال قبل مسیح ہندو لٹریچر کے آغاز کا زمانہ ہے۔ بروں ہو [illegible] اسے ۲۰۰۰ ق۔م بتاتا ہے۔ پروفیسر جیکوبی اس مدت کو ۴۰۰۰ قبل مسیح قرار دیتا ہے اور ایک گروہ محققین کے مطابق یہ زمانہ اس سے بھی قدیم تر ہے جبکہ اس وقت کی دنیا یہ کرۂ زمین نہ تھی جس پر آج ہم لوگ چلتے پھرتے ہیں۔ اوستا میں ایک ایسی آریوں کی بہشت کا ذکر ہے جو صرف قطب شمالی ہی میں ممکن ہو سکتی ہے۔

طب کے متعلق قدیم روایات

بہر حال اصل حقیقت خواہ کچھ بھی ہو۔ یہ مسائل ایسے نہیں جن کا تصفیہ گھنٹے دو گھنٹے کی صحبت میں ہو سکے۔ ہم کو صرف ویدوں کے ان اشلوکوں سے غرض ہے جو اس وقت ہمارے پاس موجود ہیں۔ رگ وید یا اس کے ساتھ کی دوسری کتابیں خواہ ۱۵۰۰ ق۔م، ۲۵۰۰ ق۔م، ۴۵۰۰ ق۔م یا اس سے بھی قدیم تر کسی ایسے زمانے سے شروع ہوتی ہوں جبکہ تاریخ کا کوئی پتہ نشان بھی نہ تھا موجودہ اغراض کے لئے اس سے بحث نہیں۔ ہم کو اس واقعہ کو اس طرح تسلیم کر لینا چاہئے، جس طرح ایک چھوٹا بچہ راجہ کے قصے کو صحیح سمجھتا ہے بالحاظ اس کے کہ وہ راجہ کون تھا، اور کس زمانے میں وہ حکومت کرتا تھا، اس لئے کہ قدیم تاریخ میں اس قسم کے قصوں اور افسانوں کو بھی کچھ کم اہمیت حاصل نہیں۔

لسانیات کا ایک عالم ان قدیم قصوں اور افسانوں کو اس نظر سے دیکھتا ہے تاکہ وہ تخیلات انسانی کے ٹوٹے ہوئے سلسلوں کو جوڑ دیں۔ مورخ ان افسانوں کو ان کے اصل سرچشمے تک لیجاتا ہے اور ایک ایسی بنیاد تلاش کرتا ہے جہاں سے کہ وہ اصل حقیقت کی تلاش شروع کر سکے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خالق اول برہما نے یہ چاروں وید کائنات کی ہدایت کے لئے بنائے اور ان میں سے اتھروید کو دوسرے دیوتاؤں کے پاس بھیجا۔ اور دو اسونیوں، یا سورج کے دو بیٹوں کو اس کا حامل قرار دیا اور اس طرح یہ دونوں آسمانی ویدیا داں بن سکے

آیورویدک ابتدا اس کے بعد اتھروید پیدا ہوا جو بنی نوع کی اور زیادہ تعلیم کے لئے فرید منتروں کا مجموعہ ہے۔ پھر ان منتروں سے برہما نے انسان کی قراب خستہ اور زوال پذیر حالت پر رحم کھاکر آیوروید پیدا کیا جس میں زندگی کے علم سے بحث کی گئی ہے۔

یہ منتر بذات خود نیست و نابود ہو گئے ہیں اور ان کا جو کچھ بھی علم ہکو ہوا ہے، وہ انکے بعض اجزاء سے یا ان تبصروں سے جو بعد کے لٹریچر میں ہمیں ملتے ہیں لیکن ان بالواسطہ ماخذوں کی بنا پر بھی ہمیں یقین ہے کہ یہی آیوروید مدتہائے دراز تک ہندو فن طب کا سنگ بنیاد رہا ہے۔

اس کے کچھ عرصہ بعد ان ویدوں کا بھی پتہ نشان باقی نہ رہا اور تمام لوگ پھر ایک بار رنج و مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔ بنی نوع کی یہ حالت دیکھکر دیوتاؤں اور راکششوں نے مختلف قسم کی جڑی بوٹیاں اکٹھا کیں اور انہیں سمندر میں ڈال دیا اس کے بعد اسے چلانے کے لئے مندرا پہاڑ لیا اور وشنو دیوتا کچھوے کی شکل میں دھرا بنے جس پر وہ لکڑی گھومتی تھی شیش جو سانپ کی شکل کا ہے، ایک رسی بنا جسے ایک طرف سے تمام دیوتا اور دوسری جانب سے راکشش کھینچتے تھے۔ اس طریقہ سے گویا سمندر سے چودہ رتن پیدا ہوئے جن میں سے دھنونتری امرت یا آب حیات لیکر نکلا اور وہی ان دیوتاؤں کا طبیب اول اور فن طب کا سب سے پہلا موجد مانا جاتا ہے۔

دھنونتری، فن طب کا موجد دھنونتری کا ظہور جو ہندوستان کا ایسکولیپیس مانا جاتا ہے، دنیا میں اس غرض سے ہوا کہ وہ لوگوں کے امراض و تکالیف کا ازالہ کرے اور انہیں علم حیات کی تعلیم دے۔ یونانی ایسکولیپیس کی طرح اس کے ساتھ کوئی سانپ وغیرہ نہیں ہے بلکہ وہ عام طور سے ایک نہایت ضعیف شخص کی صورت میں ظاہر کیا جاتا ہے جس کے ہاتھ میں صرف ایک کتاب ہے۔ رشیوں نے دھنونتری کے پاس ایک وفد بھیجا اور اس سے یہ درخواست کی کہ وہ انہیں علم حیات کی تعلیم دے۔ اس وفد میں سوشرت بھی شریک تھا جو قدیم فن جراحت کا بانی ہے

[illegible] نے آیور وید کو آٹھ حصوں میں منقسم کیا تھا۔ اسی سوشرت نے بعد میں "سوشرت سمہیتا" کے نام سے فن جراحت پر ایک کتاب لکھی تھی۔

جس طرح سوشرت فن جراحت کا بانی سمجھا جاتا ہے، اسی طرح چرک علم طب کا بانی ہے اور اس نے بھی "چرک سمہیتا" کے نام سے علم طبیات پر ایک کتاب لکھی۔ سوشرت فن جراحت کا عالم تھا اور چرک طب کا اور انہی دو ہستیوں سے ہندوستان میں فن جراحت و طب کا رواج ہوا۔

ہم یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ آیا چرک پہلے پیدا ہوا یا سوشرت۔ علمی نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو چرک کی تصانیف زیادہ قدیم نظر آتی ہیں لیکن قدما میں یہ بات بطور ایک مسلمہ امر کے سمجھی جاتی ہے کہ فن جراحت طب سے پہلے وجود میں آیا۔ ڈاکٹر وائز (Wise) نے اپنی کتاب "ہندو طب" میں لکھا ہے کہ ایک بار دھنونتری نے اپنے شاگردوں سے دریافت کیا کہ "سب سے پہلے میں کس چیز پر لیکچر دوں؟" شاگردوں نے کہا "جراحت پر" اس لئے کہ پہلے دیوتاؤں میں امراض نہیں ہوتے تھے اور سب سے پہلے جس چیز کے لئے علاج کی ضرورت پیش آئی وہ زخم تھے۔ علاوہ اس کے فن جراحت اس حیثیت سے بھی زیادہ مقدم ہے کہ اس سے فوری آرام ملتا ہے اور اس کا تعلق طبابت سے بھی ہے گو مو خر الذکر کو جراحی سے کوئی نسبت نہیں۔ سب سے پہلے انسان کو جراحی کی ضرورت ہوئی، امراض بعد میں پیدا ہوئے اور اس وقت جب انسانوں میں بہت ساری خرابیاں آ چکی تھیں اور یہ سچ پوچھئے تو یہ خرابیاں ایک طرح سے انکے حد سے زیادہ گناہوں ہی کا نتیجہ تھیں۔

ان وجوہ کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سوشرت، چرک سے پہلے پیدا ہوا لیکن انکا صحیح زمانہ متعین نہیں کیا جا سکتا، اس لئے کہ انکا زمانہ اتنا قدیم ہے کہ دوسری قومیں اور ادوار ان سے واقف نہ ہو سکیں اور اگر واقف بھی ہوئیں تو ان کے کمالات کو پورے طور پر نہ دیکھ سکیں۔

مثال کے طور پر عربوں کو لیجئے انکے یہاں انکا ذکر آتا ہے جن سے کہ بعد میں [illegible]

[illegible] کا ذکر ملتا ہے جس کا تذکرہ ہر ڈ اکٹر ہو رنلے (؟) نے ترجمہ کے ساتھ اپنی کتاب [illegible] طب کی قدامت کے دلائل میں کیا ہے۔ غرض یہ کہ ایک غیر یقینی لیکن بامعنی بیسویں [illegible] سشرت کا ذکر فن جراحت کے بانی کی حیثیت سے اور چرک کا فن طب [illegible] کی حیثیت سے ملتا ہے۔

ان تذکروں میں ہمیں ہندو فن طب کی ان دو بڑی شاخوں کی بنیاد نظر آتی ہے، جن کے ساتھ ہی ساتھ تیسری شاخ 'ندان' یعنی تشخیص امراض کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی بنیاد آیورویدپر ہے، جس سے نہایت کثرت کے ساتھ اقتباسات لئے گئے ہیں اور پھر انہی کی تشریح برہمنہ، اور بعد کے قرون وسطے کی شرحوں میں بھی کی گئی ہے۔

آیوروید کی تقسیم | خود آیوروید جیسا کہ اس کے مفسرین نے لکھا ہے، آٹھ حصوں میں منقسم ہے۔ دو حصے خاص فن جراحت کے متعلق ہیں، پانچ طب کی کسی نہ کسی شاخ سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک حصہ فن جراحت کے پہلے باب میں اجسام غریبہ کے نکالنے، چھری وغیرہ کے زخموں کو سینے، پٹیاں باندھنے کے طریقے اور آبلے آماس اور دمل وغیرہ کے علاج سے بحث کی گئی ہے۔

دوسرے باب میں آنکھ، کان، ناک اور منہ کے امراض سے بحث ہے۔ تیسرا باب [illegible] طب کا پہلا حصہ ہے، ایسے امراض سے بحث ہے جن کا تمام جسم پر اثر ہوتا ہے مثلاً بخار وغیرہ۔ چوتھا باب دماغ کے علاج، پانچواں بچوں کی خبر گیری، چھٹا تریاق کے استعمال ساتواں جوانی دوبارہ عود کرلینے اور آٹھواں نسل انسانی کے تحفظ و بقا پر مشتمل ہے۔

یہ صحیح ہے کہ کیمیا کا لفظ عربی زبان سے نکلا ہے لیکن خود یہ علم عربوں سے بہت پہلے ہندوستان میں موجود تھا اس لئے کہ آیوروید کے ساتویں باب میں اس علم سے بہت کچھ بحث کی گئی ہے۔

آیوروید کے یہی آٹھ حصے باب کم و بیش اسی ترتیب کے ساتھ سشرت اور چرک [illegible] میں [illegible] کئے گئے ہیں۔

[illegible] سشروت کے زمانے کے متعلق [illegible]

کا عصر ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ یقینی طور پر کس زمانے میں تھا۔ ہرنل (جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال) نے بدھ کے ہندوستان میں [illegible] کا زمانہ [illegible] قبل مسیح متعین کیا ہے۔ برعکس اس کے بعض ماہرین فلسفہ سوشرت کو گوتم بدھ کا ہمعصر قرار دیتے ہیں چونکہ وید کے بہت سے منتروں میں اس کا ذکر آیا ہے اس لئے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ ویدوں کے زمانے میں رہا ہوگا۔ علاوہ اس کے اتھروید کی آٹھویں کتاب کا ایک منتر انسان کی تخلیق کے متعلق ہے جس میں جسم کی ہڈیوں کا اس طرح ذکر ہے جس طرح اتریہ اور سوشرت نے ان کا [illegible] ہے۔ اتھروید کا ایک بڑا حصہ مسلمہ طور پر ۱۰۰۰ ق۔م کے قریب کا ہے اور منتر مذکورہ بالا اس سے بھی قدیم حصہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس سے اتنی بات تو صاف طور پر ظاہر ہو جاتی ہے کہ سوشرت ۱۰۰۰ ق۔م سے بعد کا کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ اور علاوہ اس کے ہمیں اس کا اصل مسودہ بھی دستیاب نہیں ہوا ہے۔ سنسکرت کی جس کتاب کو ہم "سوشرت" کے نام سے موسوم کرتے ہیں، وہ نہ جانے کتنی تقریظوں کی تقریظ ہوگی جو اصل تصنیف کے زمانے سے بعد میں کی گئی ہے۔

اپنی اس کتاب میں اس نے آیوروید کے آٹھوں ابواب کو چھوٹے چھوٹے عنوانات کے ماتحت ذکر کیا ہے۔ وہ وید کے انہی دو ابواب سے جن میں فن جراحت کا ذکر کیا گیا ہے خاص طور سے بحث کرتا ہے، اگرچہ کسی قدر طبابت سے بھی تعلق ظاہر ہوتا ہے جیسا کہ آج کل بھی دستور ہے۔ ان چھوں ابواب میں سے پہلے باب میں خاص طور سے فن جراحت پر بحث کی گئی ہے، اگرچہ اس میں کسی قدر آب و ہوا اور غذا کا بھی ذکر آتا ہے جن کا صحت پر بہت کچھ اثر پڑتا ہے۔ دوسرے باب میں ان امراض کا علاج ہے جو خراب [illegible] ان کے تیسرے باب کو ہم [illegible] ہیں، چوتھے کو علم [illegible] کو علم السموم سے [illegible] اور آخری باب بطور ضمیمہ کے ہے [illegible]

[illegible] فہرست سے صرف کچھ جانا جاتا ہے [illegible] کی ہے [illegible] معلوم ہوتا ہے
[illegible] جس میں وہ سر سے علوم کی بہت تیاسی اور استنباطی
[illegible] قدرتی بنا پر بہت کم قطعیوں کا امکان ہے، جو خاص اور بے آخیر ہے، آسمان کا بہترین
[illegible] ہے اور فہرست کا یقینی ذریعہ - اس کے بعد ایک عام بے تعلق شخص بھی صحیح طور پر اندازہ کر سکتا
ہے کہ یہ وہ [illegible] نظریوں کی کس حد پر جھلک اس میں نظر آتی ہے -

مصنف کون تھا؟ کتاب کے متعلق غور کرنے کے بعد بھی ہم کم و بیش اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ متعین طور پر
کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کون تھا اور کس زمانے میں تھا؟ - اس کی تصنیف مکالمہ کی صورت
میں ہے جو ایک استاد اور شاگرد کے درمیان ہے - مضامین سے جس انداز میں بحث کی گئی
ہے اس میں کوئی خاص نظام نظر نہیں آتا بلکہ جوں جوں وہ آگے بڑھتا جاتا ہے اپنے سے
مضامین کا اضافہ ہوتا جاتا ہے - مکالمہ کا ایک بڑا حصہ غیر دلچسپ ہے لیکن عموماً ایسے مضامین کا ذکر ہے
جو انسان کے لئے بہت ضروری ہیں -

سب سے پہلی کتاب میں جو تین عنوانات پر مشتمل ہے، فن طب کی اصل او طبیب کے فرائض
سے گفتگو کی گئی ہے، دواؤں کی ترتیب انکے خواص اور استعمال، ان میں سے ہر ایک سے
تفصیلی بحث کی گئی ہے - اسی طرح امراض کے اسباب، نوعیت اور انکے انسداد و علاج کی
[illegible] مثلاً بیماریات کے ذریعہ غسل، کھانوں کی بڑی قسمیں یہاں بے شمار مسائل ہیں
[illegible] کا ذکر اس پہلی کتاب میں آتا ہے -

موضوع دوسری کتاب [illegible] امراض کا بیان ہے مثلاً بخار، صرع، رعشہ یا ورم، جذام، جنون، صرع وغیرہ
[illegible] امراض کی نوعیت، جسم کے اندر رقیق مادوں کی خصوصیت اور دوسرے مسائل
[illegible] کی تفصیل اور جسم و روح کے تعلق سے گفتگو کی گئی ہے -

پانچویں کتاب میں اعضا [illegible]

کے باب [illegible] چھٹی کتاب میں [illegible]

اور دواؤں کو حاصل کرنے نیز مختلف قسم کے امراض کی تکالیف سے بحث کی گئی ہے [illegible]

یرقان، جلد کا صفراوی ورم، دمہ، تشنگی، زہر خوری، سوء ہاضمہ، ورم، سکرات، گٹھیا، اندمال وغیرہ

اس قسم کے تمام امراض بھی ہیں۔ ساتویں کتاب میں علمی دوسیوں کا ذکر ہے اور اس کے بارھویں

باب میں اس قسم کی بہت سی دواؤں کا ذکر ملتا ہے جو اس زمانے کے ہندوؤں کو معلوم تھیں۔

سب سے آخری اور آٹھویں کتاب میں جو آٹھ ابواب پر مشتمل ہے علاوہ مختلف امراض

کے لئے انجکشن اور پچکاریوں وغیرہ کے دینے کا ذکر ہے۔ اگرچہ اس زمانے کی طب کے

ساتھ بہت کچھ قصہ کہانیوں کا رنگ بھی ملا ہوا ہے، اور یہ ترتیب و نظام آج کل عام طور پر

لوگوں کو نظر نہیں آتا، پھر بھی اس زمانے کی غیر معمولی طبی معلومات سے کسی طرح انکار

نہیں کیا جا سکتا ہے۔ آج بہت سی باتوں کو جنہیں دور جدید کی اکتشافات شمار کیا جاتا ہے

وہ حقیقت میں اس زمانے کے لوگوں کو عام طور پر معلوم تھیں۔

ان دو اشخاص یعنی سوشرت اور چرک سے مختلف گروہ پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر وائز نے اپنی کسی تحریر کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ وہ مختلف طریقہ فن جراحت کے ہیں، فن طب کے تین علم الادویہ کے، ایک تشخیص امراض کا، ایک دوا سازی کا اور تین معدنیات سے متعلق ہیں۔ ان میں سے چار کا تو کہیں پتہ نہیں چلتا لیکن باقی طریقوں سے ہم ہندوستان کے قدیم فن طب و جراحت کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔ جراحی سے متعلق مختلف آلات و اوزار تھے۔ ان کی بھی مختلف شاخیں اور قسمیں ہیں جن کی مجموعی تعداد ایک سو [illegible] ہے۔ ان میں جو بڑی بڑی ہیں

(۱) یانترا یعنی بغیر دھار کے آلات (۲) شاستر یعنی دھار دار آلات جن کو کسی [illegible]

سے [illegible]

[illegible] ہندوستان [illegible] علم تشریح [illegible]
ہوا [illegible] بھی [illegible] طب [illegible] کے [illegible]
[illegible] ہے۔ [illegible] میں جب انگریزی طرز پر چیر پھاڑ ہندوستان میں
سب سے پہلے رائج ہوا، تو اس وقت شمبل داس طالب علم اس کے لئے دستیاب ہو سکا اور
بہ مشکل تمام اس کام کو شروع بھی کرنا چاہا تو بکری کے ڈھانچوں اور خشک ہڈیوں سے شروع
کیا گیا۔ انسان کی لاش پر چیر پھاڑ کرنا تو قطعاً بعید از قیاس تھا۔ بہ مشکل ایک بنگالی طالب علم تھا
جس نے ہمت کر کے سب سے پہلے یہ راہ کھولی پھر بھی اس کے لئے سب سے پہلا کمرہ جو تیار ہوا
اس کی دیواریں خاص طور سے بہت بلند رکھی گئی تھیں اور ہر وقت اس کے گرد پولیس کا پہرہ
لگا رہتا تھا کہ کسی وقت عوام کے جذبات مشتعل نہ ہو جائیں اور لوگ حملہ کر بیٹھیں۔ اس کے
متعلق عام خیال یہ بھی پھیلا ہوا تھا کہ ادھر ادھر سے لڑکے پکڑ لائے جاتے ہیں اور مریضوں کو
بعض اوقات قصداً مار ڈالا جاتا ہے تاکہ چیر پھاڑ کے لئے لاشیں مل سکیں، لیکن یہ کوئی خاص
ہندوستان ہی کے لئے تعجب کی بات نہیں ہے۔ ایک صدی پہلے انگلستان میں بھی یہی
حال تھا۔

بہرحال علم تشریح کے تین بزرگ ہوئے ہیں جن میں سے ایک اتریہ (Atreya) کا ہے جس کا
زمانہ ۱۲۰۰ قبل مسیح ہے، دوسرا سشرت کا اور تیسرا واگ بھٹ (Vagbhata) کا جو چھٹی
صدی عیسوی میں گزرا ہے۔ اگرچہ ان لوگوں کی تشریح میں مستقل تصنیفات دستیاب ہیں لیکن
مختصر طور پر ان کے اصول کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر چرک کو لیجئے وہ کہتا
ہے کہ جسم میں حسب ذیل حصے ہوتے ہیں: دو بازو، ۲ ٹانگیں، سر اور گردن، اور جسم
کے بیچ کا حصہ۔ [illegible] انسانی [illegible] دانت اور ناخن کو ملا کر کل ۳۶۰ ہڈیاں
ہوتی ہیں۔ اس کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے سر اور گردن کو ملا کر ایک رکھا ہے
[illegible] کی فہرست میں ہم کو صرف ۳۰۰ ہڈیوں کا ذکر ملتا ہے، جیسا کہ وہ

کتنے [illegible] علم جراحت کے [illegible]
میں [illegible] شکم کے [illegible]۔ اس کے [illegible]
ہوئی ہیں۔ اس طرح سے مجموعی تعداد ۳۰۰ کی ہو جاتی ہے۔ اور [illegible]
مزید تفصیل کرتا ہے۔

سوشرت اور چرک کے بیانات میں جو فرق ہے وہ غالباً اس وجہ سے ہے کہ چرک نے ۳۲ دانتوں اور ۲۰ ناخنوں کو بھی علیحدہ ہڈیوں میں شمار کیا ہے۔ بہرحال انکے اعداد و شمار میں خواہ کچھ ہی فرق کیوں نہ ہو، اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ان کے طریقوں سے فن تشریح کے نہایت وسیع اور جامع ہونے کا ثبوت ملتا ہے اور بڑے سے بڑے اور نازک سے نازک اپریشنوں کے لئے جن کا کہ اس زمانے میں اکثر رواج تھا ایسے ہی جامع اور صحیح علم کی ضرورت تھی۔ اس لئے کہ اس زمانے کے اپریشن میں صرف جسم کے حصہ کا کاٹنا ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ شکم کے اندرونی حصہ میں بھی اپریشن دیے جاتے ہیں، ٹوٹی ہوئی ہڈیاں جوڑی جاتی تھیں، جوڑ بٹھائے جاتے تھے اور فاسد مادہ نہایت خوبی سے نکال لیا جاتا تھا۔ موتیا بند کے علاج کا سہرہ بھی سوشرت ہی کے سر ہے علاوہ اس کے چھڑے کا نگر اعضا کے جوڑنے اور علاج کا طریقہ بھی جو یورپ کو ابھی حال میں معلوم ہوا ہے، ان قدیم جراحوں کے ہاں برابر جاری تھا۔

چیر پھاڑ کے لئے جو کمرہ ہوتا تھا اس کے لئے بھی مختلف قواعد مقرر تھے۔ اس کو بعض دافع جراثیم بخارات سے صاف رکھا جاتا تھا۔ بعض اپریشنوں سے قبل مریض کو کرنی ہلکی غذا دی جاتی تھی، اور بعض حالتوں میں اسے بالکل فاقہ کرایا جاتا تھا۔ جراح کے لئے قاعدہ تھا کہ وہ اپنے سر اور داڑھی کے بال چھوٹے رکھے اور اپنے ناخنوں کو بھی صاف اور ترشے ہوئے رکھے جن پر آج کل کے ماہرین علم جراثیم بہت زور دیتے ہیں۔ علاوہ اس کے [illegible] اور خوشبودار کپڑے پہنے [illegible] سے پہلے [illegible] کرے [illegible]

[illegible] ہے۔ [illegible] ایک کتاب تھی جو [illegible] پہلے [illegible] کا ذکر ہے جو [illegible] تھے اور جو گوتم بدھ کے زمانے میں [illegible] استعمال ہوتی تھی۔

بعض قدیم تصانیف سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں نیوٹن کی پیدائش سے سینکڑوں برس پہلے لوگوں کو کشش اجسام کا مسئلہ بھی معلوم تھا نیز ہاروے کا نام سننے سے بہت پیشتر وہ دوران خون کے عمل سے بھی واقف تھے۔ ہریت نامی ایک ماہر فن اپنی کتاب میں انیمیا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ بیماری رگوں کے درمیان میں مٹی کے آجانے سے پیدا ہوتی ہے جس سے کہ خون کا دوران بند ہو جاتا ہے۔ جز لا یتجزی کے نظریہ پر حضرت مسیح کی پیدائش سے صدیوں پہلے بحث و مباحثہ ہوتا تھا، اس کے علاوہ ریاضی وغیرہ میں ان کے معلومات بہت وسیع تھے۔

جسم کے بعض حصوں کے کاٹنے کے ساتھ لوگوں کو بعض اعضا کے از سر نو لگانے کا طریقہ بھی معلوم تھا اور رگ وید میں اس کا بعض بعض جگہ ذکر ملتا ہے ایک موقع پر لوہے کے پاؤں کا ذکر آیا ہے۔ اسی طرح مصنوعی آنکھوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ چمڑے کے پیوند لگانے کا ذکر پہلے آچکا ہے جس کا اعتراف ایک جرمن مصنف ڈاکٹر ہرش برگ (Hizch Ben) اپنی کتاب میں کرتا ہے وہ لکھتا ہے کہ "یورپ کے اس قدیم فن میں نئے سرے سے ایک جان پڑ گئی جبکہ ہندوستانی جراحوں کے ان کمالات کا ہمیں علم ہوا" ذی روح جسم سے چمڑا جوڑ لگانا بھی خالص ہندوستانی ہی طریقہ ہے۔

ان قدیم جراحوں کو چمڑے سے نئے کان اور نئی ناک بنانے میں بھی دسترس تھا اس کا سبب یہ تھا کہ ان کے اہل مجرموں یا بیوفا بیویوں کو اکثر ناک اور کان کاٹنے کی سزا دیتے تھے جس کی وجہ سے ان کے جوڑنے اور لگانے کا طریقہ بھی لوگوں نے حاصل کیا۔

[illegible] سے ہمیں یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ گوتم بدھ کا طبیب جیوکا کھوپڑی کی

کے بعد [illegible] کسی [illegible] سے [illegible] تھا [illegible]
یہاں سے گزرا جائے چیچک کا ٹیکہ لگایا جاتا تھا [illegible]
باندھ دیے گئے اور پھر اس کے بعد جسم پر [illegible] چیچک [illegible]
محفوظ ہو جاتے تھے [illegible] ایک فاضل ڈاکٹر [illegible] کا خیال ہے کہ
قدیم اطبا اس قسم کا [illegible] ٹیکہ لگایا جاتے تھے جسے آج کل ویکسینیشن کہتے ہیں
یہاں تک تو فن جراحت کا ذکر تھا۔ آئندہ سطروں میں فن طب کا تذکرہ کیا جائیگا۔

سلیم کی یاد میں

عرصہ گویا [illegible] بائیس سال ہو گئے۔ وہ بھی کیا وقت تھا جب میں کوہ نینی تال سے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علیگڑھ میں داخل ہونے کے لئے چلا اور نواب حاجی محمد اسمٰعیل خاں مرحوم نے مجھ سے کہا کہ علیگڑھ پہنچکر مولوی سید وحید الدین سلیم اڈیٹر علیگڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ سے ضرور ملنا چونکہ رسالہ معارف مرحوم جس کے وہ اور حاجی صاحب مرحوم جوائنٹ اڈیٹر تھے میری نظر سے گزر چکا تھا اسلئے مجھے خود سلیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا بہت شوق تھا مگر میں علیگڑھ پہنچکر کالج کی ایف اے کلاس میں داخل ہوتے ہی بیمار پڑ گیا۔ ایک ماہ تک صاحب فراش رہا جب کچھ افاقہ ہوا تو اس سال کثرتِ طلاب کی وجہ سے جو جگہ کچی بارک میں مجھے ملی تھی اس پر دوسروں کا قبضہ ہو گیا تھا اور میں تندرست ہو جانے کے باوجود کرزن ہسپتال ہی میں رہنے کے لئے مجبور کیا گیا۔ آخرکار کالج کے ارباب حل وعقد نے جعفر منزل کرایہ پر لی اور مجھ جیسے اور ستم رسیدوں کو بھی وہاں رہنے کا حکم ہوا۔ از آنجملہ اقتدار عالم صاحب بھی تھے جو تھرڈ ایر کلاس میں تھے اور آج کل غالباً بدایوں میں وکیل ہیں۔ ان حضرت سے صاحب سلامت ہو کر کافی شناسائی ہو گئی تھی۔ جعفر منزل اس وقت زیر تعمیر تھی اور اسی کے جو کمرے تیار ہو گئے تھے وہ بھی آرام دہ نہ تھے۔ اقتدار صاحب کالج کے پرانے طالب علم تھے۔ جوڑ توڑ لگا کر سوسائٹی کو منتقل ہو گئے مگر میں اور دیگر طلبہ کچھ عرصہ تک جعفر منزل ہی میں رہے۔ اب مجھے یہاں رہتے ہوئے دو تین ماہ گذر چکے تھے ایک روز خیال آیا کہ سلیم صاحب سے ملنا چاہئے۔ میں بڑے اشتیاق کے ساتھ جعفر منزل سے سوسائٹی کی طرف جہاں سلیم صاحب رہتے تھے پا پیادہ روانہ ہوا۔ ان دونوں میں کم از کم ایک میل کا فاصلہ ہوگا۔ شام کے کوئی چار بجے ہونگے اور غالباً آخر نومبر یا شروع دسمبر کا زمانہ تھا۔ سوسائٹی پہنچکر سلیم صاحب کا کمرہ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ دکن کی جانب کے کمرے میں مقیم ہیں

اس گروہ میں پہنچا تو وہاں دو تین اصحاب اور بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں سلام کر کے ایک کرسی پر خاموش بیٹھ گیا اور منتظر رہا کہ اور لوگ اٹھ جائیں تو سلیم صاحب سے اظہار عقیدت کروں۔ خوش قسمتی سے دس پندرہ منٹ کے بعد جس موقع کا میں متلاشی تھا وہ مل گیا۔ میں اور سلیم صاحب رہ گئے باقی اصحاب اٹھ کر چلے گئے۔ اب میں نے از اول تا آخر حاجی محمد اسمٰعیل خاں کا ارشاد اور دنیا کی وجہ سے جلد نیاز نہ حاصل کرنے کی مجبوری وغیرہ وغیرہ تمام قصہ کہا اور اُن کی ملاقات پر فخر کا اظہار کیا۔ اس وقت تک میں نے دو چار نظمیں ضرور کہی تھیں مگر وہ سلسلے یاد نہ تھیں اس لئے میں نے غزل کے کچھ اشعار سلیم صاحب کو اپنے ادبی مذاق کے ثبوت میں سنانے شروع کئے۔

عرصہ زیادہ ہو گیا ہے لیکن جہاں تک خیال ہے میں نے اپنا یہ شعر پڑھ کر سنایا تھا۔

ہمیشہ نامہ بر سے وہ یہی کہتا ہے "چل آیا" کہاں تک دل کو سمجھاؤں نہ آج آیا نہ کل آیا

سلیم صاحب۔ لغو۔

(مجھے تعجب تو ہوا لیکن میں سلیم صاحب کے "لغو" کہہ دینے سے ابھی اپنی شکست تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھا)

میں۔ ارے ناداں! تو فکرِ دنیا میں کیوں سر کھپاتا ہے دھرا رہ جائیگا سب کچھ جو پیغام اجل آیا

سلیم صاحب۔ واہیات۔

اب میں ستی ہو گیا میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سلیم صاحب کو اپنی خوش مذاقی کا کیسے یقین دلاؤں میں نے دل میں کہا کہ [illegible] ایک قطعہ مولانا حالی کو سنایا تھا جب وہ میرٹھ خواجہ غلام الثقلین مرحوم کے یہاں تشریف لائے تھے اور انہوں نے اُس کی زبان کی تعریف کی تھی۔ آؤ اُسے سنائیں چنانچہ اس تمہید سے کہ مولانا حالی سے میرٹھ میں مجھے نیاز حاصل ہوا تھا اور یہ قطعہ انہیں بھی سنایا تھا میں نے پڑھنا شروع کیا۔)

آئے ہو، بیٹھو، جاؤ گے جلدی، ہوا یہی کیا مدت میں آج ہوئی ہے زیارت حضور کی
تشریف لائے اور کیا سود و کرم تکلیف فرمائیے واسطے اپنی غرور کی

ہیں آپ ایک ہی [illegible] کی — [illegible] ہم [illegible] ہی مگر

جب تک کہ ہم نے نہیں آواز سنو دی — یہ بات تو ہے خوب ولیکن ہنر نہو

سلیم صاحب۔ خرافات۔

اب مجھے کچھ اور کہنا باقی نہ تھا اور دل ہی دل میں پشیمان تھا کہ سلیم صاحب نے نصیحتاً کہا "شاعری بیکار شے ہے اسے چھوڑنا چاہئے" اور مجھ سے دریافت کیا۔

سلیم صاحب۔ تم مولانا حالی سے کہاں ملے تھے؟

میں۔ میرٹھ میں۔

سلیم صاحب۔ کب؟

میں۔ ۱۹۰۵ء میں۔

سلیم صاحب۔ تم انہیں پہچان سکتے ہو؟

میں۔ (ذرا ہچکچاتے ہوئے) جی ہاں!

(اسی کمرے کے اندر لکڑی کے تختوں سے ایک حدِ فاصل بنا کر علیحدہ چھوٹا سا کمرہ بنا ہوا تھا اور دروازہ بھی لگا تھا تھوڑی دیر میں دروازہ کھلا اور ایک صاحب باہر تشریف لائے سلیم صاحب فوراً اٹھے، انکے اٹھتے ہی میں بھی کھڑا ہو گیا۔ غالباً سلیم صاحب سے انہوں نے دیا سلائی طلب کی، اپنا سگار روشن کیا اور کھڑے کھڑے دو ایک کش لیکر جہاں سے آئے تھے وہیں چلے گئے اور دروازہ بدستور بند ہو گیا۔ سلیم صاحب پھر اپنی جگہ پر آ بیٹھے)

سلیم صاحب۔ (مجھ سے مخاطب ہو کر) تم جانتے ہو کہ یہ کون صاحب تھے؟

میں۔ (بالکل بے پروائی سے) جی نہیں!

سلیم صاحب۔ یہ مولانا حالی تھے۔

سلیم صاحب کا اتنا کہنا تھا کہ میرے دل کی عجیب کیفیت ہو گئی [illegible] سے اٹھنے کے لئے بیقرار ہو گیا۔ میری بیقراری کو سلیم صاحب نے مولانا حالی سے ملنے کی خواہش پر محمول کیا اور

فرمانے لگے " یہ وقت اُن سے ملنے کا نہیں ہے وہ کلام مجید کا [illegible] کر رہے ہیں۔ انکو ملنے ملانے کی فرصت نہیں ہے"

میں۔ (کھڑا ہو کر) السلام علیکم

سلیم صاحب۔ (بہت بے پروائی سے) وعلیکم السلام

اب دل چھپنے ہی کو تھا۔ کمرے سے باہر نکل کر مجھے معلوم نہیں ہوا کہ میرا پاؤں کہاں پڑ رہا ہے اور میں کدھر چلا جا رہا ہوں۔ اپنے اوپر لعن و تعن کرتا ہوا اور افسوس کرتا ہوا کہ کیوں اس شخص سے ملنے آیا اور قریب قریب روتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ بار بار کہتا تھا " یہ عجیب آدمی ہے مانا کہ میں نے ما۱ مجھے شعر کہنا نہیں آتا۔ میرے اشعار بھی لغو ہیں لیکن یہ کیا انسانیت ہے کہ اس طرح آدمی کو ذلیل کیا جائے۔ کیا اپنی ناپسندیدگی کے اظہار کے لئے کوئی اور مستحسن طریقہ نہ تھا؟ اور لیجئے آپ پوچھتے ہیں تم مولنا حالی کو پہچان سکتے ہو۔ گویا میں جھوٹا ہوں، میں نے انہیں دیکھا ہی نہیں کوئی پوچھے کہ ایک ہی بار تو میں نے مولنا حالی کو دیکھا تھا۔ پھر دو برس تک دیکھنے کا موقع نہیں ملا اور تصویر انکی کہیں شائع نہیں ہوئی تھی۔ کیا یاد رہ سکتا ہے اور ان کو کیسے پہچانا جا سکتا ہے۔ مگر اس شخص کو ذلیل کرنا مقصود تھا۔ بھئی! ہم تو اب اس شخص کے یہاں کبھی نہ جائینگے خدا اس سے پناہ میں رکھے۔ توبہ! توبہ! الٰہی یہ شخص تو ملنے کے لائق ہی نہیں ہے" غرض جو میرے منہ میں آیا کہتا چلا گیا۔ اپنے آپ کو بھی برا کہا اور سلیم صاحب کو بھی۔ جب جعفر منزل پہنچا تو میں اس قدر رنجیدہ اور ملول تھا کہ اس روز میں نے کھانا بھی نہیں کھایا اور نہ رات کو کچھ لکھا پڑھا دو تین روز تک میں چپ چپ اور خاموش رہا۔ اس کے بعد یہ ناگوار سانحہ دل سے محو ہو گیا۔

ایک روز اقتدار صاحب ملے، اس واقعہ کے ایک یا ڈیڑھ ماہ بعد اور میری نظم موسومہ "ایک طائر وحشی کی فریاد" علیگڑھ منتھلی دسمبر ۱۹۰۸ء میں شائع ہو چکی تھی کہنے لگے "سلیم صاحب آپ کو یاد کر رہے تھے اور کہتے تھے کہ تنہا صاحب سے کہیں ملاؤ"

میں۔ (دل میں) شاید ان کو میری اور سلیم صاحب کی اس ملاقات کا حال معلوم ہو گیا ہے ہوا [illegible]

[illegible] اقتدار صاحب کے میری اور سلیم صاحب کی کوئی واقفیت نہیں وہ مجھ کو کیونکر یاد کرتے ہیں؟

اقتدار صاحب۔ (کسی قدر مسکرا کر) میں سے مجھے یقین ہو گیا کہ یہ ضرور میری ہنسی اڑا رہے ہیں) بھئی ایسا تمہیں کہتا ہوں وہ آپ کو پوچھ رہے تھے اور جب انہیں معلوم ہوا کہ میری اور آپ کی ملاقات ہو تو مجھ سے پھر انہوں نے کہا کہ تنہا صاحب سے ضرور ملانا۔ مجھے تو آپ سے کہنا بھی یاد نہ رہا اور وہ کئی بار تقاضا کر چکے ہیں۔ (اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر) اگر تمہیں میرا یقین نہیں تو ان سے پوچھ لو۔

اقتدار صاحب کے ساتھی۔ واقعی سلیم صاحب نے مجھ سے اور ان سے کئی بار کہا ہے کہ تنہا صاحب سے ہمیں ملاؤ۔ اور ہم نے ان سے کہہ دیا ہے کہ وہ اکثر یہاں تاش کھیلنے آیا کرتے ہیں آپ سے ملا دیں گے۔ آپ سوسائٹی ہم سے ملنے اور تاش کھیلنے اکثر جاتے ہیں مگر سچ یہ ہے کہ ہمیں یاد نہیں رہتا۔

میں۔ (دل میں) آپ کے ساتھی ہی کیا قابل اعتبار ہیں۔ اس کالج میں تو ایک سے ایک چھٹا ہوا لڑکا بھرا ہوا ہے۔ بیوقوف بنانا اور ہنسی اڑانا معمولی بات ہے۔ (اقتدار صاحب سے) اچھی بات ہے جب آپ سے ملنے آؤں گا تو سلیم صاحب سے بھی مل لوں گا۔

درحقیقت اقتدار صاحب سے میں نے یہ بات کہنے کو تو کہہ دی مگر دل میں یہی ارادہ تھا کہ سلیم صاحب سے ہرگز نہ ملوں گا اگر اقتدار صاحب فی الواقع سچ بھی بول رہے ہوں۔ علیگڑھ منتھلی جنوری سنہ ۱۹۱۷ء میں اب میری ایک اور نظم "بلبل سے دو دو باتیں" چھپی۔ معلوم ہوتا ہے کہ میری یہ دونوں نظمیں دیکھ کر سلیم صاحب کو مجھ سے ملنے کا اشتیاق ہوا اور وہ اپنی اور میری اس ناگفتہ بہ ملاقات کو بھول گئے تھے۔ میں نے یہ دیکھا کہ اقتدار صاحب جب کبھی ملتے، مجھ سے ضرور تقاضا کرتے کہ سلیم صاحب سے ملنے چلو اور میں ٹال دیتا۔

ایک روز تعطیل تھی اور دن میں کھانا کھا کر سیدھا سوسائٹی پہنچا شاید بارہ بجے ہوں گے آخر جنوری یا شروع فروری کا زمانہ تھا۔ اقتدار صاحب کے کمرے میں تاش کھیلا جا رہا تھا۔ میں بھی

قریب ہو گیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد اقتدار صاحب سے کہا گیا کہ سلیم صاحب نے ان کو
کسی ضرورت سے بلایا۔ وہ واپس آئے تو کہنے لگے کہ "تنہا صاحب! چلیے۔ آج تو کہہ رہے تھے
سلیم صاحب آپ کو یاد کر رہے ہیں"۔ میں بہت متعجب ہوا مگر چارۂ کار کچھ نہ تھا۔ میں نے کالج
واپس آنے کا بھی ارادہ کیا لیکن اقتدار عالم صاحب نے مجھے پکڑ لیا اور کشاں کشاں سلیم صاحب کے
کمرے تک لے گئے۔ وہاں پہنچ کر مجبوراً میں نے بھی متانت اختیار کی اور کہا کہ مجھے چھوڑو، میں خود
چلتا ہوں۔ چنانچہ اسی حد فاصل والے چھوٹے کمرہ میں ہم سب لوگ جو چار یا پانچ تھے داخل ہوئے۔
سلیم صاحب بآں ریش مبارک ایک پلنگ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دو تکیے جن کے غلاف
میلے تھے ایک سرہانے اور ایک ان کے زانو کے نیچے تھا۔ پان چبا رہے تھے۔ پاندان چھوٹا سا
ایک اسٹول پر تھا اور ایک بوسیدہ ڈبیہ بھی تھی جس میں بہت سے پان بنے ہوئے تھے۔ ہم
لوگوں کے بیٹھنے کے لئے کرسیاں پڑی تھیں، ایک آدھ کی جو کمی تھی وہ نوکر نے باہر سے لا کر پوری
کر دی اور ہم میں سے ایک صاحب سلیم صاحب کی پائنتی بیٹھ گئے۔ میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ اقتدار
صاحب نے سلیم صاحب سے میرا تعارف کرایا۔

سلیم صاحب۔ (مجھ سے مخاطب ہو کر) آپ کی نظمیں علیگڑھ منتھلی میں دیکھ کر بیحد طبیعت خوش ہوئی
آپ بہت اچھی نظمیں لکھتے ہیں۔ افسوس ہے آپ سے ابتک ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

میں۔ (دل میں) ارے ظالم! میں ہی جانتا ہوں، میں جیسی اچھی نظمیں لکھتا ہوں (سلیم صاحب سے)
کچھ عرصہ ہوا میں آپ کی خدمت میں حاضر تو ہوا تھا۔

سلیم صاحب۔ مجھے بالکل یاد نہیں آپ ایک مرتبہ کے بعد پھر شاید نہیں آئے

میں۔ (دل میں) کون ایسا کمبخت بے غیرت ہوگا جو ایسی ملاقات کے بعد دوبارہ آئے (سلیم صاحب
سے) جی ہاں! پھر میں نہیں آیا۔

سلیم صاحب۔ کبھی کبھی تشریف لایا کیجئے۔ آپ کے کالج کے اکثر طلبہ جن کو ادبی مذاق ہے تقریباً
روزانہ آتے رہتے ہیں۔ مجھے بڑا تعجب ہے کہ آپ ادھر [illegible] نہ کریں

مجھ کو ان دنوں ... میں ... بہت شوق تھا لیکن ... اگر ... (سلیم صاحب) کبھی یہاں آنا اتفاق ہوا تو انشاءاللہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کروں گا۔

ہم سب لوگ دس پندرہ منٹ اور بیٹھے اور سلیم صاحب نے سب کو اپنی ڈبیہ میں سے پان عنایت فرمائے۔ اس کے بعد ہم سب رخصت ہو کر چلے آئے۔ میں جعفر سرنل یا غالباً کمپنی باغ گھر فیروزا کو چلا آیا کیونکہ میں عشاء تک جب کہ میں نے ایف اے کا امتحان پاس کیا اسی کمرہ میں رہا۔ اب میں کبھی کبھی سلیم صاحب کے یہاں جانے لگا اور ان سے ایک قسم کی بے تکلفی ہو گئی ایک روز سلیم صاحب نے فرمایا "بھئی تم نثر نہیں لکھتے، نظمیں ہی لکھا کرتے ہو اب زمانہ نثر کا ہے کوئی مضمون ہمارے اخبار کے لئے لکھو"۔ میں ان سے مضمون لکھنے کا وعدہ کر کے چلا آیا۔ چار پانچ روز بعد میں ایک مضمون لکھ کر لے گیا۔ اُس کا عنوان "شہرت سے خطاب" تھا۔ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور اُسے تمام و کمال پڑھ کر مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور کہنے لگے "یہ مضمون تم نے لکھا ہے"۔ میرا اب وہ زمانہ تو رہا نہیں تھا کہ جب ان کے الفاظ "لغو، واہیات، خرافات" سنکر لہو کے سے گھونٹ پی کر چلا گیا تھا اب میں ان سے مقابلے کے لئے بھی تیار تھا۔

میں۔ جی نہیں کسی اور سے لکھوا کر لایا ہوں۔

سلیم صاحب۔ واقعی خوب مضمون لکھا ہے۔ تم نظم لکھنا چھوڑ دو۔ نثر لکھا کرو۔ نثر تم بہت اچھی لکھتے ہو۔ (میرے چہرے کی طرف دیکھکر) تمہاری صورت پر علمیت نہیں برستی۔ لیکن آگے چل کر عالمانہ شان بھی پیدا ہو جائے گی۔

سلیم صاحب نے وہ مضمون علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں چھاپا اور ایک ہفتہ تک جو کوئی آتا اُس سے میرا تعارف کراتے اور کہتے کہ آپ نے "شہرت سے خطاب" والا مضمون پڑھا ہے۔ وہ انہیں صاحب ہی ہیں جنہوں نے وہ مضمون لکھا ہے۔ دو تین ہفتہ کے بعد سلیم صاحب نے اور مضمون لکھنے کے لئے کہا۔ اور میں نے ایک ہفتہ کے بعد "اعتماد" پر مضمون لکھا۔ اُسے لیکر سلیم صاحب کی خدمت میں پہنچا۔ پہلے دو پیراگراف دیکھکر کہا کہ یہ اچھے ہیں لیکن آخر کے حصہ مضمون کو پڑھکر کہا کہ یہ کچھ

نہیں اس کو بدلو۔ میں اسکے سامنے سے چل کر لے گیا۔ پھر بڑا اظہار خوشی کیا اور میری بیحد
بیحد تعریف کی اور کہا کہ تم نے آخر کے حصہ کو خوب ہی بدلا ہے تعریف نہیں ہو سکتی۔ اس مضمون کو
بھی علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں چھاپا اور لوگوں سے اس کی تعریف کرتے تھے۔

ایک روز میں ایک انگریزی نظم کا اردو نثر میں ترجمہ کرکے لے گیا۔ بہت خوش ہوئے اور کہا کہ بہت سی انگریزی نظموں کا ترجمہ کر کے ایک کتابی شکل میں چھپواؤ۔ چنانچہ انکے ارشاد کے مطابق شعر و ترجمہ کے نام سے میں نے اس قسم کی کتاب ۱۹۱۳ء میں چھپوائی تھی۔ سلیم صاحب اس وقت لکھنؤ کے مسلم گزٹ کے اڈیٹر تھے۔ اس اخبار میں آپ نے اس کتاب پر ریویو کیا اور لکھا کہ ایک شخص نے فرانسیسی نظموں کا ترجمہ عربی میں چھاپا ہے۔ وہ ترجمہ میں ایسا کامیاب نہیں ہوا جیسے کہ تنہا صاحب۔ اس کے علاوہ اور بہت کچھ تعریف لکھی۔

ایک روز چند طلبا انکے پاس بیٹھے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ گرمی کا موسم تھا۔ مجھے سوسائٹی کے دروازے سے آتا دیکھکر بڑے زور کے ساتھ ہاتھ سے اشارہ کرنے لگے کہ فوراً آؤ۔ انیس احمد صاحب بھی تھے جو شیخ الہند مولوی محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہونے کی وجہ سے مولوی انیس احمد صاحب مشہور ہیں اور ہندوستان میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ انہوں نے بھی اشارہ کیا کہ فوراً آؤ۔ میں تیز قدمی کے ساتھ ان لوگوں کے پاس پہنچا اور حیران تھا کہ کیا ایسا ضروری کام ہے جو اس قدر جلد بلاتے ہیں۔ فوراً مجھے بیٹھنے کے لئے کہا گیا۔ میں بیٹھ گیا۔ اب سلیم صاحب نے کہا۔

سلیم صاحب۔ اس وقت ہم سب آدمی مشدد آباد کے رہنے والے موجود ہیں۔ ہم میں کوئی غیر شخص نہیں۔ مشدد آباد سے اضلاع سہارنپور، کرنال، مظفرنگر اور میرٹھ کا کچھ حصہ مراد ہے۔ اس علاقہ کو مشدد آباد کیوں کہتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ یہاں کے لوگ ہر لفظ تشدید کے ساتھ بولتے ہیں۔ مثلاً روٹی کہنا ہو تو کہیں گے روّٹی۔ لوٹا کہنا ہے تو کہیں گے لوّٹا۔ ایک لطف اور ہے جن الفاظ پر تشدید ہو، اس تشدید کو حذف کر دیتے ہیں مثلاً کتّا کہنا ہے تو کہیں گے کتا۔ بلّی کہنا ہو تو کہیں گے بلی۔ بعض اوقات اکثر الفاظ میں سے الف حذف کر دیتے ہیں مثلاً کہنا ہو [illegible]

[illegible]

[illegible] صاحب [illegible]

[illegible] کیا [illegible] لیکن [illegible]

[illegible] صاحب [illegible] اور [illegible] کے نشار کی مطابق

[illegible] نظم اس [illegible] مضمون کی [illegible] کے عنوان سے کہی۔

[illegible] بعض اشعار سلیم صاحب نے پسند کئے اور بعض کی نسبت کہا کہ انہیں بدلو۔

میں روزانہ دو چار شعر کہہ لیا کرتا تھا اور وہ پسند کر لیتے تھے۔ نظم بڑی تھی اس لئے ایک ہفتہ

تک یہی سلسلہ رہا۔ ایک روز دوپہر کا وقت تھا جب میں سلیم صاحب کے ہاں پہنچا۔ کہنے لگے کہ اب

اشعار تھوڑے رہ گئے ہیں جن کو بدلنا مقصود ہے، اس لئے تم ان کو میرے سامنے ہی بدلو۔

چنانچہ میں نے ترمیم و تنسیخ شروع کر دی۔ ایک مصرع جو بدل کر سنایا تو ہاتھ سے اشارہ کیا جیسے کوئی

کسی کو بلاتا ہو اور جلدی جلدی کرنے لگے۔ میں نے کہا کہ اس سے کیا مطلب ہے؟ فرمایا اس مصرع پر غلو ہو گئے،

[illegible] خوب ہنسے۔ اس وقت تو میں چپ ہو رہا۔ حضرت بھی میرے مصرعوں کی بجائے دوسرے

مصرعے لکھتے جاتے تھے اور جب ہم دونوں پسند کر لیتے تھے اس مصرع کو کاٹ لیتے تھے۔ سلیم صاحب

نے [illegible] مصرع میرے مصرع کی بجائے کہا وہ اچھا نہ تھا میں نے بھی ہاتھ کا وہی مخصوص اشارہ کیا

جیسا ان سے سیکھا تھا۔ اس وقت سلیم صاحب کی ہنسی کا کہیں پتہ نہ تھا بالکل سنجیدہ بن گئے

اور میں ہنس رہا تھا خود کہا کہ اچھا یہ مصرع پسند نہیں اور لو۔ غرض اسی ہنسی دل لگی میں وہ

نظم اسی وقت پوری کر دی گئی۔

ایک دفعہ حسب عادت سلیم صاحب کے یہاں حاضر ہوا تو کہنے لگے۔ میری دعا ہے

[illegible] پاس [illegible] میں [illegible] گیا اور میں نے سلیم صاحب سے کہا کہ مجھ سے

[illegible] دیتے ہیں۔ فرمایا صاحبزادے تم سے پہلے بھی اور لوگ ادبی مذاق

[illegible] کے پاس [illegible] اور ان کو [illegible] پر لکھنا پڑتا گیا۔ [illegible]

وہ پھر کیطرف بھول کر نہیں آئے۔ تم بی اے پاس ہو جاؤ گے تو تمھارا بھی یہی حال ہوگا۔ اس لئے میں کہتا ہوں خدا تمہیں بی اے پاس نہ کرے تاکہ یہ ادبی شوق تو برقرار رہے۔" میں نے مولوی صاحب کو کہا کہ آپ مطمئن رہئے میں ہرگز یہ ادبی شوق نہ چھوڑوں گا لیکن آپ میرے لئے دعا کیجئے کہ میں بی اے پاس ہو جاؤں تاکہ یہ شوق اچھی طرح پورا کرسکوں۔ سلیم صاحب نے کہا کہ میں تو اسی خیال سے کہتا تھا ورنہ کوئی مجھے تم سے دشمنی نہیں ہے۔ خدا تمہیں بی اے کرے لیکن تم کو ادبی شوق بھی برابر رہے۔

میں ایف اے پاس کر کے میرٹھ کالج کی تھرڈ ایر کلاس میں داخل ہو گیا اور اس کے بعد سلیم صاحب سے جو روزانہ ملاقاتیں ہوتی تھیں انکا لطف جاتا رہا۔ ۱۹۱۱ء میں پانی پت گیا تو سلیم صاحب سے وہاں نیاز حاصل ہوا۔ ۱۹۲۰ء میں بھی پانی پت ان سے ملنے کے ارادہ سے گیا اور ملاقات کی۔ ۱۹۰۵ء اور ۱۹۲۵ء میں بہت فرق پایا۔ ۱۹۱۱ء میں تو حالت بدستور تھی۔ سلیم صاحب مرنجان مرنج آدمی تھے۔ ۱۹۰۵ء بلکہ ۱۹۱۱ء تک دہریت کیطرف راغب تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ انکا یہ رجحان کیوں اور کیسے جاتا رہا لیکن ۱۹۲۵ء میں وہ صوم وصلوٰۃ کے پابند ہو گئے تھے اور انکے عقائد بہت درست اور صحیح ہو گئے تھے۔ مسلمانوں اور اسلام کے ہمیشہ سچے ہی خواہ رہے۔ مزاج میں ظرافت بہت تھی۔ اردو کے فاضل ادیب تھے۔ جدت پسند تھے۔ آزاد طبع تھے۔ مولانا حالی کا بہت ادب کرتے تھے اور انکو بیحد مانتے تھے۔ افسوس ۱۹۲۸ء میں انتقال فرما گئے۔ کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے۔

گرفتاری

حلقۂ گرد تن زنجیرے بپیکران آتشِ گل — آتشے در سینہ دارم از نیاگانِ شما

مجھے یاد ہے کہ میں نے بچپن میں ایک مرجھایا ہوا سا پودا دیکھا تھا، اور اُسے بالکل سوکھا سمجھ کر میں اس کی ننھی ننھی شاخیں توڑنے لگی، شاخیں واقعی سوکھی تھیں، اور ایسی طرح چٹ چٹ ٹوٹ گئیں گویا انہیں میرے توڑنے کا انتظار تھا میں نے ایک ایک کر کے سب شاخیں زمین پر بکھیر دیا اور پودے کا نازک تنا بالکل ٹُنڈ مُنڈ ہو کر رہ گیا اس کی یہ حالت دیکھ کر مجھے ترس آیا اور شرارت نے یہ مشورہ دیا کہ اگر شاخیں توڑ ڈالیں تو تنے کو کھڑا چھوڑ دینا اور زیادہ ظلم ہے۔ میں نے اس کا پتلا سرا اپنے ہاتھ میں لیا اور ذرا سا جھٹکا دیا۔ تنا نہیں ٹوٹا، اس کے تیور دیکھ کر میں نے بھی پوری طاقت آزمائی کی اور پورا جڑ سے ٹوٹ گیا۔ لیکن جڑ جہاں سے ٹوٹی وہاں تری تھی اور ہلکی سی سبزی، وہاں زندگی کا رشتہ ابھی قائم تھا۔ اس رشتے نے اپنے ٹوٹنے پر فریاد کی اور آنسو بہائے۔ یوں ہی میں بھی جب عمر کے بیس پچیس سال گذر گئے ہیں، اپنی ہستی کو تصور کرتی ہوں۔ میں ایک قصبہ میں رہتی ہوں۔ جہاں کے وہ بسنے والے جنہوں نے اسے اپنا آشیانہ بنایا تھا اور اپنے فلک پیما حوصلوں کی بنیاد پر وہاں ایک زندگی تعمیر کی تھی اب بے نشان قبروں میں آرام کر رہے ہیں اور انکے بعد سے سارے قصبہ پر موت کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ میں ایک مکان میں رہتی ہوں جس کے در و دیوار زمین کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں، اور اس زندگی سے شرمندہ ہیں جس میں اُن کی رسوائی ہی رسوائی ہے۔ اس مردہ بستی اور اجڑے مکان میں صرف میں زندہ ہوں، میرا جسم میری روح، میری امیدیں۔ اُس سوکھے پودے کی شاخوں کی طرح یہ سونی بستی اور یہ ویران گھر اس کے منتظر ہیں کہ کوئی شوخ شریر ہاتھ انہیں گرا دے اور وہ مٹی میں مل جائیں۔ میں اس کھنڈر میں گرفتار ہوں اور میری گرفتاری وہ سلسلہ قائم کئے ہے جسے زندگی کہتے ہیں، مگر اُس پودے کی تری

دنیا کی جبری اور اصلیت کی [illegible]

خیریا اور اس کشمکش کی آرزو پار [illegible] ہوں [illegible]

بچا ہے وریہ دن کشمکش کے ساتھ ممکن ہے میرا دن [illegible] جاؤں۔ لیکن [illegible]

اور ممکن ہے یہ پیلے کپڑوں کی مانند زمین پر گر جائے۔ میری ہستی [illegible] دنیا کی [illegible]

کوئی پردہ باقی نہ رہے تب بھی مجھے شکایت نہ ہوگی کیونکہ مجھے معلوم نہیں کہ میں [illegible]

آگ کی آخری چنگاری ہوں، یا ایک آتش جہاں سوز کا پہلا شعلہ۔ اور مجھے موت [illegible]

یا بقا کا، موت کی تاریکی سے بغل گیر ہونا چاہیے یا روشنی میں جلوہ افروز۔ مجھے صرف اتنا معلوم

ہے کہ میں زندہ ہوں، مجھ میں زندگی کا سامان ہے اور زندہ رہنے کی آرزو۔ مگر میں گرفتار بلا

اور میری گرفتاری عشق کی نہیں اور ہوس کی نہیں۔ اس گرفتاری میں میری ہستی مرجھائی سے،

سرسبز نہیں ہوتی۔ میں ہر حالت میں راضی برضا ہوں، مگر میرا دل یہ کہتا ہے، ممکن ہے یہ

محض مغالطہ ہو۔ کہ یہ آگ بجھنے کے لئے نہیں جلائی گئی تھی۔

میں جس مکان میں رہتی ہوں اس کی بنیاد علاؤالدین خلجی کے ایک سردار نے ڈالی

تھی، اس نے یہ قصبہ بھی آباد کیا تھا۔ اس کے زمانے سے اس وقت تک اس خاندان نے

عجیب عجیب جوہر دکھائے ہیں۔ اس نے کوئی ایسی شخصیت نہیں پیدا کی جو تمام ہندوستان

میں مشہور رہی ہو لیکن قوم اور ملت کو صرف بڑی شخصیتوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آئین

پر استقلال سے قائم رہنے پرانے اصولوں میں جوش عقیدت سے ہر دم نئی جان پھونکنے

ایسی ہستیاں درکار ہیں جن کو عوام بہت بلند پایہ نہ سمجھیں، اور [illegible]

محض حق کے پیچھے دیکھ کر مایوس نہ ہو جائیں۔ یہ وہ زنجیریں [illegible]

سے علیحدہ نہیں ہونے دیتیں وہ بادبان جو جہاز کو [illegible]

اس خاندان میں ایک نصرت خاں تھے جنہوں نے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کسان [illegible] کھیت واپس دلوانے میں گذری جو کسی مقدم نے اس سے چھین

[illegible] غریب کسان کے کھیت کے لئے وہ اپنے باپ سے خفا ہو گئے، گھر بار چھوڑ کر

[illegible] دہلی پہنچے، وہاں کوئی پرسان حال نہ ہوا تو فوج میں نوکری کی، رفتہ رفتہ

[illegible] بادشاہ کے مصاحب بنے، اور خدمت کا حق ادا کر کے شاہی فرمان کے ذریعہ سے

کھیت واپس لیا۔ انہیں درباری زندگی سے کوئی دلچسپی نہ تھی، علمی ذوق کے آدمی تھے لیکن

جوانی ہی میں ٹھان لی تھی اس پر قائم رہے، اس کے لئے تمام عمر صرف کرنا گوارا کیا جب وہ واپس

گئے تو کسان اور مقدم دونوں مر چکے تھے، انہوں نے فرمان کی بنا پر کسان کے وارثوں کو وہ

کھیت واپس دلوایا، جب وہ کسان کے وارثوں کو فرمان سنا رہے تھے، تو انہیں اپنی عمر

کی بربادی کا خیال آیا اور فرمان پر دو آنسو ٹپک پڑے۔ کھیت اور فرمان دونوں انکے بیٹے

نے انکے مرنے کے چند مہینے بعد کسان سے خرید لئے۔ یہ فرمان ابتک موجود ہے، اور اس

پر آنسوؤں کے دھبے بھی اب تک نظر آتے ہیں۔ ہمارے خاندان ہی میں ایک رنگیلے میاں تھے

جو بعد کو رنگیلے شاہ کے نام سے کافی مشہور ہوئے، انہوں نے ساری جوانی عیاشی اور ہوس

پرستی میں گذاری تھی، ایک روز جب وہ شراب پیئے بیٹھے تھے تو لوگوں نے خبر دی کہ بیوی

کا دم نکل رہا ہے، اور وہ اسی طرح بدمست ان سے آخری بار رخصت ہونیکے لئے پہنچے

بیوی کا بھی آخری وقت تھا، لیکن وہ محبت کیش عورت شوہر کو پاس کھڑا دیکھ کر اپنی تمام

ہستیں [illegible] جتنی جسم میں طاقت باقی تھی اسے جمع کر کے شوہر پر ایک لمبی پر اسرار نظر ڈالی

ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں، رنگیلے میاں محبت کا یہ جلوہ دیکھ کر سودائی ہو گئے کئی روز تک

بیوی کی لاش کے پاس کھڑے رہے، جب کھڑے رہنے کی طاقت نہ رہی تو گر پڑے، لیکن اثر

[illegible] کی نعمتیں رنگیلے میاں کے جی سے اتر گئیں، انہوں نے وہیں اپنی [illegible]

[illegible] بتائی، رات بھر عبادت کرتے اور دن کو غریب [illegible]

[illegible] عوام سے [illegible] سمجھے تھے [illegible] وہ لڑکے
سمجھتے تھے اگر سودائی نہ سمجھے جاتے قرآن پر کفر کا فتویٰ دیا جاتا، کیونکہ وہ لوگوں کو تعلیم دیتے تھے کہ خدا کی خدائی بغیر عورت کی محبت کے قائم نہیں رہ سکتی۔

لیکن یہ صوفیوں کو مدت ہوئی خاک میں مل گئیں۔ اب تو معلوم ہوتا ہے کہ صرف صوفی ہی اور نہیں بلکہ خود صوفی گر بدل گیا ہے۔ میرے والد مقدمہ بازی کی فضا میں پیدا ہوئے لیکن سے انکا حوصلہ مقدمہ دائر کرنا، لڑنا اور جیتنا رہا ہے۔ روزہ نماز کے نہایت پابند ہیں، قرآن شریف کی روزانہ تلاوت کرتے ہیں۔ کبھی کبھی جب کوئی آبا و اجداد کا ذکر چھڑتا ہے تو اعتقاد سے ٹھنڈی سانسیں بھرتے ہیں۔ اپنی حالت پر انہیں رونا آتا ہے، لیکن وہ ہمت جو زندگی تعمیر کرتی ہے، جس سے ویرانے آباد ہوتے ہیں ان میں نہیں ہے، اور کوئی اثر اسے پیدا نہیں کر سکتا۔ دوسرا کوئی مانے نہ مانے مجھے اس کا پورا یقین ہے، کیونکہ اگر ان میں ہمت ہوتی تو وہ میری آرزوئیں محسوس کرتے، میری نظر سے نظر لڑتی تو میرے دل کی کیفیت سمجھ لیتے، میری خاموشی ان کے لئے ایک معمہ ہوتی، میرے معمے ایک پر کیف کہانی۔

میرے بھائی کی چودہ برس کی عمر میں شادی کر دی گئی، ورنہ اچھی خاصی جائداد ہاتھ سے جاتی رہتی، میری چوبیس سال تک شادی نہیں ہوئی، لڑکیوں کے بیاہنے میں کچھ ہی نہیں ہے، اور سمجھدار والدین، آمدنی کا خانہ خالی نہیں رکھنا چاہتے۔ میرے لئے ایک شوہر چاہئے تھا جو خود امیر ہو اور بیوی کی غریبی کا مطلق خیال نہ کرے، جس کی اطمینان بخش آمدنی ہو اور سسرال کی جائداد حاصل کرنے کی ہوس سے اس کا نفس بالکل پاک ہو، اس سے بڑھ کر یہ کہ جب دنیا میں کسی کو نہ تھا تو میری گرفتاری میں تڑپنے کا کسے تعلق رہا، اور یہ تو سب ہی کو معلوم ہے کہ جس مرغ کے گلے پر چھری پھیر دی گئی ہو وہ زیادہ عرصہ تک تڑپ بھی نہیں سکتا۔ میں تڑپتی رہی، زمانہ گزرتا گیا۔

میرے بھائی کی شادی چودہ برس کی عمر میں ہوئی۔ شادی کے بعد وہ اسکول کے لئے [illegible] جاتے ہم نہیں جانتے۔ وہاں جا کر سب خلق اٹھائیں گے۔ [illegible] تعلیم کا [illegible]

[illegible] بار بار [illegible] رہی تھیں، لیکن بار اس قدر پر زور دیا تو کسی دوسرے اسکول میں ہو
انھوں نے میرے بھائی کو راضی کر لیا۔ ایک اسکول میں نام لکھوا دیا، گاڑی کے وقت سے تین
چار گھنٹے پہلے سے، اسباب، سب تیار کرا دیا، لیکن جب جدائی کا وقت آیا تو انکی آنکھوں میں
آنسو تھے، میری بھاوج بھائی سے چمٹ کر زار و قطار رونے لگیں، باہر لوگ چلاتے رہ گئے اور
گاڑی چھوٹ گئی۔ وہ عمر جس میں بھائی تعلیم حاصل کر سکتے تھے یوں گذر گئی، کچھ مہینہ بعد اولاد کی
پہلی قسط عطا ہوئی، ماں باپ، دادی، دادا کے بلند حوصلے پورے ہوئے جب صاحب اولاد
ہونے کا فخر حاصل ہوا اور کسی فن میں طبع آزمائی کی حاجت نہیں۔ یہ کارنامہ تمام عمر کے لئے کافی
ہے۔ لوگوں کے اصرار سے بھائی کے لئے نوکری کی تلاش کی جا رہی تھی لیکن وہ خود بچے کو کھلانے میں
اس قدر مصروف تھے کہ لوگوں پر صاف ظاہر ہو گیا کہ وہ نوکری کی شرطیں پوری نہیں کر سکتے، اور اگر
ماں باپ کی محبت آمیز نظروں سے دیکھا جائے تو وہ نوکری سے ہزار درجہ بہتر کام میں مشغول
ہیں، وہ غالباً تمام عمر اسی مبارک کام میں مشغول رہتے لیکن فطرت کے بھی کچھ احکام ہیں جن کے
خلاف عمل کرنے کی سزا ملتی ہے۔ اٹھارہ برس کے سن تک میری بھاوج کے تین بچے ہو چکے تھے
یوں وہ مجھ سے صرف ایک سال بڑی تھیں مگر دیکھنے میں دس سال کا فرق معلوم ہوتا تھا، آنکھوں
کے گرد حلقے، گالوں پر جھریاں، کمر میں خم، بڑھاپے کے تمام آثار نوجوانی میں دیکھنا انکی قسمت میں
لکھا تھا، انہوں نے دیکھا اور گھبرائیں، میرے بھائی نے دیکھا اور اپنی پرانی محبت بھول گئے۔
کمسنی میں شادی کرنے سے انکی صحت کچھ دنوں خراب رہی جسمانی نشو و نما رک گئی، ہنوز ذہن میں کم ا[illegible]
فرق نہیں آیا۔ میری بیچاری بھاوج کو انکے ہوس کی شدت، اور طبیعت پر ہوس کا بوجھ انکا کو
کی [illegible] چند دنوں میں معلوم ہو گئیں، اور بڑھاپے کے آثار موت کا پیش خیمہ بن گئے۔

کبھی کبھی مجھے انسان کی قوت برداشت دیکھ کر اندیشہ ہوتا ہے کہ ہم ذی روح نہیں، اگر ہوتے تو
چند دنوں کا تماشا ہمیں ہرگز اتنا عزیز نہ ہوتا، اور ہم خوشی سے اپنی آنکھیں بند کر لیتے۔ بھائی کا رنگ
[illegible] زندگی کا تماشا دیکھا کرنا چاہئے تھا، یا موت میں پناہ لیتا۔ مگر وہ علاج کرا کر موت

باقی رہیں والدہ انہیں مرے ہوئے کئی سال گزر گئے [illegible]
دفن کر چکے تھے۔

بیوی سے لطف اٹھانے کی امید جاتی رہی تو میرے بھائی گھر [illegible] سب معاش کے اس میں اور مشغلے ہی نہیں۔ آزادی، اطمینان، بیمار بیوی کے [illegible] علاج کی تیمارداری میرے حصے میں آئی۔ بچوں کا اور میرے والد کے۔ بھائی جب [illegible] گئے تو ایسی حالت تھی کہ بیوی سے رخصت ہونا بھی بھول گئے۔ کوئی ڈیڑھ سال بعد جب وہ بیوی کی قبر میں مٹھی بھر خاک ڈالنے آئے تو ان کی آنکھوں میں ایک نئی دنیا اور میرے تو کیا ایک بیہودہ مستی کا خمار تھا، طبیعت میں بے پروائی اور ایک خاص قسم کی محبت کا شوق بس میں بہن یا باپ کی موجودگی نامناسب تھی۔ دوسرے کچھ بھی کہیں۔ میں ایسے لوگوں کو زندہ نہیں سمجھتی۔ ان میں وہی بدبو ہوتی ہے جو سڑے گوشت میں۔ میرا رویہ تو نہایت درست رہا۔ مگر معلوم ہوتا ہے میری آنکھیں میرا راز چھپا نہ سکیں۔ میرے بھائی مجھ سے شرمانے لگے، مجھ سے چھپنے لگے اور میں نے کوئی شکایت نہیں کی۔ ہم دونوں میں محبت ہوتی تو کس بنا پر! یہی بہتر تھا کہ ہم یہ حوصلہ ہی نہ کریں۔

لیکن میرے باپ کی محبت کے ساتھ حوصلے کی شرط نہیں تھی۔ ماں کو ہو سکے انتقال کا بہت صدمہ ہوا۔ اس صدمے نے یہ خواہش پیدا کی کہ لڑکے کو اپنی نظروں کے سامنے رکھیں بھائی کو بھی گھر پر رہنے کی کوئی مصلحت سوجھی۔ علاوہ ازیں انہوں نے ایک نئی [illegible] میرے والد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ بڑھاپے کی اولاد [illegible] ہو سکتی ہے! میرے بھائی سویرے اٹھ کر کسی سے ملنے چلے جاتے ہیں، دن کا کھانا [illegible] اور رات کو کون جانے کب گئے کب آئے۔ کبھی [illegible] بڑھاپے کے [illegible]
[illegible]

[illegible] . . .

ایک عمر تھی جب میں نے صبر کرنا نہیں سیکھا تھا، لیکن اب میں اسی فن میں دوسروں کو سبق دینے پر تیار ہوں، بغیر اپنی بیقراری کھوئے ہوئے دنیا کو اُس کے رنگ پر چلتے دیکھ سکتی ہوں، اور فریاد نہیں کرتی، شکایت نہیں کرتی۔ میں نے جن حوصلوں سے زندگی شروع کی تھی، جس آزادی کی ہوس میں میں نے اپنی گرفتاری منظور کی تھی وہ اب ایک دھندلا سا خواب ہو گئی ہے، کبھی کبھی جی بہلانے کے لئے میں دل آزار حقیقتوں سے منہ پھیر لیتی ہوں، میری تمنائیں زندگی کا نقشہ ایسا بگاڑ دیتی ہیں کہ میں اس سے ایک نئی زندگی بنا سکوں لیکن میں اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کرتی کہ یہ بگاڑنا اور بنانا محض تصور کی اٹکھیلیاں ہیں جنہیں ہستی کا جامہ پہننا کبھی نصیب نہ ہوگا . . . لیکن اگر میں نے یہ تسلیم کر لیا تو میں اپنی زنجیریں کیوں نہیں توڑ ڈالتی، اپنی تمناؤں کی طرح ہستی سے مایوس ہو کر، مگر ہستی کی حسرت دل میں لئے ہوئے نیستی میں کیوں پناہ نہیں لیتی! ہونا تو یہی چاہئے، ہوگا بھی یہی، مگر اُس وقت جب میں زندگی کی ساری رسوائی جو میری قسمت میں لکھی معلوم ہوتی ہے، برداشت کر چکوں گی، کیا کروں کیا کہوں، انسان مٹی سے بنا ہے۔

کبھی کبھی جب پوتوں کو دیکھتے دیکھتے نواسے بھی دیکھنے کو جی چاہتا ہے تو میرے والد ان چند احباب سے جو شام کو اُنکے پاس آ بیٹھتے ہیں، میری شادی کے امکان پر گفتگو کر لیتے ہیں۔ ابھی تک تو یہ محض ایک گفتگو کا موضوع ہے، لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اسکا کوئی نتیجہ نکلے میں اسی اندیشہ میں اپنی سرگذشت لکھ رہی ہوں، شاید کبھی، جب میری زنجیریں مجھ میں جنبش کی کوئی طاقت نہ چھوڑیں تو میرا یہ جوش میری یہ حسرتیں مجھے اس شدت سے یاد آئیں کہ میں اپنے ہاتھ پاؤں توڑ ڈالوں یا اپنی زنجیریں، انسان کا دل بھی خود انسان کی طرح مٹی کا ہوتا ہے، میں یہ بھی ڈرتی ہوں کہ کبھی اسے تجسس یا ننگ پا کر میری تمنائیں اُسے چھوڑ نہ دیں۔

سچ پوچھئے تو مجھے سب سے زیادہ اسی کا خوف ہے۔ اپنے قصبہ اور اپنی زندگی کو دیکھتے

ہوئے اس کی امید کرنا فضول ہے کہ مجھے ایک رفیق اور ہمدم ملے گا جو میری فطرت سے واقف ہو، یا واقف ہونا چاہئے۔ مجھے اس امید پر بھی کوئی اعتبار نہیں کہ میری بیقراری ایک حیوانی سکون میں تبدیل نہ ہو جائے گی۔ میری دعا یہی ہے کہ میرے توسط سے جو ہستیاں اس دنیا میں آنکھیں کھولیں وہ میری تڑپ، میری بیقراری اپنے ورثے میں لے کر آئیں، میری آرزوؤں کو ورثے میں طلب کریں۔ اس آگ کو لے کر جو میرے سینے میں دہک رہی ہے، اس مٹی کو جس کے آس پاس ڈھیر لگے ہیں پکی، دلدار اینٹیں بنائیں اور ان اینٹوں سے زندگی کی ایک نئی عمارت کریں، ہمت کی طرح مضبوط، حوصلے کی طرح بلند اور دل کی طرح کشادہ۔

فتح مبین

یہ نظم جناب اقبال سہیل صاحب نے سنہ ۲۲ء میں لکھی تھی جب ترکی نے یونان پر فتح عظیم حاصل کی بات پرانی ہو گئی لیکن نظم ابھی نئی ہے اس لئے کہ ابتک کہیں شائع نہیں ہوئی۔

صبح آمد و از فیض سحر نغمہ سرا شد — ہر غنچہ کہ وا شد
گلبرگ تو گوئی ہمہ تن دست دعا شد — بہ بہ چہ بجا شد

صد شکر شب تیرۂ آفات سر آمد — صبح ظفر آمد
ہر طرب از پردۂ شب جلوہ نما شد — بہ بہ چہ بجا شد۔

صد شکر کہ باز آں قدح بادہ بگردید — پر از مے توحید
گوئید بتاں کہ در میکدہ وا شد — بہ بہ چہ بجا شد

ہر اشک کہ از دیدہ فرو ریخت گہر شد — ہمدوش اثر شد
ہر نالہ کہ از سینہ بروں جست رسا شد — بہ بہ چہ بجا شد

ہر عقدہ کہ در حیطہ تدبیر نبودہ — تقدیر کشودہ
ہر کام کہ ملت ز خدا خواست روا شد — بہ بہ چہ بجا شد

خون امرا ریختہ از غصہ چو دوناں — عدلیہ یوناں
خود تیغ ستمگر بسرش برق بلا شد — بہ بہ چہ بجا شد

صد چاک بشد سینہ سر عسکر یوناں — از خنجر یوناں
انجام جفا عاقبت الامر جفا شد — بہ بہ چہ بجا شد

عیارا رو پاکہ بس از پردہ فسوں کرد — تجہیز فسوں کرد
حیرت زدہ بو العجبیہائے فضا شد — بہ بہ چہ بجا شد

آن گرگ فسوں ساز کہ کابینہ بدر شد — واغش بجگر شد
برہم ہمہ شیرازہ وا مالوزا شد — بہ بہ چہ بجا شد

شذرات

ہمیں نہایت ندامت ہے کہ ہم نے رسالہ کی اشاعت کو وقت پر لانے کے لئے جو وعدہ کیا تھا اُسے پورا نہیں کر سکے۔ اگست اور ستمبر کے نمبر پہلے مہینے میں تیار ہو چکے تھے لیکن طباعت کی مشکلات سے اگست کا پرچہ ۱۰ اکتوبر کو شائع ہوا اور ستمبر کا اب چھپ رہا ہے۔ اکتوبر کے پرچہ کو نومبر کے پہلے ہفتے میں شائع کرنے کی کوشش ہے خدا کرے اب کے ہمیں قارئین کرام سے ندامت نہ اٹھانا پڑے۔

جامعہ ملیہ کے سرپرستوں اور بہی خواہوں کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ بھوپال اور حیدرآباد میں ہمارے وفد کو شاندار کامیابی ہوئی۔ افسوس ہے کہ ہم تفصیلات شائع نہیں کر سکتے کیونکہ جناب شیخ الجامعہ نے ابھی باضابطہ روداد نہیں بھیجی ہے۔ انشاء اللہ آئندہ مہینے میں ہم وفد کی رپورٹ شائع کرینگے

اس مہینے کے وسط میں افغانستان سے جو خبریں آئی ہیں انہوں نے سب ہندوستانیوں کے دلوں کو خوشی سے معمور کر دیا ہے۔ افغانستان کے مایہ ناز فرزند امان اللہ خاں کی بدولت نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ ہندوؤں کو بھی اپنی ہمسایہ قوم سے سچی محبت ہے اور وہ اس کی فلاح و بہبود کے دل سے خواستگار ہیں۔ اس لئے جب انہوں نے سنا کہ افغانیوں نے آخر کار جاہل اور ظالم بچہ سقہ کے پنجۂ غضب سے چھوٹ کر جنرل نادر خاں کے سایۂ عاطفت میں پناہ لی تو انہیں ایسی مسرت ہوئی کہ اس سے بڑھ کر اگر کبھی ہوگی تو اپنے ملک کی آزادی سے ہوگی۔ کسی قوم کو عقل سلیم اور عزم مستقیم کی بدولت آزادی اور ترقی کے نصب العین کی طرف بڑھتے دیکھ کر

ملک میں اس جوش اور ولولے کا پیدا ہونا قدرتی بات ہے

اس سے بھی زیادہ مسرت ہندوستانیوں کو ہوتی اگر اہل افغانستان امان اللہ خاں کو اٹالیہ سے بلا کر اپنا بادشاہ بناتے۔ لیکن وہ جانتے ہیں کہ افغانستان میں اندرونی پیچیدگیاں بہت بڑھ گئی ہیں اور کوئی شخص باہر سے بیٹھ کر صحیح اندازہ نہیں کر سکتا کہ ان دونوں سرداروں میں سے کون اپنے ملک کی عنان حکومت ہاتھ میں لے کر ملک و قوم کی زیادہ مفید خدمات انجام دے سکتا ہے۔ اس لئے وہ حسن ظن سے کام لے کر کہتے ہیں کہ جو کچھ ہوا غالباً موجودہ صورت میں وہی سب سے مناسب ہے۔

لیکن ابھی افغانستان کی مشکلات کا خاتمہ نہیں ہوا۔ جن عناصر نے امان اللہ خان کی حکومت کی بنیاد متزلزل کر دی تھی یعنی امرا کی خود غرضی اور علماء کی ناعاقبت اندیشی اور مالی دقتیں وہ سب بدستور باقی ہیں۔ نادر خاں سپہ سالار کی حیثیت سے اپنے ملک کو دوبارہ ذلت اور غلامی کی پستی سے عزت و آزادی کی بلندی پر پہنچا چکے ہیں مگر یہ معلوم نہیں کہ ان میں ملک گیری کے ساتھ ملک داری کی قابلیت بھی ہے یا نہیں۔ اسی لئے افغانستان کے بہی خواہ وہاں کی حالت سے بھی پوری طرح مطمئن نہیں ہیں۔ اور واقعات کی نشو و نما کا بہت تردد کے ساتھ انتظار کر رہے ہیں خدا کرے وہ دن جلد آئے کہ افغانستان میں امن و آسایش کا دور دورہ ہو اور یہ ملک جس نے حصول آزادی کی کوشش میں اب تک صرف مصیبتیں جھیلی ہیں آزادی کی برکات سے پورا فائدہ اٹھا سکے۔

ہندوستانی اکاڈمی نے اپنے ممبروں اور دوسرے اہل قلم کے پاس ایک گشتی مراسلہ بھیجا ہے جس میں اپنا لائحہ عمل بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اکاڈمی چاہتی ہے کہ اردو اور

ہندی میں تین طرح کی کتابیں شائع کرائے۔

(۱) ان لوگوں کے لئے جنہوں نے اوسط درجہ کی تعلیم پائی ہے اس طرح کی کتابیں جن کے پڑھنے سے ان کی معلومات میں وسعت ہو اور وہ ذاتی مطالعے کے ذریعے اعلیٰ درجہ تعلیم تک پہنچ جائیں۔

(۲) ان لوگوں کے لئے جنہوں نے ابتدا سے انگریزی مدارس میں تعلیم پائی ہو اور اسے تکمیل کے درجے تک پہنچایا ہے ایسی کتابیں جنہیں پڑھ کر وہ اپنی مادری زبان کے ادب اور اپنے قومی تمدن سے گہری واقفیت حاصل کر سکیں۔

(۳) کم تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے عام فہم کتابیں۔

اکادمی نے ان موضوعوں کی فہرست شائع کی ہے جن پر کتابیں لکھی جائیں گی۔ یہ فہرست بہت طویل ہے اور اس میں تقریباً کل علوم و فنون شامل ہیں۔

اس سلسلے میں یہ بات قابل غور ہے کہ اس وقت ہندوستان میں متعدد ادارے اردو اور ہندی کی ترقی کے لئے موجود ہیں اور اپنے اپنے رنگ میں ان کی خدمت کر رہے ہیں مگر افسوس ہے کہ ان میں ابتک پوری طرح تقسیم عمل نہیں ہوئی ہے۔ اردو میں انجمن ترقی اردو اورنگ آباد، دارالترجمہ حیدرآباد، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ہندوستانی اکادمی الٰہ آباد اور اردو اکادمی دہلی اور بعض دوسرے ادارات تقریباً ایک ہی قسم کا کام کر رہے ہیں۔ ان میں سے بعض کے مقاصد مخصوص ہیں لیکن ان مقاصد کی پوری طرح پابندی نہیں ہوتی۔ غالباً یہی حال ہندی کی اشاعت کے ادارات کا بھی ہے۔ اس بات کی بہت سخت ضرورت ہے کہ ان متفرق کوششوں کو ایک مرکز پر جمع کیا جائے تاکہ اتحاد عمل بھی ہو سکے اور تقسیم عمل بھی۔ یہ کام کسی عام کانفرنس میں انجام پانا ناممکن ہے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ خاص

مختلف اخبارات کے نمائندے ہر سال کسی جگہ جمع ہو کر تبادلہ خیالات کیا کریں۔ خواہ اس کا مرکز کوئی ایک اخبار قرار دیا جائے یا باری باری سے ہر ادارہ دوسروں کو جمع کیا کرے۔

ہمیں امید ہے کہ ان سب اداروں کے مدیر اس تجویز پر غور فرمائیں گے اور اسے عمل میں لانے کے لئے بہت جلد مناسب تدابیر اختیار کریں گے۔

جامعہ کے ایک طالب علم نے ۱۳ ستمبر ۲۹ء کا اخبار "سچ" مجھکو لاکر دکھایا جس میں مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی نے لکھا ہے "روضۂ اقدس (رسول) زمین، آسمان، کعبہ، عرش اور کرسی سب سے افضل ہے" جس کے صریح معنے یہ ہوئے کہ رسول کا روضہ جب عرش الٰہی سے بڑھ کر ہوا تو رسول اللہ سے بڑھ کر ہے (نعوذ باللہ)

کیا یہ اللہ تعالیٰ کی کھلی ہوئی اہانت نہیں ہے!!

بریلی اور بدایوں کے رسول پرستوں نے تو اسی پر اکتفا کی تھی کہ

وہی جو مستوی عرش ہے خدا ہو کر — اتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفےٰ ہو کر

مگر مولوی عبدالماجد صاحب نے اس سے بھی آگے قدم اٹھایا اور رسول کا رتبہ اللہ سے بھی بڑھا دیا۔ مولوی صاحب کا بیان ہے کہ فقہاء نے ایسا کہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ فقہ کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ عقیدہ کا ہے جس کے لئے نص صریح کی ضرورت ہے۔ اگر کسی نے جذبہ کی حالت میں ایسا کہا بھی ہو تو وہ شطحیات میں شمار ہوگا سند نہیں ہو سکتا۔

قرآن میں ہے

وَإِنْ تُطِعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ "روئے زمین کے اکثر لوگ اگر تو ان کی اطاعت کرے تجھ کو اللہ کی راہ سے بہکا دیں گے" رسول بندہ ہیں اور بشر۔ یہی قرآن میں ان کو حکم دیا گیا ہے کہ "قل انما انا بشر مثلکم" ان کی عظمت کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ اللہ کے پیغامبر ہیں۔ کیا ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ ان کا رتبہ اللہ سے بڑھایا جائے اور ایسی بے ادبی کا ارتکاب کیا جائے جس کی نظیر زمانہ جاہلیت میں بھی نہیں مل سکے گی۔

آپکے بچوں کیلئے ایک نہایت ہی مفید اور باتصویر رسالہ

ہونہار

زیر سرپرستی جناب حکیم محمد یوسف حسن صاحب اڈیٹر نیرنگ خیال

ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی سے شائع ہوا ہے

اس رسالہ کے اجرا کا مقصد یہ ہے کہ بچوں میں صحیح مذہبی، قومی اور اخلاقی تعلیم پھیلائی جائے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے قابل اور تجربہ کار پروفیسر اور اساتذہ کے مضامین اس رسالہ میں شائع ہوں گے ملک کے بڑے بڑے اہل قلم اس کے معاون ہیں۔ کتابت و طباعت کا بہترین انتظام کیا گیا ہے۔ بچوں کے مذاق کے مطابق فوٹو بلاک کی اور دستی تصویریں شائع ہوں گی۔ یہ رسالہ آپ کے بچوں کا اتالیق ہوگا۔ کم پڑھے لکھے مرد اور عورتیں بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔

رسالہ کا سائز ۲۰×۳۰/۸ ضخامت ۴۰ صفحے علاوہ ٹائٹل و تصاویر۔ قیمت تین روپیہ سالانہ

نمونہ تین آنے کے ٹکٹ بھیجکر منگوایا جاسکتا ہے

ملنے کا پتہ

دفتر رسالہ ہونہار۔ صدر بازار متصل نیشنل ڈائنگ فیکٹری

دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم - اے - پی ایچ - ڈی

جلد ۱۳ | بابتہ ماہ نومبر ۱۹۲۹ء | نمبر ۵

فہرست مضامین

تاریخ عثمانیہ پر ایک نظر[1]

آل عثمان کی حکومت غازی عثمان خاں کے عہد میں سلطان علاء الدین سلجوقی کے تاتاریوں کے ہاتھ سے مارے جانے کے بعد [illegible] میں بالاستقلال سلطنت حاصل کر لی تھی اس خاندان کے آخری فرمانروا عبدالمجید ثانی کے عہد تک جو ۱۳۴۲ھ میں معزول کیا گیا چھ سو بیالیس سال رہی۔ یہ ایسی طویل مدت ہی جو کسی اسلامی حکمران خاندان کو نصیب نہیں ہوئی۔ اس مدت میں ۳۷ فرمانروا ہوئے جن میں سے پہلے ۹ بایزید ثانی تک سلطان تھے اور بقیہ سلیم اول سے لیکر عبدالمجید ثانی تک سلطنت کے ساتھ خلافت کے منصب سے بھی ممتاز تھے۔

آل عثمان کا یہ کل عہد دو دور میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک دور ترقی دوسرا دور زوال غازی عثمان خاں کے استقلال یعنی ۶۹۹ھ سے لیکر سلیمان اعظم کی وفات یعنی ۹۷۴ھ تک دور ترقی رہا جس میں یہ سلطنت قوت۔ شوکت اور مقبوضات کی وسعت کے لحاظ سے برابر بڑھتی رہی اور اس کے بعد سے آجتک دور زوال ہی جس میں سلسلہ وار اس کے حصے نکلتے جا رہے ہیں۔

عین عروج کے زمانے میں بایزید یلدرم کے عہد میں جبکہ وہ یورپ میں فتوحات کر رہا تھا ۸۰۴ھ میں تیمور لنگ کے ناگہانی حملہ سے اس سلطنت کو کاری زخم لگ گیا تھا مگر چونکہ اس وقت اقبال کا دور تھا اور ترکوں کے فاتحانہ جذبات جوش پر تھے اس لئے بہت جلد یہ زخم مندمل ہو گیا۔

سلطنت

جس وقت آل عثمان نے اپنی سلطنت قائم کی اس وقت تاتاریوں کے حملہ سے بغداد کی عباسی خلافت کا چراغ گل ہو چکا تھا اور جملہ اسلامی مشرقی ریاستیں انکے پنجۂ ستم میں نیم جان ہو رہی

---

[1] یہ مضمون تاریخ الامت حصہ ہفتم کا آخری باب ہی جس پر یہ کتاب ختم ہو جاتی ہی

چنانچہ یہ ریاستیں کہ پہلے میں سلجوقی سلطنت کو بھی انہوں نے فنا کر ڈالا تھا اور طوائف الملوکی کی حالت میں چھوٹی چھوٹی سی آزاد ریاستیں رہ گئی تھیں جو باہمی جنگ و پرخاش سے فنا کے سامان کرنے لگی تھیں ۔

آل عثمان نے اپنی شجاعت اور فرزانگی سے ان متفرق ریاستوں سے جو سلجوقی سلطنت کے کھنڈر پر قائم تھیں ایک زبردست سلطنت تعمیر کی۔ اور پھر اولوالعزمی سے مفتوحات کا دائرہ یہاں تک وسیع کیا کہ یورپ میں داخل ہو گئے اور رفتہ رفتہ بلقان کے اکثر حصہ پر قبضہ کر لیا۔ یہاں تک کہ سلطان محمد ثانی نے قسطنطنیہ کو بھی فتح کر لیا جو اسلام کی ایک پرانی آرزو تھی اور سلطان سلیم نے شام و مصر کو جس سے حرمین شریفین بلکہ سارا عرب عثمانی قلمرو میں آ گیا۔ اس کے بعد سلیمان اعظم وسط یورپ میں ویانا کی فصیل تک پہنچ گیا۔ دوسری طرف افریقہ میں الجزائر اور مراکش تک ہلالی پرچم کے نیچے آ گئے اور عثمانی سلطنت نہ صرف اپنی وسعت بلکہ بری اور بحری قوت و شوکت کے لحاظ سے بھی اپنے زمانے کی سب سے بڑی اور طاقتور سلطنت ہو گئی جس کے حدود بوڈاپسٹ سے دریائے نیل تک اور فرات سے جبل طارق تک پھیلے ہوئے تھے۔

شاہان یورپ اس زمانے میں بجائے سلطان کے اس کے صدر اعظم کو مخاطب کرتے تھے اور اپنی مشکلات میں امداد مانگتے تھے۔ سنہ ۱۵۸۸ء مطابق سنہ ۹۹۶ھ میں جب ہسپانیہ کا آرمیڈا انگلستان پر حملہ کی تیاری کر رہا تھا ملکہ الزبتھ نے مسٹر ہیر لون کو سفیر بنا کر قسطنطنیہ بھیجا اور سلطان مراد ثالث کے وزیر محمد پاشا صقلی سے ان "کیتھولک کفار" کے مقابلہ میں مدد چاہی مگر اس وقت جنگ ایران کی وجہ سے امداد نہ دی جا سکی۔ سلیمان اعظم کے عہد میں شاہ فرانس فرانسیس اول نے شارلکان کے مقابلہ میں امداد کی دو بار درخواست کی اور دونوں مرتبہ سلطان نے بری اور بحری مدد دی۔

خلافت

سنہ ۹۲۳ھ میں اسلامی خلافت آل عثمان کے ہاتھ میں آئی۔ ترک چونکہ حنفی المذہب تھے

اس وجہ سے حنفیہ نے بالعموم انکی خلافت کو تسلیم کر لیا اور جابجا ملکوں میں انکے نام کے خطبے پڑھے جانے لگے۔ لیکن مالکیہ ایک مدت تک بوجہ قریشی نہ ہونے کے عثمانیوں کی خلافت کے قائل نہ ہوئے۔

چونکہ آل عثمان کو خلافت فتح مصر سے ملی تھی اس لئے بالطبع وہ اپنے اس رتبہ سلطنت کو جس کی بدولت انہوں نے مصر کی سلطنت اور خلافت دونوں کو حاصل کیا تھا زیادہ اہم سمجھتے رہے لیکن خلافت کی مذہبی وقعت انکی نگاہ میں تھی۔ چنانچہ سلطان محمود نے ۱۲۴۲ھ میں انکشاریہ کی بغاوت میں علم نبوی کو نکالکر اسکی روحانی قوت سے کام بھی لیا مگر انہوں نے شروع سے آخر تک بجز حرمین شریفین کے خادم اور عرب کے محافظ ہونے کے کہ وہ انکی سلطنت کا ایک جزو تھا فرائض خلافت کا خیال نہ رکھا۔ نہ عالم اسلامی کی دینی یا دماغی رہنمائی کی اور غالباً یہ ان سے ہو بھی نہیں سکتی تھی اور نہ کبھی انکی وحدت کا کوئی ذریعہ تلاش کیا۔ یہانتک کہ حج جس میں جملہ اقطار عالم سے مسلمان آکر شریک ہوتے ہیں اس میں بھی وہ کبھی نہیں آئے۔ آخری زمانے میں سید جمال الدین افغانی کے اثر سے عبدالحمید ثانی نے وحدت ملت کی طرف توجہ کی اور حجاز ریلوے کو امت کی مشترکہ ملکیت قرار دیکر عالم اسلامی کے اندر ترکی خلافت کا احساس پھیلایا جس سے ممکن تھا کہ اچھے نتائج مترتب ہوتے کہ ۱۳۴۲ھ میں جمہوریہ ترکیہ نے خلافت ہی کا انکار کر دیا جس سے یہ منصب مع اپنے عظیم الشان فوائد کے نہ صرف ترکوں بلکہ امت کے ہاتھوں سے جاتا رہا۔

ولی عہدی

آل عثمان میں اگرچہ شروع سے یہ دستور رہا ہے کہ خاندان کا بڑا شخص سلطنت کا متولی ہو لیکن پھر بھی اکثر تخت نشینی پر نزاعیں برپا ہوتی رہیں۔ اس وجہ سے ایک بھائی جب تخت پر آجاتا تھا تو اپنے دوسرے بھائیوں کو قتل کرا دیتا تھا۔ چنانچہ بایزید اول نے اپنے بھائی یعقوب کو علما سے فتویٰ لیکر اور سلیم اول نے اپنے دونوں بھائیوں احمد اور کرکود کو گرفتار کر کے مار ڈالا۔ مراد ثالث نے اپنے پانچ بھائیوں کو قتل کیا اور اس کے بیٹے محمد ثالث نے چھوٹے

بعض یہودیوں کو بسبب ان کے [illegible] مراسم [illegible] گے۔
آخر میں یہ صورت احتیاط کی گئی کہ محروم شاہزادے محلات میں نظر بند رکھے جانے لگے
تاکہ کوئی خطرہ بھی نہ رہے اور خون ناحق بھی نہ بہے۔

نظام سلطنت

مہمات سلطنت میں سلطان فرمانروائے مطلق تھا جس کی اطاعت لازمی تھی اور بشرط رعایت نصوص قرآن اس کو رعایا کے جان و مال اور سلطنت کے سیاہ و سفید پر کلی اختیارات حاصل تھے۔

حکومت کے سب سے بڑے دو عہدہ دار تھے ایک صدر اعظم جو امور ملکی و فوجی کا کفیل ہوتا تھا دوسرا شیخ الاسلام جو شرع شریف کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا۔ صدر اعظم کے ماتحت جملہ وزرا اور ملکی دفاتر تھے اور شیخ الاسلام کی نگرانی میں جملہ قضاۃ اور محکمہ جات شرعی۔ علاوہ مذہبی امور کے مہمات سلطنت مثلاً اعلان جنگ۔ معاہدہ۔ عزل و نصب سلاطین وغیرہ میں بھی شیخ الاسلام کا مشورہ یا فتویٰ ضروری خیال کیا جاتا تھا۔

فریق علما یعنی رجال شرع میں سے دو شخص خاص امتیاز رکھتے تھے۔ ایک قاضی عسکر روم ایلی دوسرا قاضی عسکر اناطولیہ۔ یہ دونوں جنگ اور سفر میں سلطان کے ہمراہ رہتے تھے تاکہ فوج میں کوئی اختلاف پیدا ہو تو رفع کریں۔ انہیں میں سے کوئی شیخ الاسلامی کے منصب پر آیا کرتا تھا۔ سلطان اگرچہ شیخ الاسلام کو برطرف کرسکتا تھا مگر جب تک وہ اپنے عہدہ پر ہو اس کو مجبور نہیں کرسکتا تھا۔ نہ اس کے فتوے کی مخالفت کا اختیار رکھتا تھا چنانچہ سلطان سلیم اول نے جو اپنے عقیدہ اور عزم دونوں میں بہت سخت تھا عثمانی قلمرو میں شیعوں کے استیصال کے بعد یہ ارادہ کیا کہ سلطنت کے جملہ مشرکوں۔ کافروں۔ یہودیوں۔ عیسائیوں کو قتل کرکے ان کے معبدوں اور کنیسوں کو مسجد بنالے تاکہ ملک میں صرف ایک ہی دین رہ جائے۔ مشورتاً ایک دن شیخ جمالی سے جو اس کے عہد میں مفتی اعظم تھے پوچھا کہ دنیا کو فتح کرنا بہتر

ہے یا قوموں کو مسلمان بنانا ۔ شیخ مذکور نے جواب دیا کہ مسلمان بنانا بھی زیادہ ثواب ہے ۔ اس کے بعد سلطان نے صدر اعظم کو کہا کہ سلطنت کے ہر گوشہ میں اعلان کردیا جائے کہ جو اسلام نہ لائے گا قتل کر دیا جائے گا ۔

اس سخت فرمان سے صدر اعظم کو تردد ہوا ۔ اس نے شیخ جمالی سے کہا کہ سلطان نے اس حکم میں تمہارے قول سے سند لی ہے ۔ شیخ مذکور آستانہ کے بطریق کو لیکر سلطان کے پاس بحالت وقت اذن بنیں میں تھا پہنچے اور وہ عہد نامے پیش کرائے جو قسطنطنیہ کی فتح کے بعد سلطان محمد نے نصارا کے ساتھ کئے تھے ۔ نیز قرآن کا حکم سنایا کہ اہل کتاب جزیہ لیکر مذہب میں آزاد چھوڑ دیئے جائیں ۔ سلطان کو مجبوراً اپنا فرمان واپس لینا پڑا ۔

داخلی نظم ونسق کے لئے جو دفتر تھا اس کو دیوان دولت کہتے تھے ۔ اس میں پہلے تین وزیر ہوتے تھے لیکن سلطان احمد ثالث نے ان میں مخالفت دیکھکر جس کی وجہ سے اکثر کاموں میں ابتری واقع ہو جاتی تھی ان کی تعداد آٹھ کر دی جن کا رئیس صدر اعظم ہوتا تھا ۔ انہیں کی مشاورت سے مہمات سلطنت طے پاتے تھے اور ماتحت دفاتر نیز سلطنت کے صوبوں اور ایالتوں کے حکام وعمال کی نگرانی بھی انہیں کے ذمہ تھی ۔

بحری فوج قپودان پاشا کے ماتحت ہوتی تھی اور بری صدر اعظم کے ۔ ان افواج کی تربیت وتنظیم میں ترک اپنے دور ترقی میں دیگر اقوام عالم سے فائق رہے

یہ ارکان دفاتر ۔ حکام ولایات ۔ جاگیرداران ۔ امراء لشکر بلکہ بالعموم متوسلین سلطنت بوجہ دولت کی فراوانی کے نہایت بلکہ شاہانہ عیش وآرام سے زندگیاں گذارتے تھے ۔ چونکہ غلامی کا بھی رواج تھا اس وجہ سے انکے گھروں میں غلاموں اور کنیزوں کی اچھی خاصی تعداد ہوتی تھی ۔

ترک

اصلی اوغوز ترک جو طغرل اور وہ ملوک کے ساتھ ایشیا کوچک میں آئے تھے وہ تین لاکھ سے زیادہ نہ تھے لیکن رفتہ رفتہ دیگر قبائل جو سلجوقی عہد میں وسط ایشیا سے آگئے تھے انکے ہاتھ مل

پہنچ گئے۔ مصر اور کی سلطنت کے عروج کے ساتھ اکثر مفتوح اقوام رومی اور صقالبی وغیرہ کثیر تعداد میں اسلام لائی گئیں جو سب کے سب ترک سمجھے جانے لگے اور یہ لفظ مسلمان سلطنت ترکی کے مترادف ہوگیا جس میں مختلف قومیں شامل تھیں۔

اسلام

ترکوں نے شعائر اسلامی کا ہمیشہ احترام رکھا۔ یہ اسکا سبب رہا اور مخلصانہ اسلام کا اثر تھا کہ مفتوحہ قومیں جن کو پوری مذہبی آزادی تھی اپنے دلی شوق سے اسلام قبول کرنے لگیں۔ بلغار بلغاریا۔ رومانیا اور یونان خاصکر البانیا میں بلا جبر و اکراہ بے شمار عیسائی اسلام کے حلقہ بگوش ہوگئے۔ انکشاری فوج جس میں وہ نصرانی جوان لئے جاتے تھے جو مسلمان ہوجاتے تھے اس کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی تھی اور بلقان کے عیسائی روسا اپنے اپنے بیٹوں کو خود خوشی سے لاکر اس میں بھرتی کراتے تھے۔

ترک بالعموم مجاہد اور سر فروش ہونے کے ساتھ عقائد کے پکے اور عبادات کے پابند تھے اور اپنی خانگی زندگی روزمرہ کے معاملات اور اخلاق میں خالص مسلمان۔ اُن میں بخلاف دیگر اقوام کے باہمی محبت اور اخوۃ بھی زیادہ ہے۔

ترک سلطان و رعایا ہمیشہ سے ایک مذہب حنفی کے پابند رہے اس وجہ سے ان میں اختلافی جھگڑے بہت کم پیدا ہوئے لیکن تصوف کے ساتھ بھی انکو عقیدت تھی اور پیری و مریدی کا سلسلہ بھی رائج تھا جس کے باعث کبھی کبھی فتنوں کا ظہور ہوتا رہا۔

سلاطین آل عثمان میں سے سلیم اول مذہب حنفی کا سب سے بڑا علمبردار تھا جس کی خواہش یہ تھی کہ اس کے قلمرو میں بجز اس مذہب کے اور کوئی دوسرا مذہب نہ رہنے پائے۔

رواداری

ترکوں کے اوصاف میں جہاں شجاعت سب سے نمایاں وصف ہے جس کو ان کے دوست دشمن سب تسلیم کرتے ہیں وہاں انکی رواداری کی صفت بھی اقوام عالم سے بڑھکر ہے

انہوں نے ہمیشہ غیر جنس اور دوسری قوموں کے ساتھ نہایت فیاضانہ رواداری کا سلوک کیا اور اپنی محکوم قوموں کے مذہب میں کبھی مداخلت نہیں کی یورپ کی عیسائی سلطنتوں میں یہودی مقہور اور مظلوم تھے اور ترکوں کے سایہ میں انکو امن و آرام نصیب ہوا تھا۔ سلطان محمد نے فتح قسطنطنیہ کے بعد بطریک کے عہدہ اور عیسائیوں کے حقوق کو محفوظ رکھا جس کی وجہ سے یونانی جو وہاں سے بھاگ گئے تھے پھر واپس آکر امن سے رہنے لگے۔

سلطان مراد ثانی کے مقابلہ میں جب صلیبی لشکر ہونیادی کی قیادت میں ہنگری تک تھا میدان کوسوہ میں صف آرا تھا اسی وقت اس کے ساتھی شاہ سربیا نے اس سے پوچھا کہ اگر تم کو فتح حاصل ہوگئی تو کیا کروگے؟ اس نے کہا کہ سب کو کیتھولک بنا کر چھوڑوں گا لیکن یہی سوال جب شاہ سربیا نے سلطان مراد کے پاس بھیجا تو اس نے جواب میں لکھا کہ میں اگر کامیاب ہوا تو ہر مسجد کے پہلو میں کنیسہ بنوا دوں گا کہ جسکا جی چاہے مسجد میں آئے اور جس کا جی چاہے کنیسہ میں جائے چنانچہ شاہ سربیا نے جو یونانی چرچ کا تابع تھا ہونیادی کا ساتھ چھوڑ دیا اور مورخین لکھتے ہیں صلیبیوں کی شکست کھانے کی یہی وجہ ہوئی۔

ایک بار عثمانی مفتی سے کسی نے سوال کیا کہ اگر دس مسلمان کسی ایک یہودی یا عیسائی ذمی کے قتل میں شریک ہوں تو کیا وہ سب کے سب قتل کر دئے جائیں گے؟ مفتی نے جواب دیا بے شک۔ دس نہیں ایک ہزار بھی۔

ان رواداریوں کی وجہ سے باوجود بیرونی سلطنتوں کی ریشہ دوانیوں کے بھی غیر مسلم خاصکر ان عیسائیوں کے دلوں میں جن کو ترکوں سے واسطہ پڑا تھا ترکوں کی وقعت اور عظمت تھی چنانچہ عبدالحمید ثانی کے آغاز جلوس ۱۸۷۷ء میں جب روسیوں نے دولت علیہ کے خلاف جنگ شروع کی اس وقت ہنگری کے عیسائیوں نے جو ایک مدت سے عثمانی سلطنت سے مطلقاً آزاد تھے اپنے اخلاص کا اس طرح اظہار کیا کہ ایک وفد بھیجکر مرصع تلوار عبدالکریم پاشا کی خدمت میں پیشکش کی جو روس کے مقابلہ کے لئے مامور ہوئے تھے۔

ترکی ادب

عثمانی ترکی چغتائی کی ایک شاخ ہے۔ اس میں سلطنت عثمانی کے قیام سے پیشتر کوئی تصنیف یا تالیف نہ تھی، چونکہ ترک سلجوقی سلطنت کے وارث ہیں جن کا علم ادب فارسی تھا اسلئے ترکی ادب کی بھی بنیاد فارسی ہی ادب پر پڑی۔ اور مذہبی علوم براہ راست عربی سے اخذ کئے گئے۔ اس وجہ سے عثمانی ترکی میں فارسی اور فارسی سے زیادہ عربی الفاظ کی کثرت ہو گئی۔

نویں صدی ہجری کے وسط میں جب سلطان حسین والی ہرات کے وزیر امیر علی شیر نوائی کا ترکی دیوان قسطنطنیہ میں پہنچا اس وقت سلطان محمد فاتح کے وزیر احمد پاشا نے جو ادب سے ذوق رکھتا تھا ترکی میں شعر گوئی شروع کی جس کی وجہ سے نہ صرف عوام بلکہ خود سلطان کو بھی اس سے دلچسپی ہو گئی اس کے بعد رفتہ رفتہ ترکوں میں شعر کا ذوق بڑھتا گیا۔ اور بڑے بڑے فضلاء مثلاً ابن کمال۔ فضولی۔ نابی۔ ندیم اور غالب وغیرہ پیدا ہوئے جنہوں نے غزل، قصیدہ اور مثنوی میں نام پایا۔ خود بعض سلاطین آل عثمان بھی شعر کہتے تھے جن میں سے سلیم اور مراد نمایاں طور پر مشہور ہوئے لیکن ترکوں کی یہ شاعری نہ صرف وزن و بحر بلکہ معنی اور روح کے لحاظ سے بھی فارسی شاعری کے مشابہ تھی جس کے تمام رشتے حیات اور عمل سے منقطع ہو چکے تھے۔ آخری دور میں جب مغربی خیالات کے اثر سے ترکی میں نئی ذہنیت پیدا ہوئی تو انکی شاعری نے بھی نیا رنگ اختیار کیا جس کے علمبردار نامق کمال۔ حامد۔ توفیق فکرت اور محمد عاکف وغیرہ ہیں جنہوں نے حسن و عشق کے فرسودہ افسانے چھوڑ کر اثبات زندگی اور ذوق عمل کے نغمے گائے اور عقل و تدبیر کی تحقیر اور توکل و تقدیر کی غلط تعبیر جو تصوف کے اثر سے دلوں میں جاگزیں ہو گئی تھی دور کر کے حریت فکر اور سعی پیہم کی طرف راہنمائی کی۔ ترکی میں بھی فارسی کی طرح نظم نے بہ نسبت نثر کے زیادہ ترقی پائی۔ نثر کی پہلی کتاب انوار سہیلی کا ترجمہ ہے جو سلطان محمد فاتح کے وقت میں کیا گیا۔ اس کے بعد سے دینیات، تاریخ اور ادب میں کتابیں لکھی جانے لگیں۔

ترکی میں پہلا مطبع وزیر اعظم ابراہیم پاشا نے جو ندیم شاعر کا ممدوح تھا قائم کیا۔ اس میں

ترکی کی پہلی مطبوعہ کتاب ترجمہ قاموس [illegible] میں چھپ کر شائع کی گئی۔

عثمانی ترکی جب سے کتابت میں آئی اسی وقت سے عربی حروف میں لکھی جاتی تھی سال گذشتہ سے جمہوریہ ترکیہ نے اس کو لاطینی حروف میں کر دیا ہے

انقلاب

ترکوں میں بھی دوسری مسلمان قوموں کی طرح بجز ذات شاہی کے کوئی ادارہ سیاسی نہ تھا یورپ میں انقلاب فرانس کے بعد چپہ چپہ میں آزادی کے خیالات پھیل گئے تھے جن سے عثمانی عیسائی رعایا بھی متاثر ہوئی اور اپنی آزادی کے لئے مختلف طریقوں سے جد و جہد کرنے لگی جس میں آخر کار وہ کامیاب بھی ہوئی مگر ترکی طبائع پر اس کا اثر بہت کم پڑا تھا۔

سب سے پہلا شخص جس نے ترکوں میں حریت کا احساس پیدا کیا مدحت پاشا تھا جس کی کوششوں سے سلطان عبد الحمید ثانی نے اپنے آغاز جلوس میں دستوری حکومت کا اعلان کیا مگر احساس اس قدر کمزور تھا کہ سلطان نے دستور کو توڑ کر مدحت پاشا کو طائف میں نظر بند کر دیا اور احرار ترکوں کو ملک بدر کرنے لگا اور کوئی بغاوت رونما ہوئی۔

اس کے بعد رفتہ رفتہ عبد الحمید کے استبداد سے حریت کے شعلے بڑھ گئے اور اس کی سختیوں نے جو اس نے دستور کے حامیوں پر کیں اس آگ پر تیل کا کام دیا چنانچہ جمعیۃ اتحاد و ترقی نے جس کے سرگرم ارکان نیازی بک، انور بک اور محمود شوکت پاشا جیسے لوگ تھے سنہ ۱۹۰۸ء میں قوت کے ساتھ دستوری حکومت حاصل کر لی۔ اور اب جنگ عمومی کے بعد سے تو مصطفےٰ کمال پاشا نے اس کو کامل جمہوری بنا دیا ہے۔

اسباب زوال

ترکوں کی جس طرح ترقی بتدریج ہوئی اسی طرح انحطاط و تنزل بھی رفتہ رفتہ ہوا اور یہ تلک الایام نداولہا بین الناس، کا فطرتی قانون ہے جو اس سے خالی نہیں ہے خصوصاً شخصی اور استبدادی حکومتوں کا زوال جن میں لازماً نقائص موجود رہتے ہیں۔ ہم اس جگہ مختصراً ترکوں کے اسباب زوال کو لکھتے ہیں

(۱) ترکی قوم ایک سپاہی اور شجاع قوم ہے۔ اس نے ملک داری یعنی پیشہ ور ملکی
انتظامی اداروں کی بہ نسبت اپنی بہادری اور شمشیر پر زیادہ اعتماد کیا۔ اس وجہ سے اپنی
مفتوحہ اقوام سے نہ تو زیادہ نفع اٹھا سکے نہ انکو زیادہ نفع پہنچا سکے۔ غیر قوموں کو چھوڑ کر خود
مسلمانوں میں جو انکی حکومت میں آئیں انکی قومیت اور عصبیت کو اپنے ساتھ موافق نہ کر سکے
حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے باوجود صحابہ کی کوششوں کے عراق اور مصر کے علاقوں
کو فوج میں تقسیم ہونے نہیں دیا بلکہ براہ راست خلافت کا محکوم رکھا جس سے تھوڑے ہی
دنوں میں ان مقامات کے باشندوں کی عصبیت فنا ہو گئی اور وہ اسلامی قوت کا جزو بن گئے
مگر ترکوں نے مفتوحہ اقوام کے علاقے سپاہیوں میں بانٹ دیئے۔ ان جاہل آقاؤں کے مظالم
سے ان قوموں میں حکومت کی ہمدردی نہ پیدا ہو سکی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت میں جس قدر
ضعف آتا گیا اسی قدر ان میں اپنی جنسیت کا احساس اور آزادی کا خیال بڑھتا گیا۔ چنانچہ
سلطان عبد الحمید اول کے عہد میں ۱۲۰۲ھ میں جب روس و آسٹریا نے دولت علیہ پر حملہ کیا
اس وقت بلقان کے بہت سے اصلی باشندے جا کر ترکوں کے خلاف جنگ میں شامل ہو گئے۔
جب لڑائی ختم ہو گئی تو واپس آ گئے۔ جاگیرداروں نے بوجہ باغی ہونے کے ان پر سختیاں شروع
کیں جس سے شورش برپا ہو گئی۔ باب عالی نے آخر میں عفو عام کا اعلان کر کے فوج کے ہاتھوں
سے انکے علاقے نکال لئے۔ اس پر انکشاریہ نے بغاوت کر دی۔ پازوند اوغلی نے کوشش کر کے
پھر وہ علاقے فوج کو دلوا دئے۔ انہوں نے پھر وہی مظالم شروع کئے۔ اب اصلی باشندے جو جنگ و
پیکار سے واقف ہو چکے تھے مقابلہ کے لئے کھڑے ہو گئے اور مشہور سرولی زعیم جرج پیٹروفتش
کی قیادت میں حزب وطنی قائم کی اور سلسلہ وار جد و جہد کرنے لگے یہاں تک کہ آخر میں استقلال
حاصل کر کے رہے۔

(۲) بعض ترکی وزراء اور امراء کی خیانت۔ جنہوں نے نازک سے نازک موقعوں پر
دشمنوں سے رشوتیں لیکر فتوحات کو شکستوں میں تبدیل کر دیا۔ اور سلطنت کو عظیم الشان نقصانات

پہنچائے۔

دولت علیہ کا سب سے بڑا اور جانی دشمن روس تھا جس نے ۱۷۷۴ء میں قسطنطنیہ پر قبضہ کر کے روس کے ماتحت کر لیا تھا۔ سلطان احمد ثالث کے عہد میں جب اس نے عثمانی علاقہ پر چڑھائی کی اس وقت محمد پاشا صدر اعظم نے جو وہاں کوفوج لیکر مقابلے کے لئے گیا تھا۔ دریائے بروت کے متصل اس کو معہ اس کی محبوبہ ملکہ کیتھرائن کے ایک قلعہ میں محصور کر لیا۔ اس موقع پر اگر دیانت اور صبر سے کام لیکر اس نے ان کو گرفتار کر لیا ہوتا تو ترکوں کی ساری مصیبتوں کا خاتمہ ہو جاتا لیکن ملکہ مذکورہ نے اپنے زیورات اور جواہر اس کے پاس بھیجدئے جس کی وجہ سے اس نے محاصرہ اٹھا لیا اور معاہدہ کر کے واپس آ گیا۔

سلطان عبدالمجید خاں کے عہد میں جب محمد علی پاشا خدیو مصر کے بیٹے ابراہیم پاشا نے ترکوں کو نصیبین میں شکست دیدی جس سے خطرہ پیدا ہو گیا کہ وہ نہ صرف اناطولیہ بلکہ قسطنطنیہ پر بھی قبضہ کر لے گا اس وقت احمد پاشا قبودان عام نے سارا ترکی بیڑہ اسکندریہ میں لیجا کر خدیو مذکور کے حوالے کر دیا۔ اگر انگلستان اور فرانس بیچ میں نہ آ پڑتے تو محمد علی قسطنطنیہ پر بھی قبضہ کر لیتا اور ترکی سلطنت صفحۂ وجود سے مٹ جاتی

عبدالحمید ثانی کے عہد میں انگریز کوشش میں تھے کہ جزیرہ قبرص لے لیں لیکن سلطان کسی طرح تیار نہ تھا۔ ۱۸۷۸ء میں صفوت پاشا نے صدارت پر آتے ہی جزیرہ مذکور انگریزوں کے حوالے کر دیا اور سلطان سے کہدیا کہ برلن کانفرنس میں یہ ہماری مدد کرینگے۔

یہ اور اس قسم کے واقعات ترکی تاریخ میں اور بھی ہیں بعض مورخین نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ روس کی اکثر فتوحات دولت علیہ پر زر کی بدولت تھیں نہ کہ زور کی۔

(۳) دور انحطاط میں چند سلاطین مثلاً مراد رابع، سلیم ثالث، محمود ثانی یا عبدالحمید ثانی اور بجز چند وزرا جیسے خاندان کوپریلی وغیرہ کے عام طور پر عثمانی سلاطین، انکے وزرار، امرا اور ارکان دولت سیاست اور ملک داری میں نااہل تھے جو نہ خارجی تعلقات کو ٹھیک رکھ سکے

[illegible] کی جس کے باعث دونوں فوجی اور اقتصادی حالت بہت بگڑ گئی یہاں تک یہ سلطنت شاید کو مرد بیمار کا خطاب دیا گیا جس کی ہلاکت میں بہت کم مدبرین کو شبہ تھا۔

دوسری طرف ان کے حریف یورپ نے دور جہالت و وحشت سے نکل کر علم اور وحدت قومی کی طرف قدم بڑھایا اور زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کر کے ترکوں کو پیہم شکستیں دینے لگا، یہاں تک کہ انکی سلطنت کے حصے بخرے کرنے کے منصوبے باندھنے لگے چنانچہ یکے بعد دیگرے انکے مقبوضات نکالے بھی گئے جس کے باعث بجائے اس کے کہ سلیمان قانونی کے عہد میں ترکی دنیا کی سب سے بڑی سلطنت تھی اب گھٹکر ایک معمولی ریاست رہ گئی۔ ع

وہ بڑھ کے بدر ہوئے گھٹ کے ہلال ہوئے

(۴) ترکوں اور بالخصوص انکے علماء میں تقلید اور قدامت پرستی زیادہ تھی اور حریت فکر اور وسعت نظر کمتر۔ اس وجہ سے اکثر انہوں نے جدید اصلاحات کی مخالفت کی اور مذہب کے نام سے مفید دنیاوی علوم و فنون کو روکا۔ سلیم ثالث نے ۱۲۰۸ھ میں جب جدید طرز کی فوجیں تیار کرنی شروع کیں اور خاصکوئی اور جزیرہ گیبہ لی میں انکی تعلیم کے لئے حربی مدارس کھولے اسس وقت رجعت پسند جماعت نے قیامت برپا کردی۔ اور انہوں نے نہ صرف ان اصلاحات کے حامی وزراء کو قتل کیا بلکہ سلیم کو بھی تخت سے اتار کر چھین لیا کیونکہ طوبال عطاء اللہ آفندی شیخ الاسلام نے فتویٰ دیا تھا کہ مغربی فوجی لباس شریعت کے خلاف ہے۔

دوبارہ سلطان محمود نے جب پھر وہ اصلاحات شروع کیں اُس وقت انکشاریہ پھر مقابلہ کے لئے کھڑے ہوگئے۔ مجبور ہوکر سلطان نے انکشاری فوج کو توڑ دینے کا فیصلہ کرلیا مگر اس میں کامیابی اس وقت ہوئی جب آتی میدان میں انکی چالیس ہزار لاشوں کے پشتے لگا دئے گئے۔

یورپ میں جابجا مطابع قائم ہوچکے تھے اور علوم و فنون کا سیلاب رواں تھا لیکن ترکی میں ایک مدت کے بعد احمد ثالث کے عہد میں ۱۱۴۰ھ میں پہلا مطبع قائم ہوسکا۔ اس پر بھی مفتی اعظم نے یہ قید لگا دی کہ قرآن کریم نہ چھاپا جائے کیونکہ موصوف کو تحریف کا خطرہ تھا۔

... میں جمہوریت کا یہ وجود اس نے جس کا تصور ہو کر کسی شباب جذبات میں مغرب کی تقلید شروع
کی تو ترکی زبان کے رسم الخط کو بدل ڈالا سے پیدا ہوں اور اس کو بھی لازمی قرار دیا ہے ترکی
زبان کو بھی عربی کی بجائے لاطینی حروف میں منتقل کر دیا ہوا اور شریعت سے اپنے رشتے توڑ رہے ہیں
تاکہ وہ قدیم ذہنیت بدل جائے لیکن اصل جوش جس نے یورپ کو یورپ بنایا ہے وہ جب تک
اس کو نہ اپنائیں گے ان تبدیلیوں سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

بعض پیروانِ اقبال کے مسلمان ترکوں کے مغربی تہذیب اختیار کر لینے کی وجہ سے یہ
کہنے لگے ہیں کہ وہ اسلام ہی سے بیزار ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اسلام مغربی یا مشرقی تہذیبوں
سے بالاتر ہے وہ کسی خاص ملکی یا علاقائی طرز اور وضع میں محدود نہیں بلکہ اس کا تعلق قلب
کے ساتھ ہے اگر نوجوان ترکوں کا یہ بیان صحیح ہے کہ وہ قرآن کریم کو جو اصل الاصول ہے
مضبوط پکڑے ہوئے ہیں تو پھر مایوسی کی کوئی وجہ نہیں بلکہ ممکن ہے کہ ان کا یہ زوال جس میں
جمہوریت پیدا ہو گئی ہے ایک نئے دورِ اقبال کا فاتحہ ہو۔

ڈراما کیا چیز ہے

گزشتہ سے پیوستہ

(ب)

فرحیہ: جس ڈرامے میں واقعات کی عام رفتار اور قصے کا انجام خوشگوار ہو یعنی جس سے دیکھنے والوں کے دل پر فرحت و مسرت کا اثر ہو انہیں فرحیہ کہتے ہیں۔ مگر جس طرح وہ المیے کی شان نہیں رکھتا بلکہ ایک کمتر درجے کی چیز ہے اور میلوڈراما (رقت آمیز ڈراما) کہلاتا ہے۔ اسی طرح وہ کھیل جو محض تفریح اور دل لگی کا باعث ہوتا ہے فرحیے کے معیار سے پست ہوتا ہے اور فارس (نقل) کے نام سے موسوم ہے۔ فرحیے سے راحت و مسرت کے علاوہ دیکھنے والے کی طبیعت کو اطمینان اور آزادی کی ایک مستقل کیفیت محسوس ہوتی ہے اور زندگی کا بوجھ اس کے دل پر سے ہٹ جاتا ہے

عموماً اس کیفیت کا اظہار ہنسی سے ہوتا ہے۔ اس لئے اگر ہم اس پر غور کریں کہ ہنسی عموماً کن چیزوں پر آتی ہے تو ہم یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ فرحیے کے کیا عناصر ہونا چاہئیں۔ نفسیات کے ماہروں کا عام طور پر یہ خیال ہے کہ ہنسی کی محرک تین چیزیں ہوتی ہیں کسی شخص کی خفت یا ذات کا ہلکا پن یا بے تکا پن۔ اس کا شخصیت کو مجروح اور شین نا ہونا۔ مثلاً جب کسی کا خصوصاً کسی خواہ مخواہ مرد آدمی کا پیر پھسلے اور وہ گر پڑے تو ہمیں ہنسی ایک تو اس لئے آتی ہے کہ یہ افتاد اس شخص کی خفت کا باعث ہوتی ہے دوسرے اس لئے کہ گرتے وقت اور گرنے کے بعد اس کی قطع بے تکی ہو جاتی ہے چہرے کی عجب بدرخ ہو جاتی ہے۔ متنبہ بھیل کر رہ جاتا ہے ٹانگیں اوپر اٹھ جاتی ہیں۔ تیسرے اس لئے کہ اس کی بے بسی دیکھ کر ایک لمحے کے لئے گویا ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ حضرت اشرف المخلوقات ہیں۔ جن سے ہمیں ہمدردی کرنا

چاہئے بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ گوشت اور چربی کا ایک تودہ ہے جسے تکلیف کا کوئی احساس نہیں۔
فرانسیسی فلسفی برگساں نے ہنسی کے [illegible] کی تحلیل کی ہے وہ زیادہ مکمل ہے۔ وہ کہتا ہے ہنسی کے لئے تین شرطیں ہیں (۱) [illegible] وضع قطع شکل صورت وضع قطع یا طرز معاشرت میں سوسائٹی کے عام رنگ سے مختلف ہو (۲) جس حالت میں وہ پایا جائے اس میں اس کی شخصیت چھپ جائے اور وہ مشین یا کٹھ پتلی کی طرح معلوم ہو (۳) دیکھنے والے کو اس وقت اس کے انسانی جذبات کا احساس نہ ہو۔ مثلاً اوپر کی مثال میں موٹا ہونا سوسائٹی کی عام روش سے ہٹی ہوئی چیز ہے چھپر پھسل کر گرنے میں ہر شخص کٹھ پتلی کی طرح مجبور ہوتا ہے اور پھر موٹے آدمی کی بے بسی کا تو کیا پوچھنا ہے، رہی تیسری شرط تو ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں بیچارے المزہ کے جذبات کا کسے احساس ہوتا ہے۔

لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایک اور چیز ہنسی کی محرک ہوتی ہے جس کا برگساں نے ذکر نہیں کیا اور وہ تہذیب اور ثقاہت کے تکلفات سے آزادی کا احساس ہے مثلاً ایک مجمع میں جہاں سب مقطع اور ثقہ لوگ بیٹھے ہیں اور انسان وہاں بات کرنے بلکہ سانس لینے میں بھی تکلف محسوس کرتا ہے کوئی شخص کوئی موٹی سی گالی بک دے یا بھونڈا مذاق کر بیٹھے تو حالانکہ خوش مذاق لوگوں کے لئے گالی یا بیہودہ مذاق بجائے خود کوئی ہنسی کی چیز نہیں مگر ایسے موقع پر انہیں بے اختیار ہنسی آ جائے گی۔

ہنسی کی اس نفسیاتی تحلیل کو نظر میں رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مزاح میں وہ کیفیت جس پر ہنسی آتی ہے پانچ طرح سے پیدا ہو سکتی ہے۔

(۱) ایک تو کسی شخص کی بے تکی جسمانی صفات مثلاً ناک کا بڑا ہونا۔

(۲) اس کی [illegible] ذہنی اور روحانی صفات سے مثلاً [illegible] مذاق یا [illegible] صفت میں اس قدر مبالغہ جو مذاق کی حد تک پہنچ جائے۔

(۳) اس کی [illegible] سے [illegible]

(۴) کسی مضحک حالت کے دکھانے سے۔

(۵) مضحک الفاظ اور فقرے استعمال کرنے سے۔

فرحیہ نگار ان سب ترکیبوں سے کام لیتا ہے لیکن ان کے استعمال میں تناسب کو نظر رکھتا ہے۔ جس ناٹک میں محض بے تکی جسمانی صفات یا نرالی عادتیں اور حرکتیں دکھائی جائیں وہ فرحیہ نہیں رہتا بلکہ نقل (فارس) بن جاتا ہے۔ فرحیے میں یہ چیزیں اسی حد تک کھپتی ہیں جہاں تک یہ ذہنی اور روحانی بے آہنگی کی علامت ہوں۔ البتہ ان کی ذہنی صفات کو نمایاں کرنا مضحک حالتوں کا پیدا کرنا مضحک الفاظ اور فقرے استعمال کرنا فرحیے کا اصل جوہر ہے۔

یہاں تک ہم نے فرحیے کے عناصر مضمون کے لحاظ سے بیان کئے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہنسنے ہنسانے کے لئے طرز ادا کیا اختیار کیا جاتا ہے۔

انسان اپنی خوش طبعی کا اظہار ان تین طرزوں میں سے کسی طرز سے کرتا ہے۔ مذاق یا دل لگی، ظرافت، طنز۔

مذاق یا دل لگی اسے کہتے ہیں کہ آدمی اپنی فطری شگفتہ طبعی سے ہر بات میں ہنسی کا پہلو ڈھونڈھے، خود ہنسے اور جس پر ہنسے اسے بھی ہنسائے۔ اس کی بنیاد ہمدردی، یار باشی، کشادہ دلی پر ہوتی ہے۔ مذاق کرنیوالے کا مقصد کسی کو خفیف کرنا نہیں بلکہ سب کو خوش کرنا ہوتا ہے وہ جس طرح دوسروں پر چوٹ کرتا ہے اسی طرح اپنے آپ پر بھی فقرے کستا ہے۔ اس کی طبیعت میں یا اس کی باتوں میں کوئی خاص نفاست یا باریکی نہیں ہوتی لیکن وہ تناسب کا کسی قدر احساس رکھتا ہے۔ اس کی نظر بے ڈول یا بے تکی چیز پر فوراً پڑتی ہے، وہ بے ساختہ ہنس پڑتا ہے اور اس کے ہنسنے پر دوسروں کو ہنسی آجاتی ہے۔ مذاق کرنے والا اگر متانت اور خودداری سے بالکل خالی ہو اس کی باتوں میں بازاری پن کی جھلک اور خوشامد یا مطلب براری کا پہلو پیدا ہو جاتا ہو تو اس کا مذاق مسخراپن کہلاتا ہے۔

وہ مذاق جو پستی کی طرف جھکنے کی بجائے بلندی کی طرف ابھرتا ہے جس میں نفاست، ندرت

ستھرا پن پایا جاتا ہے اسے ظرافت کہتے ہیں۔

ظرافت کی بنیاد شوخ طبعی، نکتہ سنجی اور ذہنی رعونت پر ہوتی ہے۔ ظریف آدمی کا احساس تناسب اتنا نازک ہوتا ہے کہ وہ ذرا سا بے ڈھنگا پن بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ جب وہ بیڈول چیزوں اور بے ڈھنگے لوگوں کو دیکھتا ہے تو اس کے دل میں ہمدردی کی جگہ ایک طرح کی حقارت پیدا ہوتی ہے۔ وہ دل لگی بازی کی طرح کھلے دل سے اور کھلے الفاظ میں مذاق نہیں کرتا بلکہ برتری کے احساس کے ساتھ اپنے آپ کو لئے دیتے ہوئے لطیف اشاروں اور کنایوں میں چوٹیں کرتا ہے اور اسے اس کی پروا نہیں ہوتی کہ اس سے دوسروں کے جذبات کو ٹھیس لگے گی۔ اسکا مقصد کمتر ہنسانا اور زیادہ تر بیوقوفوں اور سادہ لوحوں کو بنانا اور خفیف کرنا ہوتا ہے۔

اگر ظرافت حد سے زیادہ تلخ اور ترش ہو جائے تو وہ طنز کے درجے پر پہنچ جاتی۔ طنز کرنیوالا عموماً اکل کھرا اور مردم بیزار ہوتا ہے۔ اس کی نظر حماقت اور بے تکے پن کے علاوہ اخلاقی کمزوریو پر بھی ہوتی ہے۔ ان چیزوں کو دیکھ کر اسے تکلیف ہوتی ہے اور وہ ان کی پردہ دری کر کے دوسروں کو بھی تکلیف پہنچانا چاہتا ہے۔ اس کی ہنسی زہر خند کی شان رکھتی ہے اور اس کی ظرافت غم اور غصے میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے۔

ان میں سے فرحیے کا مخصوص طرز ادا مذاق اور دل لگی ہے۔ ظرافت کا استعمال محدود ہے اس کی باریکی اور شوخی سے کام لیا جاتا ہے لیکن رعونت کا انداز اختیار نہیں کیا جاتا۔ اکثر اعلیٰ درجے کے فرحیہ نگار، مثلاً شیکسپیر جن لوگوں کا مضحکہ اڑاتے ہیں ان کی تحقیر نہیں کرتے بلکہ ان سے ایک حد تک محبت رکھتے ہیں۔ شیکسپیر کی ہنسی میں تلخی نہیں ہوتی۔ اس کی پھبتیوں میں نشتر نہیں ہوتا۔ اس کے سب سے مشہور مضحک کیرکٹر فالسٹاف کی حماقت، لالچ، شیخی پر ہم جی کھول کے ہنستے ہیں لیکن جب وہ اپنے کئے کی سزا پاتا ہے تو ہمیں اس پر رحم آجاتا ہے۔ مولیر جو غالباً فرحیہ نگاری کا سب سے بڑا استاد ہے شیکسپیر سے زیادہ سخت گیر ہے لیکن اس کا دل بھی رعونت اور تحقیر کے جذبات سے خالی ہے۔ وہ جن لوگوں کا خاکہ اڑاتا ہے انہیں اپنے سے کم درجے کا مخلوق نہیں سمجھ

اپنی طرح انسان سمجھتا ہے۔

بقیہ دو طرز یعنی مسخرا پن اور طنز فرسے کے لئے مناسب نہیں۔ مسخرے پن پر ہنسی ضرور آتی ہے لیکن خوشی کی جو کیفیت اس سے پیدا ہوتی ہے وہ وقتی اور عارضی ہوتی ہے اس سے تھوڑی دیر دل بہلتا ہے لیکن زندگی کی دشواریوں میں کوئی مستقل سہولت حاصل نہیں ہوتی اس طرز کا محل استعمال نقل (فارس) ہے جو عوام میں بہت مقبول ہے لیکن خوش مذاق لوگوں کی نظر میں زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔

طنز کی گنجائش فرسے میں اور بھی کم ہے۔ فرسے کی سبک روی اس کی تلخی اور ترشی کا بار نہیں اٹھا سکتی۔ طنز کی جان غم و غصہ اور نفرت کے جذبات ہیں جو مذاق کے ہلکے سے پردے میں چھپے ہوتے ہیں۔ تنقید اور تضحیک کے لئے یہ بہت اچھا آلہ ہے لیکن فرسے میں جس کا اصل مقصد تفریح اور خوش وقتی ہے، اس کی آشفتہ نوائی سارے عیش کو تلخ کر دیتی ہے۔

ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ ہنسی زیادہ تر ان لوگوں پر آتی ہے جس میں شخصیت نہ ہو بلکہ جو کٹھ پتلی کی طرح کسی بیرونی قوت کے اشارے پر حرکت کرتے ہوں اس لئے فرسے میں جس کا دارومدار ہی اس پر ہے کہ ہر شخص کو مضحک حالت میں دکھایا جائے عموماً کوئی نمایاں شخصیت رکھنے والا کیرکٹر یعنی کوئی ہیرو نہیں ہوتا۔ اگر کسی کیرکٹر کو خاص طور سے مضحک بنایا جائے تو اس کی شخصی حیثیت برقرار نہیں دیا جاتا بلکہ اس سے کسی جماعت یا طبقے کی مثال (Type) کا کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً مولیر کے ڈراموں میں جہاں کہیں ایک طبیب یا ایک کنجوس آدمی کی خبر لی گئی ہے تو اس سے کوئی خاص شخص مراد نہیں بلکہ سارے طبیب اور سارے کنجوس آدمی۔ اکثر فرسوں میں اصل قصے کے ساتھ ایک یا زیادہ ضمنی قصے بھی ہوتے ہیں جن کے اشخاص کی اہمیت قریب قریب مساوی ہوتی ہے۔ اس طرح فرسے میں عمومیت کا رنگ جس کے لئے المیے میں خاص اہتمام کرنا پڑتا ہے خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ عمومیت پیدا کرنے کی اور ترکیبیں مثلاً مافوق الفطرت قوتوں کا ذکر فرسے میں کام نہیں دیتا کیونکہ ان سے خوف اور دہشت کا اثر پڑتا ہے۔ اور یہ فرسے کی

انتشار کے خلاف ہے۔

(۶)

ڈراما کی نشو ونما عہد قدیم سے عہد جدید تک

انسانی زندگی کی تمثیلیں ناٹک کے ذریعے دکھانے کی رسم اکثر قوموں میں قدیم زمانے سے پائی جاتی ہے لیکن اسے ادبی اور شاعرانہ حیثیت پہلے پہل چینیوں یونانیوں، اور ہندوؤں نے دی۔ ان تینوں قوموں نے ایک دوسرے سے متاثر ہوئے بغیر الگ الگ اس صنف شاعری کو ایجاد کیا۔ یونانیوں میں اس رسم کی بنیاد اس طرح پڑی کہ انکے یہاں ابتدا سے ڈایونی سیس[1] دیوتا کے پوجا کے سلسلے میں مذہبی روایات ناٹک کی شکل میں دکھائی جاتی تھیں۔ جب یونانی تمدن نے ترقی کی تو شعرا اس رسم کے لئے خاص ڈرامے تیار کرنے لگے عام دستور یہ تھا کہ اس موقع پر ایک فرحیہ اور تین المیے دکھائے جاتے تھے جو ڈراما نگار چوٹی کے سمجھے جاتے تھے انہیں کے ڈرامے اس کام کے لئے منتخب ہوتے تھے یونانی زبان کے اکثر بہترین ڈرامے اسی تقریب سے لکھے گئے۔

یونانیوں میں ڈراما کے اصول وضوابط سب سے پہلے ارسطو نے اپنی شعریات (poetics) میں مرتب کئے۔ ارسطو کی خصوصیت یہ ہے کہ یونانیوں کے ذہن نے اپنی فطری تخلیقی رو میں علم و ادب اور فنون لطیفہ کے جو نمونے پیدا کئے تھے اس نے انکا غور و فکر سے مطالعہ کیا اور انکے اہم عناصر دریافت کر کے علمی قوانین بنا دئے تاکہ آئندہ نسلیں اپنے بزرگوں کے تجربوں سے فائدہ اٹھائیں اور بنے بنائے راستوں پر چل کر کم وقت میں زیادہ ترقی کر سکیں اس کے عہد میں باکمال شعرا صرف المیے لکھتے تھے۔ اچھے فرحیے یا تو اس سے پہلے لکھے گئے یا

---

[1] اس دیوتا کے متعلق ابتدا میں یہ عقیدہ تھا کہ وہ سارے نباتات کے اگنے اور بڑھنے کا کفیل ہے لیکن آگے چل کر اسکا کام محض یہ سمجھا جانے لگا کہ انگور میں شراب پیدا کرے۔ اسی کو Bacchus کہتے ہیں۔

اس کے بعد پھر اس وجہ سے اور کچھ اپنی فطری سنجیدگی اور خشک مزاجی کی بدولت اس نے اعلیٰ ڈراما صرف ٹریجڈی کو قرار دیا اور کومیڈی کو ادنیٰ درجے کی چیز سمجھ کر اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی۔ اس کے عہد میں اسٹیج بالکل ابتدائی حالت میں تھی، ٹکنیکل (Technical) ذرائع بہت محدود تھے، پردوں کے بدلنے میں بڑی دقت ہوتی تھی، اس لئے اس نے یہ اصول قرار دیا کہ ہر ڈرامے میں صرف ایک قصہ ہو، ہر قصے کا محل وقوع ابتدا سے آخر تک ایک ہو اور زمانۂ وقوع جہاں تک ممکن مختصر رکھا جائے یہ سہ گونہ وحدت کا قانون کہلاتا ہے۔ ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ارسطو کا نظریہ یونانی حالات کا پابند تھا اور اس نے جو اصول بنائے تھے وہ ہمیشہ کے لئے نہ تھے۔

مگر جب یونانیوں کے تمدن کا زوال ہوا اور ان کی وراثت اہلِ روما کو ملی تو انھوں نے اپنی فطری تقلید پرستی کی بدولت فنونِ لطیفہ میں یونانیوں کے بنائے ہوئے اصولوں کو دوامی قانون سمجھا جس کی مخالفت ان کے نزدیک کسی طرح جائز نہ تھی۔ ہوریس نے ارسطو کے ضوابط کی تشریح کی اور انکی پابندی کو ہر ڈراما نگار کے لئے لازمی قرار دے دیا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ رومیوں کے ڈراما کی آزاد نشو و نما رک گئی اور وہ زیادہ ترقی نہ کر سکا۔ قرونِ وسطیٰ میں کلیسا کی مذہبی سختیوں کے سبب سے ڈراما کو اور تنزل ہوا۔ اس زمانے میں زندگی پر مذہب اور کلیسا کا رنگ چھایا ہوا تھا اس لئے ڈراما بھی اسی رنگ میں رنگ گیا۔ لوگ اپنے ذوقِ تمثیل کو مذہبی سوانگ سے پورا کرتے تھے جس میں مسیح کی ولادت اور شہادت اور اولیا کی زندگی کے سیدھے سادے قصے ہوتے تھے مگر اصولِ فن میں بدستور یونانیوں کی تقلید ہوتی تھی۔ عہدِ جدید میں سب سے پہلے شیکسپیر نے جو قدیم علوم سے تقریباً بالکل ناآشنا تھا اپنی فطری قوتِ تخلیق کی بدولت ڈراما کو فرسودہ قوانین کی پابندی سے آزاد کر کے آسمان تک پہنچا دیا۔ مگر سولھویں صدی کے نقاد ابتک پرانے ضوابط کے قائل تھے اور شیکسپیر کے ڈراموں کو بے اصول سمجھ کر رد کر دیتے تھے۔ جو لوگ اس بادشاہِ سخن کے فطری جوہر کے قائل تھے انھوں نے بھی اصولِ فن میں

کسی طرح کی تبدیلی گوارا نہیں کی۔ ہاں اتنا کیا کہ شیکسپیر کو مستثنیٰ قرار دے دیا۔ ڈراما کی تنقید میں یہ قدامت پرستی اٹھارہویں صدی تک حاوی رہی۔ البتہ سترھویں صدی میں ڈرائیڈن اور اٹھارھویں صدی میں ڈاکٹر جانسن نے لوگوں کو اس طرف توجہ دلائی کہ ارسطو کے اصول بہت سی باتوں میں اس کے عہد کے حالات کے پابند تھے اور جب وہ حالات بدل گئے تو ان اصولوں کی پابندی بھی لازمی نہیں رہی۔ ان نقادوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ شیکسپیر کی کامیابی کا راز یہی ہے کہ اس کی قوت تخلیق نے فرسودہ ضوابط کی زنجیروں کو توڑ کر اپنے دائرہ عمل کو وسیع کر لیا۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں رومانی تحریک کے بانی ہرڈر نے تو فن تنقید میں بالکل کایا پلٹ ہی کر دی۔ اس کا بنیادی اصول یہ تھا کہ ہر قوم اور ہر دور کی ایک مخصوص منشا یا اندرونی روح ہوتی ہے جو اپنے اظہار کے لئے خود راہ نکالتی ہے۔ اس کے خیال میں ادب اور شاعری کو دوامی قواعد وضوابط کا پابند بنانا گویا انکی روح کو طوق و سلاسل میں جکڑ کر رکھنا ہے۔ رومانی دور کے ڈراما میں جو جدتیں پیدا کی گئیں انہیں دیکھ کر سولھویں اور سترھویں صدی کے نقاد آپے سے باہر ہو جاتے۔ سہ گونہ وحدت کا قانون بالکل پس پشت ڈال دیا گیا۔ ڈراما کے طول میں کسی طرح کی پابندی نہ رہی۔ المیہ کا موضوع بجائے بادشاہوں کی زندگی کے عوام کی زندگی بن گئی۔

شیکسپیر کے عہد اور رومانی دور کے ڈراما میں قدیم یونانی رومی ڈراما یا قرون وسطےٰ کے فن تمثیل کے مقابلہ میں جو تبدیلیاں ہوئیں وہ محض قانون وحدت اور اصول فن کے لحاظ سے نہ تھیں بلکہ عہد جدید میں شاعری کی اور اصناف کی طرح ڈراما کا بھی مزاج ہی بالکل بدل گیا۔ یہ تغیر اصل میں انسان کے نفسی انقلاب کا نتیجہ تھا۔ یونان کے سقراطی دور اور روما کے شاہنشاہی دور کا انسان ایک ایسے تمدن کا حامل تھا جو بڑھاپے کی منزل میں پہنچ چکا تھا۔ اسکے خیالات میں پختگی تھی اور سادگی جو پختگی کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہی پختگی اور یہی سادگی اس زمانے کے فلسفے میں، آرٹ میں خصوصاً ڈراما میں پائی جاتی ہے۔ قرون وسطیٰ میں مسیحی مذہب نے رومی اور المانی قوموں میں

پہنچ کر ایک نے تمدن کی بنیاد ڈالی جسے ہم مغربی تمدن کہ سکتے ہیں۔ صدیوں تک یہ تمدن بچپن کی حالت میں رہا۔ لوگوں کے دلوں پر بھوتے پن، عقیدت تقلید کا رنگ غالب تھا جس کا اثر اس عہد کے طرز تعمیر شاعری، ڈراما سبھی چیزوں پر پڑا شکسپیر کے زمانے میں اس تمدن نے جوانی میں قدم رکھا تھا۔ اس کے ہمعصروں کے جذبات میں تلاطم برپا تھا انکے تخیل میں ہیجان پیدا ہو گیا تھا کیونکہ اس کے نفس میں نئی قوتیں، امنگیں، آرزوئیں پیدا ہو رہی تھیں یا بہ قول افلاطون کے انکا مرغ روح پر پرواز پیدا کر رہا تھا۔ اس سیلاب تخیل، طوفان آرزو، جوش جوانی کو راہ پر لگانے کے لئے اٹھارہویں صدی کی نئی روشنی کی تحریک نے عقلیت کے پشتے تیار کئے لیکن یہ دریا ان کے روکے نہ رکا، اٹھارہویں صدی کی شاعری اور ڈراما میں لیسنگ اور اس کے ہمعصروں کی کوششوں سے کچھ دن تک پختگی، سنجیدگی، ضبط کا چلن رہا لیکن رومانی تحریک نے وضع احتیاط سے اکتا کر گریبان عقل کا چاک کر دیا اور جذبات پرستی کا دور دورہ ہو گیا۔ قلب انسانی کی گہرائی سے احساس اور تخیل کے چشمے ابل پڑے اور بحر زخار کی طرح پھیل گئے۔

مگر انسانی تمدن اور انسانی روح کو پھیلنے کے بعد اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ آپ کو سمیٹے۔ جوانی کی شوریدہ سری اور مطلق العنانی تھوڑے دن رہتی ہے پھر خود بخود یہ احساس ہوتا ہے کہ بس اب سنبھلنے کا وقت ہے۔ یہ صورت مغربی تمدن کو انیسویں صدی کے نصف اول میں پیش آئی۔ رومانی دور کی جذبات پرستی نے تخیل کو بڑی وسعت دی تھی اور احساس کو بہت تیز کر دیا تھا لیکن بہت جلد یہ معلوم ہو گیا کہ محض تخیل احساس اور جذبات کی بنا پر مکمل تمدنی زندگی کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ اہل نظر تنقید اور غور سے کام لینے لگے اور ایک با اصول اور مستحکم عقیدۂ زندگی تلاش کرنے لگے۔ اس جستجو کا پہلا علمبردار شاعری اور ڈراما میں جرمن شاعر گوئٹے ہے۔ گوئٹے ابتدائی عمر میں رومانی شاعر تھا لیکن مدت تک زمانے کے نشیب و فراز دیکھنے کے بعد اس کے عقائد بہت کچھ تبدیل ہو گئے اور وہ زندگی کا ایک برتر اور بہتر نصب العین تلاش کرنے لگا۔

لیکن گوئٹے انقلاب کا قائل نہیں تھا بلکہ ارتقا کو مانتا تھا۔ وہ تاریخ کے ہر دور کو تمدنی نشو و نما کے سلسلے کی ایک کڑی سمجھتا تھا اور کسی کڑی کو توڑنا اسے گوارا نہ تھا۔ رومانی خیالات کا اس پر بڑا گہرا اثر تھا اور انکی خامیوں سے واقف ہوجانے کے بعد بھی اس نے انہیں بالکل رد نہیں کیا۔ بلکہ ان کے ایک اہم عنصر کو اپنے فلسفۂ زندگی میں جذب کر لیا۔ اُس کے نزدیک رومانیوں کی جذبات پرستی، انفرادیت، بے اصولی، بے راہ روی سطحی اور عارضی چیز تھی لیکن انکی باطنیت بڑی گہری حقیقت پر مبنی تھی۔ اس باطنیت کو اس نے لے لیا لیکن یوں نہیں کہ حواس ظاہری اور عقل کو معطل کر کے نامعلوم قوتوں کے آگے سر جھکا دیتا بلکہ اس طرح کہ انسانی زندگی کو اس نے ایک مجازی چیز قرار دیا جو عقل و ادراک کے مرحلوں سے گذرتی ہے اور ایک منزل پر پہنچ کر حقیقت کے آغوش میں چلی جاتی ہے اس کے آگے جو کچھ ہوتا ہے اس کی کسی کو خبر نہیں اور نہ ہو سکتی ہے۔

مگر گوئٹے کے بعد انیسویں صدی کے نصف دوم میں یوروپ کی زندگی اور خیالات میں بڑا انقلاب ہوگیا۔ سائنس کی ترقی اور اُس کے استعمال سے صنعت کو بیحد فروغ ہوا۔ بڑے بڑے کارخانے کھل گئے۔ دیہات کی آبادی کھنچ کر شہروں میں آگئی۔ زندگی کی ضروریات بڑھ گئیں اور انکے پورا ہونے میں دقت ہونے لگی۔ کارخانے کے مزدور جب دفعۃً ایک نئی فضا میں آئے تو انکی سماجی زندگی کا شیرازہ بالکل بکھر گیا۔ ان معاشی اور سماجی پیچیدگیوں کے سبب سے لوگوں میں ایک عام بے چینی پیدا ہوئی اور یہ محسوس ہونے لگا کہ نئے مادی حالات سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے حکومت و سیاست، مذہب و اخلاق، ہر چیز میں انقلاب کی ضرورت ہے۔

قدرتی بات تھی کہ اس زمانے میں روزمرہ زندگی کے واقعات نے لوگوں کو اس قدر متوجہ کر لیا کہ زندگی کی حقیقت اور اس کے آغاز و انجام پر غور کرنے کی فرصت نہیں رہی۔ اور ہر نظری فلسفے پر تجربیت کا رنگ چھا گیا۔ یعنی علم کا تنہا معیار تجربہ اور مشاہدہ قرار پایا اور تخیل و وجدان نا قابل اعتبار سمجھ کر ترک کر دیے گئے۔ ادبی فلسفے میں افادیت و عمل پرستی، زندگی کا اعلیٰ مقصد حصول راحت ٹھہرا اور اس کے حصول کا ذریعہ سائنس۔

عام خیال یہ تھا کہ زندگی کی تشکیل اور تہذیب کو مذہبی عقائد یا فلسفیانہ تخیلات پر نہیں چھوڑنا چاہئے بلکہ تجربے اور مشاہدے کے ذریعے سے اس کا ایک صحیح علم مرتب کرنا چاہئے۔ اس علم کا نام عمرانیات (Sociology) رکھا گیا اور یہ سارے علوم کا سرتاج سمجھا جانے لگا۔

اس انقلاب کا اثر ناول نویسی اور ڈراما پر بھی بہت گہرا پڑا۔ ان فنون کا اصل مقصد اب تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ انسان کے ذوقِ جمال اور ذوقِ مشاہدہ کو پورا کریں۔ ان سے زندگی کی تنقید یا اصلاح کا کام اگر لیا جاتا تھا تو محض ضمنی طور پر۔ اب ان کا سب سے بڑا فرض یہ قرار دیا گیا کہ فرسودہ اصولوں اور عقیدوں کی جڑ اکھاڑ کریں اور زندگی کے نئے نصب العین پیش کریں۔ عمرانیات کے جو مسئلے اس زمانے میں عام طور پر چھڑے ہوئے تھے مثلاً فرد کی جسمانی اور روحانی آزادی، عورتوں اور مردوں کی مساوات، مروجہ اخلاق کی تنقید وغیرہ وہی ناولوں اور ڈراموں کے بھی موضوع بن گئے۔

بے قید تخیل اور بے روک جذبات پر اب بڑی قدغن ہونے لگی۔ ایسی باتیں جن میں حقیقت کا رنگ نہ ہو بالکل ترک کر دی گئیں۔ مافوق الفطرت عناصر جیسے دیوتا، تقدیر، جن، پری، وغیرہ جن سے پہلے ڈراما میں بہت کام لیا جاتا تھا اب صرف بچوں کی کہانیوں تک محدود رہ گئے۔ ان سے جو تخیلی اثر پیدا ہوتا تھا وہ اب زندگی کی ظاہری قوتوں مثلاً وراثت، قوتِ حیات، اور نفسیاتی عناصر سے پیدا کیا جانے لگا۔ یوں بھی صنعتی ترقی نے اسٹیج پر ہر طرح کے مناظر دکھانے میں اتنی آسانی پیدا کر دی تھی کہ ڈراما کے زور اور اس کی دلچسپی میں کوئی کمی نہیں ہونے پائی۔

یہ نئی روح ناروے کے ڈراما نگار ابسن کی تصانیف میں سب سے زیادہ نمایاں ہے اس لئے وہی نئے ڈراما کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ ابسن یہ محسوس کرتا تھا کہ مغربی سماج کے اصول و قواعد اور اخلاق و رسوم فرسودہ ہو چکے ہیں۔ ان میں اتنی جان نہیں ہے کہ نئے زمانے کی تحریکیں اور نئی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کر سکیں۔ لوگ محض قدامت پرستی کے سبب سے ان سے اب تک مانوس ہیں۔ اور وہ ان میں اتنی بصیرت پیدا کرنا چاہتا تھا کہ اپنے پرانے خیالات اور

اور رسم و رواج کی کمزوریوں کو محسوس کریں اور اتنی ہمت کہ ان زنجیروں کو توڑ کر پھینک دیں۔ جب وہ اصلاح کے جوش میں اپنے عہد کے اصول اخلاق پر پے در پے حملے کرتا ہے تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرے سے اجتماعی اخلاق ہی کا قائل نہیں اور اس کے نزدیک فرد انسانی پر باہر سے یعنی مذہب یا تمدن کی طرف سے کسی طرح کی قیود عائد نہیں کرنا چاہئے بلکہ اسے اس کی حالت پر چھوڑ دینا چاہئے تاکہ اس کی جبلتیں اور صلاحیتیں آزادی سے نشو و نما پا سکیں۔ لیکن اس کی تصانیف کو غور سے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس حد تک نراجی نہیں ہے۔ اس کا منشا اصل میں یہ ہے کہ اخلاقی اصول اور رسوم جو انسان کی مادی اور روحانی ترقی میں مدد دینے کے لئے وضع کئے گئے ہیں اسی حد تک قابل عمل ہیں جب تک وہ زمانے کے حالات، فرد کے فطری رجحانات اور اس کی مخصوص ضرورتوں سے نہ ٹکرائیں۔ جہاں یہ تصادم پیدا ہو تو جیتے جاگتے انسان کی راحت و عافیت کو مقدم سمجھنا چاہئے اور بے رنگ اور بے جان اصولوں کی پروا نہ کرنا چاہئے۔ اگر یہ کشمکش اکثر پیدا ہونے لگے تو سمجھنا چاہئے کہ اب ہمارا مروجہ اخلاق زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتا اور نظر ثانی کا محتاج ہے۔

ابسن کا کمال یہ ہے کہ باوجود تنقیدی اور مصلحانہ طرز اختیار کرنے کے وہ آرٹ کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیتا۔ اس کے اصلاحی جوش اور اس کی انقلاب پسندانہ شورش نے اس کی شاعری کو کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچایا بلکہ اس کے کلام میں اور زیادہ زور اور اس کے انداز بیان میں اور زیادہ سوز و گداز پیدا کر دیا۔ وہ اپنے عہد کی معاشرت کا نقاد ہے، نئی سماجی تحریک کا علم بردار ہے مگر اسی کے ساتھ وہ شاعر ہے اور اس کے یہاں رومانی رنگ صاف نظر آتا ہے۔ آگے چل کر یہ رنگ ہلکا ہو گیا مگر پھیکا نہیں پڑنے پایا۔ آغاز صدی کے رومانیوں میں اور ابسن میں بس اتنا فرق ہے کہ ان لوگوں کی نظر کو جذبات پرستی نے دھندلا کر دیا تھا اور انہیں انسانی زندگی گویا کہر میں چھپی ہوئی نظر آتی تھی مگر ابسن کو بس اتنا نفع تھا کہ اس کا احساس تیز ہو گیا تھا اور ادراک میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اس میں بھی رومانیت تھی اور وہی انفرادیت مگر تنقید اور تحلیل کے ساتھ سموئی ہوئی۔ یہ تحلیل کا

تحلیل بھی جو زندگی کے چھوٹے چھوٹے پہلوؤں کو اس کی تہ تک الگ کر کے دیکھتی ہے نفسیاتی تحلیل جہاں
ہے اندر جا کر اس کے رنگ و بو، اس کی تازگی اور خوشنمائی کا جائزہ لیتی ہے اور اس کے خون دل
اور چاک جگر کا بھید پاتی ہے۔

ابسن نے "دشمن مردم" میں فرد اور جماعت کے تعلقات سے بحث کی ہے۔
"گڑیا کا گھر" اور "سمندر کی خاتون" میں مرد اور عورت" کے تعلقات پر تبصرہ کیا ہے۔ لیکن یہ بحث"
اور یہ تبصرہ "خشک علمی مذاکرے" نہیں ہیں بلکہ ان میں آرٹ کی سبک دستی نے دلکشی اور دلربائی
پیدا کر دی ہے۔ "دشمن مردم" جماعت کے خلاف فرد کا نعرۂ جنگ، "سمندر کی خاتون" اور اس
سے بھی بڑھ کر "گڑیا کا گھر" مرد کے مقابلے میں عورت کا اعلان آزادی ہے۔ مگر ان میں سے
کسی میں مناظرے کی درشتی اور تلخی شاعری کی نرمی اور حلاوت پر غالب نہیں آئی۔

آخری عمر میں ابسن کے شاعرانہ تخیل نے واقعیت نگاری میں استعاریت کا رنگ پیدا کر دیا
اس کا عمدہ نمونہ اس کا مشہور ڈراما "ماہرین فن تعمیر" ہے۔ قصہ یہ ہے کہ ایک ذکی الطبع ماہر فن تعمیر
سولنیس کچھ خود غرضی اور کچھ رشک کے سبب سے اپنے نوجوان نائب راگنر کی ترقی کو روکنا چاہتا ہے
وہ سمجھتا ہے کہ اگر راگنر اس کی ملازمت ترک کر کے اپنا کاروبار الگ جاری کر دے گا تو اس کے گاہک
ٹوٹ کر راگنر کی طرف چلے جائیں گے۔ اور اس میں اس کا بڑا نقصان ہے۔ علاوہ اس کے اسے
یہ گوارا نہیں کہ شباب کا بڑھتا ہوا زور بڑھاپے کی گھٹتی ہوئی قوت پر فتح پائے۔ اس لئے
ایک طرف تو راگنر کے بنائے ہوئے نقشوں میں خواہ مخواہ عیب نکال کر اس کی ہمت کو پست کرتا
ہے اور دوسری طرف راگنر کی منگیتر کے بھولے دل کو اپنے دام الفت میں گرفتار کر لیتا ہے تاکہ نہ وہ خود
اس کی نوکری چھوڑے اور نہ راگنر کو چھوڑنے دے مگر شباب ایک نوجوان سیلانی لڑکی ہلڈا کی شکل
میں آتا ہے اور اس کے دل کو پر اسرار طریقے سے تسخیر کر لیتا ہے۔ ہلڈا اسے اس پر آمادہ کرتی ہے
کہ نئی بنی ہوئی عمارت کے مینار پر جا کر ہار چڑھائے۔ سولنیس کڑی کے ڈھانچے پر جو معماروں
نے مینار کے گرد کھڑا کر دیا ہے چڑھتا ہے۔ مگر آخری زینے پر پہنچ کر اس کا سر چکرا جاتا ہے اور د

اس بلندی سے زمین پر گر کر مر جاتا ہے۔ اس طرح پیری کی شکست ہوتی ہے مگر یہ بڑی شاندار شکست۔ ابسن کو اس ڈرامے میں یہ دکھانا مقصود ہے کہ موجودہ نسل کا آخری شخص جو انسانی کو زور زندگی کا قانون فطرت کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس کا انجام ناکامیابی ہے مگر یہ ناکامیابی پیری کے لیے باعث ذلت نہیں۔

اس ڈرامے کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ڈرامے کے جدید دور میں رومانیت بالکل معدوم نہیں ہوئی بلکہ نئے روپ میں استعاریت (Symbolism) کی نام سے تخیل کی آگ کو ہوا دیتی رہی۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ رومانیت تو عجائب پسندی کی دھن میں واقعیت کے قوانین سے صریحی انحراف کرتی ہے، جذبات پرستی کے جوش میں اعتدال کے اصول کو کھلم کھلا توڑتی ہے مگر استعاریت عقل اور عادت کے پردے کو قائم رکھتی ہے اور اس کے پیچھے سے رموز و اسرار کی جھلک دکھلاتی ہے۔ یہ طرز بیان جو ابسن کے یہاں صرف آخری دور میں نظر آتا ہے، اسٹرنڈبرگ، ہیٹرلنک، روستان کے یہاں عام ہے آئرلینڈ کے ڈراما نگاروں خصوصاً ییٹس کی تمثیلوں میں یہ استعاریت اور گہری ہو کر باطنیت بن گئی ہے۔

روستان میٹرلنک اور ہاؤپٹمان کی بعض تمثیلوں خود ابسن کے نوجوانی کے ڈراموں میں رومانیت اپنی اصلی حالت میں بھی نظر آتی ہے۔ مگر یہ ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرنیں ہیں جن سے شام مغرب کی سنجیدگی اور افسردگی کم نہیں ہوتی۔

زمانے کا عام رجحان، جیسا ہم پہلے کہہ چکے ہیں، واقعیت نگاری اور اخلاق و معاشرت کی تنقید کی طرف تھا۔ ڈرامے عموماً اس قسم کے موضوعوں پر لکھے جاتے تھے جیسے شادی اور شادی کے بعد کی زندگی، طلاق کا مسئلہ، مرد اور عورت کے جنسی تعلقات، عشق و محبت، عزت و وقار اور غیرت و حمیت کے موجودہ نصب العین کی تنقید، سرمایہ داروں اور مزدوروں کی کشمکش وغیرہ۔ خوف تھا کہ ان خشک اور سنجیدہ مسائل پر تنقیدی بحث کرنے سے ڈراما میں ادبیت کا عنصر کم ہو جائے گا لیکن اس دور کے تمثیل نگاروں کا کمال تھا کہ انہوں نے اپنی تصانیف میں فن کی خوبی

اور کشش کو قائم رکھا۔ ابسن علاوہ اس کے معاصر اسٹرنڈبرگ، جرمنی کے ہاؤپتمان اور زودرمان، آسٹلو [illegible] انگلستان میں [illegible] گالسوردی کے قلم میں یہ جادو تھا کہ انہوں نے زندگی کی عکسی تصویروں میں بھی نقاشی کا لطف پیدا کر دیا۔

لیکن فرانس کے زولا اور بریو کی تصانیف کو دیکھ کر یہ انداز ہوتا ہے کہ واقعیت نگاری اور سماجی تنقید کو آرٹ بنا دینا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ زولا کی فحش اور بیرنگ اور بریو کی خشک اور پھیکی تمثیلیں نہ صرف آرٹ سے خالی ہیں بلکہ شہوانی جذبات اور خبیث امراض کی بے حجابانہ نمائش سے ذوق سلیم کو اس قدر آزردہ کر دیتی ہیں کہ تنقیدی اور اصلاحی مقاصد میں بھی انکی کامیابی بہت محدود ہے۔ بات یہ ہے کہ سماجی تنقید اور مصلحانہ تبلیغ کو کامیابی کے انتہائی درجے پر پہنچانے کے لئے جن عناصر کی ضرورت ہے یعنی اخلاقی خلوص اور جوش، سوز درد اور طنز و ظرافت انکی زولا اور بریو میں بہت کمی تھی۔ دوسرے ڈراما نگاروں میں جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں یہ چیزیں موجود تھیں مگر اسی حد تک کہ آرٹ کی سبک روی میں خلل نہ پڑے۔ اخلاقی مقاصد کے آگے آرٹ کی پروا نہ کرنا اور اس کے باوجود لوگوں کے قلوب کو تسخیر کر لینا صرف دو شخصوں کے حصے میں آیا جن میں ایک روس کا ناول نویس ٹالسٹائے تھا اور دوسرا انگلستان کا ڈراما نگار برنارڈ شا۔ ٹالسٹائے نے سوز و درد سے اور برنارڈ شا نے طنز و ظرافت سے یورپ کی ادبی دنیا میں قیامت برپا کر دی۔ ان دونوں کے فلسفۂ زندگی میں زمین و آسمان کا فرق ہے لیکن یہ بات دونوں میں مشترک ہے کہ انکے اصلاحی جوش اور خلوص نے آرٹ کی خوشنما زنجیروں کو توڑ کر اور گلا کر اخلاقی تبلیغ کی تلواریں بنائیں جن کی چمک نے آرٹ کے قدردانوں کی نظروں میں چکا چوند ڈال دی۔ ٹالسٹائے کو ڈراما سے سروکار نہیں اس لیئے اسکا ذکر ہم نظر انداز کرتے ہیں اور اپنے مضمون کے تیسرے حصے کو برنارڈ شا کی زندگی اور اس کے ڈراما کی نشو و نما کے بیان کے لئے وقف کرتے ہیں۔

لندن اور پیرس وغیرہ میں باقر آگاہ کی تصنیفات

رسالہ اُردو جلد ۹ حصہ (۳۴) میں مولٰنا باقر آگاہ کے متعلق ایک دلچسپ اور پُر از معلومات مضمون شائع ہوا ہے۔ مگر اس میں زیادہ تر ان کی لائف اور دیوان سے بحث کی گئی ہے۔ دیگر تصانیف کے متعلق پوری صراحت صحت کے ساتھ نہیں ہے۔ چونکہ مصنف مضمون کو ان کی تمام تصنیفات نہیں ملی ہیں اس لئے انکے متعلق فروگذاشتوں کا ہونا ناگزیر ہے

یہاں اس امر کا موقع نہیں ہے کہ اس مضمون پر تنقیدی نظر ڈالی جائے۔ البتہ یورپ میں ان کی جو کتابیں ملی ہیں انکے لحاظ سے ایک سرسری نظر ان کے تصنیفات پر ڈالی جاتی ہے۔ میرا مقصد باقر آگاہ کی لائف بیان کرنا نہیں ہے کیونکہ رسالہ اردو میں اس پر پوری روشنی ڈالی گئی ہے مگر چند امور کا بیان بطور تمہید ضروری ہے تاکہ ناظرین جامعہ باقر آگاہ کی شخصیت سے واقف ہو جائیں۔

آگاہ کا نام محمد باقر ہے انکے اجداد بیجاپور کے رہنے والے تھے ان کے والد محمد مرتضیٰ ویلور (احاطہ مدراس) آئے اور اسی کو وطن بنالیا آگاہ کی پیدائش ۱۱۵۸ھ میں یہیں ہوئی۔ اس طرح آگاہ ویلوری ہیں مگر اپنی تصنیفات میں ویلور کے ساتھ ساتھ بیجاپور کی نسبت بھی ضرور دی ہے اس سے آگاہ کی وطنی محبت بیجاپور کے ساتھ (جو دکن کا گویا بغداد تھا) بخوبی ثابت ہوتی ہے۔

آگاہ عربی فارسی اور اردو کے جیّد عالم اور بڑے پرگو شاعر تھے۔ نہ صرف اردو بلکہ عربی اور فارسی میں اشعار کہا کرتے۔ عربی اور فارسی میں آگاہ اور اردو میں باقر تخلص تھا۔ ان کی عربی قابلیت کا ثبوت اس سے مل سکتا ہے۔ انھوں نے مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کی عربی تصنیف "سبحۃ المرجان" پر چار سو اعتراض کئے تھے۔

وہ اپنے علم و فضل کی وجہ سے اپنے زمانے میں بڑی قدر و منزلت ہوئی۔ مدراس کے نواب محمد علی والاجاہ نے آپ کی بڑی توقیر کی۔

انہوں نے ۹۰ سال کی عمر پائی ۱۲۲۵ھ میں انتقال فرمایا۔ مدراس میں دفن ہوئے۔

ان کی تصنیفات عربی فارسی اور اردو میں ہیں جن کی صحیح تعداد معلوم کرنی دشوار ہے۔ تقریباً ۳۰ بتائی جاتی ہیں۔ ان میں سے ۱۶ اردو میں جن کی فہرست ذیل میں دیجاتی ہے۔

(۱) ہشت بہشت (۲) فرائد در عقائد (۳) ریاض الجنان (۴) تحفۂ احباب (۵) محبوب القلوب (۶) تحفۃ النساء (۷) گلزار عشق عرف قصہ رضوان شاہ و روح افزا (۸) روضۃ السلام (۹) خمسۂ متحیرہ (۱۰) مثنوی روپ سنگار (۱۱) ہدایت نامہ (۱۲) فرقہائے اسلام (۱۳) معراج نامہ (۱۴) دیوان اردو (۱۵) ریاض السیر (۱۶) رسالۂ عقائد۔

رسالہ اردو والے مضمون میں اردو تصنیفات کی تعداد ۱۴ ظاہر کی گئی ہے مگر نمبر ۶ جسے مضمون نگار نے تین کتابوں کا مجموعہ سمجھا ہے اصل میں ایک ہی کتاب ہے۔ اس کے علاوہ نمبر ۱۱ و ۱۲ و ۱۳ و ۱۶ کا ذکر اس مضمون میں نہیں ہے۔

ان میں سے دس کتابیں یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں آئندہ صفحات پر ان کے نام گنائے جاتے ہیں۔

(۱) ہشت بہشت: یہ دراصل آٹھ رسالوں کا مجموعہ ہے جس کی تصنیف ۱۱۸۵ھ سے ۱۲۰۱ھ تک ہوئی ہے۔ ہر رسالہ کا نام علیحدہ ہے اور ان میں آنحضرت صلعم کی سیرت مبارک کا ذکر کیا گیا ہے۔

یہ تصنیف چند خصوصیتیں رکھتی ہے اول تو یہ کہ اس وقت تک دکھنی زبان میں اس قسم کی کتابیں تصنیف نہیں ہوئی تھیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اپنے مضمون کے لحاظ سے پہلی کتاب تھی۔ اس سے پہلے ایک کتاب شیدا حیدرآبادی کی تصنیف سے تھی مگر وہ چھوٹے چھوٹے قصوں سے ہوتی تھی۔ اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عربی اور فارسی کی معتبر کتابوں سے مواد

حاصل کیا گیا ہے۔ تیسرے یہ کہ اس وقت کی عام فہم اور سلیس زبان میں لکھی گئی تھی عربی اور فارسی یا سنسکرت کے موٹے موٹے الفاظ کا زیادہ استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ یہ آٹھوں رسالے آٹھ مختلف بحروں میں ہیں۔ ان رسالوں کے نام اور ان کے مضمون کے متعلق خود مصنف کا کلام ملاحظہ ہو:۔

ذکر اُس کے ہے نور کا در اول — من دیپک آسے لقب ہے اجل
دوسری میں ہیں اسکی سب بشارات — ہر من ہرن نام اس کا خوشدہات
تسری میں لکھا ہوں اسکا مولود — ہے من موہن نام اس کا مسعود
چوتھی میں ز ہشت سال اسے بہان — سرور کی وفات لک ہے بیان
پنجم میں بیان کیا ہوں خوشدہات — اخلاق و شمائل اور عادات
چھٹی میں خصائص اس کے اکثر — بولا ہوں مفصل اے برادر
ہفتم میں معجزات سالار — تفصیل سے لکھا ہوں اسے یار
لکھتا ہوں بفضل و رحمت رب — آداب محبت اس کی کچھ اب
ہور اُس کی درود کے فضائل — کرانکوں توں نقش صفحہ اول
ہور اس کی فضائل زیارت — مین جس کی شرف کوں حد و غایت
دکھنی میں کہا ہوں اس لیے میں — تا ہووے سمجھ عوام کیت میں
تا سر پیامیاں ہور عورات — پڑنی ستی اسکی پاویں لذات
گرچہ یہ کتب ہیں دکھنی یکسک — اخبار کے ترجمے ہیں بیشک
جو کچھ یہ کتب بنی ہیں مذکور — ہے ترجمہ حدیث اسے سور
اس فن میں جو معتبر کتب ہیں — بلکہ وہ سیر کی پچ اب ہیں
اُن سب کا خلاصہ لیا ہوں — ان نسخوں میں دسچ اسے کیا ہوں
دیباچے میں ان کتب کی تفصیل — ناونگی کروں گا ان کی تفصیل

کیا ... مگر چیون آبی ہی نام دل خواہ
ہو اس سے حیات بردل آگاہ

(مخطوطہ برٹش میوزیم نمبر ۶۴۲۷ ورق ۲۳۲ ب)

رفعت بہشت کا ایک نسخہ برٹش میوزیم[1] میں ہے اور ایک نسخہ پیرس[2] کے قومی کتب خانہ میں۔

پیرس کے نسخہ کو یہ خصوصیت حاصل ہو کہ کاتب کے لکھنے کے بعد مصنف نے اس پر نظرثانی کی ہو اور کئی اشعار کا اضافہ، ترمیم اور اصلاح وغیرہ کی ہے۔

اول الذکر کی تاریخ کتابت ۱۸ رجب ۱۲۶۵ھ ہو آخرالذکر کی تاریخ درج نہیں ہو صرف کاتب کا نام اور مقام کتابت تحریر ہے:-

"از دست عاصی محمد زاہد در باغ نواب والاجاہ"

اس عبارت سے واضح ہے کہ یہ نسخہ شاہی محل میں لکھا گیا ہو۔ دونوں کتابوں میں چند صفحات کا نثر میں دیباچہ بھی ہو جس میں ان کتابوں کی صراحت کی گئی ہے جن سے اس کو مرتب کیا گیا ہو۔

یہ کتاب مدراس اور بمبئی میں متعدد مرتبہ طبع ہوئی ہے اور ایک زمانۂ دراز تک لوگ اس کے خواہشمند رہے جب بدرالدولہ نے آنحضرت کی سیرت "فوائد بدریہ" اردو نثر میں مرتب فرمائی تو بلحاظ زبان کی تدریجی ترمیم اور اصلاح کے اس کتاب کا رواج نہ رہا۔

بہرحال آگاہ کی یہ تصنیف خاص حیثیت رکھتی ہے جس پر کبھی تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔

---

(۱) برٹش میوزیم کا نمبر Or. 6427 ہو

(۲) کتب خانہ پیرس کا نمبر (Indien 872)

(۲) ریاض الجنان ۔ اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم کے نمبر ۵۰۵۶ پر اور ایک نسخہ پیرس میں نمبر ۷۸۲ پر موجود ہے۔

یہ مثنوی ہے جو اہل بیت کے حالات میں لکھی گئی ہے اس کی تصنیف ۱۲۲۷ھ میں ہوئی ہے اس کے دیباچے سے کئی ایک امور پر روشنی پڑتی ہے اس لئے اس سے کسی قدر اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

دیباچہ میں حمد و نعت اور ان کتابوں کی تفصیل کے بعد جن سے اس کو مرتب کیا گیا ہے لکھتے ہیں:-

"بعض علماء ان مناقب اشرف کو فارسی کتابوں میں سیر کے درج کئے ہیں لیکن کوئی کتاب مستقل اس بیان میں اب تک دیکھنے میں نہیں آئی پس تصنیف ہونا اسکا ہندی زبان میں معلوم۔ مگر یہ کہ ولی ویلوری و شیدائے حیدرآباد دکنی زبان میں دو نسخے منظوم لکھتے ہیں ان کا نام روضۃ الشہدا اور روضۃ الاطہار مناقب عترت اخیار کے ان دونوں میں بہت کم ہیں بلکہ نہیں ہیں واقعات شہادت کے کچھ تفصیل سے ہیں اور اکثر بیان دونو کا غلط اور بے اصل ہے جیسا انتقام چاہنا عکاشہ کا آنحضرت صلعم سے ...."

"... اکثر اہل سیر اس فن کے تساہل و سہل انگاری کو قبیح شیوہ اپنا کیا کر کر تواریخ کی لکھنے میں ضبط و تنقیح نہیں کئے بلکہ رطب و یابس جو پائی سو لکھ گئے اس سبب سے ان کی کتابوں میں غلطیاں ہیں اور بے اصل روایتیں بہت پائی جاتی ہیں جیسا حبیب السیر اور روضۃ الصفا اور روضۃ الشہدا بخلاف ثقات حدیث کے کہ تصانیف انکی غایت تحقیق سے موزوں اور نہایت تدقیق سے مشحون ہیں ...."

"... اور یوں واضح ہو کہ یہ عاصی پندرویں سال سے شعر کے ساتھ مناسبت طبیعیہ ارتباط رکھتا ہے اگرچہ شعر کم کہتا تھا لیکن بواسطے تعلیم [illegible]"

[illegible] تھا جب کہ ۱۱۹۶ھ میں پہلے رسائل ہشت بہشت کی منظوم کیا تخلص باقر رکھا جو
نام ہے بجائے تخلص رکھا من بعد ۱۲۱۱ھ وقت نظم کرنے دیوان عربی کے تخلص اپنا
آگاہ مقرر کیا اس تخلص کو عربی فارسی میں لایا اور اکثر مراثی اور ریختیوں میں بھی
اسی تخلص کو اختیار کیا اور تتمہ رسائل ہشت بہشت میں کہ بیچ سنہ ۔۔۔ کے منظوم ہوئی
اور بیچ کتاب محبوب القلوب کے در ۱۲۱۱ھ کی منظوم ہوئے اور اس رسالہ میں کہ
ریاض الجنان نام رکھتا ہے تخلص اپنا وہی باقر رکھا ہے کیا واسطے کے رسائل اول
کے جابجا مشہور ہوئی تھی اگر بعد ہوئی سو رسالوں میں تخلص آگاہ لاتا تو دو تخلص
ہوتے اس واسطے وہی تخلص باقی رکھا اب مثنویات دکنی میں ایک تخلص رہے"

اس صراحت سے جن امور پر روشنی پڑتی ہے وہ یہ ہیں ۔

(۱) مناقب کے متعلق کوئی مستقل کتاب فارسی میں نہیں تھی آگاہ نے اس مضمون کو اردو میں ایک مستقل کتاب کی صورت میں مرتب کیا ۔

(۲) ولی ویلوری اور شیدائے حیدرآبادی نے دو کتابیں شہادت امام حسین میں مرتب کی تھیں مگر وہ صداقت سے دور غلط واقعات پر مبنی تھیں ۔

(۳) اس وقت کی جتنی کتابیں سیر وغیرہ پر لکھی گئی تھیں وہ بھی اسی طرح غلطیوں سے خالی نہیں تھیں ۔

(۴) آگاہ نے پندرہ سال کی عمر سے شاعری شروع کی ۔

(۵) ۱۱۹۶ھ میں جبکہ ہشت بہشت کے چند رسالے مرتب ہوئے اپنا تخلص باقر قرار دیا ۔

(۶) ۱۲۱۱ھ میں عربی دیوان مرتب ہوا جس میں آگاہ تخلص رکھا گیا ۔

(۷) اسی زمانے میں فارسی کلام میں اسی تخلص کو اختیار کیا گیا ۔

(۸) [illegible] مراثی اور اردو غزلیں بھی کہیں جن میں آگاہ تخلص ہے

(۹) محبوب القلوب اور ریاض الجنان ۱۲۰۵ھ میں مرتب ہوئے جس میں باقر تخلص ہو

(۳) "محبوب القلوب" اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم کے نمبر ۲۶۵۵۲ پر موجود ہے یہ ایک مثنوی ہے جس میں تقریباً ۲۰۰۰ شعر ہیں۔ اسمیں شیخ عبدالقادر جیلانی کے حالات بیان کئے گئے ہیں ابتدا میں چھ ورق نثر میں دیباچہ بھی درج ہے۔ اس کے سنہ تصنیف کے متعلق رسالہ اردو میں حسب ذیل شرح کی گئی ہے :-

"اس کی تصنیف کا سال خود مخطوطے سے ۱۱۳۶ھ معلوم ہوتا ہے لیکن ریاض الجنان کے دیباچے میں ۱۱۲۶ھ لکھا ہوا ہے جو درحقیقت ایکہزار ایک سو تائیس ہے اگر یہ آخری تاریخ صحیح ہو اور کاتب کی غلطی سے بجائے ۳ کے ۲ نہ لکھ دیا گیا ہو تو غالباً یہ ۱۱۲۶ھ میں شروع ہوا ہوگا اور دس سال بعد ختم ہوا"

صاحب مضمون سے اس میں سہو ہوئی ہے کیونکہ ۱۱۲۶ھ یا ۱۱۳۶ھ کوئی بھی صحیح نہیں ہوسکتا کیونکہ اس زمانے میں آگاہ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے چنانچہ خود اسی مضمون میں انکی پیدائش کو ۱۱۵۸ھ میں لکھا گیا ہے (صفحہ ۲۰۲ سطر ۵) ریاض الجنان کے دیباچے سے صاف طور پر ۱۲۰۵ھ ظاہر ہوتا ہے اس کی تصنیف اسی سنہ کو قرار دینا چاہئے۔ علاوہ ازیں مصنف نے ۱۱۸۰ھ سے اپنی تصنیفات آغاز کی ہیں۔ اس لئے ۱۱۲۶ھ کسی طرح درست نہیں ہوسکتا اور ۱۲۲۶ھ میں وہ زندہ نہیں تھے۔

(۴) "تحفۃ احباب" اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم کے نمبر ۲۶۵۵۹ پر موجود ہے یہ بھی مثنوی ہے جس میں تقریباً ۳۵۰۰ شعر ہیں۔ اس میں اصحاب کی فضیلت اور مناقب بیان کئے گئے ہیں کتاب میں چھ باب ہیں اور ہر باب میں کئی کئی فصلیں ہیں۔

رسالہ اردو والے مضمون میں اس کے متعلق کوئی صراحت نہیں کی گئی۔ برٹش میوزیم والا مخطوطہ ۱۶ محرم ۱۲۱۳ھ کا لکھا ہوا ہے۔ کاتب عبدالواحد ہے۔ اس مثنوی کے ابتدا میں

بھی ایک دیباچہ تحریر کیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کے علما دکنی زبان کو زیادہ وقعت نہیں دیتے تھے چنانچہ لکھتے ہیں :-

"... جاہل اکثر بلکہ سب دکنی کتاباں بنانے والے بیان میں ایسی بہت غلط کئے ہیں کہ اس زبان کو بے اعتبار کر دئے اس لئے علما اُن کتابوں طرف التفات نہیں کرتے آج تک کوئی کتاب دکنی صحیح و معتبر میری نظر میں آئی نہیں۔ بعضے اُن میں سے سرتاپا جھوٹ سے بھری ہیں اور بعضوں میں جھوٹ زیادہ ہے اور بعضوں میں جھوٹ کم ہے روایات موضوع کا سننا اور سنانا اور پڑھنا اور پڑھانا شرعاً حرام ہے اس بات پر سب علما کا اجماع ہے شکر خدائے تعالیٰ کا کہ میرے تمام رسائل بہت صحیح و معتبر و نہایت مضبوط و مدلل ہیں کوئی محدث اور صاحب علم کو مقدور نہیں کہ اس کی کوئی روایت پر حرف رکھ سکے۔"

(۵) "تحفۃ النسا" اس کا ایک نسخہ پیرس کے قومی کتب خانہ میں نمبر ۸۰۲ پر موجود ہے۔ یہ بھی مثنوی ہے جس میں ۸۰۰ شعر ہیں اور اسکی تصنیف ۱۱۸۵ھ میں ہوئی ہے ان دونوں امور کو خود مصنف نے بیان کیا ہے :-

ہیں آٹھ سو اس کے جملے ابیات — پڑھنے میں ہوا اسی بہوت برکات
گیارہ سو اوپر تھے پنج و ہشتاد — ہجرت سے بنا ہے تب یہ رکھ یاد

(ص ۱۴۵ ب)

اس کتاب میں اول تو حمد و نعت ہے اس کے بعد اپنے مرشد ابوالحسن کی مدح کرتے ہیں :-

اس ملک منی تھا پیر میرا — ہر کام میں دستگیر میرا
تھا نام شریف ابوالحسن جس — اس خلق حسین ہوا حسن جس
[illegible] جنید آیا — الحاد کی جڑ کون مٹایا

وصف اسکا ہے بے شمار بآقر ۔ بیان مدح کو بآکی کر کوئی آخر

(ص ۲۲۸)

اس مثنوی میں ازواج مطہرات اور دیگر خواتین کی فضیلت بیان کی گئی ہے مثنوی کے مضمون کو خود بیان کر دیا ہے :-

امت میں نبی کی جو ہیں عورات ۔ افضل ہیں سب عورتاں سوں بات
لکھتا ہوں میں اس کتاب اندر ۔ احوال نسا رکا اسے برادر
اس شاہ کی دختران کا احوال ۔ اس شاہ کی عورتاں کا احوال
امت میں جو عورتاں تھے کامل ۔ تھا قرب خدا کا ان کو حاصل

(ص ۲۲۸ ب)

سب سے پہلے فاطمہ زہرا کی فضیلت ہے اس کے بعد دیگر صاحبزادیوں پھر ازواج اور اس کے بعد رابعہ بصری وغیرہ دیگر خواتین کا بیان ہے ۔

یہ مثنوی مصنف کے ابتدائی زمانے کی تالیف ہے کیونکہ انہوں نے اس قسم کے کام کی ابتدا ۱۱۴۰ھ میں کی ہے اور یہ تصنیف ۱۱۴۰ھ میں ہوئی ہے ۔

(۶) " رسالہ فرقہ ہائے اسلام " یہ بھی پیرس میں موجود ہے نمبر ۸۰۲ ۔ اس مثنوی کے اشعار تقریباً ۳۲۵ ہیں اس میں صرف فرقہ ہائے اسلام کا ذکر نہیں ہے بلکہ عقائد مثلاً اسما صفات رویت حسن و قبح عفو ۔ ایمان ۔ توبہ فاسق وغیرہ کا بیان بھی ہوا ہے ۔

پہلا شعر حسب ذیل ہے ۔

خدا کوں سزاوار حمد و ثنا ۔ کہ ہے گا مبرا ز نقص و فنا

آخر پر لکھتے ہیں :-

نہ تھا شان میرے کا یہ اقتضا ۔ کہ ہندی زباں کا کرے اصطفا
ولے بعض یاروں کا ایما ہوا ۔ سو ہندی زباں میں رسالہ ہوا

اس بات کا خیال رہے کہ مصنف نے اکثر جگہ اردو کے بجائے ہندی کا استعمال کیا ہے اس سے یہ خیال کرنا چاہئے کہ آج کل کی "ہندی" ہی نہیں بلکہ جنوبی ہند میں عام طور سے زمانہ حال تک اردو کو ہندی ہی سے موسوم کیا گیا ہے۔ باقر آگاہ کے بعد قاضی بدرالدولہ کی اردو تصنیفات میں بھی یہی لفظ استعمال کیا گیا ہے

(۷) "ہدایت نامہ" یہ بھی پیرس میں نمبر ۸۰۲ پر موجود ہے۔ اس مثنوی کے اشعار تقریباً ۲۵۰ ہیں اور اس میں گناہوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

پہلا شعر:۔

کروں آغاز حمد حق سوں اول　　　کہ تا نامہ ہووے یگی مکمل

کتاب کا نام بھی اشعار میں بیان ہوا ہے:۔

ہدایت نامہ یو پورا کیا میں　　　ہدایت خلق کوں پورا دیا میں

الٰہی یو ہدایت نامہ میرا　　　حقیقت میں سخن یو سب ہے تیرا

(ص ۱۰۴۳۰)

(۸) "معراج نامہ" پیرس میں ہے نمبر وہی ۸۰۲ اشعار کی تعداد ۱۵۴۵ ہے قدیم دکنی شعرا کی مثنویوں میں حمد و نعت کے بعد ضرور معراج کا عنوان قائم کیا جاتا تھا جس میں آنحضرت کے معراج کے حالات بیان کئے جاتے تھے۔ بعض شاعروں نے معراج کے متعلق علٰحدہ مستقل تصنیفیں کی ہیں جن کے منجملہ یہ بھی ایک ہے۔ پہلا شعر حسب ذیل ہے:۔

ثنا خدا کوں سزاوار ہے　　　ہر ایک ذرہ اس کا نمودار ہے

خاتمہ:۔

کیا ختم میں ذکر معراج کا　　　بنام محمد نبی مصطفٰے

کیا ختم میں نے محمد کا نام　　　علیہ الصلوٰۃ و علیہ السلام

کتاب کے آخر میں کاتب کا نام اور اشعار کی تعداد کی صراحت موجود ہے۔

"جملہ ابیات ایں کتاب یکہزار پانصد و پنج است از دست عاصی محمد زاہد در

باغ نواب والا جاہ"

(۹) "رسالہ عقائد" پیرس کے ۸۷۲ نمبر پر موجود ہے۔ اشعار کی تعداد تقریباً ۶۰۰ ہے۔ اس مثنوی میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے عقائد کا ذکر ہے جس کو خود مصنف نے بیان کردیا ہے:-

کیا میں اس لیے یہ نسخہ منظوم　　کہ تا ہر کسکوں ہوے جلدی سوں مفہوم
کیا ہوں میں بیان اس نظم اندر　　عقائد اہل سنت کا سراسر
کہا نہیں میں کبھی دکھنی میں اشعار　　منجی ہے شعر کہنے سوں بہت عار
ولی یو نظم بولیا بالضرورت　　پڑی تا اُس کو ہر امی و عورت

(ص ۲۲)

غالباً یہ بھی ابتدائی زمانے کی تصنیف ہو۔ سنہ تصنیف معلوم نہ ہو سکا۔

(۱۰) "مثنوی گلزار عشق (عرف قصہ رضوان شاہ و روح افزا) یہ مصنف کی معرکہ آرا تصنیف ہو۔ رسالہ اردو والے مضمون میں صراحت اس کے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کو تین علحدہ کتابوں سے موسوم کیا گیا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ تینوں نام ایک ہی مثنوی کے ہیں۔

اسکا ایک نسخہ آکسفورڈ کے بوڈلین لائبریری میں موجود ہے۔ کیٹلاگ میں اسکے متعلق حسب ذیل صراحت ہو۔

(۶۷۶۶۷) ایک مثنوی جو عشقیہ داستان رضوان شاہ و روح افزا ہے۔ مصنف مولوی محمد باقر جنہوں نے اس کو ۱۲۱۰ھ مطابق ۱۷۹۵ء میں لکھا ہو۔ ابتدا میں ایک دیباچہ ہو گارسان دو تاسی کی فہرست میں یہ مثنوی ہے اور کسی نے نہیں بیان کیا۔ ورق ۱۴۰ سطر ۱۱ تا ۱۴ سائز ۸×۵"

کتاب میں سب سے پہلے ۱۴ صفحے کا نثر میں دیباچہ ہے جو اپنے بیان کے لحاظ سے قابل قدر

ہے جس کی فہرست آگے آئے گی

مثنوی میں اول حمد ہے جس کے ۳۵ شعر ہیں اس کے بعد مناجات میں ۴۵ شعر، پھر نعت میں ۱۱۵ شعر، اس کے بعد معراج کے بیان میں ۸۹ شعر، اس میں منقبت بھی ہے پھر "عرض حال از رسول" کا عنوان آتا ہے جس میں ۱۰۲ شعر درج ہیں اس کے بعد محبوب سبحانی کی مدح میں ۹۰ شعر۔ امام حسین کی مدح میں ۳۲ شعر سبب تالیف کتاب اور اپنی ستایش میں ۱۹۳ شعر۔ اس کے بعد اصل قصہ کا آغاز ہے جس کے تقریبًا ۲۸۹۰ شعر ہیں قصہ کے ختم ہونے کے بعد خاتمہ کا عنوان ہے جس میں ۵۹ شعر ہیں اس طرح کل مثنوی تقریبًا ۳۵۸۱ شعر پر ختم ہوئی ہے۔

یہ مصنف کے آخری زمانے کی تصنیف ہے جو ۱۲۱۱ھ میں تصنیف ہوئی ہے اور انکا انتقال ۱۲۲۳ھ میں ہوا ہے۔

مصنف کلاگ کو اس کے سنہ کے متعلق کسی قدر غلط فہمی ہوئی ہے خود مصنف نے صاف طور پر عبارت کی تشریح کر دی ہے چنانچہ دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"الحال کہ تاریخ ہجرت با جاہ و جلال کے یک ہزار دو سو پر گیارہواں سال ہے
قصہ رضوان شاہ و روح افزا کا پسند کر کے اُسے نظم کیا"

جیسا کہ قبل ازیں ذکر کیا گیا ہے اس کتاب کا دیباچہ بھی خاص حیثیت رکھتا ہے جس میں پہلے حسب رواج حمد نعت وغیرہ کے بعد اس امر سے بحث کی گئی ہے کہ زبان کو خدا نے اپنی قدرت کی بڑی علامت قرار دی ہے اس کے بعد نصرتی کی تصنیفات پر بحث کرتے ہوئے شعرا عادل شاہی وغیرہ کے ذکر کے ساتھ اُردو کی ابتدا اور اس کی ترقی بتائی ہے چنانچہ لکھتے ہیں:-

"مقصود اس تمہید سے یہ ہے کہ اکثر جاہلان معنی اور ہرزہ درایاں لایعنی زبان دکنی پر اعتراض اور گلشن عشق۔ و علی نامہ کے پڑھنے سے اعتراض کرتے ہیں اور جہل مرکب سے نہیں جانتے کہ جب تک ریاست سلاطین دکن کے قائم تھے زبان انکی درمیان

اُسکے خوب رائج اور طعن شماتت سے سالم تھی اکثر شعرا دہاں کے مثل نشاطی ذوقی
شوقی، خوشنود، نورمی، ذوقی، ہاشمی، فضلی، بحری، نصرتی، بیتاب وغیرہم
کے بے حساب ہیں اپنی زبان میں قصائد و غزلیات و مثنویات و قطعات نظم کئے
اور داد سخنوری کا دئے لیکن نصرتی ملک الشعرا تنگ نظری سے مبرا ہے۔

جب شاہان ہند اس گلزار جنت نظیر کو تسخیر کئے طرز روزمرہ دکھنی نہج
محاورہ ہندی سے تبدیل پانے لگے تا آنکہ رفتہ رفتہ اس بات سے لوگوں کو شرم
آنے لگی اور ہندوستان مدت تک زبان ہندی کہ اُسے برج بھاکا بولتے ہیں
رواج رکھتی تھی اگرچہ لغت سنسکرت اُنکی اصل اصول اور مخرج فنون فروع و اصول
ہے پیچھے محاورہ برج میں الفاظ عربی و فارسی بتدریج داخل ہونے لگے اور اسلوب
خاص کو اُس کی کھونے لگے۔ سبب سے اس آمیزش کے یہ زبان ریختہ سے مسمی
ہوئی۔ جب ثنائی و ظہوری نظم و نثر فارسی میں باقی طرز جدید کے ہوئے ہیں۔
ولی گجراتی غزل ریختہ کی ایجاد میں سبھوں کا مبتدا اور اُستاد ہی بعد اُس کے
جو سخن سنجان ہند بروز کئے (؟) بے شبہ اس نہج کو اُس سے لئے اور من بعد
اس کو باسلوب خاص مخصوص کر دئے اور اُسے اردو کے بھاکے سے موسوم کئے
اب یہ محاورہ معتبر شہروں میں ہند کے جب شاہجہاں آباد و لکھنؤ و اکبرآباد وغیرہ
رواج پایا اور جو ان چاہی سبھوں کی من بھایا۔

اواخر عہد محمد شاہی سے اس عصر تک اس فن میں اکثر شاہیر شعرا عرصہ میں
آئی اور اقسام منظومات کو جلوے میں لائے ہیں مثل درد۔ مظہر۔ فغاں۔ دردمند
یقین۔ سوزاں۔ ابر۔ آرزو۔ سودا۔ تاباں وغیرہم لیکن ان سبھوں سے کوئی بھی
مثنوی مستعد (؟) بھی نہیں کیا فقط غزلیات و قصائد و قطعات پر اکتفا کیا۔ ہاں
اس عصر میں حسن دہلوی کا یک مثنوی مختصر لکھا دریافت اس کی بمنزلہ مصنف پر ہوتو

کو غزل کہنا مشکل ہے۔ برخلاف شعرائے دکن کے کہ اکثر مثنویات کہتے ہیں۔ بالاتفاق غزل بولنا بہت آسان ہے اور مثنوی کا کہنا دشوار و گراں ہے اس نے ملک شعرائے دکن بطور تعریض کہتا ہے سہ

دس پانچ بیتاں کہ بنئے شوقی اگر تو کیا ہوا　　　معلوم ہوتا شعر اگر کہتے تو دس بتاز ۹ کا

اس کے بعد وہ شعرا کے اقسام بتاتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں :-

" اور پوشیدہ نہ رہے بھائی کہ ان سب شعرا میں بعضے فقط شاعر ہیں اور بعضے شاعر کے ساتھ چاشنی عشق۔ عرفان میں بھی ماہر ہیں مثلاً مولنا شاہ ندیم اللہ ندیم تخلص و قاضی محمود بحری تخلص صاحب من لگن شعرائے دکن سے اور مرزا مظہر جان جاناں و خواجہ میر درد شعرائے ہند سے بعد ازیں مخفی نہ رہے تمام ریختہ گویوں میں سودا کو اعتبار نمایاں پایا "

اس بیان کے بعد سودا اور نصرتی سے بحث کی ہے اور انکا مقابلہ کیا ہے چنانچہ کہتے ہیں :-

" بعضے اس قدر اس کے باب میں دفتر افراق کا کھولتے ہیں کہ اس بیچارے کو سب شعرائے ریختہ گو بلکہ تمام ادبائے فارسی سے افضل و بہتر بولتے ہیں اور وہ عجب یہ ہے کہ ملک شعرا نصرتی کو نہیں مانتے اور قدر اس کے سر حلال کی نہیں جانتے بڑی دستاویز انکی یہ ہے کہ زبان اس کی کج مج ہے۔ نہ ہی دریافت و خوشا سخن فہمی و عجب ہے کیا نہیں جانتے کہ اتفاق سے شعرائے عرب و عجم و ہند کے معنی جان سخن آبدار اور لباس مستعار ہے ۰۰۰۰"

اس کے بعد گلشن عشق سے نصرتی کا کچھ کلام درج کر کے لکھتے ہیں:

" متعصب کو یک طرف رکھ کر سب کلیات سودا کو بغور ملاحظہ کر کر انتخاب کرے اور ان مضمونوں کو یک داستان گلشن عشق یا علی نامہ سے مقابلہ دیوے تا انداز

ہے اس کی اور اس کی پوری واقفیت ہو۔ سودا کو چھوڑ کر جن شعراء کو

گو جتنا چاہیے خواہ قصائد میں خواہ مثنوی میں کم سے کم نہیں لا سکتا۔ گلشن

بھی مہر و ماہ کی نائی فن طرازی عاقل خان رازی کی تنقیص قصہ مہر و ماہ کی نقل ہے گلشن

عشق سے موازنہ کر دیکھیے۔ مصنف مثل دکنی کے ہاتھ گلشن کو ترجیح کیا اور کہا خود یہ

کہتے ہیں ۔

کبھی نصرتی سخن کے یہ ولولہ ملا بعد مدت کے مجکو صلہ

کہا سودا کتیں انصاف سے کہ صنعت کرو مجکو آگاہ سے"

بیان بالا سے یہ بھی واضح ہوتا ہے آگاہ گلشن عشق کو مہر و ماہ کا ترجمہ نہیں خیال کرتے یہی راے میں نے اپنے ایک جداگانہ مضمون میں دی ہے۔ میرے بیان کی آگاہ کے قول سے تائید ہوتی ہے حالانکہ میں آگاہ کے اس بیان سے اس وقت لاعلم تھا۔

نصرتی کو سودا سے فوقیت دینے کے بعد وہ سودا کے کمال کے بھی انصاف کیا تم معترف ہیں چنانچہ کہتے ہیں :-

"باوجود ان سب مراتب کے ہم انصاف کرتے ہیں کہ مرزا رفیع سودا قصائد و غزل میں بجز سخن تراشی و مصاحب تلاش ہے محاورہ شستہ و صاف میں یگانہ زمانہ اور شوخی مزاج و رنگینی طبیعت میں ہر کہیں افسانہ پر افسوس کہ ہجو ہائے رکیک سے آشنا ہے اور از مدیح تمکین سے بیگانہ تھا۔"

اس کی صراحت کے بعد وہ اس امر کو بیان کرنے میں کہ گلشن عشق اور علی نامہ کو دیکھکر کسی مثنوی کے لکھنے کا شوق ہوا اور اس مثنوی کی ابتدا کی مگر چہ سو اشعار کے بعد دیگر تصنیفات میں مشغول ہو گئے۔ اس کے بعد اپنی کتابوں کی تفصیل دی ہے جن کا ذکر صفحات بالا میں ہو چکا ہے۔ اس دیباچہ میں بھی اپنے تخلص کی صراحت کی ہے اس کے بعد بتایا ہے کہ اس مثنوی کو دکھنی زبان کے بجائے شمالی ہند کی اردو میں لکھا گیا ہے اور پھر اس کی وجہ بتائی

ہے چنانچہ لکھتے ہیں :-

"ابیات اس کتاب کے تخمیناً چوبیس ہزار ہیں اس نے تکمیل قصہ عشق کی نہیں ہوئی الحال کہ تاریخ ہجرت با جاہ و جلال کے یکہزار دوسو پر گیا رواں سال ہے قصہ غزال شاہ و بدیع افزا کا پسند کر کر اُسے نظم کیا جب زبان قدیم دکنی اس سبب سے کہ آگے مرقوم ہوا اس عصر میں رائج نہیں ہے اُسے چھوڑ دیا اور محاورہ صاف و شستہ کو ترتیب روزمرہ اردو کی ہے اختیار کیا صرف اس بہا کے میں کہنے سے دو چیز مانع ہوئے اول یہ کہ تاثیر دلی یعنی دکن اس میں باقی ہے کیا واسطے کہ اجداد و پدری و مادری اس عاصی کے اور سب قوم اس کی بیجاپوری ہیں دوسرے یہ کہ بعض اوضاع اس محاورہ کے میرے دل میں بجاتے نہیں ازاں جملہ یہ کہ تذکیر و تانیث فعل نزدیک اہل دکن کے تابع فاعل ہو اگر یہ مذکر ہے تو وہ بھی مذکر ہے اور اگر مونث ہو تو مونث یہ قاعدہ موافق قاعدہ عربی کے ہو کہ سید النسا ہو اور قیاس صحیح بھی اس کی تائید کرتا ہے برخلاف محاورہ اردو کے کہ اس میں نسبت فعل کی مفعول کی طرف کر مذکر کو مونث اور مونث کو مذکر کرتے ہیں "

اس وضاحت سے امید ہے کہ دیباچہ گلزار کی حقیقت ظاہر ہو جائے۔ اب میں اصل مثنوی کی جانب متوجہ ہوتا ہوں۔

قبل ازیں اس کی صراحت ہو چکی ہے کہ مثنوی میں عنوانات قائم کئے گئے ہیں اور اس کے تحت بیان ہوا ہے۔ مگر عنوانات بھی گلشن عشق کی تقلید میں شعر میں لکھے گئے ہیں۔ مثلاً مناجات کا عنوان :-

غنچہ دل کی عرض حیرانی ۔۔۔ در حضور نسیم رحمانی

معراج کا عنوان ہے :-

ذکر معراج صاحب لولاک ۔۔۔ پائیں جس کے سیر کی تئیں افلاک

شیخ عبدالقادر جیلانی کی مدح کا عنوان :-

وصف محبوب بارگاہ قدم ۔ عرش سے برتر ہے جس کا قدم

اپنی تعریف کا عنوان :-

فخر یہ کا ہے اس میں کچھ ازار ۔ اور تعلیف کے سبب کا راز

اس میں کوئی شک نہیں شعرا خود ستائش میں حد سے بڑھ جاتے ہیں مگر پھر بھی ان سے ایک حد تک انکے کلام پر روشنی پڑتی ہے ۔ آگاہ اول اپنے عربی نظم و نثر کا فخر اس طرح کرتے ہیں :-

میری نظم دلکش کو وہ فیض ہے ۔ کہ اس سے ہوا امر القیس کا بے
ابو طیب اس خوف و ہیبت سے تھی ۔ کیا لکھو بہ لاف نبوت سستی
میری نثر میں ہوئی صابی صبی ۔ نظر آوے سحبان ابن قیس غبی
گر انشا کا بانی ہے عبد الحمید ۔ وہ لیں ہوں خاتم بوجہ سدید
اگر قاضی مصر ہوتا یہاں ۔ یہ دعوی او پر حکم کرتا عیاں
مجھے گر انشا میری تا رشید ۔ مقامات کی مہیج و تیار سید
اگر ابن عباد ہو وے حکم ۔ نہ مجھے مجھے بو محمد سے کم

اس کے بعد انہوں نے اپنی فارسی نظم اور اس کے جملہ اقسام میں اپنی مہارت کا ذکر اس طرح کیا ہے :-

نہ بیتا عرب میں مجھے ملدوگیر ۔ ہوں دیکھا جو ملک عجم کا اسیر
سنے شعر کا میری گر یک نوا ۔ تو کہتا او مجھے رودکی عز جبار
کہو گر قصائد تو انفل سے کہے ۔ کہ سلمان و ساجد ہو عرفی رہے
ثنائی کرے یوں ثنا گستری ۔ ہر اس بدر کے پاس کیا انوری
غزل میں اگر دیں رقعت کا داد ۔ تو حافظ پڑھے بیت اللہ کیا داد

نہ جنبش ہے ہمت میں ہے نہ تلاش | حسن اور خسرو کہیں بات طوطی
کہیں مثنوی گر کہے سہل گوہ | نظامی و سعدی کہیں واہ واہ
کہوں گر بحار رفت کہیں جامی جام | ہوا پھر کے گردش میں جامی کا جام
کہوں تم اگر قطعہ ہائے حسین | پڑی رشک میں جان ابن یمین
کہوں گر سعدی تو کہا پیچ و تاب | سحابی کی آنکھیں ہوں مثل سحاب
بہ غزل و تشبیب و ترجیع بند | میری فکر ہے مستزاد و بلند
میرا نثر وہ چشمہ صاف ہے | عیاں جس میں اوصاف و صاف ہے
عبارت ہے میری وہ رنگیں بہار | کہ جان ریاض آس ہو ہے خار خار

اپنے دکھنی اور اردو شاعری پر فخریہ کہتے ہیں:-

ہو دکھنی میں مجکو مہارت یتی | کہ النصر مسلم کہے نصرتی
گر اردو کی بہار کے میں کھولوں زباں | تو سودا کا سب سود ہووے زیاں

وہ اپنے علم و فن کا ذکر کرتے ہوئے فلسفہ سے ناواقف ہونے کا صاف طور سے اظہار کرتے ہیں مثلاً۔

غرض در علوم فروع اُصول | خدا کی عنایت سے ہوں با حصول
نہیں فلسفہ کا سبب کچھ بھی پاس | وگرنہ وہ کیا چیز ہے میرے پاس

آگاہ اگرچہ مدراس کی ریاست میں صاحب عزت اور مرتبہ تھے مگر معلوم ہوتا ہے عام طور سے لوگ علم کے قدر دان نہیں تھے چنانچہ آگاہ نے اس کا گلہ کرتے ہوئے زمانے کی حالت کو بیان کیا ہے:-

بہت کچھ ہے لیکن کروں کیا علاج | نہ اس دور میں ہے ہنر کا رواج

مزید تفاخر کے بعد کہتے ہیں:-

ہے اب ہزل اور مسخرے کو قبول | ہنر ہے پتھر اور فضلت فضول

تفاخر میں انذال ہیں جا بجا ۔۔۔ نجابت میں اشراف ہیں مبتلا
جہاں تک جو نوع مسلمان ہیں ۔۔۔ تو تکلیف و محنت سے حیران ہیں
سب ہی ہات سو غم کے پامال ہیں ۔۔۔ اراذل جہان میں ہیں بامال ہیں
پہ اہل نجابت او پر قہر ہے ۔۔۔ حیات انکی تمی سو جلد زہر ہے
کرے کوئی اس وقت کیا فکر شعر ۔۔۔ کہ بد تر ہے دشنام سے ذکر شعر
کرے کوئی کیوں عزم تصنیف کا ۔۔۔ ہو کس طرح سے شوق تالیف کا

آگاہ نے مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کی تصنیف پر اعتراض کئے تھے جس سو خیال ہوتا ہے دونوں میں صفائی نہ ہو گی مگر آگاہ اپنے دوستوں کے ذکر میں نہایت خلوص کے ساتھ انکا ذکر کرتے ہیں ۔

جیسا راز دان خفی و جلی ۔۔۔ ندیم سخن میر امداد علی (؟)
سیادت کی میزان کا حرف صحیح ۔۔۔ نجابت کے انشاء کا لفظ فصیح
زہی سرو موزون باغ سخن ۔۔۔ حسینی نسب بلگرامی وطن
ہو اہل سخن سے اسے اتحاد ۔۔۔ میرے سات الفت ہو اسکی زیاد
دگر دوست میرا ہے عبد السلام ۔۔۔ مروت میں کامل وفا میں تمام

اصل قصہ فارسی زبان میں ہے اس کو آگاہ سے بہت پہلے [illegible]ھ میں فائز نے دکھنی نظم میں منظوم کیا ہے ۔ آگاہ اس سے واقف ہیں اور اس دکھنی قصہ کو مکمل تصور نہیں کرتے

لکھے ہیں اسے فارسی نثر میں ۔۔۔ یہ مجمل وہ نہیں رائج اس عصر میں
کیا نظم دکھنی میں فائز اسے ۔۔۔ سخن میں نہ تھی راہ ہرگز اسے
نہیں شعر کا برگ و ساز اس میں کچھ ۔۔۔ نہ مضمون تلاشی کا باز اس میں کچھ
مضامیں ہیں اس کے پر بے اثر ۔۔۔ ہیں الفاظ سب اس کے زیر و زبر

جو تھا عقل اور نقل سے وہاں شتاب — کیا ہوں میں انصاف سے اسکو صاف
جہاں اک یہی ایجاز سے تھا غلل — کیا اس کو اطناب سے میں بدل
جہاں عشق کے جوش کا ہے مکاں — کیا ہوں وہاں اسکا پورا بیاں
نکات حقیقی عرفاں کے لایا ہوں میں — مجازی میں اس کو چھپایا ہوں میں
کیا نام میں اسکا گلزار عشق — کہ گل جوش ہیں اس سے اسرار عشق

اصل قصہ کا لب لباب اس طرح ہے :-

چین کے بادشاہ کا لڑکا رضوان شاہ علم و ہنر میں سرآمد روزگار تھا۔ باپ کے انتقال پر سلطنت کا مالک بنا ایک دن شکار کو روانہ ہوا۔ اور ہرن کا تعاقب کیا مگر ہرن ایک چشمہ میں غائب ہوگیا۔ رضوان شاہ نے اس ہرن پر فریفتہ ہوکر خود غوطہ لگانا چاہا مگر ارکان سلطنت مانع ہوئے۔ نجومی اور رمال اسکا سراغ لگانے کا وعدہ کرکے بادشاہ کو واپس لائے۔ رضوان شاہ ہرن کے عشق سے از خود رفتہ ہوگیا آخر کار اس چشمہ پر ایک محل تعمیر کرکے رہنے لگا روز محل روشنی سے جگمگا جاتا اور عطر و گلاب کی خوشبو سے معطر ہوا کرتا ایک رات روح افزا پری اس چشمہ سے باہر آئی دونوں کا وصال ہوا مگر جدائی ہوگئی اور ایک زمانے تک فراق میں بسر ہوئی مصیبتوں میں گرفتار ہوئے اور پھر ایک مدت کے بعد دونوں کی شادی ہوئی اور اس طرح بامراد چین کو واپس ہوئے۔

اب مختلف مقامات سے مثنوی کا انتخاب[1] پیش کیا جاتا ہے۔ قصہ کی ابتدا :-

محبت کے گلزار کا باغباں — جو تھا اس کے اخبار سے گل فشاں
ہلا اپنے خامہ کے شاخ نول — جھوایا یہ قصہ کا او تار پھل
کہ تھا ملک میں چین کے ایک شاہ — تھا حکم اسکا ماہی سے تا ماہ

---

(۱) انتخاب میں میں نے کوئی خاص بات مد نظر نہیں رکھی ہے بلکہ یوں ہی کچھ نمونہ دیا گیا ہے۔

رضوان شاہ کی تعلیم و تربیت کا بیان :-

بالجملہ ہر علم کے تو استاد | کئے اُس کی تعلیم کو واں نہاد
کئے اُس کو جوں چاہئے وہ تربیت | ہوئے پوری تا اُسکے تئیں معرفت
طبیعی الٰہی میں فاضل ہوا | ریاضی سے کہ ہر فن میں کامل ہوا
ہوا ہیئت و ہندسہ میں خبیر | حساب و مساحت میں تھا بے نظیر
ہوا موسیقی میں وہ یوں اوستاد | کہ نہ ہرہ کرے اس سوا اس فن کو یاد

رضوان شاہ کی بے قراری :-

ہوا رنج ضائع میرا سال کا | عجب ہی کہا ما مرے حال کا
میرا سینہ حسرت سے ناشاد ہے | گنہ لازم ور نج برباد ہے
نہ اب جان نہ جاناں میری بات میں | مجھے بخت ڈالے ہیں کس گھات میں
کہاں سے گیا کھیلنے میں شکار | کہاں ہے وہ ہرنی کئے واں کنار
میں کیا کیا نہانگ و ناموس کھو | برمن ایک سک شکل او دوا من ہو

کشتی میں سوار ہو کر تلاش میں روانہ ہونا :-

بہر حال وہ دو تو ہو کشتی سوار | چلے تن بہ تقدیر بے اختیار
اوپر انکے تھا نیلگوں آسماں | تلے انکے دریائے وہ بلا گراں
ہو دونوں بھی جینے سے اپنے ملول | گئے یک قلم اپنی ہستی کو بھول
کئے قطع اس طرح کئی روز جب | سما یا کھڑا ایک ادنیٰ عجب
نمایاں ہوئی رات کو یک نہنگ | اوڑھے کوہ کا جس کے منہ پہ رنگ

رضوان شاہ روح کو نامہ تحریر کرتا ہے :-

میں یکسر جزی کالعدم اے صنم | سہا ہوں تیرے غم سے کیا کیا ستم

کلا تیرا کہاں ہو گئت وہ جلال ‌ ‌ ‌ سکے مجکو دائم بلا سے سنبھال
تو دیوسے پہنچے تجھے کچھ بھی غم ‌ ‌ ‌ سلم رکھے دل تیرا از الم
تیرے عشق پہ جو انس جو جو آزار ہے ‌ ‌ ‌ میری جان پر اُسکا سب بار ہے
پڑی ہے ترے پاؤں میں بیڑی تجھے ‌ ‌ ‌ میرا دم ہوا پاؤں بیڑی مجھے
نکل جاکے چھڑ لی میری زنجیر اب ‌ ‌ ‌ کروں کیا میں اس غم کی تدبیر اب

رضوان شاہ کے متعلق دیو نے اظہار واقعہ :-

محبت میں کیا کیا مصیبت سہا ‌ ‌ ‌ عجب ہر کر اب تک وہ جیتا رہا
اگرچہ ضمیر اسکا ہے گا از خاک ‌ ‌ ‌ ولے آتشی سے ہوا جل کے راک
تیری شاہزادی کہ ہے شہ پری ‌ ‌ ‌ ادسے داغ سے غم کے بریاں کری
کبھو وحش صحرا کی فوجوں میں پھر ‌ ‌ ‌ کبھو جوش دریا کی موجوں میں پھر
بہرحال پہنچا ہے اب وہ یہاں ‌ ‌ ‌ بلا کی سے مجکو دیا ہے اماں
تو جو ہو سکے تجھ سے تدبیر کر ‌ ‌ ‌ اعانت میں اُس کی نہ تقصیر کر
وے احوال خبر اس کے محبوب کی ‌ ‌ ‌ سپس فکر کر اس کے مطلوب کی

رضوان شاہ کامیاب ہوکر وطن کو واپس ہوتا ہے :-

خبر شہر میں یوں پہنچتی ہے تب ‌ ‌ ‌ بنی لیکے رضوان آتا ہے اب
یہ سنکر وہ سب جب مشتاق دکبار ‌ ‌ ‌ چلے اب ہیں سب دوڑ دریا کنار

بصد شان و شوکت کے انکو لئے ‌ ‌ ‌ تھے چھوٹے بڑے جو محل میں ملے

ملاقات کتا جو ہیں لکھتے ہیں :-

اگر دیکھے اس نظم کو طمطراق ‌ ‌ ‌ تپ دق سے سودا کو ہو احتراق
مجھے تعریف شاعر ہے گفتگو ‌ ‌ ‌ اُسے کیا ہے طاقت کہ ہو روبرو

اگر چاہو سے چالیس میں یہ نور تن　　ملک اس کو اپنا کرے بن وطن

جو دل عشق کی شمع کا ہے لگن　　یہ نسخے کو اپنا کرے بیچ من لگن

جو ہے شوق شغل اور شور عزام　　نشاطی ہو اس پھول کا وہ مدام

نکرتا ہوں ہرگز مباہات میں　　کہاں یہ ریاست یہ شاہ بیت میں

اگر شعر کے فن میں ماہر ہے تو　　یہی عشق اور عرفاں میں ماہر ہو تو

یہی ہے انکا بھید میں تجکو راہ　　کبت اور دوہرت میں یہ دستگاہ

تو باور کرے گا تو یہ حرف صاف　　وگرنہ کہیگا ہے لاف و گزاف

تھے جب یکہزار اور نو کم دو سو　　بنا اسکا دیباچہ ایسے گم رد

گذر گئے ہیں جب اسپر بیس سال　　ہوا بدر کامل یہ زیبا ہلال

کیا اس کی بیتوں کو جب میں عدد　　ہوئے سہ ہزار اور پانسو نود

بھی محبوب سبحاں کے اوپر سدا
محب جس کے رہنگے تمام اصفیا

اگرچہ ان اشعار سے سنہ تصنیف ۱۱۹۱ھ ہوتا ہے ممکن ہے مثنوی کا اختتام اس سنہ میں نہ ہوا ہو کیونکہ دیباچہ جو نثر میں لکھا گیا۔ اسمیں صراحت سے ۱۲۱۱ھ کا ذکر ہے۔

آگاہ کی تصنیفات پر آجکل کے نقطۂ نظر سے غور نہ کرنا چاہئے۔ ڈیڑھ سو سال پیشتر کا ماحول آج کل کے ماحول کے مطابق نہیں ہو سکتا۔ آگاہ نے جس زمانے میں اپنی تصنیفات شروع کیں اسوقت ہندوستان میں طوائف الملوکی پھیل گئی تھی کلایو اور وارن ہسٹنگز کا دور دورہ تھا مغلیہ خاندان پر زوال آچکا تھا اور اس کا چراغ گل ہو رہا تھا اہل قلم دنیا سے گزر رہے تھے اور انکی جگہ پر کرنے والا نظر نہ آتا تھا۔ سلطنت کی زبان فارسی باقی نہ رہی تھی اس لئے اس کے جاننے والوں کا کال ہو رہا تھا۔ ملک کی عام زبان بھی فارسی تھی اس کے بجائے عام طور سے اردو کا رواج ہو رہا تھا مگر تعلیم اردو میں علم و فن کا ذخیرہ نہ تھا بلکہ نایاب تھا۔ شمالی میں صرف غزل نویسی کا زور

تھا جب ہی تحریروں کا رواج تھا مگر اس میں بھی علمی مواد بہت کم تھا۔
ولی۔۔۔ مولانا الطاف حسین حالی نے اردو کی سرپرستی کی جانب توجہ نہیں ہوئے تھے بلکہ کے
زیر اثر کی تصنیفات شائع ہوئی تھیں اور شاہ عبدالقادر نے قرآن کی تفسیر بلند کی تھی
مگر تعلیم کی کمی تھی خصوصاً عورتوں کی تعلیم کا دروازہ بالکل بند تھا اور یہ ناممکن تھا کہ فارسی
میں اور دینی علوم دونوں ہی کی تعلیم حاصل کر سکیں۔ اس نقص کے باعث سوسائٹی کو سخت
نقصان پہنچ رہا تھا اور حالت   سے بدتر ہوتی جا رہی تھی
اس نقص کو معلوم کر لینے والا۔ اس مرض کو دریافت کرنے والا۔ اس کے علاج پر کمر ہمت
باندھنے والا۔ اور اپنی تصنیفات سے اس کا علاج کرنے والا آگاہ اور صرف آگاہ ہے۔
آگاہ وہ پہلا شخص ہے جس نے ہندوستان کے مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تعلیم کو
ضروری تصور کیا اور انکے لئے خاص کتابیں لکھیں۔ آگاہ نے اپنی تصنیفات میں صاف طور
سے اس امر کی صراحت کی ہے کہ انکا مقصد خاص طور سے صنف لطیف کی بہبودی ہے۔ دیباچہ
ہشت بہشت میں لکھتے ہیں :-

"بعض علما متاخرین نے خلاصہ عربی کتابوں کا نکال کر فارسی میں لکھے ہیں تا وہ لوگ
جو عربی پڑھ نہیں سکتے ہیں ان سے فائدہ پاویں لیکن اکثر ہندوستان اور تمام اہل
فارسی سے بھی واقف نہیں اس لئے یہ عاصی مطلب قسم اول کا بہت اختصار کے ساتھ
لکھ کر دکھنی رسالوں میں ہوا ہے"

اسی کتاب میں بیان کرتے ہیں :-

"دکھنی میں کہا ہوں اس تے میں — تا ہووے فیض عوام کے تیں
تا سر بسر اسماں ہور عورات — پڑھنے ستی اسکی پاویں لذات"

رسالہ عقائد میں لکھتے ہیں :-

"وسلے یو نظم بولیا بالضرورت — پڑھے تا اسکو ہر امی و عورت"

[illegible]

آگاہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اردو زبان میں سیرت نبوی پر متعدد کتابیں تصنیف کیں اور ان کو خاص طور سے عورتوں کی تعلیم کے لئے مرتب کیا۔

آگاہ کے زمانے میں مبالغہ اور جوش عقیدت کو کلام کا خاص زیور سمجھا جاتا تھا جو کتابیں مولود وغیرہ پر لکھی گئی تھیں وہ صداقت سے دور تھیں ان کے برخلاف آگاہ نے دروغ گوئی اور مبالغہ سے پرہیز کیا اور پھر عام طور سے اس وقت کی عام فہم اور سلیس زبان میں اپنے مافی الضمیر کو ادا کیا۔

آگاہ نے آنحضرت کی لائف میں اس امر کا خاص لحاظ رکھا ہے کہ آپ کے بہترین اخلاق اور پاکیزہ سیرت کو صداقت کے ساتھ پیش کیا جائے اور بعض بعد کے مصنفین کی طرح معرکہ آرائی اور جنگ کو پیش نہیں کیا۔ آگاہ اس امر سے بخوبی واقف تھا کہ آنحضرت کی مبارک زندگی میں اخلاق اور عادات ہی امت کے لئے چراغ ہدایت ہیں اور ان کی پیروی صراط مستقیم پر گامزن کرا سکتی ہے۔

آگاہ آج دنیا میں موجود نہیں ہے اس کی تصنیفات ہندوستان سے معدوم ہو چکی ہیں مگر جب تک زبان اردو قائم ہے اس کے محسنوں کی پہلی صف میں آگاہ کو جگہ دی جائیگی اور اس کے کارنامے گو پوشیدہ ہیں مگر فراموش نہیں ہو سکتے۔

ادبیات ایران کی روشنی میں

سلطان محمود غزنوی کا وظیفہ

(سلسلہ گذشتہ)

ایک عیسائی مورخ نے منتشر اجزا پر تم جمع کئے اور پرانی روایتوں کی مدد سے ان منتشر اجزا کو ترتیب دیکر ایک مکمل کتاب تیار کرائی۔ مولانا شبلی نے اس کی تردید میں متعدد دلائل سے اس امر کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ درحقیقت شاہنامہ کا ماخذ وہی عربی تراجم ہیں۔

اگرچہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شاہنامہ ایک تاریخی نظم ہے اور فردوسی کا ان داستانوں کے نظم کرنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ ایران کی قدیم تاریخ کے منتشر اوراق یکجا ہو جائیں اور ایرانیوں کو بھی عربوں کے مقابلہ میں اپنے اسلاف کے کارناموں پر فخر کرنے کا موقع ملے لیکن ان قصوں میں اس قدر تخیل آرائی اور مبالغہ سے کام لیا گیا ہے اور ایسے دور از کار افسانے اس میں درج ہیں کہ بعض اوقات یہ قصے بھی الف لیلہ کے قصے معلوم ہوتے ہیں۔ اسی لئے اس کی تاریخی وقعت و اہمیت اہل نظر کی نگاہوں سے گر جاتی ہے لیکن یہ بھی مشکل یہ ہے کہ ایران کی تاریخ کا جو کچھ سرمایہ ہے وہ بھی اس سے زیادہ صحیح تاریخ مل بھی نہیں سکتی۔ سر جان مالکم تاریخ ایران میں لکھتے ہیں :-

"کتاب فردوسی اگرچہ افسانہ و خیالات شاعری بسیار دارد لکن تقریباً جمیع اخبار سے کہ در تاریخ قدیم ایران در تواریخ دیگر ملکے پیدا یافت می شود در آن مندرج است"

ایک بڑی وجہ اس کی بے اعتباری کی یہی بتلائی جاتی ہے کہ اس میں فرضی افسانے اور دور از کار قصے شامل ہیں۔ لیکن فردوسی نے جن کتابوں کو اپنا ماخذ بنایا ہے وہ ابتدائی عہد کی لکھی ہوئی ہیں اور سب ہر قوم کے ابتدائی عہد کی تاریخوں میں اسی قسم کے وہمی و خیالی افسانے پائے جاتے ہیں

علاوہ بریں فردوسی نے جن ماخذوں کی مدد سے یہ کتاب تیار کی ہوگی ان میں [illegible]

ہے۔ فردوسی نے [illegible] نقل کر دیا ہے

مستشرقین نے [illegible] کے بعد ذکر کیا ہے۔ ان میں سے بعض شائع بھی ہو چکی ہیں۔ شائع شدہ کتابوں میں کیخسرو شاہان ایران کی تاریخ سے متعلق تھی جیسا غالباً فردوسی کا ماخذ بھی یہی کتابیں رہی تھیں۔ ان تاریخوں اور فردوسی کے بیان میں معمولی فرق ہے یہاں تک ارد شیر جو کچھ قبل اسلام کی تاریخ ہے اور پہلوی زبان میں ہے جرمن ترجمے کے ساتھ شائع ہو چکی ہے مولانا شبلی نے اس کے متعلق پروفیسر براؤن کا حسب ذیل بیان نقل کیا ہے۔

"اس کتاب کا شاہنامہ سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی نے کس قدر ایمانداری برتی ہے اور نظم میں اس کی صحت پر [illegible] ہے اس نے شاہنامہ لکھا ہے۔ ان سے ترتیب وار مطابقت پائی جاتی ہے"(۱)

غرضکہ مستشرقین نے اس امر کا پورے طور پر اعتراف کیا ہے کہ فردوسی نے جو کچھ لکھا ہے وہ قدیم ایرانی تاریخوں سے حرف بحرف مطابق ہے۔ خود فردوسی کو اپنی ذمہ داری کا اس قدر خیال ہے کہ وہ ماخذ کا بیان کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہے"(۲)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شاہنامہ قدیم ایران کا [illegible] ہے۔ وہ صرف ایک رزمیہ مثنوی ہی نہیں ہے بلکہ آپ اس سے اس زمانے کی تہذیب و تمدن کا بھی پتہ لگا سکتے ہیں۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں۔

"شاہنامہ اگرچہ بظاہر صرف رزمیہ نظم معلوم ہوتی ہے لیکن تمام واقعات کے بیان میں اس تفصیل سے ہر قسم کے حالات آ جاتے ہیں کہ اگر کوئی شخص چاہے تو صرف شاہنامہ

---

(۱) شعر العجم حصہ اول (۲) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو شعر العجم حصہ اول

کی مدد سے اس زمانے کی تہذیب [illegible] جا سکتا ہے

بادشاہ کیونکر دربار کرتا تھا۔ امرا کس ترتیب سے کھڑے ہوتے تھے عرض و معروض کے کیا آداب تھے۔ انعام و اکرام کا کیا طریقہ تھا۔ بادشاہ اور امرا کا درباری لباس کیا ہوتا تھا۔ فرامین اور توقیعات کیونکر اور کس چیز پر لکھے جاتے تھے۔ نامہ پیام کا کیا انداز تھا۔ مجرموں کو کیونکر سزائیں دیجاتی تھیں بادشاہی احکام پر کیونکر نکتہ چینی کیجاتی تھی وغیرہ وغیرہ "

" شادیوں کے کیا مراسم تھے۔ جہیز میں کیا دیا جاتا تھا۔ عروسی کی کیا کیا رسمیں تھیں دولہا دلہن کا کیا لباس ہوتا تھا۔ پیش خدمت غلام اور لونڈیوں کی وضع اور انداز کیا تھا "

" خط و کتابت کا کیا طریقہ تھا، کس چیز سے ابتدا کرتے تھے۔ خاتمہ کی کیا عبارت ہوتی تھی، خطوط کس چیز پر لکھے جاتے تھے۔ ان کو کیونکر بند کرتے تھے۔ کس چیز کی مہر لگاتے تھے "

" مالگذاری کے ادا کرنے کا کیا دستور تھا۔ زمینوں کی کیا تقسیم تھی مالگذاری کی مختلف قسمیں کیا تھیں ٹیکس کیا کیا تھے۔ کون کون لوگ ٹیکس سے معاف ہوتے تھے "(۱)

مولانا نے اس سلسلہ میں بہت سی مثالیں بھی پیش کی ہیں لیکن مضمون اس قدر تفصیل کا متحمل نہیں ہو سکتا اس لئے ہم نظرانداز کرتے ہیں۔

شاعری کی حیثیت سے بھی شاہنامہ کا جو مرتبہ ہے اس پر حرف رکھنے کی گنجائش نہیں۔ مولانا شبلی نے شعرالعجم کے پہلے اور چوتھے حصے میں فردوسی کی خصوصیات شاعری پر مفصل بحث کی ہے نظامی کے تذکرہ میں انہوں نے فردوسی اور نظامی کا موازنہ بھی کیا ہے اور اس میں اگرچہ انہوں نے

---

(۱) [illegible] ۱۴۶

نظامی کو اکثر مقامات پر ترجیح دی ہے لیکن آخر میں انہیں لکھنا پڑا ہے کہ

"ان سب باتوں پر بھی فردوسی کا [illegible]

عنصری

محمود کے دربار کا یہی نامور شاعر ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ سلطان محمود کو [illegible] اسی کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ دولت شاہ اس کے متعلق لکھتا ہے

"مناقب و بزرگواری او اظہر من الشمس است و سرآمد شعرائے روزگار سلطان محمود بودہ و اورا بیرون از شاعری فضائل است بعضے اوصاف نوشتہ اند"(۲)

حسن بن احمد نام ابوالقاسم کنیت اور عنصری تخلص ہے۔ بلخ اصلی وطن ہے ابتدا میں مروجہ علوم و فنون حاصل کئے لیکن شاعری کا ذوق سب پر غالب آگیا۔ اس نے اسی فن کو اپنے لئے منتخب کیا اور اس قدر ترقی کی کہ سلطان محمود کی ندیمی کا منصب ملا۔

"اورا در مجلس سلطان منصب ندیمی با شاعری ضم بودہ و پیوستہ"

سلطان محمود کے دربار میں چار سو شاعر تھے اور عنصری کی حیثیت ان سب سے بلند تر تھی وہ گویا انکا افسر اور استاد تھا(۳) محمود نے اسے ملک الشعرا کا خطاب عطا فرمایا تھا اور تمام شعرا کو حکم تھا کہ پہلے اپنا کلام اصلاح کی غرض سے عنصری کو دکھائیں بعد کو بارگاہ سلطانی میں پیش کریں۔ ان کے انہیں اعلیٰ مناصب کی وجہ سے اکثر بڑے بڑے شعرا نے انکی شان میں قصیدے کہے ہیں۔ وہ خود بھی شاعروں کا قدر دان تھا اور ہر طریقے سے انکی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ دولت و ثروت کا

---

(۱) شعر العجم حصہ اول صفحہ ۱۰۶

(۲) تذکرہ دولت شاہ سمرقندی صفحہ ۴۴

(۳) " " "

[illegible] عنصری بھی کہ غلام ہر کاب میں چلتے تھے۔ اس کی شاعری کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا [illegible] کہ وہ عنصری شعرا کا افسر تھا اور دیگر شعرا کے قصائد سلطان کی خدمت میں پیش [illegible] پیشتر اس کو دکھائے جاتے تھے اس کے دیوان میں تیس ہزار اشعار تھے۔ دولت شاہ لکھتا ہے:

"دیوان استاد عنصری قریب سی ہزار بیت است مجموع آں اشعار مصنوع و معارف و توحید و مثنوی و مقطعات"(۱)

مگر اب صرف تین ہزار شعر باقی ہیں اس وقت شعرا کی طبائع کا رجحان زیادہ تر قصائد کی جانب تھا لیکن جیسا کہ مندرجہ اقتباس سے معلوم ہوتا ہے اس کی شاعری صرف قصائد تک محدود نہ تھی بلکہ اس میں قطعات و مثنویاں وغیرہ سبھی شامل تھیں اس نے متعدد مثنویاں بھی لکھی تھیں جو اب ناپید ہیں۔ بدیہہ گوئی شاعری کا لازمی جزو سمجھا جاتا تھا شاہی درباروں میں درخور حاصل کرنے کے لئے بدیہہ گوئی میں کمال پیدا کرنا ناگزیر تھا۔ عنصری اس وصف میں سب سے آگے تھا۔ مولانا شبلی نے عنصری کی بدیہہ گوئی کے متعدد واقعات لکھے ہیں(۲) اس کی طبیعت

---

(۱) تذکرۃ الشعراء دولت شاہ سمرقندی صفحہ ۴۶

(۲) شعر العجم حصہ اول صفحہ ۱۰۳ نظامی عروضی نے بھی عنصری کی بدیہہ گوئی کا ایک واقعہ لکھا ہے یہ محمود والا واقعہ [illegible] لکھتا ہے ایک رات محمود نے شراب بہت پی لی اسی حالت بدمستی میں ایاز کی طرف دیکھا تو ایاز کی پیچ و تاب زلفیں دیکھ کر بے قرار ہو گیا اور والہانہ اس کی طرف بڑھا لیکن ایک [illegible] حالت سنبھل گئی اور تقویٰ کا جوش بدمستی پر غالب آ گیا۔ فوراً ہی ایاز کی طرف [illegible] کا حکم دیا۔ اسی حالت میں خوابگاہ کو چلا گیا صبح کو اٹھا تو ایاز کی یہ حالت دیکھ کر بہت [illegible] پر نادم و پشیمان تھا اور بے قراری میں اٹھ اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا۔ درباریوں میں [illegible] کی مخالفت کرتا آخر صاحب علی قریب کے حکم سے عنصری اس کی خدمت میں حاضر

کا رجحان زیادہ تر قصیدہ گوئی کی جانب تھا۔ قصیدہ میں اس نے لب تک غزل یا تشبیب کی ہے [illegible] قصائد میں اس نے اپنا زور صرف ممدوح کی مبالغہ آمیز تعریفوں ہی پر صرف نہیں کیا بلکہ اکثر قصیدوں میں سلطان کی لڑائیوں کے واقعات بھی لکھے ہیں۔ ایک قصیدہ میں شروع سے آخر تک دو دو چیزوں کا مقابلہ کیا ہے ایک دوسرا قصیدہ سوال و جواب سے شروع کیا ہے اور آخر تک اسے نباہا ہے (۱)

فرخی

علی نام[۲] ابوالحسن کنیت فرخی تخلص سیستان وطن (تذکرۃ الشعرا میں ترمذی لکھا ہے) باپ کا نام جولوغ یا قلوغ۔ نہایت نیک، سلیم الطبع اور ذہین تھا۔ شاعری میں خاصی مہارت پیدا کر لی تھی۔ چنگ بجانے میں کمال پیدا کیا تھا۔ سیستان کے ایک دہقان کا ملازم تھا۔ دو سو کیل

تھا۔ سلطان نے کہا میں تیرے ہی انتظار میں تھا تجھے معلوم ہے کہ کیا واقعہ ہو گیا ہے کچھ ایسے شعر کہہ جو حسب حال ہوں۔ عنصری نے برجستہ کہا

کے عیب سر زلف بت از کاستن است | چہ جائے بغم نشستن و خاستن است
جائے طرب و نشاط و مے خواستن است | کا راستن سرو ز پیراستن است

سلطان یہ اشعار سن کر بے انتہا خوش ہوا اور حکم دیا کہ تین مرتبہ عنصری کا منہ جواہرات سے بھر دیا جائے۔ (چہار مقالہ صفحہ ۳۵) یہ واقعہ شعر العجم میں بھی کم و بیش اسی طرح مذکور ہے لیکن مولانا نے چہار مقالہ کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ اس میں بجائے منہ کے دامن ہے لیکن درحقیقت غالباً کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے۔ چہار مقالہ کا جو نسخہ اس وقت ہمارے پیش نظر ہے اس میں بجائے "دامان" کے "دہان" ہی لکھا ہے۔

(۱) تفصیل کے لئے شعر العجم حصہ اول تذکرہ دولت شاہ سمرقندی صفحہ ۴۵ و ۴۶ [illegible]
(۲) فرخی کے ابتدائی حالات لکھتے وقت ہم نے چہار مقالہ اور شعر العجم دونوں کو پیش نظر رکھا [illegible] بھی ابتدائی حالات تاحد چہار مقالہ سے ماخوذ کئے ہیں۔

[illegible] معاوضہ مقرر تھا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد ایک امیر عورت سے شادی کی جس کی [illegible] میں [illegible] ہوئی اور موجودہ آمدنی ناکافی ہونے لگی فرخی نے زمیندار سے مقررہ معاوضہ میں اضافہ کی درخواست کی۔ زمیندار نے معذوری کا اظہار کیا اس سے فرخی کو بہت مایوسی ہوئی اور اب وہ اس تلاش میں رہنے لگا کہ کسی امیر کے دربار تک رسائی ہو جائے تاکہ اس کی موجودہ مشکلات کے حل ہونے کی کوئی صورت نکل آئے لوگوں نے اسے بتلایا کہ امیر ابو المظفر چغانی بہت بڑا سخن سنج اور قدر دان علم و فن ہے۔ شعرا کی جماعت کو بیش قرار انعامات اور عطیے دیتا ہے اور معاصر امراء میں اس بارے میں اسکا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ سنکر اس نے ایک قصیدہ کہا جسکا پہلا شعر یہ ہے۔

با کاروان حلہ برفتم ز سیستان با حلہ تنیدہ ز دل بافتہ ز جاں

اور بلخ کی جانب روانہ ہو گیا جہاں ابو المظفر محمود کی جانب سے گورنر تھا۔ اسے گھوڑوں سے بہت شوق تھا۔ اس کے چراگاہ میں اٹھارہ ہزار گھوڑیاں اور بچھیرے تھے ہر سال وہ انکا جائزہ لیتا تھا اور داغ کرتا تھا۔ فرخی جس وقت بلخ پہنچا تو معلوم ہوا کہ امیر "داغگاہ" میں ہے اتفاقاً عمار کا عمید اسعد بھی وہیں موجود تھا فرخی اس کے پاس پہنچا۔ اور قصیدہ جو لکھ لایا تھا اسے سنایا اور امیر ابو المظفر کی خدمت میں پیش کرنے کی درخواست کی خواجہ اسعد ایک فاضل اور شاعر دوست آدمی تھا قصیدہ سنکر اور اس کی صورت دیکھکر اسے سخت تعجب ہوا اس لئے کہ قصیدہ بہت اچھا تھا اور فرخی کی صورت بالکل دیہاتی گنوار کی سی اس لئے عمید اسعد کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ قصیدہ اسی گنوار کا لکھا ہوا ہے جس کو شاعری سے کوئی مناسبت نہیں معلوم ہوتی۔ امتحاناً کہا کہ میں تمہیں امیر کی خدمت میں باریاب کر دوں گا مگر پہلے تم داغگاہ کی توصیف میں ایک قصیدہ لکھکر لاؤ اس نے داغگاہ کا نقشہ کھینچکر بتلایا کہ یہ بہت خوش [illegible] ہے کوسوں تک سبزہ زار چلا جاتا ہے۔ خیموں کی قطار لگی ہوئی ہے چاروں طرف [illegible] ہیں احباب ایک ساتھ بیٹھکر شراب پیتے ہیں۔ جشن کرتے ہیں بادشاہ کے

ایک ہاتھ میں شراب اور دوسرے ہاتھ میں گلدستہ ہوتی ہے۔ شراب پیتا جاتا ہے اور [illegible]
بجاتا جاتا ہے۔ فرخی نے اسی رات بھر میں یہ قصیدہ کہہ ڈالا اور دوسرے روز صبح [illegible] کے سامنے
پڑھا۔ اس قصیدہ کے چند اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

چون پرند نیلگون بر روی پوشد مرغزار — پرنیان ہفت رنگ اندر سر آرد کوہسار
خاک را چون ناف آہو مشک زاید بی قیاس — برگ را چون پر طوطی برگ روید بی شمار
دوش وقت صبحدم بوے بہار آورد باد — حبذا باد شمال و خرما بوے بہار
باد گوئی مشک سودہ دارد اندر آستین — باغ گوئی لعبتان جلوہ دارد در کنار
نسترن لولوے بیضا دارد اندر مرسلہ — ارغوان لعل بدخشی دارد اندر گوشوار
تا برآمد جامہاے سرخ مل بر شاخ گل — پنجہاے دست مردم سر فرو کرد از چنار
باغ بوقلموں لباس و شاخ بوقلموں نما — آب مروارید گون و ابر مروارید بار
راست پنداری کہ خلعتہاے رنگین یافتند — باغہاے پرنگار از داغگاہ شہریار

خواجہ عمید یہ قصیدہ سن کر حیران رہ گیا۔ اس سے پہلے کبھی ایسے اشعار اس کے گوش گذار نہیں ہوئے تھے۔ تمام کام چھوڑ چھاڑ فرخی کو اپنے ساتھ لے کے امیر کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ خداوندا دقیقی کے بعد سے اب تک ایسا شاعر نہیں پیدا ہوا اور تمام واقعہ بیان کیا۔ غرضکہ ابو المظفر کے دربار میں اسے جگہ مل گئی اور ابو المظفر نے جو [illegible] محمود کے دربار میں پہنچا دیا جہاں اس نے رفتہ رفتہ اس قدر ترقی کی کہ [illegible] غلام اس کی رکاب میں چلتے تھے (1)

فرخی کی تعلیم و تربیت دیہات میں ہوئی اس لئے اس کی شاعری نے بھی [illegible]

---

(1) [illegible] ..... زر [illegible] لیکن [illegible]
[illegible]

[illegible] اس کی ابتدائی شعر و شاعری ہی میں [illegible] اسی لیے اس [illegible]
[illegible] ایک فطری شاعر [illegible] ہونے چاہئیں۔ زبان کی صفائی معانی [illegible]
[illegible] جو ہر ہیں اس کی فطری ذکاوت و ذہانت اور شاعرانہ کمال کی مہر صرف [illegible]
[illegible] عراقی کرتا ہے۔

فرخی کہ رخ خوب زوسنے بلاغت را بشاطۂ فصاحت او بخیال آراست کہ ہیچ قامع انگشت بر حرف آں تہا دو شعراء عذب و پر معنی است یاول و صنعت سخن و بدعت معانی کوششید و در اں از اقران سابق آمد و با غرسخن سہل ممتنع ایجاد می کرد۔[1]

دولت شاہ سمرقندی ایک قدم اور آگے بڑھ گیا ہے۔ چنانچہ اس نے فرخی کی تعریف کے سلسلہ میں وطواط کا قول بھی نقل کیا ہے وہ کہتا ہے۔

ذہنے سلیم و طبع مستقیم داشتہ استاد رشید وطواط می گوید کہ فرخی عجم را چناں است کہ متنبی عرب را و ایں ہر دو فاضل سخن را سہل ممتنع می گویند[2]

قصیدہ اور واقعہ نگاری میں اس نے کمال حاصل کیا تھا۔ مرثیہ کے اشعار پہلے فارسی میں بہت کم پائے جاتے تھے شاعری کی اس صنف کو بھی اس نے درجہ کمال تک پہنچا دیا اس نے سلطان محمود کی وفات کے بعد اسکا زبردست مرثیہ لکھا تھا۔ مولنا شبلی اس کے متعلق کہتے ہیں:۔

"فرخی نے سلطان محمود کا جو مرثیہ لکھا وہ نہ صرف پر درد اور اثر سے بھرا ہوا ہے بلکہ اس فن کے تمام اصول اور قوانین اس سے منضبط کئے جا سکتے ہیں۔"[3]

---

(۱) لباب الالباب صفحہ ۲۴

(۲) تذکرۃ الشعراء صفحہ ۵۵

(۳) شعر العجم حصہ اول صفحہ ۱۴۰

اس کے چند اشعار نمونہ کے طور پر ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

[illegible] زمین نہ پیاں است کمین [illegible] … بر مناوست کہ اسمال [illegible]

[illegible] پر شور ش و سر تا سر کہسے … ہمہ پر جوشن و جوشن [illegible]

مہتراں سیم بر روے زناں بچو نتاں … چشمہا کردہ زخوں نابہ برنگ گلنار

ملک استاں دگر باز نہ بیاد زغزا … وشنے روے نہا دہ است [illegible]

سیرے خوردہ نگردی کہ بخفتہ است لرد … دیر تر خاست نگر رنج رسیدش زخمار

خیز شاہا کہ رسولاں شہاں آمدہ اند … ہدیہا دارند آوردہ فراواں و نثار

گر تو اند کہ برانگیز داریں خواب ترا … خفتی خفتنی کز خواب نگردی بیدار

خفتن بسیار لے خواجہ نہ سے تو نبود … ہیچ کس خفتہ ندیداست ترا زیں کردار

یکدمک بار سے درخانہ بایست نشست … تا بدیدمے روے تو عزیزان و تبار

بحصار از فزع و بیم تو رفتند شہاں … تو شہا از فزع و بیم کہ رفتی بحصار

شعرا ما بہ تو بازار برافروختہ بود … رفتی و با تو بہ یکبارہ برفت آں بازار

اس کے دیوان کو ما ورا النہر میں بہت شہرت حاصل ہوئی۔ نظم کے علاوہ نثر میں بھی اسکی ایک تصنیف ہو جو اس نے فصاحت و بلاغت پر لکھی ہو "ترجمان البلاغت" نام ہے[1] لیکن رشید الدین وطواط[2] نے اس کتاب کے متعلق کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی ہے[3] اور

---

(۱) تذکرۃ الشعرا صفحہ ۵۰

(۲) رشید الدین محمد عبد الجلیل سلسلۂ نسب حضرت عمر بن الخطاب سے جا کر ملتا ہے۔ بہت بزرگ فاضل اور ادیب تھا بہت سے فنون میں مہارت تھی اس کی قابلیت علم کا اعتراف وقت کے تمام اکابر کو تھا بلخ [illegible] تھا لیکن خوارزم میں سکونت اختیار کی قطب الدین خوارزم شاہ کے عہد میں [illegible] لوگ اکثر شعر و شاعری میں ان سے استفادہ کرتے تھے۔ نہایت تیز زبان اور فصیح تھا [illegible]

خاص کتابچہ کہ یہ ایک مثنوی کتاب ہے

اسدی طوسی

یہ بھی سلطان محمود کی بزم ادب کا ایک اہم رکن ہے شاعری کے اعتبار سے اس کا مرتبہ اپنے ہمعصر شعراء سے کسی طرح کم نہیں۔ دولت شاہ نے اس کو فردوسی کا استاد لکھا ہے۔ لیکن مولانا شبلی نے اس کی تردید کی ہے اور خود اسدی کے اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ فردوسی کا استاد نہیں بلکہ ہمعصر ہے۔ محمود کے زمانہ میں وہ خراسان کے شعرا کا استاد تھا۔ اسے بار ہا شاہنامہ نظم کرنے کے لئے مجبور کیا گیا لیکن اس نے ہمیشہ اس سے پہلو تہی کی اور اپنے بڑھاپے کا عذر پیش کرتا رہا۔ البتہ فردوسی سے ہمیشہ شاہنامہ نظم کرنے کی فرمائش کرتا رہا کہ اسے وہ اس کام کے لئے سب سے زیادہ موزوں سمجھتا تھا۔[1] دولت شاہ نے ایک روایت اور بھی نقل کی ہے یعنی یہ کہ فردوسی جب غزنین سے بھاگ کر دوسرے مقامات سے ہوتا ہوا اپنے وطن پہنچا ہے تو موت کے کنارے آن لگا تھا۔ اس نے اپنے استاد اسدی کو بلا کر کہا کہ استاد! موت کا وقت قریب پہنچ گیا ہے اور شاہنامہ ہنوز مکمل نہیں ہوا ہے اگر میں مر گیا تو مجھے خوف ہے کہ میرے بعد کسی کو اس کی تکمیل کی ہمت اور توفیق نہیں ہوگی۔ اسدی نے کہا کہ عزیز من کچھ فکر مت کرو اگر زندگی رہی تو تمہارے بعد میں اسے پورا کروں گا فردوسی نے کہا کہ آپ بہت بوڑھے ہو گئے ہیں اس لئے کس طرح آپ اس کام کو انجام دے سکیں گے۔ اسدی نے کہا کہ انشاء اللہ سب ہو جائے گا یہ کہکر وہ مکان پر واپس ہوا اور اسی روز دوسری نماز کے وقت

حاصل تھا اس لئے اکثر شعرا اس سے ناراض تھے۔ بہت سے شعرا نے اس کی ہجو بھی لکھی ہے اور طرح طرح کے الزامات بھی قائم کئے ہیں لیکن وہ ان تمام الزامات سے بالا تر ہے۔ "تذکرۃ الشعرا صفحہ ۴۴

(۱) تذکرۃ الشعرا صفحہ ۳۵

تک ... ۴۰ چار ہزار شعر کردہ اے۔ الی آخرہ(۱) لیکن مولانا شبلی نے اس کو بھی نہایت تفصیل دلائل کے ساتھ فرضی اور غلط ثابت کیا ہے(۲)۔ اسدی کا اصلی نام علی بن احمد اور کنیت ابو نصر ہے۔ طوس وطن تھا تعلیم سے فراغت حاصل کر کے عراق آیا اور دیلمیوں کے دربار میں اس کی رسائی ہو گئی یہاں سے آذربائیجان کا رخ کیا وہاں کے رئیس ابو دلف کا وزیر نہایت قدرشناس تھا اس نے اسے شاہنامہ کے طرز پر ایک کتاب لکھنے کی ترغیب دی چنانچہ گرشاسپ نامہ اسی ترغیب کا نتیجہ ہے(۳)

فارسی مصطلحات پر بھی اس کی ایک کتاب ہے اور یہ اس موضوع پر سب سے پہلی تصنیف مانی جاتی ہے۔ چنانچہ خود اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک نسخہ ویانا کے کتب خانہ میں موجود ہے اور ایک یورپین مستشرق نے اسے چھاپ کر شائع بھی کیا ہے(۴)

عسجدی

عسجدی بھی محمود کے دربار کے مقبول شعرا میں تھا۔ دولت شاہ نے اسے "از جملہ شاگردان استاد عنصری"(۵) لکھا ہے۔ وطن کے متعلق بھی تذکروں میں اختلاف ہے عوفی اسے مرو کا باشندہ بتاتا ہے(۶)، دولت شاہ نے "ہروی الاصل" لکھا ہے(۶)۔ دولت شاہ اس کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "و قصائد را متین و علائم می گوید"۔ عسجدی کے دیوان کو شہرت نہیں نصیب ہوئی لیکن اس کا جستہ جستہ کلام مختلف رسائل اور تذکروں وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔ محمود نے جب سومنات فتح کیا تو اس نے بھی ایک قصیدہ لکھا چند شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

تا شاہ خسرواں سفر سومنات کرد ۔۔ کردار خویش را علم معجزات کرد

آثار روشن ملکان گذشتہ را ۔۔ نزدیک بخرداں ہمہ از مشکلات کرد

---

(۱) تذکرۃ الشعرا صفحہ ۳۶ (۲) شعر العجم حصہ اول صفحہ ۱۰۳ (۳) ایضاً صفحہ ۱۰۴ (۴) [illegible]

(۵) تذکرۃ الشعرا صفحہ ۴۷ (۶) ایضاً [illegible]

[illegible]
[illegible]

یہ مشہور رباعی اسی کی ہے۔

از شرب مدام و لاف مشرب توبہ — از عشق بتان سیم غبغب توبہ
دل در ہوس گناہ و برلب توبہ — زیں توبۂ نادرست یارب توبہ(۱)

غضائری

شعرائے عراق کا سرتاج سمجھا جاتا ہے سلطان محمود غزنوی کے زمانہ میں رے سے ملازمت کی غرض سے غزنین آیا۔ شاعری کے تمام اصناف پر اسے قدرت تھی، صنعت اغراق میں خصوصاً کمال حاصل تھا۔ سلطان محمود کی شان میں متعدد قصیدے کہے ہیں، ایک قصیدہ کا مطلع یہ ہے:۔

اگر مراد بجاہ اندر است و جاہ بمال — مرا ببیں کہ ببینی جمال را بکمال
من آں کسم کہ بمن تا بحشر فخر کنند — ہر آنکہ بر سر یک بیت بر نویسد قال

اس قصیدہ میں صنعت اغراق ہے جس کے صلہ میں محمود نے سات توڑے دئے جن کی قیمت ۱۴ ہزار درہم تھی۔ اغراق یہ ہے

صواب کرد کہ پیدا نکرد ہر دو جہاں — یگانہ ایزد دادار بے نظیر و ہمال
وگرنہ ہر دو بہ بخشیدے او بروز سخا — امید بندہ نماندے بایزد متعال

روایت دولت شاہ کی ہے مولانا شبلی نے ۷ کے بجائے ۱۴ توڑے لکھے ہیں اور خود غضائری کے ان اشعار سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔

---

(۱) یہ بیان تمامتر لباب الالباب جزو دوم اور تذکرۂ دولت شاہ سے ماخوذ ہے۔ (۲) شعر العجم جلد اول

[illegible]

[illegible]

---

(۱) غضاری کا دیوان [illegible]

غزلیات

(از جناب احسان احمد صاحب بی اے، ایل ایل بی وکیل اعظم گڑھ)

کئی مہینے ہوئے یہ غزلیں حضرت احسان نے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی درخواست پر عطا فرمائی تھیں۔ ادارت کی غفلت سے ابتک شائع نہ ہو سکیں۔ دینے والے اور دلانے والے دونوں سے معافی کی التجا ہے۔

(۱)

محسوس ہو رہی ہیں خود اپنی تجلیاں — اب کعبہ چاہیے نہ صنم خانہ چاہیے

وہ شمع حسن آج بھی ہے مائل کرم — سوز و گداز سینۂ پروانہ چاہیے

کیا کیا لطافتیں ابھی ناکامیوں میں ہیں — احساس لذت غم جانانہ چاہیے

دیکھوں تو پھر حقیقت [illegible] — اک [illegible] کا نعرۂ مستانہ چاہیے

نغمے عجیب شور سلاسل میں ہیں نہاں — سننے کو لیکن اک دل دیوانہ چاہیے

اس بزم قدس تک تو پہنچنے کے واسطے — زاہد مری یہ لغزش مستانہ چاہیے

[illegible]

اس تشنگی کو میں تو سمجھتا ہوں زندگی　　اہل ہوس کو ساغر و پیمانہ چاہیے

یہ نالۂ دبا تو نہیں کار عاشقی　　سرمایۂ عزیز کا نذرانہ چاہیے

آساں نہیں ہے جیب و گریباں کا سینا　　اس کے لئے بھی عاقل و فرزانہ چاہیے

اپنی راہ عشق میں تو بس اتنا ہے مجکو ہوش　　ہر ہر قدم پہ سجدۂ شکرانہ چاہیے

دشوار یاں حیات کی احسان کچھ نہیں

فکر بلند و ہمت مردانہ چاہیے

(۲)

کس کے فیضان تجلی سے یہ دل سیراب ہے　　آج ہر داغ چمکتا ہے گلستاں ہو کر

راحت روح ملی، دولت کونین ملی　　محرم جلوۂ کیف غم پنہاں ہو کر

دیکھ پھر ہوتی ہے کیا بارش انوار کرم　　مشہد عشق میں آ سر بہ گریباں ہو کر

کردیا نیز نگہ دہر کو معمور "گداز"　　خاک پروانہ کے ذرے بھی پریشاں ہو کر

وادی عشق ہے یہ، نالہ و شیون کیسا　　ہاں، اٹھا گام طلب نعرہ زن رقصاں ہو کر

کردیا برق سر طور کو محروم جمال　　جلوہ ہائے دل بیتاب نے عریاں ہو کر

اب تو اس برق تجلی سے ہے ایک ربط لطیف　　مجکو کیا چیز ملی سوختہ ساماں ہو کر

بزم اسرار کے پردوں کو اٹھنا تھا جسے　　رہ گیا ہاتھ وہ پابند گریباں ہو کر

دل میں اک رقص تو ہے روح میں اک وجد تو ہے　　گرچہ کچھ بھی نہ ملا چاک گریباں ہو کر

کاش رہ جائے مرے سینہ میں داغ جنوں　　اک نشاط ابدی کا چمنستاں ہو کر

تجکو گر تھا مرے قلب پہ لے برق جمال　　کیا ملا طور پہ تجکو شرر افشاں ہو کر

دو عینکیں

بابو صاحب علیگڑھ کے گریجویٹ تھے اور جج میں منصرم تھے۔ مولوی صاحب اپنے استاد مرحوم کے شاگرد تھے اور گورنمنٹ اسکول میں ہیڈ مولوی تھے۔ بابو صاحب دبلے پتلے آدمی تھے، داڑھی منڈاتے تھے۔ مونچھیں اتنی بڑی رکھتے تھے کہ دودھ کی بالائی اُن میں اٹک کر رہ جاتی تھی۔ مولوی صاحب فربہ اندام تھے۔ اُنکی داڑھی عرض میں زنخداں تک محدود تھی مگر طول میں بہت دور تک پہنچی تھی۔ مونچھیں صاف رہتی تھیں۔ یخنی، حریرہ، ہریسہ، ماء اللحم کسی چیز کے پینے میں دقت نہ ہوتی تھی۔ بابو صاحب گھر پر قمیص اور ڈھیلا پاجامہ پہنتے تھے اور دفتر میں سوٹ سے مشابہ ایک چیز جو چھاؤنی کا درزی انہیں سی کر دیا کرتا تھا۔ مولوی صاحب گھر پر اور مدرسے میں ہر جگہ نیچا کرتہ اور اونچی ازار پہنتے تھے جو اُنکی بیوی سیتی تھیں۔ بابو صاحب ولایتی چشمہ لگاتے تھے جس کی کمانی پر سونے کا ملمع تھا مولوی صاحب بہت موٹے شیشے کی عینک استعمال کرتے تھے جس میں بٹا ہوا دھاگا کمانی کا کام دیتا تھا۔

بابو صاحب پہلے لیڈر کے خریدار تھے مگر جب سے پائنیر کا چندہ کم ہو گیا، پائنیر منگواتے تھے۔ مولوی صاحب کوئی اخبار خریدتے نہیں تھے مگر اسکول کے دار المطالعہ میں جتنے اردو اخبار آتے تھے سب کو پڑھا کرتے تھے۔ بابو صاحب کو کتب بینی کا شوق نہ تھا۔ اخبار کے علاوہ اگر وہ کچھ پڑھتے تھے تو اپنے صوبے کی سول لسٹ۔ مولوی صاحب کے مطالعہ میں کوئی نہ کوئی موٹی سی عربی کی کتاب ہمیشہ رہا کرتی تھی۔ بابو صاحب کو سوائے اصلاح معاشرت کے کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ مولوی صاحب کو علاوہ دینیات کے علمی اور سیاسی مسائل سے بھی شغف تھا۔ اور انہیں بھی وہ دینیات کا جزو سمجھتے تھے۔ بابو صاحب اپنے آپ کو آزاد خیال اور مولوی صاحب کو تنگ نظر اور متعصب سمجھتے تھے مولوی صاحب اپنے آپ کو مسلمان اور بابو صاحب کو ملحد کہتے تھے۔

[illegible] باوجود ان اختلافات کے بابو صاحب اور مولوی صاحب میں بڑی گہری دوستی تھی۔ دونوں
ایک ہی مکان میں رہتے تھے جس میں زنانے کے دو الگ حصے تھے۔ مگر دروازہ مشترک تھا۔ مردانے میں
غسل خانے، پاخانے اور نوکروں کی کوٹھری کے علاوہ چار بڑے کمرے تھے جس میں سے ایک بابو
صاحب کی نشستگاہ کا کام دیتا تھا۔ اس میں دری بچھی تھی اور چند بید کی کرسیاں اور چند موڑھے۔
دوسرا بابو صاحب کے مطالعہ کا کمرہ تھا جس میں ایک میز تھی اور دو کرسیاں۔ میز پر لکھنے کا سامان
دفتر کی مسلیں، تار اور منی آرڈر وغیرہ کے فارم، سول لسٹ اور ریل کا ٹائم ٹیبل سب چیزیں تتر بتر
پڑی رہتی تھیں۔ تیسرے کمرے میں مولوی صاحب رہتے تھے۔ اس میں آدھے کمرے میں چٹائی
پر ایک بوسیدہ چاندنی بچھی ہوئی تھی صدر میں ایک میلا سا گاؤ تکیہ رکھا تھا۔ اس کے آگے چار پانچ
آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ چھوڑ کر سو سوا سو کتابیں بے ترتیبی سے پھیلی ہوئی تھیں۔ کمرے کے بقیہ
نصف حصے میں نماز کی چوکی تھی اور ایک تخت جس پر مولوی صاحب کے کپڑے اور گھر کی بہت سی
چیزیں جن کے رکھنے کا کہیں اور ٹھکانا نہ تھا، پڑی رہتی تھیں۔ چوتھے کمرے میں بابو صاحب کا لڑکا اور
مولوی صاحب کا لڑکا جو ہم عمر تھے اور گورنمنٹ اسکول میں ایک ہی جماعت میں پڑھتے تھے، رہا
کرتے تھے۔

مولوی صاحب دونوں لڑکوں کے ساتھ مدرسے سے ساڑھے چار بجے واپس آیا کرتے
تھے اور ساڑھے پانچ بجے تک عصر کی نماز سے اور سہ پہر کے ناشتے سے فارغ ہو جاتے تھے۔
اسی وقت بابو صاحب اپنے دفتر سے لوٹتے تھے۔ بابو صاحب کا معدہ کمزور تھا اس لئے وہ سہ پہر
کو ناشتہ نہیں کرتے۔ دفتر سے لوٹ کر وہ منہ ہاتھ دھوتے تھے اور پھر اپنے نشست کے کمرے
میں یا گرمی کے دن ہوں تو صحن میں ایک تکیہ دار موڑھے کے سامنے ایک تپائی رکھ کر دراز
ہو جاتے تھے۔ مولوی صاحب بھی آ بیٹھتے تھے اور محلے کے بعض احباب بھی جمع ہو جاتے تھے
مغرب تک یہیں نشست رہتی تھی مختلف مسائل پر گفتگو ہوتی تھی جس میں مولوی صاحب بہت
زیادہ اور بابو صاحب بہت کم حصہ لیتے تھے۔ اس کے بعد مولوی صاحب اور دوسرے حضرات

جو نماز کے پابند تھے محلہ کی مسجد میں مغرب کی نماز پڑھنے چلے جاتے تھے اور بابو صاحب اور یاران بے نماز بدستور باتیں کرتے رہتے تھے۔ مولوی صاحب کے مسجد سے واپس آتے ہی سب احباب رخصت ہو جاتے تھے اور مولوی صاحب اور بابو صاحب اور دونوں لڑکے سب ان کو کھانا کھلاتے تھے۔ کھانا کھا کر بابو صاحب اپنے مطالعے کے کمرے میں چلے جاتے تھے اور دفتر سے جو مسلیں ساتھ آتی تھیں ان کے ملاحظہ میں چار گھنٹے مصروف رہتے تھے۔ مولوی صاحب اپنے کمرے میں مطالعہ کیا کرتے تھے۔ عشا کی نماز مولوی صاحب گھر پر پڑھتے تھے اور نماز سے فارغ ہو کر گھر میں آرام کرنے چلے جاتے تھے۔ بابو صاحب کو بارہ بجے کے قریب سونا نصیب ہوتا تھا۔ مولوی صاحب صبح کو تڑکے اٹھتے تھے نماز اور تلاوت قرآن سے فارغ ہو کر ٹہلنے جاتے تھے وہاں سے واپس آکر دونوں لڑکوں اور بعض طالب علموں کو عربی فارسی اور دینیات کی کتابیں پڑھاتے تھے اور ساڑھے نو بجے کھانا کھا کر مدرسے کی راہ لیتے تھے۔ بابو صاحب ساڑھے سات بجے بیدار ہوتے تھے اور ناشتہ کرتے ہی جج صاحب کے گھر چلے جاتے تھے کیونکہ دفتر کے وقت سے پہلے انہیں وہاں بھی کام کرنا پڑتا تھا۔

یوں تو بابو صاحب اور مولوی صاحب میں روز شام کو باتیں ہوتی تھیں لیکن چونکہ بابو صاحب ذرا محتاط اور خوددار آدمی تھے اس لئے اور لوگوں کی موجودگی میں اپنے اصلی خیالات ظاہر کرنا وہ خلاف مصلحت اور خلاف شان سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ مولوی صاحب کا مزاج بہت تیز تھا اور جب ان سے اور کسی شخص سے مجمع میں گفتگو ہوتی تھی تو ذرا سی دیر میں گفتگو مناظرہ ہو جاتی تھی اور مناظرہ مجادلے کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ برخلاف اس کے جب وہ کسی سے تنہائی میں باتیں کرتے تھے تو ان کا رویہ اول سے آخر تک عدم تشدد کا رہتا تھا۔ اس لئے بابو صاحب ان سے اگر کبھی کھل کر باتیں کرتے تھے تو اتوار سے پہلی رات کو جب ان دونوں کے سوا کوئی تیسرا نہیں ہوتا تھا۔ اس رات کو عموماً دونوں صاحب کلام نہیں کرتے تھے اور اکثر کھانے کے بعد ایک ایک گھنٹے تبادلہ خیالات میں صرف کرتے تھے۔ موضوع بحث عموماً معاشرت کے مسائل ہوتے تھے کیونکہ بابو صاحب کسی اور بحث سے ذوق نہیں رکھتے تھے۔

اس وقت ان دونوں حضرات کی عجیب شان ہوتی تھی۔ دوران گفتگو میں مولوی صاحب کی نگاہ اندر کی جانب
کی طرف جھکی ہوتی تھیں اور ان کی آنکھوں کی چمک سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کی نظر تاحد و فضا سے گذر کر
کائنات کی بلندیوں کی سیر کر رہی ہے اور بابو صاحب بڑے گہرے غور و فکر کے انداز سے فرش پر
نظر جما دیتے تھے گویا طبقات ارض کے نیچے تحت الثریٰ کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ دونوں عجیب
محویت کے عالم میں باری باری سے گفتگو کرتے تھے اور بیچ بیچ میں بابو صاحب اپنے رومال
سے اور مولوی صاحب اپنے کرتے کے دامن سے عینک صاف کرتے جاتے تھے۔ اس حالت
میں کوئی انہیں دیکھتا تو یقیناً یہ سمجھتا کہ ان دونوں حضرات کے پیش نظر یہ زندگی اور یہ دنیا
نہیں ہے بلکہ ان میں سے ہر ایک اپنی عینک کی مدد سے کسی اور طلسمی عالم کا نظارہ کر رہا ہے۔
اور دوسرے کے سامنے اپنے منظر کا نقشہ کھینچ رہا ہے۔ ان دونوں کے طرز گفتگو سے اس
خیال کو اور تقویت ہوتی تھی۔ مثلاً بابو صاحب حکیمانہ شان سے پیشانی پر شکنیں ڈال کر فرمایا کرتے
تھے "مجھے یہ نظر آ رہا ہے کہ ایشیا جہالت اور تعصب کی زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہو گیا ہے اور
اصلاح و ترقی کی شاہراہ پر تیزی سے قدم بڑھا رہا ہے۔ قدامت پرستی اور تنگ نظری قصۂ
پارینہ ہو گئی ہے، روشن خیالی کا دور دورہ ہے۔ تہذیب و تمدن کا چاند جو مغرب سے طلوع ہوا تھا
مشرق کی تاریکی کو آہستہ آہستہ دور کر رہا ہے۔ اس کی چاندنی کا دریا دو طرف سے بڑھ رہا ہے
امریکہ کی طرف سے اور یورپ کی طرف سے اور ظلمت شرق اس سیلاب میں غرق ہوتی جاتی ہے۔
جاپان اس نور سے منور ہو چکا ہے اور چین اب منور ہو رہا ہے۔ ترکی اور مصر اس کی تابانی سے
جگمگا اٹھے ہیں۔ ایران، شام اور عراق، وسط ایشیا اور افغانستان کی نظریں اس کی درخشانی سے
خیرہ ہوئی جا رہی ہیں۔ ہندوستان پر اس کی کرنیں مدت سے پڑ رہی ہیں اور اس کی روشنی سارے
ملک میں پھیل چکی ہے لیکن چونکہ یہاں کی فضا میں غیر معمولی تاریکی ہے اس لئے یہ چاندنی ابتک
مدھم ہوتی ہے۔ جیسے جیسے دن گذرتے جائیں گے اندھیرا چھٹتا جائے گا اور چاند کی روشنی
اُجلی ہوتی جائے گی،" مولوی صاحب یہ سنکر تھوڑی دیر خاموش رہتے تھے۔ رفتہ رفتہ انکے

چہرے پر وارفتانہ جبروت کے آثار تھے جو بتا رہے تھے کہ وہ اپنی روحانی کرامات میں [illegible] ہیں کیونکہ وہ یہ ہیں کہ ایشیا یورپ کی تقلید میں اکھڑ بنگر کے ہلاکت کے غار میں گر رہے [illegible] حق شیطانی کے غرور میں مدہوش ہو رہا ہے۔ علم انسانی کے نشے میں بدمست ہو کر خدا کے بنائے ہوئے قوانین کو پامال کر رہا ہے اور بہائم کی طرح شرم و حیا کی حدیں توڑ کر ہوائے نفس کے میدان میں بھاگا چلا جا رہا ہے۔ کفر و الحاد کی ایک آگ بھڑک اٹھی ہے جو ایمان اور عقیدے کے خرمن کو پھونکے ڈالتی ہے۔ اس کی چمک نے جیسے لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے۔ چین، جاپان، روم، روس، ایران، افغانستان سب کی آنکھوں میں چکا چوند ڈال دی ہے اور اس کی آنچ نے [illegible] اس کے شعلے ہندوستان میں زمین کے اندر اندر پھیل رہے ہیں اور ایک دن سارے ملک کو جلا کر خاک کر دیں گے۔ وہ خدا جس نے ابراہیم پر آگ کو گلزار کر دیا تھا اگر چاہے تو اس بدنصیب ملک کو بچا سکتا ہے اور اپنے برگزیدہ بندوں کو یہ قوت دے سکتا ہے کہ دہریت کی آگ کو اپنے پیروں سے کچل کر بجھا دیں۔"

بابو صاحب یہ سن کر ذہنی تفوق کے احساس سے مسکراتے تھے اور کہتے تھے "دنیا میں جہالت کی قوتیں ہمیشہ مذہب کے نام سے ترقی اور اصلاح کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا چاہتی رہی ہیں مگر کبھی کامیاب نہیں ہوئیں۔ اب وہ دن نظر آ رہا ہے جب لوگوں کی آنکھوں سے جہالت کے پردے اٹھ گئے ہیں اور وہ دیکھ رہے ہیں کہ ان کے دینی پیشواؤں نے انہیں صدیوں تک گمراہی میں مبتلا رکھا، اپنی کوتاہ بینی اور بزدلی سے انہیں خدا کی بہترین نعمتوں سے فائدہ اٹھانے نہ دیا۔ دھوکے کا طلسم ٹوٹنے کے بعد یہ فریب خوردہ بھیڑیں غیرت میں آ گئی ہیں اور فریب دینے والوں کو غضبناک تیوروں سے گھور رہی ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ ہونا ہے اسے دیکھ کر دل ہل جاتا ہے، اسے بیان کرتے ہوئے زبان کانپتی ہے۔"

اب مولوی صاحب کا چہرہ روحانی جلال سے سرخ ہو جاتا اور ان کی آواز [illegible] کمرے میں گونجتی ہوئی سنائی دیتی تھی "روز ازل سے شیطان اور انسان کے درمیان [illegible]

کے بہانے سے ان کا مقابلہ زور و شور سے گفتگو کرتے آئے ہیں مگر ان کا انجام واقعی ذلت اور ابدی لعنت کے سوا کچھ نہیں۔ بہت روشن دیکھ رہا ہوں جب لوگوں کے اعمال میزانِ عدل میں تولے جا رہے ہیں اور نہیں یقیناً مستحقِ جزا و سزا بن رہی ہے، بندوں کو خدا کی راہ سے ہٹانے والے دوزخ میں اور غرور کا بیج بونے والے کفر کر قادر کو پہنچ رہے ہیں جہنم کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی قبائیں اپنے لئے مانگ رہی ہیں۔ اس کے بعد جو آنکھوں کے سامنے گذرتا ہے اس سے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اور روح لرزتی ہے۔"

اس نقطے پر پہنچ کر گفتگو عام مباحث سے ہٹ کر ذاتی مسائل پر آجاتی تھی۔ دونوں حضرات بہ تقاضائے دوستی ایک دوسرے کے عیوب اور نقائص گنانے لگتے تھے اور حق گوئی میں اس قدر اہتمام کرتے تھے کہ حق کی تلخی کام و دہن کے لئے اور اس کی بو مشامِ جان کے لئے ناقابلِ برداشت ہوجاتی تھی۔

ایک بار جمعے کے دن مولوی صاحب نے اپنے لڑکے کو مارا کیونکہ اس نے نہانے میں دیر کر دی اور نماز جمعہ میں شامل نہ ہو سکا اور اتفاق سے بابو صاحب نے بھی اسی دن اسکول دیر میں پہنچنے کے قصور میں اپنے نورِ عین کی گوشمالی کی۔ سنیچر کے دن صبح کو دونوں لڑکوں نے آپس میں صلاح کرکے ان پدرانہ مظالم کا انتقام اس طرح لیا کہ مولوی صاحب اور بابو صاحب دونوں کی عینکیں خدا جانے کہاں چھپا دیں کہ لاکھ ڈھونڈھا مگر نہ ملیں۔ عینک نہ ہونے سے دونوں کو دن بھر بڑی دقتوں کا سامنا ہوا۔ مولوی صاحب لڑکوں سے درسی کتابوں کا آموختہ نہ سن سکے اور انہیں اس پر قناعت کرنا پڑی کہ صرف و نحو کے پیچیدہ مسائل زبانی سمجھائیں اور لڑکوں کی سمجھ میں کچھ نہ آئے تو قلمی سے ان کی تشریح کریں ادھر بابو صاحب کو مسلیں ایک محرر سے پڑھوا کر سننا پڑیں جس میں بہت وقت ضائع ہوا اور جج صاحب کے سامنے کاغذات پر دستخط کرانے وہ اس دن نہ جا سکے۔ شام کو واپسی کے بعد دونوں صاحبوں نے پھر عینکیں تلاش کیں مگر کہیں پتہ نہ چلا۔ مجبوراً

تہیہ کیا کہ اگلے دن تعطیل ہو بازار جا کر دوسری عینک خرید لائیں گے [illegible]

کھانے کے بعد حسب معمول دونوں حضرات بابو صاحب کی نشست گاہ میں نزول [illegible] ہوئے اور تھوڑی ہی دیر بعد باتیں پھر گرم ہو گئیں۔ پہلے تو کچھ دیر ادھر ادھر کی ہوتی رہیں پھر دفعتاً دونوں گرما گرمی کرنے لگے اور اپنی اپنی جگہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ بابو صاحب کی نظر فرش پر جم گئی اور انہوں نے چہرے کو فلسفیانہ ساز و سامان سے آراستہ کر کے اپنے پراسرار انداز میں گفتگو شروع کرنا چاہی مگر خدا جانے عادت کا اثر تھا کہ کوئی اس سے زیادہ گہرا بھید کہ پہلا لفظ منہ سے نکلتے ہی بابو صاحب کا سیدھا والا ہاتھ عینک کو تلاش کرتا ہوا آنکھ تک پہنچا اور جب عینک نہ ملی تو ان پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ ان کے ہاتھ پیر کانپنے لگے۔ ان کی زبان رکنے لگی۔ "مجھے نظر آتا ہے۔۔۔ مجھے۔۔۔ یہ۔ مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ اندھیرا۔ ہے۔ ہر طرف۔ اندھیرا۔"

بابو صاحب کی یہ حالت دیکھ کر مولوی صاحب بھی سراسیمہ ہو گئے۔ ان کے کرتے [illegible] اٹھا اور آنکھ کی طرف بڑھا مگر وہاں عینک کہاں تھی۔ ان کی زبان بھی لغزش کرنے لگی "میں یہ دیکھتا ہوں۔ میں۔ یہ۔ دیکھتا۔ ہوں۔ مجھے۔ کچھ۔ دکھائی۔ نہیں۔ دیتا۔ کچھ۔ ہے۔ مگر۔ خدا۔ جانے۔ کیا۔"

غزل

(از حضرت جلیل قدوائی بی اے (علیگ)

خوبیِ حسنِ یار کی باتیں — سر بہ سر ہیں بہار کی باتیں

مجھکو دیکھا تو ہنس دیا وہ شوخ — اس تغافل شعار کی باتیں

آہ ، وہ ابتدائے عشق کے دن — وہ زمانِ بہار کی باتیں

ذکرِ ایامِ کامرانیِ وصل — طالعِ سازگار کی باتیں

چشمِ پر شوق کے پیامِ لطف — نگہِ شرمسار کی باتیں

دلِ مرحوم کی اٹھان کی شان — ہائے اس ہونہار کی باتیں

اب نہ وہ دل ہے نہ دل میں سوز نہ ساز — نہ وہ اس دلِ فگار کی باتیں

چپکے اس کو اک ملال ہوا — ہیں یہ پچھلی بہار کی باتیں

اب نہیں ہے بہار ، اب نہ کرو — اس خزاں میں بہار کی باتیں

بے رخی کا کسے یقیں ہو جلیل

یاد ہیں اس کے پیار کی باتیں

شذرات

پچھلے مہینے متعدد قومی اخباروں اور رسالوں میں "عربوں کا تمدن" مورد اعتراض قرار پایا۔ ہم نے مولانا محمد علی صاحب، مولانا ابوالکلام صاحب اور علامہ اقبال سے مشورہ کیا۔ تینوں حضرات نے یہ رائے دی کہ مصنف کی غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں پر جو تردیدی نوٹ مترجم نے لکھے ہیں وہ کافی مفصل اور مدلل نہیں ہیں۔ اس سے زیادہ گہری تنقید کی ضرورت ہے۔ جناب شیخ الجامعہ حیدرآباد میں تشریف رکھتے ہیں ان کی خدمت میں یہ روداد پیش کی گئی۔ انھوں نے وعدہ فرمایا ہے کہ اپنی واپسی پر جو بہت جلد ہونے والی ہے۔ ہمدردان جامعہ کی شکایت کے رفع کرنے کا معقول انتظام فرمائیں گے۔ ممدوح کی طرف سے اس کا اعلان اس رسالے کے چھپنے سے پہلے اخبارات میں شائع ہو جائے گا۔

---

۳۰ نومبر کو الٰہ آباد یونیورسٹی کے تقسیم اسناد کے جلسے میں سر مالکم ہیلی گورنر صوبجات متحدہ نے ایک مختصر مگر پر مغز خطبہ صدارت پڑھا جس کا لب لباب یہ ہے کہ ہندوستان میں مغربی اور مشرقی تمدن کا امتزاج ہو رہا ہے لیکن ابھی تک اس کا فیصلہ نہیں ہوا کہ آیا یہ ملک یورپ کے سیاسی، اقتصادی سماجی اور علمی نظاموں کو اختیار کر کے ان میں اپنی ضروریات کے مطابق تصرف کرے گا یا اپنی زندگی کی بنیاد اپنی قدیم روایات پر رکھے گا اور مغربی تہذیب سے محض وہ عناصر لے گا جو مشرقی تہذیب میں کھپ سکیں۔ موصوف نے بہت افسوس کا اظہار کیا کہ ہندوستانی رہنمایان ملت آج اور کل کی فکر میں دور و دراز مستقبل کی طرف سے غافل ہیں اور انہیں نصیحت فرمائی کہ جہاں تک ممکن ہو وہ جذبات کے جوش سے دل کو خالی کر کے حکیمانہ بے تعلقی سے ان مسائل پر غور کریں اور اس غور کا جو نتیجہ نکلے اسے عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں۔ موصوف نے یہ بھی یقین دلایا کہ وہ خود اور دوسرے

[illegible]

سر مالکم نے جن مسائل کیطرف توجہ دلائی ہے انکی اہمیت میں کوئی شبہ نہیں۔ ہندوستان ایشیا کے اور سب ملکوں کی طرح مشرق و مغرب کے تمدنوں کا جولانگاہ ہے اور اگر اس نے ان دونوں میں مصالحت کی کوشش نہ کی تو انکے آپس میں ٹکرانے سے اس کے پس جانے کا اندیشہ ہے لیکن ممدوح کی فلسفیانہ وسعت نظر سے تعجب ہے کہ انہیں وہ مجبوریاں نظر نہیں آئیں جو ہندوستان کو اپنے مستقبل پر غور کرنے میں پیش آ رہی ہیں۔ جب ایک ملک اپنی زندگی کے تمام اہم مسائل میں اپنے حکمرانوں کی مرضی کا پابند ہے تو وہ کس بنیاد پر اپنی آئندہ نشو و نما کا اندازہ کرے اور کس برتے پر اس کی تشکیل کی تدابیر سوچے۔ جب تک وہ قوت جو دریا کی دھار کو موڑ سکتی ہے اپنے ہاتھ میں نہ ہو اس کے بہاؤ کا رُخ پہلے سے کیسے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ یہی احساس ہے جس کی بدولت اکثر ارباب فکر اور ارباب عمل جو واقعی ملک و قوم سے محبت رکھتے ہیں دوسرے کام چھوڑ کر سیاسی آزادی کی جد و جہد میں لگے ہوئے ہیں اور بعض عام تعلیم اور فنی تعلیم کے ذریعے ملک سے افلاس و جہالت کو دور کرنے کی دھن میں ہیں۔

سر مالکم کی نصیحت سن کر اکبر مرحوم کا ایک شعر یاد آتا ہے

غنیمت ہے شب فرقت کی فرصت   رسالہ لکھو تحقیق کمر میں

مگر اکبر مرحوم خوب جانتے تھے کہ شب فرقت میں جو کرب اور بےچینی ہوتی ہے اس میں سوائے اختر شماری کے اور کسی قسم کی علمی تحقیقات ممکن نہیں۔ سر مالکم بھی اسے خوب سمجھتے ہیں لیکن ان کی حکمت عملی کا یہی تقاضا ہے کہ ملک کی توجہ کو جس طرح ممکن ہو آزادی کی تحریک سے

جتا کر کبھی اس طرف تکتا نہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ بعض ہندوستانی حضرات ایسے ہیں جو گوروں کی طرح خیالات ظاہر کرتے اور ارشاد فرماتے ہیں وہ بھی اپنے آقا کی آواز کو دہرایا کرتے ہیں اور جہاں موقع ملتا ہے ہندوستانی تہذیب پر چوٹ کرنے سے نہیں چوکتے۔

سر مالکم کی زبان سے یہ خبر سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ انگریزوں کو بھی ہماری بہبود و ترقی سے دلچسپی ہے اور وہ اس کی راہ دیکھ رہے ہیں کہ ہم سفر کی کٹھنائیاں جھیل کر منزل مقصود تک پہنچ جائیں مگر سوال یہ ہے کہ یہ ہمارے بہبود و ترقی کسے کہتے ہیں اور منزل مقصود سے ان کی کیا مراد ہے۔ اگر گول میز کانفرنس جس کا آج ہر طرف شہرہ ہے کبھی منعقد ہوئی تو یہ راز بھی غالباً کھل جائیگا۔

بے استادی بھی عجیب چیز ہے۔ اگر کوئی دوسرا ہم سے کہتا کہ وقتی جھگڑوں میں زیادہ منہمک نہ ہو بلکہ ابدی مسائل کیطرف توجہ کرو یا سیاسی اور اقتصادی آزادی پر زیادہ زور نہ دو بلکہ ذہنی اور روحانی آزادی کی کوشش کرو تو ہم اپنا سب سے بڑا خیر خواہ سمجھتے لیکن سر مالکم کی زبان سے یہ باتیں سن کر شبہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ ہمیں لامکان و لازمان کا خواب اس لئے تو نہیں دکھاتے ہیں کہ زمان و مکان کو اپنے لئے محفوظ کرلیں، کہیں موصوف کی یہ کشادہ دلی اس بڑے بھائی کی فیاضی تو نہیں ہے جس نے چھوٹے بھائی سے کہا تھا۔

از صحن خانہ تا بہ لب بام از آن من
از سقف بام تا بہ ثریا از آن تو

[illegible]

باہتمام

[illegible] ڈاکٹر ذاکر حسین ایم اے پی ایچ ڈی

[illegible] | ماہ دسمبر ۱۹۲۶ء | [illegible]

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری   ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔اے۔پی ایچ۔ڈی

جلد ۱۳   بابتہ ماہ دسمبر سنہ ۱۹۲۹ء   نمبر ۶

فہرست مضامین

مسئلۂ قضا و قدر*

تعلیم یافتہ اور باخبر مسلمانوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو سید جمال الدین افغانی، اور اُنکے زندہ کارناموں سے واقف نہ ہو، اور یہ نہ جانتا ہو کہ سید صاحب موصوف اپنے مذہب و ملت کے کیسے سچے فدائی، غم خوار اور مسلمانوں کے کتنے بڑے محسن تھے۔

یہ مضمون انہیں کے پرزور، حقیقت شناس قلم اور حساس فکر کا نتیجہ ہے جسے محمد فواد شقارہ طرابلسی نے جو جامعۂ ازہر مصر کے متعلم تھے ۱۳۲۳ھ میں مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے ایک رسالے کی صورت میں چھپوا کر شائع کیا تھا۔ اس کے نشر و اشاعت کا فخر مصر کے مشہور مطبعۃ المنار نے حاصل کیا، چونکہ غرض اس کی اشاعت سے ناشر کی ہے، اسی نے مجھے بھی اس کی اشاعت پر آمادہ کیا کیونکہ ہندوستان کے مسلمانوں نے بھی بدقسمتی سے قسمت اور تقدیر کے معنی نہایت ہی غلط سمجھ رکھے ہیں۔

علامہ سید افغانی (رح) نے مسئلہ قضا و قدر کے ذیل میں جن حکیمانہ باتوں کو حوالۂ قلم کیا ہے کہ ہر شخص مسلمان بلکہ ہر مشرقی شخص کا ان سے واقف ہونا ضروری ہے۔ مولانا کے زورِ قلم کی داد نہ دینا بھی انصاف کا خون کرنا ہے۔

محوی

اپنی مخلوقات میں خدائے تعالیٰ کا ہمیشہ سے یہ دستور رہا ہے کہ انسان کے دلی عقائد کا جسمانی اعمال پر زبردست اثر ہوتا ہے یعنی افعال میں جو کچھ بُرائی یا بھلائی ہوتی ہے اُس کا اصل سرچشمہ عقیدے کی عمدگی یا خرابی ہے۔ اور بارہا ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی عقیدہ انسان کے تمام خیالات پر اس طرح چھا جاتا ہے کہ دوسرے عقائد اور معلومات بھی اسی کے تابع بن جاتے ہیں اور انسان کے تمام اعضا اور جوارح سے اسی عقیدے کے موافق ایسے اعمال ظاہر ہوتے ہیں

جس کا اثر نفس انسانی پر پڑتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان پر خواہ کیسا ہی مفید اور بہتر اصول پیش کیا جائے کیسی ہی بہتری کی بات بتائی جائے، خواہ وہ تعلیمی ہو یا تبلیغ مذہب کے لئے لیکن وہ اسے قبول کرنے میں تامل کرتا ہے اور اس کی بھلائی میں شبہ کرتا ہے۔ اور یہ شبہ بدستور اسے اصل عقیدے کے بالکل منافی اعمال میں مبتلا رکھتا ہے، اصل عقیدے کی ظاہری و معنوی صورت بدل جاتی ہے اور اپنی غلط فہمی یا خبث استعداد کی بدولت اُن سے بے خبر ہوتا ہے۔ وہ ان کا معتقد تو ہو گیا مگر یہ نہیں جانتا کہ اس کے غلط اور گمراہ کن اعتقاد نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ بظاہر کا فریب خوردہ انسان سمجھتا ہے کہ میرے تمام اعمال اُس مبارک اور سچے اعتقاد کا نتیجہ ہیں۔ اس قسم کے انحراف عقیدہ سے مذاہب و ادیان کے بعض اصولی اعتقادات میں تحریف پیدا ہو جاتی ہے اور غالباً کیا بلکہ یقیناً یہی چیز ہر مذہب میں بدعت و گمراہی کی اصلی علت ہے۔ اکثر و بیشتر یہی انحراف عقیدہ اور اس کے توابع و دوسری بدعتیں انسانی طبائع کی بربادی اور اُن سے بدترین اعمال کے ظہور کا سبب ہو جاتی ہیں۔ خدا جسے اس نامبارک بلا میں مبتلا کرتا ہے۔ یہ بلا اُسے ہلاکت و تباہی تک پہنچا دیتی ہے، اور یہ انسان کا بدترین آل کار ہے۔ "اللھم احفظنا"۔ یہی چیز اُن لوگوں کو جو اصل راز سے بے خبر ہیں ایک سچے اور پاک مذہب پر لعن طعن کی زبان کھولنے اور صحیح و حق عقیدے پر نکتہ چینی کرنے پر آمادہ کر دیتی ہے۔ اس لعن و طعن کی بنیاد زیادہ تر اُن سادہ لوحوں کے اعمال ہوتی ہیں جو اس دین کے نام لیوا ہوتے ہیں۔

اسی قسم کے عقائد میں سے ایک عقیدہ قضا و قدر بھی ہے جو اسلام کے سچے اور حق مذہب کے اصولی عقائد میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس مسئلہ پر بہت سے یورپین غفلت کیش نکتہ چینوں نے چیخ پکار مچائی ہے اور بہت خیال آرائیاں کیں ہیں۔ وہ یہ سمجھتے اور کہتے ہیں کہ جس قوم کے افراد میں یہ عقیدہ متمکن ہو گیا ہے اس نے ساری قوم کی ہمت و قوت سلب کر لی ہے۔ اور اُن میں ضعف و انحطاط پیدا کر دیا ہے۔ وہ مسلمانوں کو اس قسم کی بہت سی صفتوں سے

منسوب کرکے نشانۂ ملامت اور ہدفِ ذلت بناتے ہیں، اور اُس کی علت غائی عقیدۂ قضا و قدر کو ٹھہراتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:۔

مسلمان فقر و فاقہ میں مبتلا ہیں۔ وہ دنیا کی تمام قوموں سے جنگی اور سیاسی قوتوں میں پیچھے ہیں۔ ان میں کثرت سے اخلاقی برائیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ مثلاً بہت زیادہ جھوٹ بولنا، باہمی نفاق، بدعہدی و خیانت۔ ایک دوسرے پر حسد، اور بغض و کینہ۔ ان کا شیرازۂ اتحاد منتشر ہو چکا ہے۔ وہ اپنے موجودہ اور آنے والے حالات سے بالکل بے خبر ہیں، وہ نہیں جانتے کہ کیا چیز اُن کے لئے مفید اور کیا مضر رساں ہے۔ وہ ایسی زندگی پر قانع ہیں جس میں کھانے پینے اور سو رہنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ وہ دوسروں کے مقابلے میں برتری حاصل کرنے کا خیال بھی کبھی اپنے دلوں میں نہیں لاتے۔ البتہ جب کبھی کوئی مسلمان اپنے کسی مذہبی بھائی کو نقصان پہنچانے پر آمادہ و قادر ہوتا ہے تو ذرا بھی کوتاہی نہیں کرتا۔ اُن کا خوف و رعب آپس ہی میں ایک دوسرے پر مسلط ہے۔ اور اُن کی قوتیں باہم صرف ہو رہی ہیں۔ دنیا کی دوسری بیدار قومیں لقمہ لقمہ کر کے ان کو چبا تی ہیں اور نگلتی جا رہی ہیں۔ مگر وہ ہر پیش آنے والی مصیبت پر راضی اور ہر حادثے کو انگیز کرنے پر آمادہ ہیں، وہ اپنے مکانوں کے چھوٹے چھوٹے حصوں میں نہایت سکون کے ساتھ رہتے ہیں۔ صبح اپنی چراگاہوں میں جاتے ہیں اور شام کو اپنے دارالامن (گھروں) میں پلٹ کر آتے ہیں۔ یہی اُن کی زندگی کا معیار ہے اور بس۔

مسلمان امراء دولت کے نشہ میں مست ہیں، کھیل کود میں مصروف ہیں۔ نفسانی خواہشوں کی تکمیل میں اپنی عزیز زندگی کی منزلیں آرام سے قطع کر رہے ہیں، حالانکہ اُن کے لئے اور بھی بہت سے فرائض ہیں، جن کے ادا کرنے میں انہیں اپنی عمریں صرف کر دینی چاہئیں۔ مگر یہ ان فرائض کا ادنیٰ حصہ بھی ادا نہیں کرتے۔ اپنی عزیز دولت کو صرف اُن چیزوں پر اٹھاتے ہیں جن میں اپنی حیات کے عزیز لمحات کا شمار رہے ہیں، وہ بھی نہایت فضول خرچی و بے دردی کے ساتھ۔ اُن کے مصارف نہایت وسیع ہیں، مگر مصارف کے ذیل میں کوئی ایسی مد نہیں

جس کا نفع قوم و ملت کو پہنچتا ہو۔ اپنے ذاتی مصالح اور فوائد پر وہ عمومی مصلحتوں اور فائدوں کو بیکار جانکر نہایت بے دردی سے قربان کر دیتے ہیں۔ اُن سے نفرت کرتے اور پس پشت ڈالتے رہتے ہیں۔ اور بسا اوقات دو امیروں کا باہمی تنافر پوری قوم کو تباہ کر ڈالتا ہے۔ اُن میں سے ہر ایک امیر دوسرے کو خوشی سے برباد کرتا ہے اور اس پر اُس کی کسی ہمسایہ حکومت کو مسلط کر کے مسرور و مطمئن ہوتا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ ایک اجنبی حکومت محسوس کر لیتی ہے کہ ان میں ایک فانی قوت اور ضعف قاتل پیدا ہو گیا ہے تو دونوں امیروں کے مقبوضات سے اتنا حصۂ ملک خود ہڑپ کر لیتی ہے جس سے بظاہر اُن کو کوئی تکلیف و تکلف نہ ہو۔ مسلمانوں میں خوف و رعب عام طور پر پھیل گیا ہے۔ بزدلی و کاہلی اُن پر چھا گئی ہے، وہ ہنگامے سے گھبراتے ہیں۔ ذرا سی مصیبت سے چیخ اٹھتے ہیں۔ دوسری قوموں اور حکومتوں کو جو شوکت و قوت حاصل ہے اُسے خود حاصل کرنے سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ یاد رہے کہ اس باب میں وہ کھلم کھلا غلطی پر ہیں وہ اپنے احکام دین کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ باوجودیکہ اپنی ہمسایہ قوموں کے اقدام کو دیکھ رہے ہیں، بلکہ جو قومیں اُنکے اقتدار و اثر میں تھیں وہ بھی اُن سے آگے نکل گئی ہیں اور اپنے حاصل کئے ہوئے مرتبے پر بجا طور پر فخر کر رہی ہیں۔ مگر ہماری حالت یہ ہے کہ جب کسی ایک اسلامی ملک پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے یا کوئی دشمن دست درازی کرتا ہے تو دوسرے ملک کے عاقل مسلمان اُن کی مصائب کو دور یا کم کرنے میں بالکل حصہ نہیں لیتے۔ نہ اُس مظلوم کی امداد کے لئے اٹھتے ہیں۔ ان میں بڑی بڑی ملکی و ملی انجمنوں کا وجود نہیں ہے نہ ایسی خفیہ یا علانیہ مجلسیں ہیں جن کے مقاصد میں یہ باتیں داخل ہوں:۔ مذہبی غیرت اور جوش کو زندہ کرنا، قومی حمیت کے جذبے کو ابھارنا۔ کمزوروں کی دستگیری کرنا، غرباء اور کمزوروں کے حقوق کو طاقتوروں اور سرکشوں کے ہاتھوں پامال نہ ہونے دینا۔ اپنے حقوق کی حفاظت کرنا ...... وغیرہ وغیرہ "

غرض ایسی بہت سی باتوں سے ارباب مغرب مسلمانوں کو متصف کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی

کہتے ہیں کہ اس کا سبب اصلی اور حقیقی سرچشمہ مسلمانوں کا عقیدہ قضا و قدر ہے یعنی "اپنے تمام اہم مقاصد اور معاملات کو قدرت خداوندی کے سپرد کر دینا،، ان لوگوں کا یہ بھی فیصلہ ہے کہ اگر مسلمان اس عقیدے پر یونہیں ہمیشہ قائم رہے تو ایک دن دنیا میں انکا کوئی مرکز و مرتبہ نہ رہے گا۔ اور نہ وہ کبھی عزت کے اعلیٰ مدارج پر قائم ہو سکتے، نہ اپنے حقوق پا سکتے، نہ دوسروں کے مظالم اور حقوق کی پامالی کو دور کر سکتے نہ اپنے کسی بادشاہ کی حمایت کے لئے اٹھ سکتے بلکہ برابر اُن کا قومی زوال بڑھتا اور اُن کے نفوس میں گھن کی طرح اپنا کام کرتا رہے گا۔ اُن کے دلوں کو پیچھے ہٹاتا رہے گا۔ یہانتک کہ اُن کو منتہائے فنا تک پہنچا وے گا۔ (معاذ اللہ خدا نخواستہ) خود اُن میں سے ایک دوسرے کو اپنی ذاتی خصومتوں کی بدولت ہلاک کرے گا۔ اور جو کچھ اُس کے ہاتھوں سے بچ رہے گا اُسے اغیار جھپٹ لیں گے؛

دانایان مغرب کا یہ خیال بلکہ عقیدہ ہے کہ عقیدہ قضا و قدر، اور عقیدہ جبریہ میں (جو یہ کہتے ہیں کہ انسان اپنے تمام افعال و اعمال میں مجبور محض ہے) کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ مسلمان اس عقیدہ تقدیر کی بنیاد پر بالکل اُس تنکے کے مانند ہیں جو ہوا میں معلق ہو۔ ہوا اُسے ہچکولے دیتی رہتی ہے اور جدہر چاہتی ہے بہکا دیتی ہے۔ اور جب کسی قوم میں یہ عقیدہ راسخ ہو گیا کہ اُس کو قول، فعل، حرکت، سکون، غرض کسی میں بھی کچھ اختیار نہیں۔ بلکہ وہ مجبور محض ہے،، اور یہ سب ایک زبردست طاقت، ایک قوی قدرت کے ہاتھ میں ہے تو یقیناً اس قوم کے تمام قوائے بالکل معطل اور بیکار ہو جائیں گے اور خدائے تعالےٰ نے مدارج اور عقل انسانی کا جو حصہ انہیں دیا ہے وہ بالکل معدوم ہو جائے گا۔ اُن کے دلوں سے سعی و عمل کا پاک جذبہ فنا ہو جائے گا۔ اس صورت میں تو ایسی قوم کے لئے سب سے بہتر یہ ہے کہ اس عالم وجود سے ہمیشہ کے لئے سیدھا عالم عدم کا رستہ لے۔

یورپ ہی کے ایک گروہ کا یہ خیال خام اور ذوق فاسد نہیں بلکہ بہت سے ضعیف العقول مشرقی بھی ان کے نقش قدم پر چل پڑے ہیں۔ مگر میں یہ کہتے ہوئے ذرا بھی نہیں جھجکتا کہ یہ

گمان بالکل جھوٹ ہو، یہ خیال سرتاپا غلطی پر مبنی ہے، اور یہ وہم تامتر باطل و بے سروپا ہے۔ یہ گروہ خدائے پاک اور تمام مسلمانوں پر افترا کرتا اور جھوٹا الزام لگاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آج مسلمانوں میں ایک متنفس بھی، شیعہ، سنی، زیدی، اسماعیلی، وہابی یا خارجی ایسا نہیں جو محض جبر کا قائل ہو۔ اور اپنے کو بالکل غیر مختار جانتا ہو۔ بلکہ ان تمام اسلامی فرقوں میں ہر ایک کا یہ اعتقاد ہے کہ ہمیں اپنے اعمال میں یقیناً اختیار کا بھی ایک جز حاصل ہے۔ اور اس فرد کو وہ "کسب" کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اس پر ثواب و عذاب کا دارومدار ہے۔ ان سب کے نزدیک یہ مسلّم ہے کہ خدا نے جتنا اختیار کا حصہ دیا ہے، اس کا محاسبہ کیا جائے گا۔ اُن سے تمام خداوندی احکام کی بجاآوری اور ممنوعاتِ ربانی سے بچنے کا مطالبہ ہوگا۔ یہی اوامر ونواہی دراصل فلاح و خیر کی جانب انسان کو لیجانے والے ہیں اور یہی ہر بہبودی کی طرف راہ نما ہیں۔ اختیار کی یہی وہ قسم ہے جسے تکلیفات شرعیہ کا سرچشمہ کہتے ہیں۔ اور اس پر حکمت و نصفتِ الٰہی کی تکمیل ہوتی ہے۔

ہاں، بیشک، مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا تھا جسے "جبریہ" کہتے ہیں۔ اُس کا یہ مسلک تھا کہ انسان اپنے تمام اعمال میں ایسا مجبور ہے کہ اُسے اختیار کی ہوا تک نہیں لگی۔ اُس کا خیال تھا کہ آدمی کھانے اور چبانے کے لئے اپنے جبڑوں کو جو حرکت دیتا ہے، شدت سردی سے کپکپاتا ہے، اس میں بھی مجبور محض ہے مگر عام مسلمان اسے "لاادریہ" کے جاہلانہ اور فاسدانہ نزاعات میں شمار کرتے ہیں۔ اس عقیدے کے قائل چوتھی صدی ہجری کے آخر میں دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔ اُن کا نام ونشان تک آج صفحۂ ہستی پر باقی نہیں۔ نہ عقیدۂ قضا و قدر "بعینہ" عقیدۂ جبر" ہرگز نہیں ہے۔ اور نہ اس عقیدے کے وہ نتائج اور مقتضیات ہیں جو یہ مغربی وہمی اور خیالی پلاؤ پکانے والے سمجھے ہوئے ہیں۔

اب رہا "عقیدۂ تقدیر" اس کی تائید ایک زبردست دلیل سے ہوتی ہے۔ بلکہ خود فطرت اس کی طرف راہ نمائی کرتی ہے۔ جس کو غور و فکر کا مادہ قدرت نے دیا ہے۔

اس کے لئے یہ کچھ دشوار نہیں کہ ہر پیش آنے والی چیز کی طرف ایک نگاہ ڈالے اور تھوڑا اقتضا سے کام لیکر یہ سمجھے کہ ہر پیش آنیوالی چیز کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے، جو دنیا میں اُس کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ غور و فکر کرنے والا اس سلسلا سباب میں انہیں اسباب کو دیکھ سکتا ہے جو خود اُس کے پیش نظر ہوں۔ اور ان کے ماضیات کو اُس خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا جو خود اس کے نظام کو عدم سے وجود میں لانیوالا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر ایک سبب کا اپنے آگے آنے والے واقعات میں کچھ نہ کچھ دخل ضرور ہوتا ہے۔ اور یہ خود خدائے عزیز و علیم کا مقرر کیا ہوا نظام ہے۔ انسانی ارادہ اس سلسلہ کی کڑیوں میں سے صرف ایک کڑی ہے۔ یہ ارادہ بھی آثار و ادراک کا ایک نشان واضح ہے ادراک کیا چیز ہے؟ نفسانی خواہشات کا علم جو حواس اور شعور پر صادر ہوتی ہیں اور جو انسانی فطرت میں ودیعت کی گئی ہیں اُن سے نفس کی اثر پذیری کائنات کے ظاہری حالات کو ارادہ و فکر پر جو قدرت و تسلط حاصل ہے اُس سے کوئی بیوقوف سے بیوقوف بھی انکار نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ عقلمند آدمی! ۔ جن اثرات کو تم مظاہر میں موثر دیکھتے ہو۔ ان سب کا مبدا اُس کائنات کے مدبر اعظم کے ہاتھ میں ہے۔ جس نے تمام اشیاء کو اپنی حکمت و مصلحت کی بنیاد پر پیدا کیا ہے۔ اور ہر نو پیدا کو اپنی ہی جیسے کا تابع بنایا ہے۔ گویا وہ اس کا ایک بدل ہے۔ خاصکر عالم انسانی میں۔

اگر ہم فرض کرلیں کہ ایک جاہل ایسے معبود کے ماننے سے منکر ہے جو اس عالم کا بنانے اور ایجاد کرنے والا ہے، پھر بھی اُس کے امکان سے یہ باہر ہے کہ بشری ارادوں میں حوادث زمانی اور موثرات طبعی کی تاثیر کو ماننے سے وہ پہلو تہی کرے۔ کیا کسی انسان کے امکان میں یہ ہے کہ وہ اپنے کو خدا کے اس قانون و قاعدے سے الگ رکھ سکے۔ جو اُس کی مخلوق میں جاری اور نافذ ہے۔ یہ وہ بات ہے جسے تمام طالبان حق و صداقت مانتے ہیں۔ واصلین کا تو کہنا ہی کیا ہے۔

اس کے علاوہ یورپ کے بعض فلاسفہ اور علمائے سیاست خود قضا و قدر کی طاقت و سطوت کے آگے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو چکے ہیں۔ اور انہوں نے بہت تفصیل سے اثبات

عقائد پر اپنے بیانات و مضامین میں کام لیا ہے۔ مگر ہمیں اُن کی آرا، و افکار سے سند و شہادت پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

تاریخ کے لئے روایت سے بالاتر ایک علم اور ہے۔ جس کی طرف ہر قوم و ملت کے علماء نے اپنی پوری توجہ صرف کی ہے۔ یہ وہ علم ہے جو قوموں کے عروج و زوال، انحطاط و اقبال کے باب میں اُن کی اخلاق و سیرت سے بحث کرتا ہے، اور اہم ترین حوادث کے عام و خاص وجوہ، اصلی راز و خصائص سے پتا چلاتا ہے کہ اُن کے عادات اور خیالات کیا ہوں گے۔

اس کے تابع قوموں کے نشو و ارتقا اور نئی حکومتوں کا وجود میں آنا۔ یا بعض قوموں کا فنا ہونا، کہنہ و فرسودہ ہونا، غرض کیا کیا تغیرات ہوتے ہیں۔ کیا کیا صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان سب سے زیادہ اہم اور بلحاظ فائدہ سب سے بالاتر قرار دیا ہے۔ اس علم کی بنیاد بحث عقیدۂ قضاء و قدر پر ہے اور اسی یقین و ایمان پر کہ تمام بشری طاقتیں، مدبر کائنات (باری تعالیٰ) ہی کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ جو کائنات کا منتظم اور واقعات و حادثات کو عمل میں لانے والا ہے اور اگر قدرت بشری بلحاظ اثر اندازی کچھ قادر و موثر ہوتی تو نہ کوئی بلند مرتبہ آدمی زوال کا شکار ہوتا۔ نہ کوئی ضعیف و کمزور طاقت ور ہو سکتا نہ کوئی اپنے مرتبے سے گرتا اور نہ کسی سلطنت و سطوت کا بھی خاتمہ ہوتا۔

قضاء و قدر کا مسئلہ اگر جبر محض کی بد اثری سے الگ ہو تو یہ حقیقت ہو کہ اس کے ساتھ ہی جرأت و اقدام کی صفت اور بہادری و دلاوری کی خصلت ظہور میں آتی ہے۔ یہ عقیدہ آدمی کو ہلاکت آفریں معاملات میں گھس پڑنے پر آمادہ کر دیتا ہے۔ وہ معاملات جن سے بڑے بڑے شیروں کے دل لرزتے اور جن سے دلاور چیتوں کے پتے پانی ہو جاتے ہیں۔ یہی اعتقاد نفوس انسانی کو ثبات کا خوگر، مصائب کی برداشت کا عادی، اور ہولناک مہمات میں کود پڑنے کا متحمل بنا دیتا ہے۔ انسان کو سخاوت و دریا دلی کے نفیس زیوروں سے آراستہ کر دیتا ہے۔ ہر اُس چیز پر آمادہ کر دیتا ہے۔ جو آدمی پر گراں ہو سکتی ہے بلکہ انہیں اپنی جانیں فدا کر ڈالنے، مثالی

حیات سے کنارہ کش ہو جانے تک پر خوشی تیار کر دیتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ حق و انصاف کی راہ میں صرف اُسکا عقیدۂ قضا و قدر ہی آمادہ کرتا ہے۔

جو یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ زندگی محدود ہے۔ رزق مقرر ہے۔ تمام اشیاء اور اُن کا نظام خدا کے ہاتھ میں ہے، وہ انہیں جس طرح چاہتا ہے تصرف میں لاتا ہے ظاہر ہے کہ ایسا آدمی حق و صداقت کے لئے مدافعت کرنے میں موت کی کیا پرواکر سکتا ہے، اپنی قوم و ملت کا بول بالا ہونے نیز خدا نے جو فرض اُس پر عائد کیا ہے اُس کے بجالانے میں موت سے کیا ڈر سکتا ہے۔ اپنے عزیز مال و دولت کو حمایتِ حق، اور اپنے مجد و شرف کے استحکام میں صرف کرنے پر، اور وہ بھی اوامر خداوندی کے بموجب، نیز انسانی تمدن و اجتماع کے موافق، وہ تنگ دستی و فقر کے خوف سے کیا اثر پذیر ہو سکتا ہو۔

خدائے بزرگ و برتر نے اس عقیدے کی بنیاد پر مسلمانوں کی تعریف کی اور فضیلت بیان فرمائی ہو۔ وہ ارشاد فرماتا ہے :-

الذین قالوا ان الناس قد جمعوا لکم فاخشوہم
فزادہم ایماناً و قالوا حسبنا اللہ و نعم الوکیل ۝
فانقلبوا بنعمۃ من اللہ و فضل لم یمسسہم سوء
واتبعوا رضوان اللہ واللہ ذو فضل عظیم ۝

مسلمانوں نے اپنی نشأت اولین میں اقطار عالم کی طرف پیش قدمی کی اُن کو فتح و تسخیر کرتے، اور اُن پر اپنی سطوت و جبروت کا سکہ قائم کرتے چلے گئے۔ اس شان سے کہ انسانی عقلیں محو تعجب رہ گئیں اور فہم و خرد سراپا تصویر تھی۔ یہ دیکھکر کہ بڑی بڑی باجبروت حکومتوں کی انہوں نے اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اور زبردست قوموں کو مغلوب کرلیا۔ اُن کی حکومت کا سکہ برنیز کے پہاڑوں سے، جو اسپانیا اور فرانس کے درمیان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دیوار چین تک رائج ہوگیا باوجودیکہ اُن کی تعداد قلیل تھی اور مختلف آب و ہوا کے خوگر، رنگا رنگ ممالک کے موسمی اثرات کے

مادی نہ تھے۔ بڑے بڑے گردن فراز بادشاہوں کی ناکیں رگڑوا دیں۔ پرشوکت قیصروں اور کسراؤں کو مجبور ومقہور کر دیا۔ اور وہ بھی اتنی قلیل مدت میں جو اسّی سال سے زیادہ نہیں لی جا سکتی۔ حقیقت میں یہ چیز خوارق عادات اہم ترین معجزات میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ یہ مافوق الفطرت ہے۔ مسلمانوں نے بڑے بڑے ممالک کو زیرنگیں کیا۔ سربفلک دمسوں اور ٹیلوں کو ملیامیٹ کر دیا، زمین کے اس ساتویں طبقے پر جنگی گرد وغبار سے ایک آٹھواں طبقہ ورکھڑا کر دیا۔ انہوں نے پہاڑوں کی چوٹیوں کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے روند ڈالا۔ اور اُن کی جگہ اُن کی سطوت کے خلاف سر اٹھانے والوں کے سروں سے پہاڑ اور ٹیلے کھڑے کر دئے ہر دل کو لرزا دیا۔ اور ہر شانے کو پھڑکا دیا۔ دیکھو تو ان کو ان مہموں میں آگے بڑھانے والا عقیدۂ قضا وقدر کے سوا کون تھا۔

یہ اعتقاد ہی وہ زبردست قوت ہے جس کی بنیاد پر مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کے قدم اُن جرار لشکروں کے سامنے جمے رہے اور نہ ڈگے۔ جن سے قضائے الٰہی برہم تھی۔ اور یہ بسیط ارض ان پر تنگ ہو گیا تھا پس ان جاں باز ٹکڑیوں نے دشمنوں کو اُنکے مرکزوں سے ہٹا دیا۔ اور پیچھے پاؤں لوٹا دیا۔

اسی اعتقاد کی بدولت مشرق میں اُن کی خارا شگاف تلواریں چمکیں اور اُنکے جہاں سوز شعلوں نے جنگ کی آندھیوں میں مغرب کے برگشتہ نصیبوں کو خاک کر دیا۔ یہی اعتقاد تو ہے جس نے مسلمانوں کو اپنی دولت اموال لٹا دینے پر آمادہ کر دیا تھا۔ اور اپنی تمام املاک کو محض اپنی قومی حکومت کے اعلار کلمہ (بول بولا) کے لئے خرچ کر کے، نہ وہ فاقے سے ڈرتے تھے۔ نہ فقر کے اندیشے سے سراسیمہ وپریشان ہوتے تھے۔ یہی اعتقاد تو ہے جس نے مسلمانوں پر یہ اثر کیا کہ وہ اپنی بیویوں، بچوں، اور جو کچھ اُن کی گودوں میں تھا۔ سب کو جدال وقتال کے میدانوں میں لیکر پہنچ جاتے تھے۔ اور وہ بھی دنیا کے بالکل آخری سرے تک اور اس طرح جیسے سیر وتفریح کے لئے باغوں کو جا رہے ہیں، گویا وہ اپنی جانوں کا ہر آفت وبلا سے خدا کے

بھروسہ کا بیمہ کرا چکے تھے۔ اور اپنی عزیز جانوں کے گرد انہوں نے خدا پر بھروسہ کا ایک مضبوط حصار تیار کر لیا تھا۔ وہ حصار جو رات کی آنے والی تاریکیوں میں آنے والی مصیبت سے اُن کے بچوں، اور بیویوں کو محفوظ رکھ سکتا تھا۔ وہ بیوی، بچے جنہیں یہ مٹھی بھر مسلمان اپنی فوج ظفر موج کو پانی پلانے اور دیگر لوازمات کی فراہمی و خدمت پر مامور کرتے تھے۔ ان معرکوں میں عورتیں اور بچے جوانوں اور بوڑھوں سے الگ نہیں رہتے تھے۔ نہ اُن میں کوئی مابہ الامتیاز فرق رکھا جاتا تھا۔ نہ عورتوں پر کوئی خوف طاری ہوتا تھا۔ نہ بچوں پر کوئی خطرہ کی حالت۔ یہی وہ اعتقاد تھا جس نے مسلمانوں کو اس حد پر پہنچا دیا تھا کہ اُن کا نام لینا دلوں کو دہلا دیتا تھا۔ اور جگر کے ٹکڑوں کو پراگندہ کر دیتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ صرف رعب سے فتح حاصل کر لیتے تھے اور اپنے دشمنوں کے دلوں کو نشانہ بناتے چلے جا رہے تھے۔ وہ محض اپنی سیاہ رعب و سطوت سے دشمنوں کو شکست دیدیتے تھے۔ قبل اس کے کہ دشمن اُن کی تلواروں کی بجلیوں کو کوندتا ہوا دیکھیں۔ اور اُن کے بھالوں، برچھیوں اور نیزوں کی تڑپ اور چمک کا روح فرسا نظارہ کریں بلکہ اس سے بھی پہلے کہ دشمنوں کے حدود میں مسلمانوں کے لشکر پہنچیں۔

میں روتا ہوں اُن بزرگوں پر اور نوحہ و ماتم کرتا ہوں ان اسلاف پر۔ کہاں ہو تم اے حزب اللہ؟ کہاں ہو تم اے انصار اللہ! کہاں ہو تم اے بہادری اور دلاوری کے اٹل جھنڈو! کہاں ہو تم! اے قوت و شوکت کے بلند ستونو؟ کہاں ہو تم اے شرفاء کی اولاد امجاد؟ اور مصیبت کے وقتوں میں مظلوموں کے فریاد کو پہنچنے والو؟! کہاں ہو تم اے

خیر أمتہ اخرجت للناس تأمرون

بالمعروف وتنہون عن المنکر ؟

کہاں ہو تم اے شرفاء و معزز لوگو؟! اے عدل و انصاف کے علم بردارو! اے مساوات کے قائم کرنے والو! اے حکمت کی بات بسنے والو! اے امت کی بنیاد رکھنے اور مضبوط کرنے والو! تم اپنی قبروں کے شگافوں سے کیا نہیں دیکھتے کہ تمہارے خلف کس درجہ کو پہنچ گئے ہیں؟ اور تمہاری

اولاد کس مصیبت کا شکار ہے ؟ تمہارے لگائے ہوئے پودے میں کیا گھن لگ رہا ہے ؟ آہ! یہ تمہارے نقوش قدم سے ہٹ گئے، یہ تمہارے طریقوں سے دور ہو گئے، تمہارے راستے سے الگ جا پڑے ہیں، ٹکڑیاں ٹکڑیاں ہو گئے ہیں، ضعف و انحطاط کی آخری حد کو پہنچ گئے ہیں۔ ان پر افسوس و تاسف سے دل پانی پانی، رنج و حزن سے جگر ٹکڑے ٹکڑے ہوئے جاتے ہیں۔ وہ آج غیر قوموں کے شکار ہیں۔ آج اتنی سکت نہیں رکھتے کہ اپنے دائرہ حکومت سے مدافعت کر سکیں۔ دشمنوں کو اپنے احاطۂ مملکت سے باہر نکال سکیں۔ کیا تمہارے بزرگوں میں کوئی اتنا پکار کر کہنے والا نہیں جو غافلوں کو ہشیار اور سوتوں کو بیدار کرے۔ گمراہوں کو سیدھا راستہ بتلائیے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

میں کہتا ہوں، اور کسی ایسے خام خیال سے نہیں ڈرتا جو مجھ سے میرے اس قول میں بحث کرے، کہ انسانی تمدن و اجتماع کے آغاز تاریخ سے آج تک کوئی ایسا زبردست فاتح نہیں پایا جاتا۔ اور نہ ایسا جنگجو گزرا جو متوسط طبقے میں پیدا ہوا ہو۔ اور محض اپنی ہمت سے ترقی کر کے اعلیٰ مدارج تک پہنچ گیا ہو۔ کہ بڑے بڑے سورما اس کے آگے جھک گئے ہوں اور گردنیں اس کے آگے خم ہو گئی ہوں۔ اس نے ملک و حکومت کو اتنا وسیع کر لیا ہو کہ موجب حیرت ہو۔ اور اپنی فکر کو حصول منافع کے لئے انتہائی حد تک جولانی دی ہو۔ مگر یہ کہ وہ قضا و قدر کا ضرور قائل ہوگا "سبحان اللہ" انسان اپنی زندگی پر حریص ہے، وہ فطرت و جبلت کے موافق اپنے کو زندہ و برقرار رکھنے کا آرزومند ہے، پھر وہ کیا چیز ہو سکتی ہے جو اس کے لئے ہولناکیوں میں گھس پڑنے، اور خطرناک مہموں میں در آنے، موت و فنا سے دو بدو مقابلہ کرنے کو آسان کر دے۔ اور کچھ نہیں صرف یہی عقیدۂ قضا و قدر ہے۔ اور دل کو اس اعتقاد پر ثابت رکھنا!۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ کورش فارسی (کے خسرو) جو تاریخ قدیم میں دنیا کا پہلا فاتح تھا۔ اس کے وسیع ترین فتوحات کے سلسلے کو جس چیز نے جاری رکھا وہ یہی قضا و قدر کا اعتقاد تھا۔ اس اعتقاد کی وجہ سے کوئی خطرہ اسے ہراساں اور کوئی مصیبت اس کے عزم کو شکست نہیں

کرتی تھی۔ یونان کا اسکندر اعظم بھی انہیں لوگوں میں تھا جن کے دلوں میں یہ عقیدۂ جلیلہ راسخ تھا چنگیز خاں تاتاری، صاحب فتوحات مشہورہ بھی اس عقیدے کے لوگوں میں تھا۔ بلکہ نپولین اول بوناپارٹ (فرانسیسی) قضا وقدر پر سب سے زیادہ استوار رکھنے والا سردار تھا۔ یہی عقیدہ تو تھا جو اس کے مختصر سے لشکر کو ایک ٹڈی دل پر بڑھائے لئے چلا جا رہا تھا۔ اس کے لئے فتح ونصرت کے سامان پیدا کر رہا تھا، اور وہ حسب آرزو فتح حاصل کرتا چلا جاتا تھا۔

پس کیا اچھا اعتقاد ہے وہ، جو نفوس انسانی کو نامردی و بزدلی کی کثافت سے پاک کرے۔ وہ بزدلی جو اپنے مبتلا کو اس کے طبقے میں درجۂ کمال پر پہنچنے سے سب سے پہلا مانع ہو۔ ہاں! بیشک! میں اس سے انکار نہیں کروں گا کہ اس عقیدے کو بعض عوام مسلمانوں کے دلوں میں عقیدۂ جبر کے شائبوں سے مخلوط کر دیا ہے۔ اور یہی خلط ملط بعض مصائب میں ان کے گھر جانے کا سبب ہو گیا۔ جس کی وجہ سے آخری صدیوں میں اُن کو چند حوادث نے گھیر لیا۔

اب ان علماء عصر سے جو راسخ العقیدہ ہیں۔ ہماری یہ استدعا ہے کہ اس مبارک عقیدے پر جو بدعات وغیرہ طاری ہو گئے ہیں۔ اُن سے اسے چھڑانے اور بچانے پر کوشش و توجہ مبذول کریں۔ عامۃ الناس کو سلف صالحین کے عقیدے یاد دلائیں۔ اور جو کچھ وہ کرتے تھے۔ ان میں بھی اس کا رواج پھیلائیں۔ ہمارے ملت کے امام جیسے غزالی اور اُن کے مانند دیگر علماء نے جو کچھ بیان کیا ہے کہ قضا و قدر پر توکل وتکیہ کا اصل مفہوم کیا ہے۔ اس کو سمجھائیں کہ شریعت غراء تو ہم سے عمل میں توکل چاہتی ہے نہ کہ غفلت اور کاہلی و سستی میں۔ نہیں خدا نے یہ حکم نہیں دیا ہے کہ اپنے فرائض کو چھوڑ دیں۔ جو ہمارے حیاتی و قومی واجبات ہیں، خدا پر توکل کرکے اُن سے کنارہ کش ہو جائیں۔ یہ دلیل تو دین سے نکل جانے اور پھر جانے کی ہے۔ اہل اسلام میں سے کوئی بھی اس میں شک نہیں کر سکتا کہ اس وقت ہر مسلمان مکلف پر "دفاع عن الملۃ" فرض عین ہے۔ اس وقت کوئی ایسی چیز نہیں جو مسلمانوں کو اُن کے عقائد حقہ کی طرف طبقت کرے،

اُن کی جماعت کے بکھرے ہوئے شیرازے کو جمع کرے اُن کی عزت وعظمت کو دوبارہ دلائے، اپنی پہلی شان دوبارہ حاصل کرنے کے لئے اُن کی غیرتوں کو ابھارے۔ سو علماء کی بہترین دعوت ہے۔ اور یہ انہیں علماء کے ذمے اور انہیں کی توجہ پر منحصر ہے۔

اب رہا مسلمانوں کا انحطاط، اور دوسری قوموں سے پیچھے رہنا، اس کا سبب نہ یہ عقیدہ ہے اور نہ اسلامی عقائد میں سے کوئی اور دوسرا عقیدہ۔ اس عقیدے کی طرف مسلمانوں کے قومی انحطاط کی نسبت کرنا، گویا ایک نقیض کی نسبت دوسری نقیض کی طرف کرنا ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ ایسا ہے جیسے حرارت کی نسبت برف کی طرف اور برودت کی آگ کی طرف۔ ہاں! مسلمانوں کی نشأت کے بعد اُن کی فتح وظفر کو دھچکا لگا اور اُن کے اقتدار وعظمت کو صدمہ پہنچا۔ وہ یہ کہ مسلمان اس عالم ترقی میں تھے کہ اچانک دو زبردست صدمے اُن پر ٹوٹ پڑے۔ ایک مشرق سے۔ یہ تاتاریوں یعنی چنگیز خاں اور اس کے اخلاف کی غارتگری تھی۔ دوسرا صدمہ مغرب کی جانب سے۔ یہ یورپین اقوام کا اپنی پوری طاقت سے مسلمانوں پر حملہ تھا۔ بڑھتی ہوئی حالت میں ایکدم ایسا صدمہ انسان کی صحیح رائے کو کھو دیتا ہے۔ اور بتقاضائے فطرت دہشت وخوف اور پھر غشی وبے ہوشی کا سبب ہو جاتا ہے۔ آخر یہی ہوا۔ اس کے بعد مسلمانوں میں مختلف حکومتیں رہیں۔ امارت ناا ہلوں کے ہاتھ آئی۔ اور رہبات کی باگ ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچی جو ریاست کے حسن وخوبی سے بیگانہ تھے۔ یہی حکام اور امراء مسلمانوں کے اخلاق اور طبائع میں نقائص پیدا کرنے والے جراثیم تھے۔ اور اُن پر ادبار وبدبختی کی بلا لانے والے۔ اس سے مسلمانوں کے نفوس میں ضعف جاگزیں ہو گیا۔ اور اُن میں سے بہتوں کی نظریں جزئیات تک محدود ہو کر رہ گئیں۔ جو موجودہ لذت ولطف سے متجاوز نہ تھیں۔ ان میں سے ہر ایک نے دوسرے کی کھوپری پکڑلی اور ہر پہلو، ہر صورت سے اس کو نقصان پہنچانے اور تباہی وخرابی میں مبتلا کرنے کی ٹوہ میں رہنے لگے۔ وہ بھی بغیر کسی صحیح ومناسب سبب۔ اور کسی قوی وواقعی باعث کے اس کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھنے لگے۔ آخر اُن کا ہر شعبۂ حیات ضعف وپاس تک پہنچ گیا، جو آج نظر آرہی ہے۔

مگر میں یہ دیکھتا اور کہتا ہوں کہ یہ قوم کبھی مردہ نہیں ہو سکتی جبکہ یہ پاکیزہ عقائد اس قوم کے دلوں میں راسخ اور اپنے صحیح مرکز پر ہیں اور جب تک ان عقائد کے نقوش انکے ذہنوں میں تاباں نظر آتے ہیں۔ اس وقت جو مرض بھی عقلی ہو کہ نفسی ان کو عارض ہو گیا ہے ان عقائد صحیحہ کی قوت اُسے دفع کرے گی۔ وہ انشاء اللہ پھر اُسی حالت پر پہنچ جائیں گے جس پر پہلے تھے۔ اور اپنے مضبوط بندھنوں سے نکل جائیں گے۔ اپنے ممالک کو نجات و آزادی دلاسکیں طامع و حریص اقوام کو مرعوب و خوف زدہ کرنے میں حکمت و بصیرت کے جو طریقے ہیں وہ اختیار کریں گے۔ اور انہیں اُن کی حد پر رکھنے میں کامیاب ہوں گے۔ یہ شکل آسان ہونا دور نہیں ہے، تاریخی واقعات اس کی تائید کرتے ہیں۔ تم ذرا انہیں ترکوں کو دیکھو۔ جو اسی قوم کے زبردست صدمات اور نقصانات کے بعد بیدار ہوئے ہیں۔ (یعنی تاتاری اور صلیبی جنگوں کے بعد) انہوں نے اپنے جرار لشکر اطراف عالم میں دوڑا دیے۔ اور فتوحات کے میدان اُن کے لئے برابر وسیع ہوتے چلے گئے۔ انہوں نے بڑے بڑے ملکوں کو روند ڈالا۔ گردن فراز بادشاہوں کی ایڑیاں رگڑوا دیں۔ اور یورپ کی حکومتوں کی گردنیں اپنی سطوت و جبروت کے آگے جھکوا دیں۔ حتیٰ کہ دول یورپ عثمانی سلطان کو "سلطان اعظم" کے نام سے یاد کرتی تھیں۔

پھر اب ذرا نظر پھیر کر دیکھو! تم اب بھی ان میں ایک لہر اور ایک حرکت پاؤ گے۔ آخری حادثات کے انجام، اور نامبارک نتائج کے بعد جو خوفناک اثرات ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ ترکوں میں یہ حرکت اُن سے پیدا ہوئی ہے۔ یہ حرکت ترکوں کے ارباب دانش و بصیرت کے افکار و خیالات میں ساری ہو گئی ہے۔ انکے ملک کے اکثر حصوں میں، مشرق و مغرب میں حمایت حق کے لئے بہترین لوگوں کی جماعتیں بن گئی ہیں۔ جنہوں نے اپنی جانوں پر عدل و انصاف کی مدد، شریعت و قانون کی اعانت، اور سعی و عمل کو فرض کر لیا ہے۔ اپنے افکار و خیالات پھیلانے اور اتحاد کے منتشر شیرازے کو جمع کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ وہ متفرق ٹکڑیوں کو ملانے پر کامیاب ہو گئے ہیں انہوں نے اپنے کاموں کی فہرست میں سب سے چھوٹا کام ایک عربی اخبار کا اجرا

قرار دیا ہے، تاکہ جو کچھ اُس میں لکھا جائے دور دراز مقامات پر رہنے والوں تک پہنچ جائے۔ دوسرے اُن کی نسبت جو کچھ دل میں لئے ہوئے ہیں وہ اُن تک منتقل ہو جائے۔ میں دیکھتا ہوں کہ بہترین سیاسی انجمنوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ ان انجمنوں کو ان کے ارادوں میں کامیابی ہو۔ ان کا جو سچا اور حق مقصد ہے۔ تائید الٰہی اس کے شامل حال رہے۔ اور اُسی کے فضل و کرم سے مجھے یہ بھی توقع ہے کہ ان انجمنوں کی حسن سعی کا کوئی ایسا اثر مرتب کرے جو مشرقیوں کے لئے عموماً اور مسلمانوں کے لئے خصوصیت سے مفید ہو گا۔ انشاء اللہ۔

ادبیات ایران کی ترقی میں

سلطان محمود غزنوی کا حصہ

(بسلسلۂ گذشتہ)

محمود غزنوی کی علمی قدردانیاں اس سے پہلے آپ جو کچھ پڑھ چکے ہیں اُس سے آپنے اندازہ کیا ہوگا کہ محمود غزنوی کی ادبی قدردانیوں نے ایرانی شاعری اور زبان کو عروج کمال پر پہنچا دیا تھا لیکن اس نے ادبی قدردانی اور شعرا نوازی پر ہی اکتفا نہیں کی تھی بلکہ اس کے ساتھ وہ علماء کا بھی ویسا ہی قدردان تھا۔ اگر ایک طرف عنصری فردوسی اور فرخی جیسے مایۂ ناز شعرا اس کے دربار کی زینت تھے تو دوسری طرف البیرونی احمد بن حسن میمندی اور بیہقی اور ابن الخمار جیسے مشہور اہل علم اس کی قدر افزائیوں کے خوشہ چیں تھے۔ علماء کی صحبت سے فیض حاصل کرنیکا اسے شوق نہیں حرص تھی۔ مشہور علماء کو اپنے دربار میں لانے کے لئے وہ اپنی پوری کوشش صرف کرتا تھا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ خوارزم شاہیوں سے معرکہ آرائی کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ بیرونی اور دوسرے علماء کو حاصل کرے۔ اور وہ اپنے اس مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہوا۔ اس نے بو علی سینا کو بھی اپنے دربار میں بلانے کی کوشش کی لیکن اُس نے متعدد مصالح کی بنا پر اس کو قبول نہیں، اور بدقسمتی سے محمود کا دربار ایک ایسے نادرۂ روزگار عالم سے محروم رہا۔ بیرونی کے علاوہ اس کے دربار میں احمد بن حسن میمندی اور دیگر علمائے وقت بھی موجود تھے گو انہوں نے کچھ ایسی نمایاں شہرت حاصل نہیں کی لیکن کوئی شک نہیں کہ یہ اپنے وقت کے کامیاب لوگوں میں تھے اور محمود کے دربار کی زینت تھے۔ یہاں مختصر طور سے محمود کے دربار کے بعض مشہور علماء کا مختصر طور پر تذکرہ کیا جاتا ہے۔

بیرونی[1]

البیرونی کی پیدائش خیوا یا خوارزم[1] کے ایک قریہ میں ہوئی ۔ سنہ پیدائش ۳۶۲ھ (۹۷۳ء) ہے بعض مورخین نے اسکا وطن سندھ بتایا ہے لیکن انہیں اس بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے سندھ میں نیرون (بالنون) ایک قصبہ تھا جسے بعض مورخین نے بیرون پڑھ لیا اور بیرونی کو اسی بیرون کا باشندہ سمجھ لیا لیکن یہ قطعی طور پر ثابت ہے کہ وہ مضافات خوارزم کے ایک قریہ کا رہنے والا تھا ۔ جس کا نام غالباً بیرون تھا (یا وہ بیرون شہر کا رہنے والا تھا) بیرونی کے ابتدائی حالات تاریکی میں ہیں اتنا معلوم ہے کہ اس کی ابتدائی تربیت آل عراق (خوارزم کا شاہی خاندان) کی سرپرستی میں ہوئی ۔ خصوصاً ابونصر منصور بن علی بن عراق نے اس کی طرف خاص توجہ کی افسوس ہے کہ باوجود بہت کچھ تلاش و تفحص کے بیرونی کا سلسلہ نسب دریافت نہ ہو سکا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے والدین کی کوئی غیر معمولی حیثیت نہیں تھی ۔ کسی معاصر شاعر نے اس کے مجہول النسب ہونیکا طعنہ بھی دیا ہے لیکن بیرونی نے اسکا نہایت معقول اور مناسب جواب دیا ہے ، کوئی شبہ نہیں کہ اسکی عظمت و شہرت بجز ذاتی کمال کے کسی دوسری چیز کی مرہون منت نہ تھیں ۔

بیرونی نے جس زمانہ میں جنم لیا تھا وہ عجمی ممالک میں علوم و فنون کی اشاعت کے لحاظ سے

---

[1] "البیرونی" کے نام سے انجمن ترقی اردو کی جانب سے بیرونی کی سوانحعمری شائع ہو چکی ہے از نوشتہ سید حسن برنی علیگ ، ہم نے اسی کتاب کو زیادہ تر اپنا ماخذ قرار دیا ہے ۔ اس کے علاوہ (کتاب الہند مرتبہ ڈاکٹر خود غیرہ) بھی دو تین کتابیں پیش نظر ہیں لیکن زیادہ تر مدد اسی سے لی گئی ہے حسن برنی صاحب شکریہ کے مستحق ہیں کہ بیرونی جیسی عظیم الشان شخصیت کی ایک مستند سوانح حیات لکھکر انہوں نے علمی طبقہ پر احسان عظیم کیا ہے ۔

[2] مقدمہ کتاب الہند از زاخو ۔

نہایت شاندار دور تھا۔ وسط ایشیا کا ہر ہر حصہ علوم و فنون کا مرکز بن رہا تھا۔ بیرونی سے پہلے ان ممالک میں علم و فضل میں ممتاز شخصیتیں پیدا ہو چکی تھیں۔ خود بیرونی اور ابن سینا اس کا زندہ ثبوت ہیں۔ بیرونی کی تربیت بھی تمام تر علمی ماحول میں ہوئی۔ ابو نصر منصور جس نے اس کی تربیت کی جانب خاص طور پر توجہ کی تھی خود بھی اس زمانہ کا زبردست فاضل اور علوم ریاضی کا ماہر تھا۔ اس نے بیرونی کے نام متعدد کتابیں بھی معنون کی تھیں۔ بیرونی نے ایک قصیدہ میں اپنے محسنوں کے احسانات کا اعتراف کیا ہے اور آل عراق کے سلسلہ میں ابو نصر منصور کا خاص طور پر تذکرہ کیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے

مضیٰ اکثر الایام فی ظل نعمۃ
علی رتبۃ فیہا علوت کراسیا
فآل عراق قد غذونی بدرّہم
ومنصور منہم قد تولیٰ غراسیا

۲۳ سال کی عمر تک بیرونی اپنے وطن میں حکومت کی زیر سرپرستی علمی تحقیقات میں مصروف و منہمک رہا۔ بالآخر اس کے مربیوں کی حکومت ختم ہو گئی تو اسے ترک وطن پر مجبور ہونا پڑا کئی سال تک وہ پریشانی کی حالت میں ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا۔ آخر کار شمس المعالی والی جرجان و طبرستان کے دربار میں کسی طرح اس کی رسائی ہو گئی۔ یا یہ کہ شمس المعالی نے خود اسے اپنے ہاں مدعو کیا۔ شمس المعالی خود ایک بڑا ادیب اور فاضل تھا۔ علوم حکمیہ سے اسے خاص تعلق تھا اسی لئے اس نے بیرونی کی زیادہ سے زیادہ عزت کی لیکن وہ ایک سخت گیر حکمران تھا بیرونی کو بھی اس کی یہ عادات پسند نہیں تھیں اس لئے وہ زیادہ عرصہ تک وہاں نہیں رہا۔ اس زمانے میں علی بن مامون خوارزم کا حکمران تھا اسے جب بیرونی کی قدر و منزلت معلوم ہوئی۔ نیز شمس المعالی سے اس قدر تقرب کے حالات سنے تو اس نے خود اپنے یہاں مدعو کیا۔ اپنے ہی قصر میں اسے فروکش کیا۔ اور اس کی عزت و تکریم میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ دیگر والیان ملک کی

طرح وہ بھی علم وفن کا شائق اور اہل علم کا قدردان تھا۔ اس کے دربار میں ابوالحسین احمد بن محمد السہیلی[1] جو وزارت کے عہدہ پر فائز تھا علوم حکمیہ کا خاص ذوق رکھتا تھا علی بن مامون کے بعد اس کا بھائی ابوالعباس مامون تخت حکومت پر متمکن ہوا وہ بھی نہایت ذی علم اور قدردان علم وفن بادشاہ تھا۔ اس کی علمی قدردانی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کا دربار ماہرین علم کا مرکز بن گیا تھا۔ اور سب سے بڑھکر یہ کہ علوم حکمت میں تاریخ اسلامی کی سب سے بڑی شخصیتیں جمع ہو گئی تھیں[2] یعنی ابوریحان بیرونی اور بو علی سینا ان دونوں میں عرصہ تک علمی بحثیں بھی چھڑی رہیں خوارزم کے بعد ابن سینا اور بیرونی کو پھر کبھی باہم مجتمع ہونے کا موقع نہیں ملا۔ بالآخر نا مساعدت روزگار سے یہ علمی مجلس درہم برہم ہو گئی۔ محمود غزنوی نے خوارزمی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ابوالعباس مامون اپنی قوم کے ہاتھوں قتل ہوا اور

---

[1] السہیلی خوارزم کے اکابرین سے تھا اور اسکا خاندان ریاست و وزارت کا گھرانہ تھا۔ ثعالبی نے لکھا ہے کہ وہ وزیر بن وزیر تھا اور ریاست کے ساتھ علوم و آداب میں بھی امتیاز رکھتا تھا۔ اور کرم وحسن خلق کے لئے مشہور تھا۔ کتاب روضۃ السہیلیہ اس کی تصنیف تھی۔ اسی کے حکم سے الحسن بن الحارث نے کتاب السہیلی تصنیف کی تھی جس میں فقہ شافعی و حنفی سے بحث کی گئی تھی۔ وہ شعر بھی کہتا تھا۔ ابن سینا نے اپنے حالات میں لکھا ہے کہ وہ علوم حکمیہ کا محب تھا۔ اور اسی کے توسط سے ابن سینا بخارا سے آکر علی بن مامون کے دربار میں پہنچا۔ الخ البیرونی صفحہ ۵۵

[2] نظامی سمرقندی لکھتا ہے۔

ابوالعباس مامون خوارزم شاہ وزیرے داشت نام او ابوالحسین احمد بن محمد السہیلی۔ وے حکیم طبع و کریم نفس و فاضل۔ خوارزم شاہ ہم چنیں حکیم طبع و فاضل دوست بود۔ و بسبب ایشاں چندے حکیم و فاضل براں درگاہ جمع شدہ بودند چوں بو علی سینا و ابو سہل مسیحی و ابوالخیر خمار و ابوریحان بیرونی و ابونصر عراق الخ (چہار مقالہ مطبوعہ یورپ)

خوارزم کی سلطنت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا۔ اس کے دربار کے علماء کچھ تو پہلے ہی محمود غزنوی کی خواہش کے مطابق اس کے دربار میں منسلک ہوگئے تھے[1] کچھ اس انقلاب کے کے بعد محمود کی معیت پر مجبور ہوئے۔ البیرونی نے اس موقع پر جب کہ ابوالعباس مامون

---

[1] نظامی عروضی نے اس شاندار علمی مجلس کی تباہی اور انتشار کا خاکہ اس طرح کھینچا ہے :۔

روزگار بر نہ پسندید و فلک روا نہ داشت آں عیش بر ایشاں منغص شد و آں روزگار بر ایشاں بزیاں آمد از نزدیک سلطان یمین الدولہ محمود معروضے رسید بانامہ آں کہ شنیدم کہ در مجلس خوارزم شاہ چند کس اند از اہل فضل کہ عدیم النظیر اند چوں فلاں و فلاں ۔ باید کہ ایشاں را بہ مجلس ما فرستی تا ایشاں شرف مجلس ما حاصل کنند تا بعلوم و کفایات ایشاں مستظہر شویم و آں منت از خوارزم شاہ داریم و رسول وے خواجہ حسین بن علی میکال بود کہ یکے از افاضل و اماثل عصر و اعجوبہ بود ۔ در رجال زمانہ و کار محمود در اوج ملک او رونقے داشت و دولت او علوے ۔ و ملوک زمانہ او را مراعات ہمی کردند و شب ۔ و بہ اندیشہ ہمی خفتند ۔ خوارزم شاہ خواجہ حسین میکال را بجائے نیک فرود آورد و نگرف فرمود و پیش از انکہ او را بار داد حکما را بخواند و ایں نامہ بر ایشاں عرضہ کرد و گفت محمود قوی دست است و لشکر بسیار دارد و خراسان و ہندوستان ضبط کردہ است و طمع در عراق بستہ من نمی خواہم کہ مثال او را امثال نہ نمایم و فرمان او را بہ نفاذ نہ پیوندم ۔ شما دریں چہ گوئید ۔ ابو علی و ابو سہل گفتند ما نہ رویم اما ابو نصر و ابو الخیر و ابو ریحان رغبت نمودند کہ اخبار صلات و ہبات سلطان ہمی شنیدند ۔ پس خوارزم شاہ گفت شما دو تن را کہ رغبت نیست پیش از آنکہ من ایں مرد را بار دہم شما ۔ سر خویش گیرید ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ روز دیگر خوارزم شاہ حسین علی میکال را بار داد ۔ ۔ ۔ ۔ و گفت نامہ خواندم و بر مضمون و فرمان بادشاہ وقوف افتاد ۔ بو علی و ابو سہل برفتہ اند لیکن ابو نصر و ابو ریحان و ابو الخیر بسیج می کنند کہ بیش خدمت آیند الخ (چہار مقالہ نظامی مطبوعہ یورپ)

کی سلطنت خطرہ میں پڑی ہوئی تھی اور محمود اس کو فتح کرنیکی فکر میں تھا۔ بادشاہ کے سلئے بہترین مشیر ثابت ہوا اگر اس کی تدبیریں اور مشورے سلطنت کے استحکام میں کارگر نہ ہوئے تو یہ قصور اسکا نہیں مامون کی قسمت کا ہے کہ خود اس کی قوم اس کی دشمن ہوگئی۔

خوارزم کی فتح کے بعد بیرونی بھی دیگر اعیان و مشاہیر خوارزم کی طرح محمود کے ساتھ غزنین پہنچا۔

محمود اور بیرونی کے تعلقات[1]

اس خصوص میں ہم محمود کے بیان میں تفصیلی بحث کر آئے ہیں اس لئے یہاں اس کے متعلق کچھ زیادہ لکھنا تحصیل حاصل ہوگا۔ جناب سید حسن برنی صاحب نے اس کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ عام طور پر محمود کا سلوک بیرونی کے ساتھ ایسا نہیں تھا کہ اس سے کسی خاص شکایت کا موقع پیدا ہوتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ خود محمود کے علم میں اسقدر گہرائی نہیں تھی کہ وہ اس کی قدر پہچانتا۔ اور اس کے شایاں شان اس سے سلوک کرتا۔

شروع میں انہوں نے معجم الادبا اور خود اس کے ایک قصیدہ کے کچھ اقتباسات دیئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمود کا سلوک بیرونی کے ساتھ کس قسم کا تھا مسئلہ کی وضاحت کے

---

[1] زاخو نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ محمود اور بیرونی کے تعلقات آخر تک ناخوشگوار رہے اس سلسلے میں اس نے بہت سے دلائل پیش کئے ہیں مثلاً بیرونی سے احمد بن حسن کی رقابت۔ احمد کے مشورے سے بیرونی کو ہندوستان جلاوطن کر دینا۔ کتاب الہند کا انتساب سلطان مسعود کی جانب حالانکہ کتاب سلطان محمود کے زمانے میں لکھی گئی نیز کتاب میں جہاں کہیں محمود کا تذکرہ آیا ہے وہاں بجائے سلطان کے امیر لکھا ہے برخلاف اسکے اپنے گذشتہ محسنین کا جو محمود سے کہیں فروتر تھے نہایت شاندار الفاظ میں تذکرہ کیا ہے۔ محمود کی فتوحات کے متعلق اسکا خیال تھا کہ اس نے ہندوستان کی خوشحالی کو تباہ کر دیا اور ایسے حیرت انگیز حملے کئے جن سے ہندی مثل ذروں کے تمام طرف بکھر گئے۔ لیکن برنی صاحب نے زاخو کے اس خیال کی تردید کی ہے تفصیل کیلئے دیکھو البیرونی طبع دوم)

مقدمہ زاخو بر کتاب الہند

ہم یہ دونوں اقتباسات ذیل میں نقل کرتے ہیں:۔

(۱) بیرونی نے ابوالفتح بستی کی مدح میں جو قصیدہ لکھا تھا اس میں اس نے محمود کا بھی تذکرہ کیا ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے۔

ولم یقبض محمود علی بنعمۃ	محمود نے کسی نعمت کو مجھ سے دریغ نہیں کیا۔ مجھے مالا
فاغنی واقنی متغضیا من مکا سیا	مال کردیا اور میری سخت طلبی سے چشم پوشی کی۔
عفا من جہالاتی وابدی تکرما	میری جہالتوں کو معاف کیا اور میری توقیر کرنے لگا۔
و، و، و، وطری بجاہ رونقی ولباسیا	اور اس کے جاہ سے میری رونق اور لباس تازہ ہو گئے

(۲) یاقوت الحموی نے محمد بن محمود النیشاپوری سے ایک روایت نقل کی ہے جس سے محمود اور بیرونی کے تعلقات پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

ولما استبقاہ السلطان الماضی لخاصۃ امرہ	چونکہ سلطان ماضی (محمود) نے البیرونی کو اپنے خاص کام
وھو جار صدرہ کان یفاوض فیما یسنح لخاطرہ	اور دلی حاجت کے لئے محفوظ رکھا تھا اس لئے امور
من امر السمار النجوم فیحکی انہ ورد علیہ رسول	سماوی نجوم کے متعلق جو بات اس کے دل میں آتی تھی
من اقصی بلاد الترک وحدث بین یدیہ بما	اس کے تفویض کرتا تھا۔ اس لئے ایک قصہ بیان کیا
شاہد فیما وراء البحر نحو القطب الجنوبی من	جاتا ہے کہ اقصٰے بلاد ترک سے ایک ایلچی آیا اور اس
دور الشمس علیہ ظاہرۃ فی کل دورہا فوق	نے محمود کے روبرو بیان کیا کہ میں نے سمندر پر قطب
الارض بحیث یبطل اللیل فبا زع علی عادتہ	جنوبی کے قریب دیکھا کہ سورج کا پورا دور وہاں زمین
فی التشدد فی الدین الی نسبتہ الرجل الی الحاد	پر ظاہر رہتا ہے اور رات نہیں ہوتی۔ یہ سنکر محمود نے
والقرمطۃ علی براءۃ اولئک القوم من ہذہ	بوجہ اپنی تشدد دینی کی عادت کے فوراً اس شخص کو
الآفات حتی قال ابو نصر مشکان ان ہذا لا یذکر	ملحد اور قرمطی قرار دیدیا۔ حالانکہ ترک ان آفات سے
ذلک من رای برئیۃ ولکن عن مشاہدۃ یحکیہ	محفوظ ہیں۔ اس پر ابو نصر مشکان نے کہا کہ یہ شخص

دتلا قوله عزوجل وجدها تطلع علی قوم لم نجعل لہم من دونہا ستراً فسال ابا الریحان عنہ فاخذ یصف لہ علی وجہ الاختصار ویقررہ علی طریق الاقناع وکان السلطان فی بعض الاوقات یحسن الاصغار ویبذل الانصاف فقبل ذلک وانقطع الحدیث بینہ وبین السلطان وقتئذ

(معجم الادبا بحوالہ البیرونی)

اپنی طرف سے کسی رائے کو پیش نہیں کر رہا ہے بلکہ اس نے جو کچھ دیکھا ہے بیان کرتا ہے اور اس کے بعد قرآن شریف کی یہ آیت وجدہا تطلع الخ پڑھی۔ محمود نے اس کے متعلق ابوریحان البیرونی سے پوچھا تو البیرونی نے مختصر مگر شافی طریق پر اس بحث کو سمجھا دیا۔ سلطان محمود بعض اوقات بغور سنتا اور انصاف کرتا تھا۔ اس نے اس کو تسلیم کر لیا اور وہ بات اسوقت وہیں ختم ہوکر رہ گئی۔

بیرونی کے علمی کارنامے بیرونی کے علمی کارناموں کی تفصیل کے لئے دفتر کے دفتر درکار ہیں۔ یہ مختصر مضمون اس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ ابتدائے عمر سے لیکر موت کے آخری دم تک وہ علمی تحقیق و تفحص میں منہمک رہا۔ اوپر کسی موقع پر ہم بیان کر آئے ہیں کہ اس کی تربیت ابونصر منصور کی سرپرستی میں ہوئی جو خود بہت ذی علم اور علوم حکمیہ کا ماہر تھا۔ البیرونی ایک غیر معمولی ذہن و دماغ لیکر پیدا ہوا تھا اسپر شفیق اور علم دوست استاد اور مربی کی سرپرستی نے سونے پر سہاگے کا کام دیا اور بہت جلد اس زمانے کے مشہور علماء میں اس نے امتیاز پیدا کر لیا اور علمی دنیا میں اس کا ایک خاص وقار قائم ہوگیا۔ غیر معمولی ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ وہ محنتی بھی بہت زیادہ تھا۔ اس کا ذوق تفحص اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ ایک کتاب کے لئے وہ ۴۰ سال تک سرگرداں رہا ہے[1]۔

علم و فن کے ہر شعبہ میں اسے یکساں مہارت حاصل تھی، فلسفہ، علم ہیئت، ریاضی، جغرافیہ تاریخ، تمدن، علم آثار اور علم المذاہب سب میں اسے کامل دسترس تھی۔ ان تمام شعبہ ہائے علوم میں اس کے کارنامے آج بھی حیرت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ عربی و فارسی کے علاوہ اپنی

---

[1] البیرونی صفحہ ۲۱۴

علمی تصنیفات کے سلسلہ میں اسے اور بھی بہت سی زبانیں سیکھنا پڑیں۔ فارسی اس کی مادری زبان تھی۔ عربی چونکہ اس وقت کی تصنیفی زبان تھی اس لئے اس میں بھی اس نے پوری دستگاہ حاصل کی۔ ہندوستان میں اسے سنسکرت زبان سے واسطہ پڑا جو اس وقت کی مشکل ترین زبانوں میں تھی لیکن اس نے اس پر بھی عبور حاصل کر لیا اور غالباً عبرانی اور سریانی زبانوں سے بھی واقفیت پیدا کرلی[۵۱]۔ ان زبانوں کے سیکھنے میں اسے کیا کچھ دقتیں نہیں اٹھانا پڑی ہوں گی۔ اسکے طالبعلمانہ شوق اور محنت کا آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سنسکرت اس نے پچاس برس کی عمر میں سیکھی۔ شب و روز وہ مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں محو رہتا تھا شہر زوری اس کے علمی انہماک اور محویت کے متعلق لکھتا ہے۔

"بیرونی ہمیشہ علوم کے حاصل کرنے میں محو رہتا تھا اور کتابوں کی تصنیف پر جھکا ہوا تھا۔ اپنے ہاتھ سے قلم کو، دیکھنے سے آنکھ کو اور فکر سے دل کو کبھی جدا نہیں کرتا تھا مگر سال میں صرف دو روز یعنی نوروز اور مہرجان کے دن جب وہ اپنے کھانے وغیرہ کے سامان کو مہیا کرتا تھا[۵۲]"

بیرونی کے علمی کارناموں کا "البیرونی" میں تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے اس لئے یہاں انکا بیان تحصیل حاصل ہوگا۔ اس کے علم و فضل کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ آخر عمر تک اس نے تقریباً ۱۱۴ کتابیں لکھیں جن میں مختصر رسائل اور ضخیم کتابیں سب کچھ شامل ہیں۔ اس کی ان تالیفات و تراجم میں ہر علم و فن کی کتابیں ہیں اور تقریباً تمام علوم و فنون کو محتوی ہیں[۵۳]۔ لیکن اس حقیقت کا اظہار کس قدر افسوسناک ہوگا کہ ان بے شمار کتابوں میں سے ہندوستان یورپ اور دیگر ممالک کے کتب خانوں میں ہنوز صرف ۱۲ کتابوں کا پتہ چلا ہے۔ بہت سے مشہور علما نے خود اس

---

[۵۱] البیرونی صفحہ ۲۱۳ [۵۲] شہرزوری بحوالہ البیرونی صفحہ ۲۱۴

[۵۳] تفصیل کے لئے دیکھو البیرونی صفحہ ۱۱۴ تا ۱۱۹ ایضاً ۱۲۹

کے نام پر بھی اپنی کتابیں معنون کی ہیں ان میں ابونصر منصور اور ابو سہل مسیحی خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان حضرات کو بیرونی سے کس قدر محبت وعقیدت تھی۔ اسکی بعض کتابیں کتاب الہند وغیرہ یورپ سے شائع ہو چکی ہیں۔ اب ہندوستان میں بھی اس طرف توجہ ہوئی ہے چنانچہ قانون مسعودی کو (مع ترجمہ انگریزی و اردو) مسلم یونیورسٹی سے شائع کیا جا رہا ہے انجمن ترقی اردو سے کتاب الہند کا ترجمہ شائع ہو رہا ہے۔ ممکن ہے اسکے بعد دوسری کتابوں کی طرف بھی توجہ ہو۔

خواجہ احمد بن حسن میمندی

خواجہ احمد بن حسن میمندی کے ابتدائی حالات افسوس ہے کہ تفصیل سے معلوم نہ ہو سکے وہ محمود غزنوی کا بہت کامیاب وزیر تھا۔ زاخو کا خیال ہے کہ اس کے اور بیرونی کے تعلقات ناصاف کشیدہ تھے بلکہ اسی کے مشورے سے بیرونی کو ہندوستان جلاوطن کیا گیا تھا لیکن محمود کے دربار میں حسنک نام ایک اور ہستی بھی تھی اس کی تربیت خود محمود کے ہاتھوں ہوئی تھی اس لئے وہ اسکا خاص خیال رکھتا تھا۔ حسنک اور احمد بن حسن کے درمیان معاصرانہ چشمک تھی اور اسکا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ احمد بن حسن کو بھی ہندوستان کے قید خانوں میں ڈلوا دیا گیا۔ محمود کے انتقال کے بعد مسعود اور احمد دونوں بھائیوں میں سخت معرکہ آرائی ہوئی جس میں مسعود کو فتح اور محمد کو شکست ہوئی۔ حسنک محمد کا طرفدار تھا اس لئے اس پر قرمطی ہونیکا الزام لگا کر پھانسی دیدی گئی، خواجہ احمد بن حسن کے دن پھرے اور ہندوستان کے قید خانہ سے رہائی ملی۔ مسعود نے تمام بڑے بڑے عہدیداروں کا تقرر کیا لیکن وزیر اعظم کی جگہ ہنوز خالی تھی۔ سب کی نظریں احمد بن حسن میمندی پر پڑ رہی تھیں۔ مسعود نے ابو سہل ہمدانی کے ذریعہ پیام بھیجا لیکن احمد بن حسن بوڑھا ہو گیا تھا اور گوشہ عافیت اختیار کرنا چاہتا تھا اس لئے اس نے ابو سہل پر ٹالدیا کہ اس کام کے لئے تم مجھ سے زیادہ انسب ہو آخر مجبور ہو کر سلطان مسعود نے خود اس سے درخواست کی اسے تخلیہ میں بلا کر دیر تک گفتگو کی اور کہا

" خواجہ آپ کیوں نہیں اس فرض کو اپنے ذمہ لیتے ہیں آپ جانتے ہیں کہ آپ میرے لئے بمنزلہ باپ کے ہیں میرے سر پر اس وقت بہت سے اہم کام ہیں اور یہ مناسب نہیں کہ ایسے موقع پر آپ اپنی قابلیت سے مجھے محروم رکھیں ۔

احمد بن حسن نے ضعیفی کا عذر پیش کیا لیکن مسعود کا اصرار برابر جاری رہا اس نے وعدہ کیا کہ بجز سیر و شکار اور شراب و کباب کے سلطنت کے تمام معاملات اسی پر چھوڑ دے گا بالآخر خواجہ احمد بن حسن نے چند شرائط کے ساتھ اسے منظور کر لیا ۔ تفویض منصب کی رسم بڑے تزک و احتشام کے ساتھ ادا کی گئی اور نہایت اہتمام سے خلعت اور قلمدان وزارت تفویض کیا گیا ۔

خواجہ نے نہایت تدبر اور ہوشمندی کے ساتھ وزارت کے فرائض انجام دئے ۔ اور تھوڑے عرصہ میں تمام سیاہ و سفید کا مالک ہوگیا ۔ باوجودیکہ امراء اور اہل دربار میں باہمی نزاع اور مخاصمت بھی جاری رہی لیکن محض خواجہ احمد بن حسن کے اثر سے مملکت کے نظم و نسق پر اسکا کوئی اثر نہیں پڑا ۔ اس کے مشورے سے تمام بڑے بڑے خود سر جنرل معزول کر دئے گئے جس کی وجہ سے سلطنت میں کسی بغاوت اور شورش نے جڑ نہیں پکڑی

بیہقی

پورا نام ابوالفضل بن الحسن البیہقی ۔ پیدایش ۳۸۶ھ (۹۹۶ء) وفات ۴۷۰ھ (۱۰۷۷ء) اپنے وقت کا مشہور عالم و فاضل اور تاریخ کا ماہر تھا اس کی کتاب کا نام " تاریخ بیہقی " یا " تاریخ آل سبکتگین " ہے تمام جلدیں مجلدات بیہقی کے نام سے موسوم ہیں ۔ ابتدائی حصہ یعنی ناصرالدین سبکتگین کے متعلق " تاریخ ناصری " کے نام سے ، مسعود کے متعلق حصہ " تاریخ مسعودی " اور محمود کے متعلق " تاج الفتوح " کے نام سے بھی علیحدہ علیحدہ طور پر موسوم کیا جاتا ہے " روضۃ الصفا " کے مقدمہ میں ہے کہ یہ کتاب کل ۳۰ جلدوں میں ہے ۔ مصنف کا ذکر حیدر رازی ۔ ضیاالدین برنی ۔ ابوالفضل اور جہانگیر نے اپنی اپنی کتابوں میں کیا ہے ۔ باوجود اس قدر مشہور ہونیکے

تمام جلدوں کا کہیں پتہ نہیں بچی کچی جلدیں بھی اب ہندوستان میں نایاب ہیں صرف تین نسخہ یہاں تھے جو ایک انگریز مستشرق مسٹر مارسے نے حاصل کئے اور تین اور نسخوں کی مدد سے جو یورپ کے کتب خانوں میں تھے ۔ ایک ایڈیشن شائع کیا ۔ اس ایڈیشن میں ۷، ۸، ۹ مکمل اور ۶، ۱۰ کے کچھ اجزا شامل ہیں ۔

بیہقی کی تاریخی فضیلت اس کے ان الفاظ سے عیاں ہو سکتی ہے ۔

آدمی ، آدمی کے دل سے پہچانا جا سکتا ہے ۔ دل قوی یا ضعیف ہوتا ہے جو کچھ کہ وہ سنتا ہے یا دیکھتا ہے اور جب تک کہ وہ برا یا بھلا نہیں سنتا یا دیکھتا اس وقت تک وہ اس دنیا کی رنج و خوشی سے بے خبر رہتا ہے لہذا معلوم ہونا چاہئے کہ آنکھ اور کان (انسان کے) دل کے پاسبان اور مخبر ہیں وہ جو کچھ دیکھتے یا سنتے ہیں ۔ اس کی خبر وہ دل سے کر دیتے ہیں تاکہ وہ ان سے فائدہ اٹھا کر عقل کو پہنچا دے جو نیک و بد کی تمیز کر سکتی ہے اور پہچان سکتی ہے کہ کونسی چیز مفید ہے اور کونسی مضر ۔ یہ غرض ہوتی ہے جس کے لئے انسان مخفی باتوں اور اُن چیزوں کا جن کے متعلق اس نے کبھی کچھ سنا ہے اور نہ دیکھا ہے اور ان باتوں کا جو زمانہائے ماضی میں واقع ہوئی ہیں علم حاصل کرنا چاہتا ہے ۔

ابوالخیر الحسن

ابوالخیر الحسن بن سوارین بابا بن بہرام (بقول ابن ابی اصیبعہ بہنام) المعروف (یا ابن الخمار) ۳۳۱ھ میں بغداد میں پیدا ہوا ۔ یحیٰی بن عدی مشہور منطقی سے فلسفہ پڑھا ۔ بعد ازاں خوارزم میں مامون کے دربار میں پہنچا جہاں خوارزم شاہیہ کے کنف حمایت میں انکے انقراض حکومت تک بسر کرتا رہا ۴۰۸ھ (۱۰۱۶ء) میں خوارزم کی تباہی کے بعد وہ محمود کے ساتھ چلا گیا محمود اس کی کمال تعظیم و تکریم کرتا تھا ۔ یہاں تک مشہور ہے کہ اس کے سامنے زمیں بوس ہوتا تھا ۔ ابوالخیر نہایت منکسر

مزاج تھا لیکن سلاطین و امراسے تزک واحتشام سے ملتا تھا تین سو غلام رکاب میں رہتے تھے۔ اہل علم اور زہاد کی خدمت میں پاپیادہ جاتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ اس پیادہ روی کو جابرون اور فاسقوں کی عیادت کا کفارہ قرار دیتا ہوں۔ ایک مرتبہ محمود کے دربار سے واپس آتے ہوئے گھوڑے سے گر کر ضربات کے صدمہ سے ایسا بیمار ہوا کہ جاں بر نہ ہو سکا۔

ابوالخیر اخیر زمانے میں عیسائی مذہب چھوڑ کر مسلمان ہو گیا تھا وہ سریانی سے عربی میں کتب حکمت کا ترجمہ کرتا تھا اور اپنے زمانے کے مشہور حکما میں شمار ہوتا تھا۔[۱]

اس مضمون کے لکھتے وقت مندرجہ ذیل کتابیں پیش نظر تھیں۔

۱۔ تذکرۃ الشعرا مطبوعہ یورپ

۲۔ چہار مقالہ "

۳۔ لباب الالباب "

۴۔ شعرالعجم حصہ اول وچہارم

۵۔ مقالات شبلی

۶۔ البیرونی

۷۔ مقدمہ زاخو برکتاب الہند

۸۔ ایلیٹ

۹۔ آثار الکرام

۱۰۔ محمود غزنوی کی بزم ادب

۱۱۔ تنقید شعر العجم از محمود شیرانی

مضمون مولانا مسلم عظیم آبادی (رسالہ جامعہ)

---

[۱] البیرونی صفحہ ۵۸، ۷۰

طولسطائے اور میکائیلووچ کی خط و کتابت

لیو طولسطائے اور نواب اعظم نکولائی میکائیلووچ کی یہ خط و کتابت جو اب تک شائع نہیں ہو سکی اس صدی کی ابتدا سے متعلق ہے۔ روسی زبان سے ہر۔ ی۔ لیون نے جرمن میں ترجمہ کیا ہے جو سہ ماہی رسالہ "سیاست و تاریخ" میں شائع ہوا ہے۔ خاکسار اسے اردو کا جامہ پہنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ سب سے پہلے جرمن مترجم کا ایک نوٹ ہے اس کے بعد ایک خود نواب اعظم کا۔ اور پھر وہ خطوط ہیں جو انہوں نے ایک دوسرے کو لکھے۔ جرمن مترجم کا جو مقدمہ ہے اس کے ترجمے میں میں نے ذرا اجمال سے کام لیا ہے اور صرف ضروری حصوں کا ترجمہ "جامعہ" کے ناظرین کے لئے پیش کر رہا ہوں۔ مگر نواب اعظم کے مقدمے اور خطوط کا پورا پورا ترجمہ کیا گیا ہے۔

محمود

دیباچہ مترجم

اس خط و کتابت کے متعلق بعض تشریحات ضروری معلوم ہوتی ہیں۔ نواب اعظم نکولائی میکائیلووچ، زار روس نکولاؤ اول کا نواسا تھا۔ اور زار سکندر سوم کا چچا زاد بھائی عام سیاسی کاموں میں اس نے کبھی کوئی خاص حصہ نہیں لیا۔ اس فوجی خدمت کے بعد جو شاہی خاندان کے ہر رکن پر فرض ہوتی تھی اس نے اپنی زندگی روسی تاریخ کے لئے وقف کر دی۔ اس نے روس کی تاریخ جدید یعنی سکندر اول کی حکومت پر جس سے اسے خاص ذوق تھا کئی معرکۃ الآرا تصانیف کی ہیں۔ اسکی بعض تصانیف کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں بھی ہوا ہے۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں وہ روسی تاریخی مجلس کا صدر تھا۔ ۱۹۱۹ء کی ابتدا پر شاہی خاندان کے بعض دوسرے ارکین کے ساتھ اسے بھی گولی کا نشانہ بنایا گیا حالانکہ سیاسیات میں اس نے کبھی کوئی حصہ نہ لیا تھا۔

نواب اعظم کے بعض پرانے کاغذات میں جو ابھی حال میں دستیاب ہوئے ہیں طولسطائی کے خطوط اور انکے جوابات ملے ہیں۔ نواب اعظم اور طولسطائے کی پہلی ملاقات ۱۸۸۱ء میں کریمیا میں ہوئی۔ طولسطائے کی عمر اس وقت ۵۳ سال کی تھی۔ نواب اعظم کو طولسطائے کے متعلق سرکاری حلقوں میں جو معلومات حاصل ہوئی تھیں وہ بالکل غلط اور بے بنیاد تھیں۔ ان کی پہلی گفتگو کا موضوع فرقہ "دوخوبور" تھا (اس لفظ کا ترجمہ اُردو میں معقولئے اور انگریزی میں Rationalist کیا جا سکتا ہے) اس فرقے کے متعلق انیسویں صدی کے آخر میں بہت غلط فہمیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ روس میں اس فرقے کی ابتدا سترہویں صدی ہی میں ہو چکی تھی۔ یہ لوگ تمام مذہبی اصولوں کی بنیاد عقل پر رکھنا چاہتے تھے۔ انہیں کلیسا کے ناقابل تبدیل اصولوں اور ہر طرح کی پابندیوں، یہاں تک کہ سیاسی اور فوجی فرائض اور لگان کی ادائگی میں بھی عذر تھا۔ اس فرقے اور حکومت کے تعلقات میں ۱۷۸۰ء ہی سے کشیدگی شروع ہو گئی۔ اور اس جماعت کے اراکین کو خاص طور پر "خطرناک" سمجھا جانے لگا ۱۸۳۱ء میں ان سے بعض کو جلا وطن بھی کیا گیا۔ انیسویں صدی کے آخر میں اختلافات نے اور بھی شدید صورت اختیار کر لی اور طولسطائے اور اس کے ساتھیوں کے مشورے کے مطابق اس جماعت کے ۴۰۰۰ اشخاص کنیڈا چلے گئے۔ طولسطائے کو ان لوگوں سے دلی ہمدردی تھی۔ ان لوگوں کے اصول کچھ ایسے واقع ہوئے تھے کہ کنیڈا میں بھی وہاں کی حکومت انکے لئے بعض قوانین بنانے پر مجبور ہوئی۔ اس کے بعد ان میں سے کچھ تو وہاں رہنے پر راضی ہو گئے اور کچھ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے برطانی کولمبیا چلے گئے۔ ان معقولین کی ہجرت کے مسئلہ پر طولسطائے اور میکائیلوویچ میں بہت گفتگو ہوئی ہے۔

طولسطائے نے نواب اعظم کے نام جو خط لکھا ہے اس میں ایک دوسرے نہایت اہم مراسلے کا ذکر ہے جو طولسطائے نے زار نکولاؤ دوم کے نام لکھا تھا۔ اور جو نواب اعظم نے زار تک پہنچایا تھا۔

طولسطائے ہنری جارج کے مسلک کا پیرو تھا۔ اس کی کتاب "اجتماعی مسائل" کے روسی ترجمہ پر طولسطائے نے ایک مقدمہ بھی لکھا ہے۔ ہنری جارج کے خیال میں تمام مصائب کی وجہ زمین کی تقسیم ہے۔ زمین پر ہر شخص کو وہی حق حاصل ہے جس طرح ہوا اور سورج کی روشنی پر۔ زمین پر جو لگان ہوگا وہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں بلکہ ریاست کی ملک ہوگا اور سب کے کام آئے گا۔ ریاست کو اس کے بعد کسی اور قسم کی آمدنی کی ضرورت بھی باقی نہ رہے گی اور اس کی ضروریات کے لئے یہی رقم کافی ہوگی۔ ہنری جارج کے اس طریق کو Single Tax System یا "وحدانی طریقہ مالگذاری" کہا جاتا ہے۔

طولسطائے ہنری جارج کا ہم خیال تھا۔ اس نے زار کے نام جو خط بھیجا تھا اس میں اس سے اسی طریق پر کاربند ہونے کی درخواست کی تھی۔ اس خط میں اس نے حکومت وقت کی اچھی طرح خبر لی ہے اور زار کو جسے خط میں وہ "برادر عزیز" کے لقب سے یاد کرتا ہے اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ قوم کو آزادی رائے اور آزادی تقریر عطا کرے۔ خط میں طولسطائے یوں رقمطراز ہے :۔

"اگر روسی قوم کو اس بات کی آزادی ہو کہ وہ اپنے دل کی بات زبان پر لا سکے تو میرے خیال میں وہ اس وقت یہی کہے گی۔ سب سے پہلے تو مزدور پیشہ لوگوں کا مطالبہ ہوگا کہ تمام غیر مساوی قوانین ختم ہو جانے چاہئیں جنہوں نے ان کی حیثیت "اچھوت" کی سی بنا دی ہے اور جن کی وجہ سے انہیں وہ تمام حقوق حاصل نہیں جو اور شہریوں کو حاصل ہیں۔ انہیں اس بات کی آزادی ہو کہ وہ جہاں چاہیں آباد ہو سکیں، جو چاہیں پڑھیں اور اپنی روحانی ضروریات کے مطابق جس عقیدہ کی چاہیں پیروی کریں مگر جو سب سے بڑی بات ہے وہ یہ ہے کہ تمام کے تمام دس کروڑ نفوس یک زبان یہ کہیں گے کہ زمینداری کا خاتمہ ہونا چاہئے۔ زمین پر سے شخصی قبضے کے اٹھنے کا سوال ایسا ہے جو میری رائے میں تمام روسی قوم کے پیش نظر ہے۔ زندگی کے ہر دور میں انسان کی یہ آرزو ہوتی ہے کہ وہ زندگی کو ایک قدم آگے اعلیٰ معیار

کی طرف لے جائے۔ آج سے پچاس سال پہلے یہ قدم روس سے غلامی کا ملیامیٹ کرنا تھا۔ آج یہ قدم یہی ہے کہ مزدور پیشہ لوگ اس جماعت کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں جو بلا وجہ انکے سر پر سوار ہے روس میں جہاں آبادی کا بیشتر حصہ کھیتی سے پیٹ پالتا ہے یہ ممکن نہیں کہ محض کارخانوں اور فیکٹریوں کو قومیانے (nationalise) سے یہ مشکلات دور ہوجائیں۔ روسیوں کے لئے تو ناگزیر ہے کہ اس بات کو تسلیم کیا جائے کہ زمین مخلوق خدا کی ملکیت ہے۔ یہی ہے وہ آرزو جو آج روسیوں کے دل میں جگہ کئے ہوئے ہے اور تمام قوم حکومت سے اس بات کی متوقع ہے کہ وہ اسے واقعہ کی صورت دے گی۔ پھر رعایا کو روز روز دبانے کے لئے نئے ہتھیاروں کی ضرورت باقی نہ رہے گی حکومت کا بھی وہی مقصد ہوگا جو قوم کا ہے۔ اور وہ مقصد بس یہی ہے کہ زمین کو شخصی ملکیت سے نجات دلائی جائے۔ میرا پختہ یقین ہے کہ آج یہ "ارضی جائداد" اسی قدر بے انصافی پر مبنی ہے جتنی آج سے پچاس سال پہلے "جسمانی جائداد" تھی۔ اور میں خیال کرتا ہوں اس کے دور ہو جانے سے روسی قوم اپنی آزادی، خوشحالی اور اطمینان کے اعتبار سے بہت آگے بڑھ جائے گی۔ میں یہ بھی یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر حکومت نے اس قسم کا قدم اٹھایا تو روز کے ان تمام انقلابی اور اجتماعی جھگڑوں کا خاتمہ ہوجائیگا جو آج مزدور پیشہ جماعت کو بھڑکا رہے ہیں اور جو قوم اور حکومت کے لئے خطرے کا باعث ہیں۔"

یہ ہے وہ خط جو طولسطائے نے زار کے نام لکھا اور نواب اعظم کو بھیجا جنہوں نے خود اپنے ہاتھ سے اسے زار تک پہنچایا۔ اس موضوع پر خود نواب اعظم نے دو خطوط طولسطائے کو لکھے ہیں جن میں انہوں نے طولسطائے سے اپنا اختلاف رائے ظاہر کیا ہے۔ مگر انکا بھی یہ خیال تھا کہ سرکاری عمال اور محکموں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ یہ بھی واضح ہونا چاہئے کہ خطوط پہلے روسی انقلاب (۱۹۰۵ء) سے بھی پہلے کے لکھے ہوئے ہیں۔ خطوں پر جو تاریخیں ہیں وہ پرانی روسی جنتری کے حساب سے ہیں جسے یورپی کیلنڈر سے ۱۲ دن پیچھے سمجھنا چاہئے۔

طولسطائے اور نواب اعظم کے خطوط سے پہلے اسی موضوع پر نواب اعظم نے ایک نوٹ لکھا ہے جسکا ترجمہ درج ذیل ہے۔

مقدمہ خط وکتابت

میں عرصہ سے لیو طولسطائے سے نیاز حاصل کرنے کا متمنی تھا، خزاں ۱۹۰۱ء میں بمقام کریمیا مجھے اسکا بہت اچھا موقع ہاتھ آیا۔ میں وہاں دو ہفتے کے لئے اپنے بھائی سکندر سے ملنے گیا ہوا تھا۔ طولسطائے بیگم پانینؔ[1] کے مکان میں جو پاس ہی تھا مقیم تھے۔ میں ۲۲ر اکتوبر کو کریمیا پہنچا۔ میں نے سنا تھا کہ طولسطائے اکثر پیدل اور گھوڑے پر سیر کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ ان سے ملاقات کے خیال سے میں بے نتیجہ روزانہ ادھر اُدھر گھوما کیا۔ مگر جب میں نے دیکھا کہ یوں کام نہیں چل سکتا تو پھر فیصلہ کیا کہ انکے نام ایک پرچہ لکھکر خود دریافت کروں کہ کیا میں مل سکتا ہوں۔ اسکا جواب میں نے ان سے صاف صاف اور بے تکلفانہ مانگا۔ ادھر زبان پر بات آئی اور اس نے واقعہ کی صورت اختیار کی۔ میں نے ۲۶ر کی صبح کو خط بھیجا اور میرے پاس فوراً جواب آیا کہ میں اسی دن ایک بجے ان سے مل سکتا ہوں۔ میں پہنچا تو بیگم طولسطائے نے میرا بڑے جوش سے خیر مقدم کیا اور کہا کہ ان کے شوہر ابھی اوپر کی منزل سے نیچے آتے ہیں۔ دو منٹ میں طولسطائے تشریف لائے مجھے نہایت محبت سے سلام کیا اور مجھ سے اس بات کی معافی چاہی کہ انہوں نے میرے پرچے کا جواب تحریری نہیں بلکہ ٹیلیفون کے ذریعے دیا۔ لیکن اس کا سبب یہ بتایا کہ درد مفاصل کی وجہ سے ان کے ہاتھوں میں درد تھا۔ بیگم صاحبہ چلی گئیں، ہم دونوں پاس پاس بیٹھے اور گفتگو شروع ہوئی۔ ان کی جسمانی حالت کے متعلق پہلی نظر میں تو یہ اندازہ ہوا تھا کہ وہ بہت معمر اور ناتواں ہیں۔ مگر تھوڑی دیر بعد یہ خیال تبدیل کرنا پڑا اور میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ خوب تندرست اور

---

[1] انقلاب سے پہلے بہت رئیس عورت تھی اور اپنی فیاضی اور نیک دلی کے لئے مشہور تھی۔

توانا ہیں۔ انکا لباس سادہ تھا۔ ایک خاکی رنگ کا کرتہ اور پیٹی۔ اسی رنگ کا چوڑے پائنچے کا پاجامہ سادے جوتے جن کا اوپر کا حصہ پائنچوں کو ڈھک لیتا تھا۔ اگر کوئی کہے کہ طولسطائے کا لباس میلا کچیلا اور جسم صاف نہیں رہتا تو اسکا اعتبار نہ کرنا چاہئے۔ برخلاف اس کے وہ نہایت صاف ستھرے۔ ان کے ہاتھ پاکیزہ اور ناخون بالکل ٹھیک ہیں۔ البتہ ان کی زبردست سفید ریش میں کسی قدر شاعرانہ بے ترتیبی پائی جاتی ہے۔ مگر اس میں بھی کنگھی کی ہوئی ہوتی ہے جس چیز کا سب سے زیادہ اثر ہوتا ہے وہ ان کی نیلے رنگ کی آنکھیں ہیں۔ انکی نگاہ دل کے پار ہوجاتی ہے۔ آنکھیں کسی قدر بیٹھی ہوئی ہیں اور گال خوب ابھرے ہوئے ہیں۔ اس وجہ سے اور بھی اثر ہوتا ہے۔ آنکھوں سے خوش اخلاقی اور کسی قدر رنج مگر اس کے ساتھ ہی فہم وعقل پختگی نیز اور اصابت رائے کا اظہار ہوتا ہے۔ نہ تو ان کی آنکھوں میں کج نگہی اور نہ انکے طرز عمل میں کسی قسم کی خرابی ہے، تمام چیزیں نہایت مناسب اور موزوں ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ دوران گفتگو میں ان کی نگاہ مخاطب پر جمی رہتی ہے۔ خصوصاً ایسے موقع پر جب انہیں کسی بات سے خاص دلچسپی پیدا ہوگئی ہو اور اسے وہ تشریح کے ساتھ بیان کررہے ہوں ان کی نگاہ مخاطب کی آنکھوں پر جم جاتی ہے۔ مجھے تو ان کی شخصیت بہت ہی بھلی معلوم ہوئی۔

ہماری گفتگو تین مسائل پر ہوئی:-

۱۔ زار سکندر اول اور فیودر کسیچ[1]۔

۲۔ کوہ قاف کے دوخوبور

۳۔ میرا اپنا بھی مسئلہ

---

[1] فیودر کسیچ۔ پیدائش ۱۷۷۷ء۔ سکندر اول کی موت کے بعد لوگوں میں یہ خیال عام تھا کہ بوڑھا دراصل سکندر اول ہے۔ اور سکندر اول کا انتقال ہوا ہی نہیں۔ ان کی جگہ کسی اور کو دفن کردیا گیا ہے۔ بعض مورخین نے بھی اس شبہ کا اظہار کیا ہے، خود نواب اعظم نے اس موضوع پر مفصل کتاب لکھی ہے۔

یہ آخری سوال ان کے لئے سب سے زیادہ دلچسپی کا باعث ہوا۔ انہوں نے بہت داد دی اور میری طرف محبت بھری آنکھوں سے دیکھ کر کہا کہ "یہ سوال بہت نادر اور یہ واقعہ نادرتر ہے"، مگر میں اب اس اجمال کی تفصیل نہیں کرنا چاہتا۔

دوسرے موضوع کے سلسلہ میں طفلس کے سابق گورنر نواب شیروا کلدزے کے رویے اور خود طولسطائے نے اس میں جو حصہ لیا اس پر ان میں اور مجھ میں اختلاف تھا۔ یہاں مجھے یہ بھی کہنا ہے کہ طولسطائے اپنی رائے میں پکے تھے اور مجھ پر اعتراضات کر رہے تھے۔ مگر پھر بھی انکی آواز بلند نہ ہوئی اور اس طرح وہ مجھے ہمیشہ موقع دیتے رہے کہ میں اپنی رائے کا اظہار کروں۔ گورنر کے متعلق طولسطائے مجھے اس بات کا یقین دلانا چاہتے تھے کہ ویسے وہ نہایت نیک آدمی ہیں مگر حاکم اچھے نہیں۔ دوخوبوروں کے طفلس میں آباد ہوجانے کے بعد وہ حالات کو سدھارنے کی قابلیت نہیں رکھتے تھے۔ مگر میں نے انہیں یقین دلایا کہ ایک طرف تو ریاست کے تمام کل پرزوں کا ڈھیلا ہوجانا اور دوسری طرف خود طولسطائے کی تعلیمات جن کی وجہ سے اس جماعت کو مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، یہ ایسی مشکلات تھیں جنہوں نے نواب کے کام کو بہت دشوار بنا دیا۔

مگر طولسطائے مجھے یہی یقین دلا رہے تھے کہ اس جماعت کو روسی سرحد میں رکھنے کے لئے خود ان سے جو کچھ بن پڑا انہوں نے کیا۔ مگر جب انہوں نے حکومت کی بے پرواہی کا اچھی طرح اندازہ کر لیا تو ان کی بھلائی کی خاطر انہیں غیر ملک میں جانے کا مشورہ دیا۔ طولسطائے کی رائے میں اب دوخوبور کناڈا میں خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مگر میری معلومات اس کے برعکس ہیں، ہاں جب میں نے کہا کہ دوخوبوروں کے نواب شیرواکلدزے سے اب بھی اچھے تعلقات ہیں اور وہ انہیں کنیڈا سے خطوط لکھتے ہیں تو طولسطائے بہت پریشان ہوئے۔ میں نے خاص طور پر طولسطائے کے دو شاگردوں چلکو اور برجکو کا ذکر کیا جو اکثر حد سے تجاوز کر جاتے ہیں اور جن کا اس جماعت پر ہمیشہ اچھا اثر نہیں ہوتا۔ اس پر طولسطائے نے دبی زبان سے

یہ تسلیم کیا کہ ان کے شاگرد انہیں ہمیشہ اچھی طرح نہیں سمجھتے ہیں مگر بہر حال وہ حکام اور عمال سے تو بہتر ہی ہیں۔

سکندر اول پر ہماری گفت گو نے بہت طول کھینچا۔ طولسطائے نے کہا کہ ان کا اپنا ارادہ تھا کہ اس روایت پر جو سکندر اول کی موت اور پھر فیودر کسیچ کے بھیس میں سائبیریا میں زندگی بسر کرنے کے متعلق مشہور رہے کچھ لکھیں۔ اگرچہ ابھی تک اس روایت کی نہ صرف تصدیق نہیں ہو سکی ہے بلکہ اکثر واقعات اس کی تردید کرتے ہیں۔ بہر حال طولسطائے کو سکندر اول کی زندگی سے بہت دلچسپی تھی اور واقعی اس میں بہت کچھ جدت، الجھاؤ اور دو رنگی پائی بھی جاتی ہے طولسطائے کے خیال کے مطابق اگر سکندر نے اپنی زندگی تنہائی ہی میں بسر کرنے کی ٹھان لی تو واقعی اس نے پورا پورا جرمانہ ادا کر دیا۔

اسی سلسلے میں ذاتی فراخ کی بحث چھڑ گئی جس کے متعلق مجھے خاموشی اختیار کرنی چاہئیے اس کے بعد ان لوگوں کے متعلق گفتگو ہوئی جنہیں ہم دونوں جانتے ہیں مثلاً بیگم ہیلینے اولوناشو والوا اور بیگم الیزابتھ اولونا چرتکوزا۔ یہ دونوں لارڈ رڈ اسٹوک[۱] اور پیکو[۲] کی تعلیمات کی پیرو ہیں۔ ان تعلیمات کے بارے میں طولسطائے نے کہا کہ چاہے ان کی نیت اچھی ہو مگر ان کی تعلیمات بنیادی طور پر غلط اور غیر اطمینان بخش ہیں۔ بیٹھے بیٹھے جب ایک گھنٹہ ہو گیا تو میں نے رخصت چاہی۔ پہلی ملاقات میں میں انکا زیادہ وقت نہ لینا چاہتا تھا۔ انہوں نے مجھے دروازے تک پہنچایا اور کہا کہ انہیں مجھ سے مل کر بہت خوشی حاصل ہوئی۔

دوسری مرتبہ شام کے کھانے سے قبل میں طولسطائے سے ملنے گیا۔ انہوں نے

---

[۱] انگریز نواب۔ ایک طرح کے مذہبی و اخلاقی استباغ کا مروج۔ اٹھارہویں صدی میں روس کے اعلیٰ طبقوں میں اس کے بہت سے پیرو تھے۔

[۲] لارڈ رڈ اسٹوک کی موت کے بعد اس کے خیالات کی اس شخص نے روس میں ترویج و اشاعت کی۔

مجھے اوپر خلوت خانہ میں بلایا۔ اور میرا ان الفاظ سے استقبال کیا:۔

"آپ کو دیکھ کر مجھے حد درجہ مسرت حاصل ہوئی۔ مجھے آپ کا انتظار تھا میرا ضمیر مجھے مجبور کر رہا تھا کہ میں آپ سے پوچھوں کہ آپ کچھ کر رہے ہیں اس پر آپنے اچھی طرح غور بھی کر لیا ہے کہ نہیں؟ اس لئے کہ آپ مجھ سے پہلی مرتبہ ملے تھے۔ میں بذات خود طاعون ہوں۔ مجھے کلیسا سے نکال باہر کیا گیا ہے۔ لوگ مجھ سے خوف زدہ ہیں اور آپ پھر بھی میرے پاس آتے ہیں۔ میں پھر دہرا دوں کہ میں طاعون ہوں۔ مجھے ایک طرح کی وبا خیال کیا جاتا ہے۔ آپ کو میری وجہ سے کہیں دشواریوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ لوگ آپ کو ٹیڑھی نظروں سے دیکھیں گے کہ آپ ایسے شخص سے ملتے ہیں جو سیاسی اعتبار سے بہت مشکوک ہے۔"

اس غیر متوقع تمہید کا جواب میں نے یہ دیا کہ "میری عمر اس وقت ۲۲ سال کی ہو چکی ہے۔ شادی میری ہوئی نہیں۔ لوگ مجھ سے خوب واقف ہیں۔ مجھے نتائج کا ذرہ برابر خوف نہیں۔ اور پھر جہاں تک حکومت کا تعلق ہے مجھے اس کے متعلق آپ کی نسبت ذرا زیادہ حسن ظن ہے۔"

پھر وہی دوخوبوردن اور شیرواشد نئے کا قصہ شروع ہوا۔ مگر طولسطائے میری رائے بدلنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ میں نے اس بات پر بہت زور دیا کہ ان کو اپنے مختلف النوع شاگردوں اور پیرووں کی بات ہمیشہ بلا چون و چرا نہ تسلیم کر لینا چاہئے۔ ان کی وجہ سے طولسطائے کی حیثیت نازک ہو جاتی ہے۔ اکثر تو یہ بات سمجھتے ہی نہیں اور اکثر ان کا عمل طولسطائے کی مرضی کے سراسر خلاف ہوتا ہے۔ طولسطائے اپنے شاگردوں میں سے چرتکو[۱] اور برجلکو کو نہایت ہوشیار اور عقلمند تصور کرتے ہیں۔

ان میں سے پہلے سے میں بھی واقف ہوں۔ گو وہ صاف دل، ایماندار اور مخلص بھی مگر میری رائے میں وہ غیر معمولی طور پر کم سخن ہیں۔ اس کے بعد ہم نے وقت کی مشہور

---

[۱] طولسطائے کا مشہور شاگرد اور اس کی تصانیف کا ناشر۔

شخصیت میکا اشا خوویچ[1] اور مسئلہ ضمیر پر اس کی جو معرکۃ الآرا تفسیر ہوئی ہے اس پر گفتگو شروع کی۔ اگرچہ طولسطائے کی رائے میں وقت آگیا ہے کہ روس کو آزادی ضمیر حاصل ہو جائے مگر میکا اشا خوویچ کے متعلق ان کی رائے کچھ زیادہ اچھی نہیں۔ وہ اسے شہرت کا بندہ اور کم ظرف انسان تصور کرتے ہیں مجھے یہ معلوم کرکے دلی مسرت ہوئی اس لئے کہ میری بھی اس کے متعلق یہی رائے تھی۔ کہ وہ محض ہر دلعزیزی حاصل کرنے کے لئے یہ سب کچھ کہتا ہے ورنہ اسے خود اپنی بات پر یقین نہیں!

پھر روس کی موجودہ صورت حال مثلاً انتشار حکومت، طریق کار کا فقدان، وزرا کی ضد اور ناعاقبت اندیشی۔ سپ یگنس[2] کی ناقابلیت۔ وٹس کی گستاخی۔ عام لا مذہبیت وغیرہ پر بات چیت ہوتی رہی۔ طولسطائے نے لا مذہبیت پر بہت تفصیل سے گفتگو کی اور اسی کو تمام موجودہ مصیبتوں کی اصل وجہ قرار دیا۔ جب میں نے ان سے کہا کہ "آپ کی تصانیف کے اکثر قارئین یہ سمجھتے ہیں کہ آپ روح کے دوام کے قائل ہیں" تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ مجھ سے کہنے لگے کہ "کیا واقعی ان میں سے بعض کی یہ رائے ہے اور میرے خیالات کی وہ اس طرح تعبیر کرتے ہیں؟ اگر یہ واقعہ ہے تو سوائے افسوس کے میرے لئے اور کیا چارہ کار ہے۔ مجھے خود اس بات کا احساس ہے کہ میں بہت بوڑھا ہو چکا ہوں مجھے اب پہلے کی طرح القا نہیں ہوتا اور بعض اوقات تو بالکل ہی نہیں۔ مگر میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میری لے دے کر ایک ہی تمنا ہے اور وہ یہ کہ جس طرح بھی ممکن ہو میں بنی نوع انسان کی مدد کروں۔ آج کل

---

[1] مجلس قانون ساز کا رکن۔ رئیس۔ خیالات میں لبرل "آزادی ضمیر" پر تقریر کرنے کے بعد تمام روس میں غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ ۱۹۲۳ء میں بحالت ہجرت انتقال ہوا۔

[2] ۱۹۰۱ء میں وزیر داخلہ مقرر ہوا۔ ۱۹۰۲ء میں کسی اجتماعی نے کام تمام کر دیا۔

[3] مشہور سیاسی۔ وزیر مال

میں ایک کتاب" ایمان" کی تصنیف میں منہمک ہوں۔ میری آرزو ہے کہ اسے میں اپنی موت سے پہلے تکمیل کو پہنچا دوں۔ یہ میری بڑی خوش قسمتی ہوگی اگر میں موت سے پہلے اسے اختتام تک پہنچا سکا۔ تقریباً دو تہائی حصہ ختم ہو چکا ہے۔ ایک تہائی باقی ہے۔ مگر اس میں کامیابی مشکل نظر آتی ہے۔ طبیعت موزوں ہی نہیں ہوتی۔ اکثر بیمار رہتا ہوں اور اسی وجہ سے یہ کام پڑا ہوا ہے۔"

طولسطائے کی گفتگو میں موت کا اکثر ذکر آیا کیا۔ یہ سوال اس وقت انہیں بہت پریشان کرتا ہے۔ گو وہ صاف صاف نہیں کہتے مگر پھر بھی انہیں اپنی زندگی کے متعلق جو شبہ پیدا ہو گیا ہے اسکا اظہار اکثر انکے الفاظ سے ہو جاتا ہے۔

اس دفعہ میری ملاقات ٹھیک دو گھنٹے تک جاری رہی۔ اور ہمیں دونوں میں گفتگو ہوا کی۔ طولسطائے کی گفتگو کا وہ حصہ خاص طور پر دلچسپ تھا جو سکندر اول کی سوانح اور اس کے عہد کی عام زندگی سے متعلق تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنے ناول" جنگ و صلح" کا بھی ذکر کیا۔ اس تمام بات چیت کا مجھ پر جو خاص اثر ہوا وہ یہ تھا کہ مجھے یقین آگیا کہ وہ بالکل بے تکلفانہ بول رہے ہیں اور انہیں میرے سامنے کسی طرح بننے کا خیال نہیں۔ انہوں نے نہایت بے باکی سے تمام مسائل پر گفتگو کی اور میں ان کی ملاقات سے حد درجہ متاثر ہوا۔

جس روز میں وہاں سے رخصت ہونے والا تھا تو صبح کے پہر میں آخری مرتبہ اس قابل تعظیم بزرگ سے ملاقات کی غرض سے گیا۔ ملاقات کا سلسلہ پھر گھنٹہ بھر رہا۔ اس مرتبہ طولسطائے نے جنگ کریمیا (۱۸۵۴ء-۱۸۵۶ء) کا تفصیل سے ذکر کیا جس میں وہ خود نوجوان کی حیثیت سے شریک تھے۔ اور جس میں سے محاصرہ سیباسٹوپل کا انہوں نے اپنی بعض مشہور تصانیف میں بھی ذکر کیا ہے۔ یہ یادگار انکے حافظے میں اس طرح محفوظ ہے کہ واقعہ کی جیتی جاگتی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اور اس کے سننے میں طبیعت کو عجیب حظ حاصل ہوتا ہے۔

اس کے بعد انہوں نے موجودہ زار نکولائی دوم کا ذکر کیا۔ طولسطائے کو ان سے بہت ہمدردی ہے اور وہ ان کی بڑی خوشی سے مدد کرنے کے لئے تیار ہیں۔ انہیں شہنشاہ نہایت بھلے مانس۔

نیک طبیعت اور مدد کرنے والے انسان معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ساری مصیبت انکے اردگرد کے لوگ ہیں۔ انہوں نے مرحوم زار سکندر سوم کا بھی اچھے الفاظ میں ذکر کیا اور کہا کہ "اگر وہ زندہ ہوتے تو یہ ذلیل پادری مجھے کلیسا سے نکال باہر نہ کر پاتے" پھر انہوں نے مجھ سے میرے والد[1] کی خیریت دریافت کی جن سے ان کی ملاقات ۱۸۵۴ء میں جنگ کریمیا میں فوجی افسر کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ طولسطائے نے انکے مزاج کی بابت دریافت کیا اور یہ سب اتنے پیارے اور بھلے انداز میں کہ میں تو یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ طولسطائے کو "نراجی" کہنا ظلم ہے۔ ایک بات اور کہہ کر میں مقدمہ ختم کرتا ہوں اور وہ یہ کہ طولسطائے، مصنف کی حیثیت سے ایک ہیں اور انسان کی حیثیت سے دوسرے۔ اور میں بہت ہی خوش قسمت ہوں کہ انہیں بچشم خود دیکھ سکا۔

. . . . . .

۵ را پریل کو طولسطائے نے نواب اعظم کے نام مندرجہ ذیل خط لکھا ہے:

ہز ہائنس نکولائی میکائیلووچ۔ مجھے آپ کا تار ملا۔ میں فوراً ہی جواب دینا چاہتا تھا مگر مجھے صاحب فراش ہونا پڑا۔ دو مہینے تک بستر سے اٹھنے اور قلم ہاتھ میں لینے سے قاصر رہا۔ فوراً میں یوں لکھنا چاہتا تھا کہ مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا۔ خاص طور پر اس وجہ سے کہ آپ نے میری درخواست پوری کی باوجود اس کے کہ اس سے آپ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ اور جو خط آپ نے پہنچایا ہے اور جسے آپ نے غالباً میری درخواست کے بموجب پڑھا بھی ہوگا۔ وہ آپ کے خیالات کے صریح مخالف اور طبیعت کو ناگوار ہوا ہوگا۔ اگر اس میں میں غلطی پر ہوں تو مجھے بہت خوشی ہوگی اگر آپ میرے شکوک کو معاف فرمائیں، بہرحال آج جبکہ پہلی مرتبہ طبیعت سنبھلی ہے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ چرتکوف کے ذریعہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ میرا خط خندہ پیشانی کے ساتھ وصول کیا گیا (یہ بہت خوب) اور یہ وعدہ کیا گیا کہ اسے کسی کو نہ دکھایا

---

[1] یعنی نواب اعظم میکائیل نکولائیوچ، زار سکندر کے بھائی جو عرصہ تک کوہ قاف کے حاکم رہے۔

جائے گا۔ مگر میں نے تو اس قسم کی کوئی درخواست نہ کی تھی۔ اب آپ نے اسے ضروری خیال لیا تو آپ کے پاس اس کے وجوہ بھی ہوں گے اور مجھے اس میں کوئی خاص عذر نہیں۔

اب میں اپنے بعض ان خیالات کی تشریح کرنا چاہتا ہوں جو میں نے آپ کے سامنے پیش کئے تھے اور جو میں خط میں اچھی طرح نہ کر پایا تھا۔ اور یہ اس امید پر کہ اگر آپ میرے ہم خیال نہ بھی ہو جائیں تو کم از کم مجھے اچھی طرح سمجھ سکیں اور میری تجاویز کو ایک غیر عملی شخص کے تخیل کی بلند پروازی نہیں۔ (اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سرکاری حلقوں میں مجھے یوں ہی سمجھا جاتا ہے) بلکہ سنجیدہ اور طویل فکر و خیال کا نتیجہ سمجھیں۔ میرا ایمان ہے کہ یہی ایک ذریعہ ہے جو اس مطلق العنانی کو مکمل تباہی و بربادی سے بچا سکتا ہے۔ یعنی یہ کہ حکومت ترقی کی ان تمام خواہشات کو جن کے حصول کی کوشش میں لوگ لگے ہوئے ہیں اپنا بنا لے اور اپنی قوت سے رعایا کے مقاصد کی تکمیل کرے۔ میرے خیال میں روسی قوم کے سامنے اس قسم کا جو مطمح نظر اب تک رہا ہے اور آج بھی یہی ہے کہ زمین کو شخصی ملکیت سے نجات دلانی چاہئے۔ اس مضمون پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور ابھی اور لکھا جائے گا۔ مگر بنیادی طور پر اس سوال سے امریکن مصنف ہنری جارج نے اپنی بڑی کتاب "ترقی اور افلاس" اور چھوٹے سے رسالے "اجتماعی مسائل" میں بحث کی ہے۔ یہ سوال میرے خیال کے بموجب اسی قدر اہم اور حل کا محتاج ہے جتنا اٹھارہویں صدی کے نصف اول میں غلامی کا مسئلہ تھا۔ مگر وقت یہ ہے کہ آج اس کا حل تو در کنار اس کا ذکر بھی بدیں وجہ ممنوع ہے کہ یورپ اور امریکہ کے امراء، اور امراء ہی نہیں تمام جائداد رکھنے والے جن کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ ہے اس بات کے کوشاں ہیں کہ یہ مسئلہ یہیں کا یہیں ختم کر دیا جائے اور اس پر سرکاری حلقوں میں گفت و شنید بھی نہ ہو۔ اس مسئلہ کا حل صرف روس میں مطلق العنانی کے وجود کی وجہ سے ممکن ہے اور روس میں اسے خاص اہمیت بھی حاصل ہے اس وجہ سے کہ روسی قوم کا بڑا حصہ کھیتی باڑی کا کام کرتا ہے اور اس کے لئے زمین کی کمی اور غیر مساوی تقسیم نے بڑی دشواریاں پیدا کر دی ہیں۔ ہنری جارج کا بتایا ہوا طریقہ جسے "وحدانی طریقہ مالگذاری"

کہا جاتا ہے اور جس کا غالباً آپ کو علم ہوگا نہایت آسان اور قابل عمل ہو۔ اسے یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ تمام زمین پر اس کی پیداوار کے مطابق لگان مقرر کر دیا جائے جو زمین جوتنے والے سرکار کو خود ادا کر دیا کریں۔ یہی ریاست کی آمدنی ہو اور وہ تمام دوسرے محصولوں کی جگہ لے سکے۔ میں بآسانی اندازہ لگا سکتا ہوں کہ سرکاری فرمان کی رو سے ایک مرکزی بورڈ اس غرض سے بنایا جائے جو زمین پر سے شخصی ملکیت اٹھا لے۔ اور حکومت کی ایک کمیٹی بنا دی جائے جو زمین پر لگان لگائے اور دوسرے امور کی انجام دہی کرے۔ جو روسی شہنشاہ صرف روسیوں کے لئے نہیں بلکہ تمام دنیا کے لئے یہ خدمت انجام دے گا وہ کتنا بڑا کام کرے گا۔ اور وہ کتنی خوبی کے ساتھ روز کے اجتماعیوں کے جھگڑے اور انقلابیوں کی چالبازیوں سے محفوظ ہو جائے گا۔ وہ اپنے آپ کو اپنی جگہ پر کس قدر محفوظ محسوس کرے گا۔ قوم کے بہترین افراد اسے مدد دیں گے اور اسی طرح عام رعایا جو اپنی سب سے اہم اور دلی خواہشات کو اس کے ذریعے پورا ہوتے ہوئے دیکھے گی۔ اور وہ خواہش یہی ہے کہ ہر شخص اس کا حق رکھتا ہے کہ وہ اپنے لئے زمین سے اپنی خوراک حاصل کرے جو خدا نے کسی ایک کو نہیں بلکہ بلا تفریق ہر ایک کو عطا کی ہے۔ یہ ہی میرا ایمان۔ مگر جیسا میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں یہ بہت ممکن ہے کہ میں غلطی پر ہوں اور کوئی اور مطمح نظر ہو جسے حاصل کرنے کی دھن میں انسان لگا ہوا ہے اور جو حکومت کا بھی مطمح نظر ہونا چاہئے یہ تو ممکن ہے مگر ایک چیز بہرحال ناممکن ہے اور وہ یہ کہ ایسی حکومت ہرگز زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتی جو موجودہ طریقہ پر چل رہی ہے، جو اپنی زندگی میں لوگوں سے بے تعلق ہو چکی ہے اور جو اپنے آپ کو رعایا کی خدمت کے لئے پیش کرنے پر آمادہ نہیں اور نہ رعایا کی اس مقصد کی طرف رہنمائی کرتی ہے جس کا حصول واقعی اسے خوشحالی دے سکتا ہے۔

کل سپاگنس[1] کے قتل کی اطلاع ملی۔ یہ واقعہ بہت تکلیف دہ ہے۔ خاص طور پر نفرت

---

[1] ۱۹۰۰ء وزیر داخلہ۔ ۱۹۰۲ء میں کسی انقلابی نے قتل کر دیا۔

غصہ اور انتقام کے ان جذبات کی وجہ سے جنہوں نے اسکا ہونا لازمی بنا دیا ۔ یہ بات بہرحال ایک دن ہونیوالی تھی ۔ اور اگر حکومت نے اپنے رویہ میں پوری پوری تبدیلی نہ کی تو درا صل یہ اور بھی آنے والی تباہی کا پتہ دیتی ہے ۔ کامل تظلم و تسخ صرف معقول سمجھوتے اور محبت پر قائم ہو سکتا ہے قوت، مقاتلہ اور انتقام پر کسی چیز کی بھی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی ۔

مجھے معاف فرمائے کہ میں نے آپ کو اتنا بڑا خط پڑھنے کی تکلیف دی، مگر اس سے میرا مقصد صرف اس قدر تھا کہ آپ میرے مطلب کو سمجھ سکیں کچھ تو کمزوری کی وجہ سے جس کا اندازہ آپ اسی سے کر سکتے ہیں کہ میں لیٹے لیٹے لکھ رہا ہوں اور خاص طور پر سپ یاکنس کے مظلومانہ قتل کے واقعہ کی وجہ سے میں غیر معمولی بے قراری محسوس کر رہا ہوں ۔ یہ واقعہ جانبین میں دشمنی اور سختی کے جذبات کو اور بھی بھڑکائے گا حالانکہ اس کو دور کرنا کس قدر آسان تھا ۔

اچھا اب رخصت ۔ میں تہ دل سے آپ کی جسمانی تندرستی اور روحانی مسرت و اطمینان کی دعا کرتا ہوں ۔

آپکا مخلص

لیو طولسطائے

ان خطوں کے جواب میں نواب اعظم نے طفلس سے دو خط لکھے ہیں جہاں ان دونوں انکا قیام تھا ۔ پہلا خط ۱۵ ر نومبر کا لکھا ہوا ہے :۔

صدیقی لیونکولائیوچ ۔ آپ کے خط نے جو مجھے کل ملا ۔ مجھے حد درجہ خوشی بخشی ۔ ایک تو اس وجہ سے کہ مجھے یہ معلوم ہوا کہ آپ اب اتنے تندرست ہیں کہ خط لکھ سکیں اور دوسرے اس وجہ سے کہ مجھے آپ کے جس خط کا انتظار رہتا وہ عین ایسٹر کے موقع پر ملا ۔ آپ کی صحت کے متعلق اب تک جو اطلاعات شائع ہوئیں انکا میں بڑی توجہ سے مطالعہ کرتا رہا ہوں اور خیال تھا کہ میں خود اب اپنی خاموشی کو توڑ دوں اور ڈھائی مہینے کے بعد کہ اس زمانہ میں سفر بھی کیا اور آرام بھی ۔ آپ کو پھر اپنی بکواس سے تکلیف دوں ۔

اب آپ اپنے خط کا جواب سنئے ۔ ۲۲ جنوری کو جب میں پیٹرس برگ پہنچا تو دوسرے ہی دن آپ کا خط ملا ۔ ظاہر ہے کہ اسے میں نے پڑھا ۔ اس کی ایک نقل کی اور خیال کیا کہ میں اسے بالیس و پیش اس تک پہنچا سکتا ہوں جس کے نام وہ لکھا گیا تھا[1] ۔

جب میں نے قیصر سے پوچھا کہ کیا میں خط آپ تک پہنچا سکتا ہوں تو انہوں نے جواب دیا "یقیناً" چنانچہ تین دن کے بعد جب ایک خاندانی دعوت ہوئی تو اس کے اختتام پر میں نے خود انہیں آپ کا خط دے دیا ۔ اسی کے ساتھ میں نے اپنی طرف سے یہ بھی کہا کہ "لیو گلولائے وچ کی عزت کے خیال سے میں آپ سے ایک درخواست کرتا ہوں جسے اگر شرف قبول بخشا گیا تو مجھے دلی مسرت ہوگی ۔ اور وہ درخواست یہ ہے کہ آپ اپنے وزرا میں سے کسی کو بھی یہ خط پڑھنے کے لئے نہ دیں ۔ یہ میری اپنی درخواست ہے" قیصر نے یہ وعدہ کیا کہ وہ خط کسی کو نہ دکھائیں گے اور فرمایا کہ وہ اسکا بہت دلچسپی کے ساتھ مطالعہ فرمائیں گے ۔ اس کے بعد مجھے کوئی اور موقع نہ مل سکا کہ میں اس خط پر ان سے گفتگو کر سکتا اور خود اس موضوع پر ان سے گفتگو چھیڑنا میں نے مناسب خیال نہ کیا ۔

میں اس بات سے ان کی نوازش کا اندازہ لگا سکتا ہوں کہ انہوں نے مجھے خط پہنچانے کی اجازت دی اور پھر اسے بڑی مہربانی کے ساتھ راز میں رکھنے کا وعدہ کیا ۔ ہمارا قیصر واقعی نہایت نیک دل اور دوسروں کی مشکل میں کام آنے والا انسان ہے ۔ ساری مصیبت تو وہ لوگ ہیں جو اس کے راز دار ہیں ۔ میں نے جب قیصر سے درخواست کی کہ وہ خط کسی اور کو نہ دکھائیں تو یہ محض آپ کی عزت کے خیال سے تھا ۔ اور اس خواہش کی بنا پر کہ ہزار قسم کی افواہوں اور وزرا کی تشریحات کا سدباب ہو سکے جن کا ہمیشہ یہ مقصد رہتا ہے کہ وہ قیصر کے سامنے آپ کی نہایت بھیانک تصویر پیش کریں ۔ مجھے امید ہے کہ آپ بھی اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھیں گے ۔

---

[1] یعنی زار نکولائی دوم کے نام

موجودہ حکومت اور مادر وطن کو اس انتشار کی حالت سے نکالنے کے لئے آپ اپنے ۵ راپریل کے خط میں جو نسخہ تجویز کرتے ہیں اس کے متعلق اگر آپ برا نہ مانیں تو میں عرض کروں کہ آپ کا تخیل بہت زیادہ بلند ہے۔ اور اس کے محض تخیل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ آپ روس میں اس بات کو ممکن سمجھتے ہیں جس کا یورپ اور یہاں تک کہ امریکہ میں بھی کوئی شخص خیال تک دل میں نہیں لاتا۔

مانا کہ ہر کسان اپنی چھوٹی سی ملکیت کا خود ہی ذمہ دار ہو اور اسکا لگان ادا کرے۔ مگر جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں آپ کا منشا تو یہ ہے کہ تمام جائداد مع اپنی تمام آمدنی کے ریاست یعنی شاہی خزانہ کی ملک ہو جائے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اگر مالکوں کی پوری جماعت یعنی ہر قسم اور رتبے کے مالک اس شرط کے ساتھ کہ آمدنی کا ایک حصہ انکے لئے مخصوص ہوگا اس پر راضی بھی ہو گئے تو آپ کو خود کسانوں کی نہایت خوفناک مخالفت کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ اتنے عظیم الشان مقصد کی تکمیل کے لئے ایک غیر معمولی زار کا وجود لابدی شے ہے۔ مثلاً پیٹر اعظم پھر اس کے ساتھ ایسے ہی دوسرے مدد کرنے والے ہوں نہ کہ وہ جو آج نکولاؤ دوم کے احکام کی تکمیل کرتے ہیں۔ آج وہ محکمے جن کے قیام کو سو سال سے اوپر ہو چکے ہیں مجلس قانون ساز، مجلس مدبرین اور وزارت، ان کی از سر نو اصلاح اور ان میں نئی روح پھونکنے کے لئے یہ اشد ضروری امر ہے۔

میں اس موضوع کو اسپر ختم کرتا ہوں کہ آپ کے خیالات جس قدر بلند اور ہمدردانہ ہیں انہیں عملی جامہ پہنانا اسی قدر دشوار ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ "کل جگ" اصلاح کا محتاج ہے۔ مگر اصلاح قابل ہونا چاہئے نہ کہ عجلت پسندانہ۔ اب سب سے اہم سوال یہ باقی رہتا ہے کہ اصلاح کا کام شروع کہاں سے کیا جائے۔ کتنے مسائل ہیں۔ تعلیم، تربیت، مدرسین، اساتذہ مزدور، نقصان پہنچانے والے افسر، جماعت حکام، عام مصیبتیں، دولت پیدا کرنے کا سوال ناقابل برداشت فوجیت، ضابطہ کا فقدان۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہی مسائل کیا کم ہیں کہ آپ کا منشا کاری

کی اصلاح کا مسئلہ بھی چھیڑنا ممکن خیال کرتے ہیں۔ انسان جماعت کا ساتھ دے کر ہی تو لڑائی لڑ سکتا ہے مگر آپ کو اس کی کوئی یقین نہیں کہ آپ اس معاملہ میں تنہا ہیں۔ اس لئے کہ جب آپ کے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کا سوال آئے گا تو وہ لوگ بھی جو آپ سے ہمدردی رکھتے ہیں آپ کا ساتھ نہ دے سکیں گے۔ میرے خیال میں تو ہماری سوسائٹی اس قدر قعر مذلت میں جا چکی ہے کہ اس کی اصلاح صرف حکومت کی مستحکم اور مسلسل کوشش اور اس کی پوری پوری رضامندی ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ میری رائے میں شہنشاہیت اب بھی محفوظ رہ سکتی ہے۔ اگر وہ اپنی ذمہ داری کو ۱۳ کرور انسانوں کے سامنے کم کرے اور وزرا کی ذمہ داری بڑھا دے۔ خرابی کی جڑ یہ ہے کہ یہ تمام چیزیں بہت پرانی ہو گئی ہیں۔ انیسویں صدی میں زندگی اور اس کی ضروریات کہیں آگے نکل گئیں مگر ہمارے سرکاری محکمے وہیں کے وہیں رہے۔ اس کی اگر اصلاح ہوئی اور اسے پھر زندہ کیا گیا تو پھر اسکا بھی امکان ہوگا کہ اس پیچیدہ مسئلہ پر جو آپ نے چھیڑا ہے غور کیا جائے اور یہ بلند تخیل خوبی کے ساتھ عملی جامہ پہن سکے۔

آپ کو مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ سپاگنس کے قتل کی وجہ سے جوش اور غصے کے ایسے جذبات پیدا ہوں جو نہ ہونے چاہئے تھے۔ اب مجھے تو یہ دیکھنے کا شوق ہے کہ پلیوے[1] معاملہ کو کیونکر طے کرتا ہے۔ مجھے تو فن لینڈ اور کوہ قاف میں اچھی علامات نظر آرہی ہیں۔ خدا کرے میں اپنے اس خیال میں غلطی پر نہ ہوں۔ اب وانوسکی[2] کے استعفے پر کیا رائے زنی کی جا سکتی ہے۔ کیا اپنی ہر دلعزیزی کی خاطر اور خود اپنی مرضی سے اپنے قیصر کو ایسے وقت میں خیرباد کہنا

---

[1] ورک۔ پلیوے: جو سپاگنس کی جگہ وزیر داخلہ مقرر ہوا تھا اور ۱۵ر جولائی ۱۹۰۴ء کو ایک انقلابی کے ہاتھ مارا گیا۔

[2] وانوسکی (۱۸۲۴ء تا ۱۹۰۴ء) ۱۸۸۱ء سے ۱۸۹۸ء تک وزیر جنگ تھا، اس زمانہ میں اس نے بہت سی اصلاحات کیں۔ ۱۹۰۱ء میں جب وزیر تعلیم کے قتل کا واقعہ ہوا تو اسے وزیر تعلیم مقرر کیا گیا۔ ایک سال تک نوجوانوں کی انقلابی تحریکوں سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کرتا رہا اور ۱۹۰۲ء میں اپنی جگہ سے مستعفی ہو گیا۔

اور اس کے بدلے اور دشواریاں پیدا کرنا مناسب تھا؟

مگر میں نے اپنے خط کو بہت طول دیا۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں آپ اسے پڑھتے پڑھتے تھک نہ جائیں، میں اس طویل تحریر کے لئے معافی کا خواستگار ہوں۔ اگر آپ کے پاس وقت ہو تو مجھے لکھئے۔ مجھے جانچ پڑتال کا ذرہ برابر خوف نہیں اور مجھے آپ سے گفتگو کرنے میں بہت لطف آتا ہے۔ آپ کی ۵ر نومبر کی سطروں کا تہ دل سے شکریہ جنہوں نے مجھے اطمینان اور یقین دلایا ہے کہ آپ کے دل میں میرے لئے جگہ ہے۔ میں دل سے دعا کرتا ہوں کہ آپ جلد سے جلد دوبارہ تندرست و توانا ہو جائیں۔ آپ اپنی صحت کا بہت خیال رکھئے۔ اور بغیر سوچے سمجھے زیادہ تفریح کے لئے باہر نہ جانے۔ نہ پیدل اور نہ گھوڑے پر۔ براہ کرم اپنی بیگم صاحبہ کی خدمت میں نیاز مندانہ سلام پہنچا دیجئے۔ میں آپ سے پوری قوت کے ساتھ مصافحہ کرتا ہوں۔

آپ کا نہایت ہی مخلص

نکولا ذمیکا ئیلووچ

نواب صاحب کا دوسرا خط یہ ہے:۔

جیبی لیو نکولائی وچ۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ ملیریا کے حملہ کی وجہ سے دوبارہ کمزوری محسوس کر رہے ہیں۔ مگر امید ہے کہ موسم گرما کے ساتھ ساتھ آپ کی قوت بھی عود کر آئے گی۔ آپ نے از راہ کرم مجھے جو خط لکھا ہے اس میں اس قدر اہم، بنیادی اور دلچسپ سوالات سے بحث کی گئی ہے کہ میں نے اسے کئی بار پڑھا، مگر مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میں آپ سے بہت سی باتوں میں متفق نہیں ہو سکتا۔ اس کی سب سے پہلی وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ مجھے ہنری جارج کی کتاب کے متعلق پوری معلومات نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اس کے مطالعہ سے قاصر رہا اور میرے ذہن میں اس کتاب کا صرف ایک دھندلا سا خاکہ ہے۔ مجھ پر اتنی نوازش کیجئے کہ مجھے اس کتاب کا روسی یا فرانسیسی ترجمہ بھیج دیجئے۔ اس لئے کہ اگر میں انگریزی میں پڑھوں تو جلد پڑھنے میں بہت سے الفاظ کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ اختلاف کی دوسری وجہ غالباً زراعتی معاملات سے میری

ناواقفیت ہی ظاہر ہے کہ اس موضوع پر میرے تمام دلائل کچھ زیادہ وقیع نہیں ہو سکتے۔ اور خصوصاً آپ کے سامنے کہ آپ نے اتنی کثرت کے ساتھ اور بغیر دم لئے ہوئے ان مسائل کا مطالعہ کیا ہو۔ تجربہ اور علم اشیا آپ کی پشت پر ہیں اور میری طرف صرف مباحثہ کی قابلیت۔

اگر مجھے روزانہ کے مسائل سے دلچسپی ہو بھی تو میری طبیعت کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہو کہ میں اس کی طرف صرف اس وقت توجہ کرتا ہوں جب مجھ پر کوئی ذمہ داری عائد کیجائے۔ لیکن آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ مجھے ان معاملات سے کتنا واسطہ ہے اور پیٹرس برگ کے سرکاری حلقوں سے میں اپنے آپ کو کس قدر دور رکھتا ہوں۔ لہذا مخلوق کے معاملات میں کسی طرح کا فائدہ یا نقصان پہنچانے کا سوال تو جاتا رہا۔ البتہ میں بیٹھے بیٹھے کاغذ پر نظریے بنا سکتا ہوں اور آپ کا مشکور ہوں کہ آپ مجھ سے خط وکتابت پر آمادہ ہو گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب سے آپ نے گذشتہ خزاں کے موقع پر مجھ سے چند گھنٹوں کے لئے ملاقات کی ہے اور آپ کا دل میری طرف سے مطمئن ہو گیا ہے۔ اس وقت سے آپ میرے حال پر جو عنایت فرماتے ہیں اسے میرا دل اچھی طرح محسوس کرتا ہے لیکن اس قدر پیچیدہ مسائل پر خط وکتابت، آمنے سامنے گفتگو کے ذریعہ تبادلۂ خیالات کی نسبت بدرجہا دشوار ہے۔ اور افسوس اس بات کا ہے کہ نہ معلوم اسکا موقع مل سکے گا کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں اور جی بھر کے گفتگو کروں۔ مجھے یقین ہو کہ اس صورت میں آپ کے پیش کردہ مسائل کے متعلق مجھے جو غلط فہمیاں یا شبہات ہیں وہ فوراً رفع ہو جائیں گے۔ مگر کاغذ پر یہ ذرا مشکل معلوم ہوتا ہو۔

میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ آپ کے خط کی بعض باتوں کا جواب نہ دوں :-

۱۔ اگر آپ مطلق العنان حکومت کو اس کا اہل سمجھتے ہیں کہ وہ اس قسم کی زراعتی اصلاحات کر سکے جن کا خاکہ ہنری جارج نے اپنی کتاب میں کھینچا ہے تو پھر گویا آپ اس کی موجودہ ساخت کو بھی اس قابل سمجھتے ہیں۔ مگر آپ تو خود ہی فرماتے ہیں کہ موجودہ اہل کار اس قابل نہیں اور ان میں سے ہر ایک دوسرے سے بدتر ہے۔ اس سے جو نتیجہ نکل سکتا ہے وہ صاف ہے۔

یعنی یہ کہ ان کی جگہ اوروں کو مقرر کرنا چاہئے۔ مگر کیسے؟ کیا شاہ نکولاؤ دوم کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ حکومت کا تمام عملہ بیک وقت بدل سکے؟ آپ پرانے محکموں کو پرانے زمانہ کی یادگار تو سمجھتے ہیں مگر اس کے ساتھ "پرانی قمیص پر نئے پیوند لگانا" آپ مناسب نہیں خیال کرتے۔ پھر میری سمجھ میں کوئی دوسرا اصل نہیں آتا کہ نئے عناصر کیونکر ان اجسام میں داخل کئے جا سکتے ہیں جو اپنی زندگی ختم کر چکے ہیں۔

۲۔ اب فرض کیجئے ہیں ایسے اشخاص مل بھی گئے کہ جو کام کر سکیں اور روس سے اچھی طرح واقف ہوں۔ (یہ دوسری شرط میں اپنی طرف سے لگاتا ہوں) آپ کے خیال میں تو ایسے لوگوں سے "روس بھرا پڑا ہے" مگر میں اسے آسانی یقین نہیں کر سکتا۔ میری رائے میں یہ بہت مشتبہ امر ہے۔ مگر پھر بھی فرض کیجئے کہ آپ کو ایسے اشخاص مل گئے تو کیا آپ کے خیال میں یہ ممکن ہے کہ ان تمام نئے تمام دس یا بیس عہدہ داروں کے دل میں بھی زراعتی اصلاح اور اس کے فوائد کا خیال گھر کر لے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر نکولاؤ دوم کے ذہن میں آپ کی تجاویز کے فوائد آ گئے اور اس نے انہیں پورا بھی کرنا چاہا تو سب سے پہلے راہ میں جو رکاوٹ آتی ہے وہ عہدہ داروں کا انتخاب ہے اور واقعہ یہ ہے کہ پھر وہی "گھڑیال، راج ہنس، اور جھینگے" کی کہانی اپنے آپ کو دہرائے گی۔

۳۔ اسی خیال سے میں نے آپ کو لکھا ہے کہ اس قسم کی بلند پایہ اصلاح کے لئے (اگر اسے منصفانہ سمجھا جائے) تو پیٹر اعظم جیسی شخصیت کی ضرورت ہے یعنی ایسا شہنشاہ جو قوی ہو، آزاد ہو، اپنی تجاویز پر آخری دم تک اڑا رہنے والا ہو اور پھر لوگوں کے انتخاب کا ملکہ رکھتا ہو۔ محض نیکی اور خوش خلقی کے ذریعہ آپ جو کچھ چاہتے ہیں اس میں سے عشر عشیر بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس پر میرا پورا پورا یقین ہے۔ اس لئے کہ شہنشاہ کی یہ خوبیاں دراصل اس کی مطلق العنانی کے قیام کی بنیاد ہیں۔

۴۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی موجودہ حالت کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہئے اور یہ نہیں کہ

زار کو لاؤ ووم سے تا ممکنات کا مطالبہ کیا جائے۔ ضروری یہ امر ہے کہ اس کی مدد کی جائے۔ اور یہی ہر اس روسی کا اولین فرض ہے جو اپنے وطن اور اپنے بادشاہ کو عزیز رکھتا ہے۔ ان اعلیٰ محکموں کی نئی اصلاحات کا خیال میرے دل میں پیدا ہوا۔ یہ کام وزرا کے ذمہ کر دینا چاہئے۔ مگر آپ پوچھیں گے کہ وہ کس کے سامنے ذمہ دار ہوں؟ اس کا کھلا ہوا جواب یہ ہے کہ رائے عامہ کے سامنے کوئی وجہ نہیں کہ سرکاری اطلاعات میں مجلس قانون ساز کے اجلاس اور اس کے محکموں کی ٹھیک ٹھیک کارروائی شائع نہ کی جائے۔ جب ہر وزیر کو اس کا علم ہوگا کہ جو لفظ بھی اس کی زبان پر آئے گا۔ اس کا رعایا کو علم ہو جائے گا۔ تو پھر اسے کہنے سے پہلے ذرا اچھی طرح غور کر لینا ہوگا۔ اس صورت میں کام کی مقدار زیادہ ہو جائے گی اور فضول گوئی کم۔ اور اسی سے ایک طرح کی اخلاقی جوابدہی کی ابتدا ہو سکے گی۔ ایک طرف زار کے سامنے اور دوسری طرف پبلک کے سامنے۔

موجودہ محکموں کی تعداد اور یہ تمام لکھا پڑھی جو حد سے زیادہ بڑھ چکی ہے کیوں نہ کم کر دی جائے؟ اور ایسے حکام جو بے لگام چھوڑ دئے گئے ہیں اور جن کی حیثیت اس کیڑے کی سی ہے جو درخت کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا کر دیتا ہے۔ وہ حکام جنہیں جب بھی موقع ملتا ہے حکومت کے نام پر بٹہ لگاتے ہیں ان کو کیوں نہ اچھی طرح قابو میں رکھا جائے؟ بہت کچھ جو اب تک زار کی آنکھ سے پوشیدہ ہے پھر وہ اس کے سامنے آئے گا۔ اور اس کی آنکھیں کھلیں گی۔ تب اس کے لئے یہ آسان ہوگا کہ وہ معتبر اور اپنی مرضی کے مطابق حکام کا انتخاب کرے۔

اس طرح تمام اعلیٰ محکموں کی از سر نو ترتیب کے ساتھ نئے لوگ بھی خود بخود سامنے آئیں گے اور شاید آپ کی تجاویز واقع کی صورت اختیار کر سکیں گی۔ گزشتہ صدی میں بھی آخر لوگ تھے ہی جو اس بات کے کوشاں تھے کہ زندگی میں نئی روح پھونکیں۔ کیا آپ کی نظر اسپرانسکی[1]

---

[1] اسپرانسکی۔ (۱۷۷۲ء تا ۱۸۳۹ء) مشہور روسی سیاست داں۔ روس میں بہت سی اصلاحات کا

ن۔ س۔ موردوینو[51] نواب کانکران[52]، ن۔ ا۔ ملیوتن[53]۔ اور خود قیصر سکندر دوم کی شخصیتوں پر نہیں جاتی؟۔ اس طرح زار سکندر سوم نے اپنے خاص روسی انداز میں تمام چیزوں کو روسی رنگ دینے کی کتنی کوشش کی؟ اندرونی سیاست میں ہمیشہ ریاست کی بھلائی ان کے پیش نظر رہی اور بیرونی سیاست میں ان کے ۱۳ سالہ عہد میں روس نے وہ حیثیت حاصل کی جو اس سے پہلے اسے کبھی حاصل نہ ہوئی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری روسی زندگی میں مطلق العنان بادشاہ کو کتنا اہم درجہ حاصل ہے۔ مگر میں پھر دہراؤں کہ محض نیکی اور نرمی سے کام نہیں چل سکتا۔

میں نے پھر اپنے شبہات اور بعض فروعات کے بیان میں طول کو بہت دخل دیا اور پھر بھی مجھے خوف ہے کہ میں آپ کو ذرہ برابر بھی مطمئن نہیں کر سکا ہوں۔ مگر میں دوبارہ عرض کر دوں کہ میں ہمیشہ ہی ایمانداری کے ساتھ لکھ دیتا ہوں جو کچھ میرے دماغ میں آتا ہے۔ بہرحال اس بات پر ہم دونوں متفق ہیں کہ موجودہ صورت حال زیادہ عرصہ تک قائم رہنے والی نہیں۔ اور اگر یہ ڈھرا یوں ہی چلتا رہا تو تباہی و بربادی یقینی ہے۔ اب اس مرض کے علاج کے متعلق مجھ میں اور آپ میں اختلاف ہے۔ میرے لئے یہی بات اطمینان بخش ہے کہ میں آپ سے صاف صاف اپنے دل کی بات کہہ سکتا ہوں اور آپ اسے صبر کے ساتھ سن لیتے ہیں۔

ذمہ وار۔

[51] نواب ن۔ س۔ موردوینو (۱۷۵۴ء تا ۱۸۴۵ء) اعتدال پسند روسی سیاست داں۔

[52] نواب ا۔ ف کانکرن (۱۷۷۴ء تا ۱۸۴۵ء) المانی النسل، ۲۲ سال کی عمر میں روس گیا اور وہاں سرکاری ملازمت اختیار کی۔ ۱۸۲۳ء تک وزیر مالیات رہا۔

[53] ن۔ ا۔ ملیوتن (۱۸۱۸ء تا ۱۸۷۲ء) سکندر دوم کے عہد کا مشہور مدبر۔

آخر میں پھر آپ سے درخواست ہے کہ آپ بہت احتیاط سے کام لیں۔ اور جب تک طبیعت بالکل صاف نہ ہو جائے کسی قسم کی مشقت نہ کریں مجھے امید ہے کہ کریمیا کی آب و ہوا اور موسم گرما کا آپ کی صحت پر اچھا اثر ہوگا۔ میں آپ سے نہایت گرمجوشی سے مصافحہ کرتا ہوں۔

آپ کا مخلص ترین نیازمند

نکولائیو میکا ئیلووچ

غزل

(از حضرت احسانؔ)

نہاں ہے جسکی ہر اک موج میں پیام سُرُش — وہ ہم شکستہ دلوں کا ہے نغمۂ خاموش
نگاہ شوق لطافت سے ہو اگر معمور — تو رقص گاہ تجلی ہے دیدہ کا آغوش
نظر سے بچ نہ سکا کوئی نکتۂ فطرت — جنون عشق میں اللہ ری یہ عالم ہوش
ابھی نصیب کہاں ذوق بیحسی دل کو — اک اضطراب ہی پر ہی یہ اضطراب خموش
نکل گئے ہیں بہت دور تیرے دیوانے — غضب ہوا جو کہیں انکو آگیا پھر ہوش

بنیادی اصلاح

رانیم نوو؟ لیا جدید روس کا مشہور افسانہ نگار ہے۔ ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوا۔ بچپن ایک صنعتی شہر میں گزرا۔ لڑکپن کا زمانہ اوڈیسا میں ایک مدرسہ میں کاٹا اور اپنے وطن میں آن بسا۔ بچپن ہی سے اس کی نظر بہت تیز اور زبان بہت شوخ تھی۔ انقلابی تحریکوں میں حصہ لیا، اس لئے کئی مرتبہ قید خانہ میں رہنے کا بھی اتفاق ہوا۔ اس نے ۱۸ سال کی عمر میں افسانے لکھنا شروع کر دئے تھے لیکن پھر کچھ عرصہ کے لئے اس شغل کو ترک کر دیا۔ اس کی طنزیہ تحریریں روس میں تلوار کا کام کرتی ہیں، بولشویکوں نے اسے اپنا لیا ہے، لیکن یہ ان پر بھی وار کر ہی دیتا ہے۔ ذیل کا افسانہ نہ معلوم روس کے انسانوں کی ہجو ہے یا ان کے معلمین کی!)

اشتہار

گھر بھی روز جیسے ہیں، گلیاں بھی۔ سر پر وہی نیلا آسمان۔ سڑک کے پتھر اُسی پرانے مٹیالے لباس میں ہیں۔ مگر کچھ آدمی ہیں، بدحواس و پریشان، جو دیواروں پر بڑے بڑے اشتہار چسپاں کر رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے ہیں اور لیئی کی بالٹی میں جو سیڑھی کے ڈنڈے میں لٹکی ہے ٹپ ٹپ گر رہے ہیں۔

اشتہار کی عبارت نہایت سادہ ہے، بے رحم اور بے پناہ۔ ملاحظہ ہو:۔

ہر شخص کے لئے

بلا استثنا

عدالت العالیہ نے ایک خاص تحقیقاتی کمیشن کا تقرر فرمایا ہے۔ جو شہر کے باشندوں کا امتحان کریگا۔ نیز محلہ محلہ تحقیق کر کے فیصلہ کریگا کہ شہریوں

میں کس کس کو زندہ رہنے کا حق ملنا چاہیئے۔ جو باشندے مدنامے میں درج کئے جائیں گے اور جن کا وجود غیر ضروری قرار پائے گا انھیں برخاستی کا حکم ملے گا اور انہیں ۲۴ گھنٹے کے اندر دنیا کو چھوڑنا ہوگا۔ حکم برخاستی کے خلاف ۲۴ گھنٹے کے اندر مرافعہ دائر ہو سکتا ہے۔ مرافعہ تحریری ہونا چاہیئے۔ یہ درخواست کا مرافعہ عدالت العالیہ کی مرکزی کونسل کے سامنے پیش کر دی جائیگی تین گھنٹے کے اندر فیصلہ صادر ہو جائے گا۔ غیر ضروری انسان جو قوت ارادہ کے ضعف یا زندگی سے محبت کے باعث زندگی ترک کرنے پر بخوشی آمادہ نہ ہونگے اُن کے متعلق عدالت العالیہ مناسب کارروائی کرے گی اور اُن کے دوستوں، پڑوسیوں، یا خاص مسلح ٹولیوں کے ذریعہ تعمیل حکم کرائے گی۔

نوٹ:۔ ا ۔ باشندگان شہر پر واجب ہے کہ کمال اطاعت کے ساتھ عدالت عالیہ کے اراکین کے احکام کو مانیں۔ ان کے سوالات کے جواب صحیح صحیح دیں۔ ہر غیر ضروری شخص کے خصائص کے متعلق ایک سرکاری رپورٹ بھی شائع کی جائے گی۔

۲ ۔ اس حکم پر بلا رورعایت عمل ہوگا۔ انسانی فضلہ جو زندگی کو عدل و مسرت کی بنیادوں پر تعمیر نہیں ہونے دیتا اُسے بے رحمی کے ساتھ صاف کرنا ہے۔ یہ اعلان بلا امتیاز سب کے لئے ہے۔ مرد عورت، غریب امیر کوئی مستثنیٰ نہیں۔

۳۔ حق زندگی کی تحقیقات کے دوران میں شہر چھوڑ کر جانا سخت ممنوع ہے۔"

ہمارے بھائی! تم نے پڑھا؟

"تم نے پڑھا بھی؟"

"کیوں جی، پڑھا، یہ پڑھا؟"

"تم نے پڑھا؟"

"پڑھا؟ پڑھا؟"

شہر میں ہر جگہ آدمیوں کا جمگھٹا۔ راستے بھیڑ سے بند۔ کسی کے پاؤں جواب دے گئے، اشتہار پڑھتے پڑھتے وہیں دیوار کا سہارا لے لیا۔ کوئی زار و قطار رو رہا ہے۔ کوئی غش کھا کر گر پڑا۔ شام تک بے تعداد لوگوں کو ضعف کے دورے پڑ گئے۔ شہر میں کہرام مچ گیا۔ جو ہے بس یہی "تم نے پڑھا، تم نے سنا؟"

"ارے کیسا غضب ہے۔ کسی نے ایسا اندھیر نہ سنا نہ دیکھا۔"

"کیوں بھائی ہمیں نے تو عدالت عالیہ کو منتخب کیا تھا، ہمیں نے تو انھیں سارے اختیارات دئے تھے!"

"ہاں، یہ تو سچ ہے"

"اس مصیبت کے ہمیں ذمہ دار ہیں، ہمیں ہیں، جی ہمیں"

"ہاں، یہ تو سچ ہے۔ قصور تو اپنا ہی ہے۔ ہمیں نے تو بہتر زندگی کی خواہش کی تھی۔ مگر یہ کسے خبر تھی کہ اس کی تدبیر ہوگی۔ عدالت نے جو سہل اور سخت طریقہ نکالا وہ کسی کے خیال میں بھی نہ تھا۔"

"نام تو دیکھو، کمبختوں کے نام، جو اس کمیٹی میں ہیں۔ اللہ اللہ کیا لوگ ہیں۔"

"کون، کون۔ تمھیں کیا خبر؟ کیا نام بھی نکل گئے؟"

"ایک جان پہچان والے سے سنا ہے۔ کمیٹی کا صدر "آک" ہے۔"

"سچ؟ خدا کا شکر ہے۔ یہ بھی خوش قسمتی جانو۔"

"ہاں ہاں۔ وہی صدر ہے۔"

"یہ بڑا ہی اچھلہے۔ واللہ کیا آدمی ہے!"

"ٹھیک۔ پھر زیادہ فکر نہیں۔ وہ تو واقعی فضلیہ ہی کو صاف کرے گا۔ وہ ناانصافی نہیں کرنے کا۔"

"بھائی کیا کہتے ہو۔ مجھے چھوڑ دینگے؟ میں تو اچھا خاصہ آدمی ہوں۔ خبر ہے؟ ایک دفعہ ایک جہاز ڈوبا تو بیس آدمیوں نے ایک کشتی میں اپنی جان بچائی۔ مگر کشتی اتنے آدمیوں کا بوجھ نہ سہارسکی اور سب کے سب ڈوبنے ہی کو تھے۔ پندرہ کشتی میں بیٹھ سکتے تھے۔ ان کی جان بچانے کے لئے پانچ کو سمندر میں کودنا ضرور تھا۔ میں ان پانچ میں پہلا تھا۔ میں سب سے آگے کودا۔ دیکھتے کیا ہو، یقین نہیں آتا؟ اب بڈھا ہو گیا، کمزور ہو گیا۔ کیوں تم نے کیا واقعی یہ بات پہلے نہیں سنی تھی؟ اس وقت تو سارے اخبار کے اخبار اس سے بھرے پڑے تھے۔ میرے چار ساتھی تو مر گئے۔ میں اتفاق سے بچ گیا۔ کیوں کیا سمجھتے ہو؟ مجھے چھوڑ دینگے؟"

"اور مجھے؟ اور مجھے؟ میں نے اپنا سارا مال دولت غریبوں کو دے ڈالا۔ بہت دن ہوئے۔ میرے پاس ثبوت کے کاغذ موجود ہیں۔"

"بھائی کیا خبر۔ یہ سب اُس پر منحصر ہے کہ عدالت کے پیش نظر کیا چیز ہے؟"

"اجی حضرت۔ میں عرض کرتا ہوں کہ اپنے پڑوسی کو تھوڑا سا فائدہ پہنچا دینے سے آدمی کو زندہ رہنے کا حق نہیں ملجاتا۔ یوں تو پھر ہر بیوقوف اناّ اور دائی کو زندہ رہنے کا حق ملنا چاہئے۔ یہ تو پُرانے دقیانوسی خیالات ہیں۔ زمانہ بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ آپ ہیں کہاں؟"

"اچھا تو پھر آدمی کی اصلی قدر و قیمت کاہے سے ہے؟"

"ہاں، واقعی بتائیے، کاہے سے ہے؟"

"میں کیا جانوں، کاہے سے۔"

"خوب، یہ خوب رہی۔ جب نہیں جانتے تو پھر خواہ مخواہ ہر بات میں اپنی ناک کیوں گھسیڑتے ہو؟"

"معاف کیجئے گا۔ میں جو سمجھتا تھا وہ میں نے کہہ دیا۔"

"لوگو، لوگو، ذرا دیکھو تو، دیکھو تو! سب کے سب بھاگ رہے ہیں۔ گڑبڑ تو دیکھو! ہنگامہ!!"

"یا اللہ، یا اللہ...... اوہو، اُفوہ...... جان بچاؤ، جان۔"

بھاگڑ

سڑکوں اور گلیوں میں بھاگڑ پڑی تھی۔ آدمیوں کے غول کے غول اِدھر سے اُدھر دوڑے دوڑے پھرتے تھے۔ لال لال منہ والے نوجوان، چہروں پر ہوائیاں۔ دفتروں اور دکانوں کے بیچارے غریب منشی اور محرر۔ نئے کھڑ کھڑاتے جوڑے پہنے ہوئے دولھا۔ گوئیے، ہیجڑے۔ بانکے۔ قصہ گو۔ اینٹیں کھیلنے والے۔ ہر شام کو سینما میں جانے والے۔ سفارشی ٹٹو، بدکار، بدمعاش، ٹھگیے، سفید پیشانی اور گھونگردار بالوں والے۔ لچے، شہدے، تفندے، نشہ باز۔ ٹھٹھے لگانے والے، ھلڑ مچانے والے، خوش چھیلے عشاق، سائیکلوں پر چڑھنے والے! ہٹے کٹے جھگڑالو جنھیں بیکاری کی وجہ سے سوائے ٹھلکلی کے کوئی کام نہیں، باتیں بنانے والے؛ تریبی لٹ لمبے بال والے مکار رکیٹی پاکمنڈی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر آہ سرد بھرنے والے، غمگین اداس آنکھوں والے جنکے غم کے پردہ میں بس کچھ نہیں۔ نوجوان بانگڑ گنوار، بھرے بھرے چہرے، لال لال ہونٹ والے، چکنی چپڑی باتیں کرنے والے، شیخی باز، بدگو، نیک دل بھولے ناکام لوگ، اور چالاک خراباتی۔

موٹی موٹی، ٹھوس ٹھوس کر کھانے والی سست عورتیں بھی دوڑ رہی تھیں

اور پتلی دبلی بڑھاکو جھگڑالو عورتیں بھی چنچل چلبلی، کان کھاؤ منہ چاٹ، عقلمندوں کی
اور بیوقوفوں کی، بے وفا، باتونی، حاسد، لالچی، خوف کے مارے سب کے چہرے
ہوئے۔ گمری مدیخ آلنیں؛ نیک پارسا گھر بیکار عورتیں، جو بیکاری میں اور کچھ نہیں
بال ہی رنگا کرتی ہیں؛ بے وارث و بے یار، بے سہارے اور بے مددگار عورتیں
بے لاج عورتیں، فقیرنیاں، بھک منگیاں؛ مارے ڈر کے سب خراب حال، نہ
پاس لحاظ سب بالائے طاق۔

کمر جھکے بوڑھے بھی دوڑ رہے تھے، اور موٹے ہٹے کٹے بھی۔ ٹھنگنے بھی لـ
خوبصورت بھی بدصورت بھی۔ طوائف خانوں کے مالک، مال گروی رکھنے والے
برہمنی، بنیئے بقال، جیل خانوں کے منتظم، سربراہ کار، سلیقہ شعار بڈھے بڈھے خ
اچھے کھاتے پیتے گرہست، لوگوں کو دھوکہ دے دیکر موٹے ہونے والے، معز
مقدس ڈاکو۔

سب کے سب دوڑ رہے ہیں۔ ایک پر ایک چڑھا جاتا ہے۔ بدن پر
ہیں، سر پر، کپڑے گدڑے لدے ہیں۔ منہ سے لعاب نکل رہی ہے۔ خاموش
افسردہ گھروں سے ان کے چیخنے چلانے، رونے پیٹنے کی صدائے بازگشت اٹھ
ہے۔ پتہ ہے ہیں کہ اپنا سارا مال اسباب لئے جا رہے ہیں۔ کسی کی انگلیاں اسـ
ہی میں گڑی ہیں۔ کوئی اپنا صندوق گھسیٹ رہا ہے۔ کوئی زر و جواہر لئے جا رہا
کوئی اپنے بچوں کو کھینچ رہا ہے۔ ایک گھر سے چلاتا پیٹتا نکلا، پھر لوٹا، سر پیٹنے لگا،
سڑک پر دوڑا۔

مگر سب کو لوٹا دیا جاتا تھا۔ سب کو۔ انہیں کے سے دوسرے انسان از
بے دریغ گولی چلا رہے تھے؛ ان کا راستہ روک رہے تھے، ڈنڈوں سے خو
پیٹ رہے تھے؛ گھونسے بھی چل رہے تھے، پتھر بھی، کوئی تو گھتہ جاتا تھا اور د

کے استعمال کی نوبت بھی آجاتی تھی۔ ایسا شور، ایسا ہنگامہ، الاماں۔ آخر کو شہریوں کو لوٹنا پڑا۔ پھر گھروں کی طرف بھاگے اور میدان میں اپنے زخمیوں اور مردوں کو چھوڑ آئے۔

شام ہوتے ہوتے شہر میں پھر کچھ سکون سا ہو گیا۔ روتے کانپتے لوگ گھروں کو واپس آئے اور اپنے بستروں پر پڑ پڑ کر سو گئے۔ سر سب کے ایسے گرم تھے جیسے آگ جل رہی ہو، مگر ان میں تھوڑی دیر کے لئے امید کی جھلک پیدا ہو جاتی تھی۔

سیدھی سادی کارروائی

"تمہارا نام؟"

"بسو"

"عمر؟"

"تیس برس"

"پیشہ؟"

"سگریٹ بناتا ہوں"

"سچ بولو، جی!"

"حضور سچ عرض کرتا ہوں۔ میں نے ایمانداری سے ۱۴ برس یہی کام کیا ہے اور اپنے بال بچوں کی پرورش کی ہے"

"بال بچے کہاں ہیں؟"

"یہ حاضر ہیں۔ یہ میری بیوی ہے۔ یہ میرا لڑکا ہے"

"ڈاکٹر، بسو کے بال بچوں کا امتحان کرو"

"جی، کر چکا"

"پھر، کیا کہتے ہو؟"

"شہری لبو کے بدن میں خون کی کمی ہے۔ عام حالت اوسط۔ اس کی بیوی کو سر کے درد اور گٹھیا کی شکایت ہے۔ لڑکا تندرست ہے۔"

"اچھا، ڈاکٹر، تم جا سکتے ہو۔ شہری لبو، تمہاری دلچسپیاں کیا ہیں؟ تمہیں کیا چیزیں پسند ہیں؟"

"مجھے سب آدمی پسند ہیں۔ زندگی پسند ہے۔"

"زیادہ واضح بات کرو۔ ٹھیک ٹھیک صراحت سے!"

"مجھے پسند...... ہاں، کیا پسند ہے؟...... مجھے اپنے لڑکے سے محبت ہے...۔ وہ بڑی اچھی بانسری بجاتا ہے...۔ مجھے کھانا پسند ہے...... یہ نہیں کہ میں کوئی پیٹو ہوں...... مجھے عورتیں پسند ہیں...... عورتوں اور لڑکیوں کو سڑک پر چلتے دیکھنا اچھا لگتا ہے...... جب تھک کر شام کو گھر آتا ہوں تو آرام کرنا مجھے بھاتا ہے.... مجھے سگریٹ پینا پسند ہے...... مجھے زندگی پسند ہے۔"

"بس بس سنبھلو۔ روں روں مت کرو.... کیوں نفسی صاحب، آپ کیا کہتے ہیں؟"

"فضول بکتا ہے۔ کچرا ہے کچرا۔ نہایت معمولی ہستی۔ لغو مخلوق۔ طبیعت کچھ بلغمی کچھ دموی جیسی کم۔ درجہ: آخری۔ ترقی کی اُمید۔ مفقود۔ مجہولیت: ۵، فی صدی۔ مسز لبو اس سے بھی پست۔ لڑکا بھی معمولی ہے مگر شاید...... کیوں جی، تمہارے لڑکے کی کیا عمر ہے۔ روں روں کیوں کرتے ہو؟"

"تیرہ برس"

"گھبراؤ مت۔ فی الحال تمہارا لڑکا زندہ رکھا جائیگا۔ رہے تم سو...... خیر یہ میرا کام نہیں۔ آپ صاحبان فیصلہ صادر فرمائیں۔"

"عدالت عالیہ کی کمیٹی کی طرف سے جو حیات انسانی کو کچرے اور فضلہ سے پاک کرنے کے لئے قائم کی گئی ہیں تم کو حکم دیتا ہوں، شہری لبو، اور تمہاری بیوی کہ تم دونوں

۲۴ گھنٹے کے اندر زندگی سے رخصت ہو لو۔ بس چپ رہو۔ چلاؤ مت۔ دایہ وغیرہ صفائی، تم عورت کو چپ کرو۔ سنتری کو بلاؤ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بلا خارجی مدد کے تعمیل حکم نہیں کر سکیں گے۔

فضول اور فالتو لوگوں کی خصوصیات

بھورا کمرہ

عدالت العالیہ کی غلام گردش میں ایک طرف کو ایک بھوری کوٹھری تھی ایک کوٹھری جیسی بتیری کوٹھریاں ہوتی ہیں، چھوٹی جس میں دم گھٹے۔ لمبائی چوڑائی کوئی ڈھائی ڈھائی گز ہوگی، چھت بھی کچھ زیادہ اونچی نہ تھی۔ لیکن اسی چھوٹی سی کوٹھری میں کئی ہزار انسانوں کی قبر تھی۔ ایک الماری تھی جس پر موٹا موٹا لکھا تھا: "غیر ضروری آدمیوں کی فہرست"۔ اس فہرست کے کئی حصے تھے، منجملہ اُن کے ایک حصہ "بلا امتیاز اثر پذیر لوگوں" کے لئے تھا؛ ایک حُپٹ بھیئے طرفداروں کے لئے؛ ایک محبوبوں کے لئے؛ ایک توازن بگڑوں کے واسطے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہر شخص کی خصوصیت نہایت مختصر لکھی گئی تھی اور بالکل بے تعلقی کے ساتھ۔ بعض بعض کے متعلق بیشک ایک آدھ سخت بات درج تھی۔ لیکن ایسی عبارتوں پر بلا استثناء آگ نے سرخ پنسل سے نشان کر دئے تھے اور حاشیہ پر لکھدیا تھا کہ غیر ضروری لوگوں کو بھی خواہ مخواہ بُرا کہنا مناسب نہیں۔ غیر ضروری لوگوں کی مسلوں کے چند نمونے یہ ہیں:۔

غیر ضروری نر نمبر ۱۴۷۴۱

صحت: اوسط۔ اپنے جان پہچان کے لوگوں سے ملنے جاتا ہے لیکن اُس کی صحبت سے نہ کسی کو فائدہ ہوتا ہے نہ دلچسپی۔ ہر بات میں ہر ایک کو صلاح و مشورہ ضرور

دیتا ہے۔ عنفوانِ شباب میں ایک لڑکی کو بھگالایا تھا، پھر اُسے چھوڑ دیا۔ شادی کے بعد سامان آرائش کی خریداری اُس کے نزدیک زندگی کا سب سے اہم مقصد ہے۔ دماغ کند اور دُھندلا ہے۔ کام کی بالکل صلاحیت نہیں۔ جب پوچھا گیا کہ زندگی میں سب سے دلچسپ تجربہ کیا ہوا تو جواب دیا کہ پیرس کے ایک قہوہ خانہ میں جانا۔ نہایت معمولی درجہ کی مخلوق۔ سب سے نیچی تہ کا فرد۔ دل کمزور۔ ۲۴ گھنٹہ کے اندر۔

غیر ضروری نمبر ۱۴۶۲۳

ایک چھوٹی سی دوکان میں نوکر ہے۔ درجہ: متوسط۔ کام سے ذرا دلچسپی نہیں۔ ہر کام میں بس وہ راستہ اختیار کرتا ہے جس میں سب سے کم دشواری ہو۔ جسمانی طور پر: اچھا۔ دماغی اعتبار سے اسی عام مرض کا شکار ہے: یعنی زندگی کا خوف، آزادی کا ڈر۔ جب چھٹیوں میں آزاد ہوتا ہے تو شراب سے اپنے حواس مختل کر لیتا ہے۔ انقلاب کے زمانہ میں ذرا جلت پھرت دکھائی تھی۔ ایک لال تسمہ بھی لگا لیا تھا اور جتنے آلو اور جتنا غلہ کہیں ملتا سب جمع کر رہا تھا۔ ڈرتا تھا کہ کہیں کھانے پینے کی چیزیں کم نہ پڑ جائیں۔ اس پر فخر کرتا تھا کہ غریبوں کی اولاد ہے۔ خود انقلاب میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ مارے ڈر کے۔ کشتی بالائی اسے پسند ہے۔ بچوں کو مارتا ہے۔ زندگی کی رفتار سست ہے ۲۴ گھنٹہ کے اندر۔

غیر ضروری نمبر ۱۵۲۰۱

آٹھ زبانیں جانتا ہے مگر کہتا ہے کہ سب سے جی اکتا گیا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں ذہانت جتلاتا ہے۔ بہت بر خود غلط ہے۔ زبانیں جاننے پر بڑا گھمنڈ ہے۔ چاہتا ہے کہ لوگ اس کی عزت کریں۔ گپ بہت لگاتا ہے۔ زندہ چیزوں کی طرف سے بیزار اتنا ہی بھی اعتقاد ہو جیسے بیل کو ہو۔ فقیروں سے بہت ڈرتا ہے۔ مکھیاں اور بھنگے مارنے کا بڑا شوق ہے۔ شاذ ہی اسے دلی خوشی حاصل ہوتی ہو۔ ۲۴ گھنٹہ کے اندر۔

غیر ضروری مادہ نمبر ۴۳۵۶

خواہ مخواہ نوکروں کو برا بھلا کہتی رہتی ہے۔ چھپکر رودہ پر سے بالائی اور شوربہ پر سے تار اُتار لیتی ہے۔ ہفتوں صوفہ پر پڑے پڑے گزار دیتی ہے۔ اس کی سب سے عزیز آرزو یہ ہے کہ اس کے پاس ایک چاکدار زرد آستینوں کا لباس ہو۔ بارہ برس تک ایک نہایت قابل موجد اس پر عاشق رہا۔ اور اسے اپنے عاشق کے شغل تک کا علم نہ ہوا۔ یہی سمجھا کی کہ کوئی بجلی کا کام کرنے والا ہے۔ اس غریب کو چھوڑ کر اس نے ایک چمڑے کے تاجر سے شادی کر لی۔ اولاد نہیں ہے۔ اکثر بلا وجہ تلون مزاجی کا اظہار کرتی ہے۔ رات میں سوتے سوتے اُٹھکر جا ر اور توس بنواتی ہے۔ بالکل غیر ضروری ہستی۔ ۲۴ گھنٹہ کے اندر۔

ماہرین فن کی ایک فوج آگ کے ساتھ عدالت العالیہ کی کمیٹی میں کام پر لگی ہوتی تھی۔ اس میں ڈاکٹر بھی تھے، ماہران نفسیات بھی، بڑے بڑے مبصر اور مشہور مصنف بھی۔ یہ سب بہت غیر معمولی رفتار سے کام کرتے تھے۔ بعض بعض موقعوں پر یہ ماہر گھنٹہ بھر میں سیکڑوں آدمیوں کو دوسری دنیا کی راہ بتلا دیتے تھے اور غیر ضروری انسانوں کی شکلیں تھیں کہ بھوری کوٹھری میں بھری جا رہی تھیں۔ ان کاغذات میں بیان کی روانی کا مقابلہ اگر ممکن ہے تو مصنفین کے راسخ تیقن کے ساتھ ہی ممکن ہے۔

صبح سے رات تک کام جاری رہتا تھا۔ گھروں پر جانے والے کمیشن آتے تھے اور جاتے تھے۔ احکام عدالت کو نافذ کرنے والوں کی ٹولیاں آتی تھیں جاتی تھیں۔ اور میزوں کے پیچھے درجنوں آدمی بیٹھے ہوئے نہایت تیزی اور بے تعلقی کے ساتھ لکھے جاتے تھے۔

آگ ان سب کو اپنی چھوٹی چھوٹی تیز اور ناقابل فہم آنکھوں سے دیکھتا تھا اور کچھ سوچا کرتا تھا۔ اسی فکر میں اس کا بدن روز بروز جھکتا جاتا تھا اور اس کے بڑے، جھلے، اور ضدی سر میں سفیدی کے آثار زیادہ نمایاں ہوتے جاتے تھے۔

رفتہ رفتہ اس کے اور اس کے ملازموں کے درمیان ایک دیوار سی پیدا ہو گئی - جو اسکی اختر شماری، اسکی فکر، اور اس کے احکام کو نافذ کرنے والوں کی کورچشمی اور ان کے ہاتھوں کی بے تعلقی کے درمیان حائل ہو گئی ۔

آک کے شبہات

ایک دن کمیٹی کے اراکین اپنے کمرہ میں اپنی رائیں سنانے کے لئے جمع ہوئے آک اپنی روزوالی جگہ پر نہ تھا - بہت ڈھونڈھا کہیں پتہ نہ لگا - انہوں نے ادھر اُدھر آدمی دوڑائے، ٹیلیفون کئے مگر بے سود - کوئی دو گھنٹے بعد اتفاق سے دیکھا تو یہ بھوری کوٹھری میں بیٹھے ہیں - یہ کوٹھری میں غیر ضروری آدمیوں کی مِسلوں پر بیٹھا تھا - آنکھوں میں شدید تفکر کے آثار تھے جو خود آک تک کے لئے بھی غیر معمولی سی چیز تھی -

سب نے پوچھا "آپ یہاں کیا کر رہے ہیں ؟"

"دیکھتے ہو نہ کہ سوچ رہا ہوں" آک نے تھکی ہوئی آواز سے جواب دیا -

"مگر یہاں اس کوٹھری میں کیوں ؟"

"یہی سب سے مناسب جگہ ہے - میں آدمیوں کی بابتہ کچھ سوچ رہا ہوں اور اگر انسانوں کے متعلق کار آمد فکر ممکن ہے تو وہ انکی تباہی کے مکناموں کے قرب ہی میں ممکن ہے - انسان کی تباہی کے دستاویزوں کے پاس بیٹھکر اُس کی عجیب وغریب زندگی کے متعلق کچھ سیکھا جا سکتا ہے -"

کسی نے ایک سوکھا ٹھٹھا لگایا -

"ہنستے ہو ؟" آک نے ہاتھ میں ایک مِسل لیکر کہا "منسومت، میں سمجھتا ہوں کہ عدالت العالیہ کے خیال میں ایک تبدیلی پیدا ہو رہی ہے - مرنے والوں کی مِسلوں کو دیکھکر مجھے ترقی کے کچھ نئے راستے سوجھے ہیں - تم سب نے تیزی اور صفائی سے مختلف ہستیوں کو

غیر ضروری قرار دے دینا سیکھ لیا ہے۔ تم میں سے نا قابل سے نا قابل چند جملوں میں یقین کے ساتھ یہ حکم لگا دیتا ہے۔ اور میں ہوں کہ یہاں بیٹھا سوچ رہا ہوں کہ آیا تمہارا یہ طریق درست بھی ہے؟"

آک پھر سوچتے سوچتے کچھ ہنک سا گیا، ایک ٹھنڈی سانس لی، اور آہستہ سے کہا:

"کرنا کیا چاہیئے؟ اصل بات کیا ہے؟ اگر زندوں کی زندگیوں کو دیکھو تو نتیجہ نکلتا ہے کہ ان میں سے تین چوتھائی کو ختم کر دینا چاہیئے۔ مگر جب ان بے دھیان کرو جو مر گئے ہیں تو کچھ شبہ سا پیدا ہو جاتا ہے۔ کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ ان سے محبت کیجاتی اور ان پر رحم کیا جاتا؟ میں سمجھتا ہوں کہ بس یہی مسئلہ انسانیت کی، اور تاریخ انسانیت کی اندھی گلی ہے۔"

آک پر ایک غم آمیز خاموشی طاری ہو گئی۔ اس نے مرے ہوؤں کی مسلوں کو پھر الٹ پلٹ کرنا شروع کیا اور ان کے تکلیف دہ اختصار پر غور کرتا رہا۔ عدالت کے ارا کین چلے گئے۔ کسی نے آک کے خیال کی تردید نہ کی۔ اول تو اس لئے کہ آک کی تردید بیکار تھی، دوسرے اس لئے کہ کسی میں اس کی ہمت بھی نہ تھی۔ مگر سب نے یہ محسوس کر لیا کہ کوئی نئی تجویز پک رہی ہے اور سب اس سے غیر مطمئن تھے۔ موجودہ صورت کی انہیں عادت پڑ چلی تھی اور یہ تجویز تھی بھی نہایت واضح اور قطعی۔ اب معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نئی صورت اختیار کیجانے والی ہے۔ مگر کیا؟ یہ کسی کو نہ معلوم تھا۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ اس عجیب وغریب آدمی کا دماغ کیا نئی چیز نکالے گا، یہ جس کو اس شہر پر ایسا حیرت خیز تسلط حاصل تھا۔

آک غائب ہو گیا۔ یہ اس کی عادت تھی، جب کوئی خاص فکر ہوتی تو غائب ہو جاتا تھا۔ لوگوں نے ہر جگہ ڈھونڈا پر نہ پایا۔ کسی نے خبر دی کہ آک شہر کے باہر بیٹھا رو رہا ہے۔ کسی اور نے خبر دی کہ آک اپنے باغ میں چاروں ہاتھ پاؤں پر جانوروں کی طرح چل رہا تھا اور مٹی منہ میں لے لیکر چابتا تھا۔

عدالت العالیہ کا کام دھیما پڑ گیا۔ آک کے غائب ہونے سے کام میں وہ انہماک کہاں

رہ سکتا تھا۔ شہریوں نے اپنے دروازوں میں لوہے کی سلاخیں چڑھالی تھیں اور عدالت کے آدمیوں کو گھر میں گھسنے ہی نہ دیتے تھے۔ بعض محلوں میں تو عدالت کے سوال پر کہ تمہیں زندہ رہنے کا حق ہے یا نہیں لوگ ٹھٹھے لگاتے تھے۔ اور ایک جگہ تو یہ تک ہوا کہ لوگوں نے عدالت کے اراکین کو پکڑ کر اُن کے حق زندگی کی تحقیقات کر ڈالی اور ان کی مسلیں تیار کر دیں جو کسی طرح سوری کوٹھری والی مسلوں سے کم نہ تھیں۔

شہر میں پھر ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ "غیر ضروری" شہری جن پر ابھی عدالت کے حکم کی تعمیل نہ ہو سکی تھی ایسے مطمئن اور دلیر بنگئے تھے کہ خوب مزے سے سڑکوں پر اکڑتے پھرتے تھے ہر طرح کی دل لگی کرتے اور غضب یہ کہ شادیاں تک کر رہے تھے۔ لوگ راستوں میں ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے تھے۔ "شکر ہے، شکر، ختم ہوئی مصیبت، ختم ہوئی۔" "حق زندگی کا امتحان خدا خدا کر کے ختم ہوا۔" "کیوں، میاں، سچ کہو، کیا واقعی زندگی زیادہ مزہ کی نہیں ہو گئی۔ انسانی کچرا پہلے سے کم ہے۔ اب آدمی ذرا اطمینان سے سانس تو لے سکتا ہے!"

"ارے، ارے، تمہیں شرم نہیں آتی؟ کیا سچ تم سمجھتے ہو کہ جن بیچاروں کو ختم کیا گیا ہے انہیں زندگی کا حق نہ تھا۔ اجی کیا کہتے ہو، میں کتنے ہی ایسے آدمیوں کو جانتا ہوں جنہیں ایک منٹ زندہ رہنے کا حق نہیں اور وہ زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ اور ذرا سوچو تو کتنے اچھے بھلے آدمی ختم کر دیے گئے۔ اُفوہ۔ کاش تمہیں خبر ہوتی۔"

"یہ کیا بات ہے، غلطیاں تو لازمی ہیں۔ یہ تو کہو، بکہ اک کی بھی خبر ہے۔"

"کچھ پتہ نہیں۔"

"سنا ہے کہ شہر کے باہر ایک درخت پر بیٹھا رو رہا ہے۔"

"نہیں جی۔ چاروں ہاتھ پاؤں پر جانوروں کی طرح چل رہا ہے اور مٹی چبا رہا ہے۔"

"روئے دو جی" "ہاں، ہاں، مٹی چبانے دو۔"

"شہریو۔ تمہاری یہ خوشی قبل از وقت ہے۔ سچ کہتا ہوں، قبل از وقت ہے۔ آگ آج شام کو آنے والا ہے اور عدالت کا کام پھر شروع ہو جائے گا۔"

"تمہیں کیا خبر؟"

"مجھے معلوم ہے۔ ابھی بہت سا کچرا باقی ہے۔ پوری پوری صفائی لازمی ہے۔ پوری پوری۔"

"بڑے بے رحم ہو، بھائی۔"

"دیکھو لوگو، دیکھو...... نئے اشتہارات لگ رہے ہیں۔"

"دیکھو تو...... کیسی خوش خبری، کیسی خوش قسمتی ہے۔"

"پڑھو، پڑھو"

"ذرا پڑھو تو"

"پڑھنا ذرا پڑھنا"

نئے اشتہار

آدمی چاروں طرف دوڑ رہے تھے۔ سانس پھولے ہوئے تھے۔ ہاتھوں میں لیئی کی بالٹیاں تھیں، اور گلابی رنگ کے اشتہارات کے کٹّے۔ اس کٹّے سے اشتہار نکالکر خوشی خوشی مکانوں پر چپیاں کئے جا رہے تھے۔ ان کا مضمون بھی نہایت واضح، سادہ اور قطعی تھا:

سب کے لئے

بلا استثنا

اس اعلان کے شائع ہوتے ہی سب شہریوں کو حق زندگی ملجائیگا۔ زندہ رہو، بڑھو، اور زمین پر پھیلو۔ عدالت العالیہ اپنا سخت فرض انجام دے چکی۔ آئندہ سے اس کا نام عدالت ترحمات عالیہ ہوگا۔ تم سب اچھے لوگ ہو اور تمہارا حق زندگی مسلم۔ عدالت ترحمات عالیہ

تین تین اراکین کے خاص کمیشن مقرر کریگی جو روزانہ شہریوں کے گھروں پر جاکر انہیں مبارکباد دینگے اور اس پر ان کے خیالات جمع کرکے "خوشی کی مسلوں" میں شامل کریں گے۔

اس کمیشن کے اراکین کو شہریوں سے اُن کے طریق زندگی کی بابتہ مفصل سوالات کا اختیار ہوگا۔ اور شہری اگر چاہیں تو تفصیل سے جواب دے سکتے ہیں بلکہ یہی بہتر ہوگا۔ شہریوں کے مسرت خیز جواب مرتب کرکے ایک گلابی دفتر میں آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کردئے جائینگے"

سارا شہر باغ باغ تھا۔ سارے دروازے، دریچے، کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ گھروں سے گانے بجانے، ہنسنے کھلکھلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ موٹی موٹی شمس لڑکیاں بیٹھی پیانو بجاتی تھیں۔ صبح سے شام تک گراموفون چلتے ہی رہتے تھے۔ بانسریاں، ستار، سارنگیاں سب بج رہی تھیں۔ شام کو لوگ کوٹ اُتار کر پیر پھیلا کر اپنے چھجوں پر بیٹھتے تھے۔ سڑکوں میں چہل پہل دیکھنے کی تھی۔ مٹھائی کی دوکانوں اور قہوہ خانوں میں مرد عورتوں کی بھیڑ تھی۔ کوئی مٹھائیاں اُڑا رہا تھا، کوئی ٹھنڈا شربت پی رہا تھا۔ لباطیوں کے یہاں جہاں آئینہ بکتے تھے ایک ہجوم تھا۔ مرد عورت سب کے سب آئینہ خرید کر اپنا اپنا منہ دیکھ رہے تھے۔ مصوروں کے یہاں تصویروں کے بے تعداد آرڈر آرہے تھے۔ ہر شخص اپنی تصویر پر چوکھٹہ چڑھوا کر دیوار پر لگا رہا تھا۔ ایک جگہ تو قتل ہی ہوگیا۔ جس کا اخباروں میں بڑا چرچا رہا۔ بات یوں تھی کہ ایک نوجوان نے کسی مکان میں ایک کمرہ کرایہ پر لیا۔ اور مالک مکان سے مطالبہ کیا کہ دیوار پر اُس کے ماں باپ کی تصویریں ٹنگی ہیں وہ اُتار دے۔ مالک اور اُس کی بیوی اس پر بہت ناراض ہوئے۔ آخر کو بات بڑھی اور ان دونوں نے ملکر نوجوان کو مار ڈالا اور پانچویں منزل سے اُس کی لاش سڑک پر پھینکدی۔

احساس نفس اور خود پرستی کے جذبے بڑی ترقی پر تھے۔ جھگڑے ٹنٹے روز کا قصہ بن گئے تھے۔ ایسی باتیں ہر وقت سننے میں آتی تھیں۔ "ٹھیک ٹھیک۔ ظاہر ہے کوئی غلطی ہوگئی

کہ تم زندہ ہو۔ عدالت عالیہ نے اپنا کام بے پروائی سے کیا" "جی ہاں، بینت بے پروائی سے کیا، ابھی تو آپ جیسے بیتے پھر رہے ہیں۔" مگر روزانہ زندگی میں ان جھگڑوں کا کوئی زیادہ خیال نہ کرتا تھا۔ آدمیوں نے بہتر کھانا شروع کر دیا تھا۔ طرح طرح کے مربے بنتے تھے۔ گرم کپڑے کی مانگ بھی بڑھ گئی تھی۔ لوگ صحت کی بڑی قدر کرنے لگے تھے۔ عدالت ترحمات عالیہ کے اراکین روزانہ گھروں پر جاتے اور لوگوں سے دریافت حال کرتے تھے۔ اکثر کا جواب یہی ہوتا تھا کہ ہم بڑے مزہ میں ہیں۔ اور بہت سے اس کا ثبوت دینے پر بھی اصرار کرتے تھے۔ ..... بعض کچھ شکایت بھی کرتے تھے کہ عدالت العالیہ نے اپنا کام قبل از وقت ختم کر دیا۔ "کل شام میں ٹرام میں آ رہا تھا۔ اور غضب ہے خدا کا ایک جگہ بھی تو خالی نہ تھی۔ مجھے اور میری بیوی کو برابر راستہ بھر کھڑا رہنا پڑا۔ ابھی بہت سے غیر ضروری آدمی زندہ ہیں۔ قدم قدم پر سامنا ہوتا ہے۔ شیطان اُن کی خبر لے۔ کیسا افسوس ہے کہ جب موقع تھا تو انہیں ختم نہیں کیا گیا!" بعض کو اور شکایتیں تھیں۔ مثلاً "ذرا دیکھو تو، کسی نے مجھے زندگی کی مبارکباد نہ دی، نہ بدھ کو، نہ جمعرات کو میں انتظار ہی کرتا رہا۔ عجیب لوگ ہیں۔ کیوں جی۔ کیا اب میں خود ان کے پاس جاؤں کہ مجھے مبارکباد دو؟"

خاتمہ

آگ کے دفتر میں حسب معمول کام جاری تھا۔ لوگ بیٹھے تھے اور لکھ رہے تھے۔ گلابی دفتر خوشی کی مسلوں سے بھر گیا تھا۔ ان میں نہایت تفصیل کے ساتھ لوگوں کی سالگرہ، شادیوں، سفر، دعوتوں، اور عشق و محبت کی رودادیں درج تھیں۔ بعض مسلیں تو ناول و افسانہ معلوم ہوتی تھیں۔ باشندوں نے درخواست دی کہ عدالت ترحمات عالیہ ان مسلوں کو کتابوں کی صورت میں شائع کر دے۔ جب شائع ہوئیں تو لوگوں نے خوب پڑھیں سادہ آگ پر خاموشی طاری تھی۔ بس، روز بروز کم جھلک رہی تھی، سر سفید ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی یہ گلابی دفتر میں جاتا اور

گھنٹوں وہاں بیٹھا رہتا جس طرح پہلے بوری کوٹھری میں بیٹھا کرتا تھا۔

ایک دن ایک چیخ مار کر گلابی دفتر سے نکلا "ان کو ختم کرنا ضروری ہے۔ ان کو قتل کرنا۔ ان کو مار ڈالنا چاہئے" مگر جب اُس نے دیکھا کہ اُس کے نوکر اپنی سفید سفید اُنگلیوں سے اب اُسی تیزی کے ساتھ زندوں کا حال کاغذ پر لکھ رہے ہیں جیسے پہلے مُردوں کا لکھتے تھے تو اُس نے عجیب طرح سے اپنا ہاتھ ہلایا اور دفتر سے باہر بھاگ کر غائب ہو گیا۔ اور ہمیشہ کے لئے ہی غائب ہو گیا۔

آک کے غائب ہونے کی بابتہ سیکڑوں افسانے بنگئے اور طرح طرح کی افواہیں مشہور ہوئیں مگر آک کا پتہ پھر نہ چلا۔

اور وہ کثیر التعداد انسان جنہیں آک پہلے ختم کرنا چاہتا تھا، جن پر بعد کو اسے رحم آگیا تھا اور تھوڑے دن بعد اس نے جنہیں قتل کرنے کی پھر ٹھانی تھی، وہ انسان جنہیں بہت سے اچھے لوگ بھی تھے اور بہت کچھ غیر ضروری کچرا بھی وہ انسان آجتک زندہ چلے جاتے ہیں۔ جیسے کبھی آک تھا ہی نہیں، جیسے کبھی ان کے حق زندگی کا سوال ہی کسی نے نہ اٹھایا تھا۔

غزل

(از حضرت جگر)

اک سے بے نام جو اس دل کے پیمانے میں ہے
وہ ترے شیشہ میں ہے ساقی نہ پیمانے میں ہے

پوچھنا کیا کتنی وسعت میرے پیمانے میں ہے
سب الٹ دے ساقیا جتنی بھی میخانے میں ہے

ایک ایسا راز بھی دل کے نہاں خانے میں ہے
لطف جس کا کچھ سمجھنے میں نہ سمجھانے میں ہے

یوں تو ساقی ہر طرح کی تیرے میخانے میں ہے
وہ بھی تھوڑی سی جو ان آنکھوں کے پیمانے میں ہے

ایک کیفِ ناتمام درد کی لذت ہی کیا
درد کی لذت سراپا درد بن جانے میں ہے

غرق کر دے تجھکو زاہد تیری دنیا کو خراب
کم سے کم اتنی تو ہر میکش کے پیمانے میں ہے

شیشہ مست و بادہ مست و عشق مست و حسن مست
آج پینے کا مزا پیکر بہک جانے میں ہے

تجھکو اے جذبِ طلب حسنِ ازل ہی کی قسم
دیر کتنی دل پہ اک تصویر اترانے میں ہے

حسن کی ایک ایک ادا پر جان و دل صدقے مگر
لطف کچھ دامن بچا کر ہی گذر جانے میں ہے

منتشر کر دے اسے بھی حسنِ بے پایاں کیا تھا
زندگی شیرازۂ دل کے بکھر جانے میں ہے

اُٹھ گیا کافر جگر سا کیا کوئی پھر حق پرست
حشر ہے کعبہ میں برپا شور بتخانے میں ہے

غزل فارسی

(از حضرت اصغر)

ز فیضِ ذوقِ رنگیں صد بہارے کردہ ام پیدا
ز خونِ دل کہ می جوشد نگارے کردہ ام پیدا

ہمے روحانیاں را در کمندِ شوق آوردم
بہ اوجِ عرشِ اعلیٰ ہم شکارے کردہ ام پیدا

ز موجِ خونِ دل صد بار من رنگیں قبا گشتم
بخاکِ کربلا ہم صد بہارے کردہ ام پیدا

ز "الّا" تسخیر کردم ایں جہانِ ماہ و انجم را
ز جوشِ بندگی پروردگارے کردہ ام پیدا

ببے از جلوۂ حسنت جہاں یکسر نمی ماند
بیا اکنوں کہ خود را پردہ دارے کردہ ام پیدا

جہانے را بآتش بخشم، جہانے را بوجد آرم
دریں خاکسترے حسن شرارے کردہ ام پیدا

من مسلم چہ مسلم؟ آنکہ او را یار میگوید
پس از عمرے ہمی زنّارداری کردہ ام پیدا

جہانِ مضطرب را پر سکوں دانی نمیدانی
چہ ساں در بیقراری ہا قرارے کردہ ام پیدا

مگر اے پیرِ دلبر زِ جنونِ من نمیدانی
پس محمل نشینے صد غبارے کردہ ام پیدا

من از رنگِ وجودِ خویش اصغرؔ نقشہا بینم
برائے جانِ بیخود دستیارے کردہ ام پیدا

شذرات

۱۹۲۶ء بھی ختم ہوگیا۔ سال کے ختم پر عموماً ادارے اپنے کام کا محاسبہ کرتے ہیں، ان مفید کاموں کو گنواتے ہیں جو انکے ہاتھوں گذشتہ بارہ مہینے میں انجام پائے، دبی زبان سے اپنی خامیوں کا ذکر بھی کردیتے ہیں شاید اس لئے کہ اس سے ان کی خدمات ذرا اور چمک جاتی ہیں، اور پھر آئندہ سال کے متعلق وعدے کرتے اور اپنے ارادوں کا اعلان کرتے ہیں۔ جامعہ والے اپنی خدمات کیا گنوائیں؟ اگر ان سے کوئی خدمت بن پڑی تو اللہ کا احسان ہے۔ سچی خدمات کا سچا اجر اسی کے یہاں سے ملتا ہے۔ اگر ہم میں خامیاں ہیں (اور اس دنیا میں ان خامیوں کا خود جامعہ والوں سے زیادہ کسے احساس ہوگا) تو ہم انہیں سب کے سامنے بیان کرکے اپنے دل کے بوجھ کو کیوں ہلکا کریں، خدا کرے اگلے سال ہماری زندگیاں پچھلے سال سے بہتر، ہماری خدمت زیادہ پرخلوص، ہماری فکر زیادہ حق پسند، ہماری نظر زیادہ پاک بیں ہو۔ آئندہ کے لئے وعدے ہم کیا کریں اور کیسے کریں؟ اپنی خامیوں کے بھروسہ پر؟ اپنی قوم کی بے اعتنائی کے زعم پر؟ تنگ نظر خیر خواہوں اور تنگ دل مخالفوں کے اعتماد پر؟ نہیں۔ نہ ہم اپنی خدمات کی اہمیت جتانا چاہتے ہیں، نہ اپنی غلط اندیشیوں اور خامکاریوں کا اعلان کرکے اپنی ذمہ داری کو کم کرنا چاہتے ہیں، نہ ہم بڑے بڑے وعدے کرکے اپنے ہمدردوں کے لئے اس وقت خوشی لیکن بعد کو مایوسی کا سامان مہیا کرنا چاہتے ہیں۔ جو ہماری خدمات کی قدر کرنا چاہے یا بے قدری وہ خود انہیں معلوم کرے۔ جس کا دل ہماری خامیوں پر دکھتا ہو اور وہ انکی اصلاح میں ہماری مدد کرنا چاہے اسے ہماری کھلی ہوئی برائیاں تو معلوم ہی ہو سکتی ہیں، وہ جو اسے معلوم نہیں وہ بھی اس پر دیانت داری سے ظاہر کردی جائیں گی؟ اور جس کا جی ہماری برائیوں اور ان کی تشہیر سے خوش ہوتا ہو اسے

اسے اپنی خوشی کے وسائل اپنی ہی محنت سے تلاش کرنے چاہئیں۔ ہم سال کے ختم پر جب اپنا اور اپنے کام کا محاسبہ کرتے ہیں تو ہماری گردن اس کے دربار میں جھک جاتی ہے جسکی منشار کی تلاش اور جس کی رضا کی طلب ہمارے وجود کی غایت ہو اسی کے سامنے اپنی کوتاہیوں کا اقرار صراط مستقیم کے ملنے کا وسیلہ ہو اور اسی کے منشار کی تکمیل اصلی خدمت۔ آئندہ کے وعدے اور ارادے بھی اس کے سامنے پیش کرتے ہیں جس کے سامنے ہماری روحیں ایک جامع سوال کے جواب میں نہ جانے کب کی "بلا" کہہ چکی ہیں۔ ہمارا کام ہے کہ جامعہ کو اس کا کام بنائیں۔ وہی اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

حسبنا اللہ، ونعم الوکیل

اس سال ہندوستان کی سیاسی زندگی کا سب سے اہم واقعہ کانگریس کا وہ رزولیوشن ہے جس میں ملک کی سیاسی جد و جہد کے مقصود، سوراج کی وضاحت کر دی گئی ہو اور اسکے معنی کامل خود مختاری مقرر کئے گئے ہیں۔ ملک کے اخباروں اور ہماری سیاسی انجمنوں اور فرقوں کے مباحثوں میں اس کی وجہ سے مکمل آزادی اور "ڈومینین" جیسی حیثیت کے فرق اور ان کے اعتباری محاسن و معائب کا سوال بہت اہم بن گیا ہے۔ حالانکہ اس کی کچھ زیادہ ضرورت نظر نہیں آتی۔ دنیا کی ہر قوم کا حق ہے کہ وہ اپنی تمدنی زندگی کو اپنی روایات اور اپنے مخصوص حالات کے اعتبار سے ترقی دے۔ متمدن دنیا ہر قوم کے اس حق کو نظری حیثیت سے تسلیم بھی کر چکی ہے۔ سب مانتے ہیں کہ تمدن انسانی کا گلدستہ اپنے کمال حسن کو اسی وقت پہنچ سکتا ہو جب اسکا ہر پھول اپنی تاریخ اور روایات کی سرزمین سے کسب فیض کر کے پوری شادابی حاصل کرے اور اپنے اندر اپنے مخصوص رنگ و بو کے اعتبار سے کمال پیدا کرے۔

ہندوستان میں آزادی کی جو تحریک آج تقریباً پچاس سال سے جاری ہو گیا اس کے

سامنے ابتک یہ ابتدائی حقیقت نہ تھی ؟ پھر وہ کیوں ابتک "ڈومینین" جیسے مرتبہ سے زیادہ کا مطالبہ نہ کرتا تھا ؟ ہوسکتا ہے کہ کمزوری کے باعث، ممکن ہے اپنی بزدلی کی وجہ سے ۔ یا ضرورت زمانہ اور مصلحت وقت کا لحاظ کرکے ۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سب چیزیں بھی اس ظاہری اعتدال مطالبات میں شامل تھیں لیکن ہندوستانی آزادی کے مجاہدوں میں سب کے سب تو کمزور و بزدل، صرف مصلحت اندیش اور ابن الوقت نہ تھے ۔ نہ آج بظاہر ان میں کسی مخصوص عزم و شجاعت کا ظہور ہوگیا ہے ۔ بات یہ ہے کہ ہر محکوم قوم جب وہ اپنی محکومیت کے معنی کو جان جاتی ہے تو آزادی ہی کی طالب ہوتی ہے اور آزادی "کامل" ہی ہوتی ہے ۔ اسکے ٹکڑے کرنا مشکل ہے اور اس کی قسطیں متعین کرنا ممکن نہیں ۔ اسلئے ہندوستان نے بھی جس دن سے اپنی محکومیت کی ذلت کو محسوس کیا اس وقت سے آزادی کا مطالبہ شروع کیا اور ہمیشہ اسکا مطلب کامل آزادی تھا ۔ لیکن ہندوستان کی تاریخ و روایات کی حقیقی روح یہ ہے کہ دنیاوی زندگی میں اختلافات کو رفع کرکے ہم آہنگی پیدا کرے ۔ کل کی بھلائی کے آگے جزو کا خیال نہ کرے ۔ ہندوستان کی سیاست میں اسکی اس تمدنی روح اور مسلمانوں کے اس عقیدہ نے کہ قوم، نسل، ملک کا امتیاز حیات انسانی کے ارتقاء صحیح کا دشمن ہے ہمیشہ اس کے مفکرین کو تنگ نظری اور یورپ جیسی انسانیت دشمن قوم پرستی سے بچایا ہے ۔ اس لئے اس کے ان مجاہدین راہ حریت نے بھی جو کلمہ حق زبان سے نکالکر قید و بند کی صعوبتوں کے برداشت کرنے کے لئے آمادہ تھے کبھی آزادی کے یہ معنی نہیں سمجھے کہ ساری دنیا سے الگ، سب ملکوں سے بےتعلق ہندوستان اپنی سیاسی زندگی کا ڈھچر کھڑا کرے ۔ انہوں نے اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہی کہ دنیا میں الگ الگ قوموں کے دن ختم ہوگئے اور معیشت و صنعت کے انقلابات عظیم نے اتحاد اقوام کو حیات عالم کے لئے لازمی بنا دیا ہے ۔ اور وہ اس حقیقت کو کس طرح بھولتے ؟ ان میں خود وہ لوگ شامل تھے جو اتحاد دول اسلامی کے لئے کوشاں تھے وہ شامل تھے جو اتحاد ایشیا کے خواب کی تعبیر اپنی جدوجہد سے کرنا چاہتے تھے اور ہال

وہ بھی تھے جو آزاد قوموں کے اس اتحاد کو جس نے مصر اور ہندوستان کے ساتھ انصاف نہ کرکے اپنے نیک نام کو بٹہ لگایا ہی۔ یعنی سلطنت برطانوی کو سیاست عالم میں ایک مفید جمعیتہ اقوام سمجھتے تھے اور جن کا خیال تھا کہ اگر ہندوستان اور مصر کے ساتھ بھی یہ جمعیتہ وہی رویہ اختیار کرے جو اس نے اپنی نوآبادیوں کے ساتھ کیا ہے تو یہ جمعیتہ دنیا کے لئے سیاسی رحمت ثابت ہو سکتی ہی۔ اسلئے کہ حقیقی طور پر آزاد قوموں اور ملکوں کا ایسا اتحاد جو اشتراک مقاصد کی رو سے اس درجہ مستحکم ہو دنیا کی تاریخ نے آجتک نہیں دیکھا لیکن اسکے افادہ اور اس کے استحکام کی شرط اصلی یہی ہی کہ اسکا ہر رکن پورا پورا آزاد ہو کہ جب چاہے اس جمعیتہ کو چھوڑ دے اور جبتک رہے اشتراک مقاصد کی وجہ سے ساری ذمہ داریوں میں برابر کا شریک ہو۔ سلطنت برطانوی میں مصر اور ہندوستان کے علاوہ اور کونسا حصہ ہے جسے برطانیہ آج بہ جبر اپنے ساتھ رکھ سکتا ہو؟ کنیڈا آج چاہے تو بلا اسکے خون کا ایک قطرہ گرے ریاستہائے متحدہ امریکہ کا جزو بنجائے۔ اور دیکھنے والے دیکھ رہے ہیں کہ ریاستہائے متحدہ اور کنیڈا دونوں کی طرف سے اس قسم کے اتحاد کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ لیکن کیا کوئی برطانوی مدبر خواب میں بھی یہ خیال کر سکتا ہی کہ اس اتحاد کو بہ جبر روکا جائے۔ نہیں، برطانیہ کنیڈا کو صرف باہمی اشتراک مقاصد اور اس کے مفاد ملی کا یقین دلا کر ساتھ رکھ سکتی ہی۔

غرض ہندوستان کی آزادی خواہ جماعت نے اگر اتبک ڈومنین جیسے مرتبہ کو اپنی سیاسی جدوجہد کا مقصد قرار دیا تھا تو کمزوری اور بزدلی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے قومی روایات اور تاریخ عالم کے رجحان کو پیش نظر رکھ کر ایسا کیا تھا۔ اسلئے کیا تعجب ہی کہ جب لارڈ اروِن کے مشہور اعلان سے یہ توقع قائم ہوئی کہ انگلستان اس کے لئے آمادہ ہے کہ ہندوستان کو بھی اس جمعیتہ اقوام میں جس کا نام سلطنت برطانوی ہے برابر کے شریک کی حیثیت سے شامل کرے تو وہ اس کی طرف بھوکوں کی طرح دوڑ پڑے۔ مگر جب بعد کو معلوم

ہندوستان سکے لئے ڈومینین والا مرتبہ کچھ اور ہی ہے، اور وزیر ہند نے بتا دیا کہ ہندوستانی کو تو ابھی ہند تک یہ مرتبہ حاصل ہی ہو چکا ہے تو لوگوں کے کان کھڑے ہوئے۔ اس لئے کہ جو ہمیں حاصل ہے اسکا حال تو ہم سے بہتر اور کون جانتا ہے۔ اور یہی وجہ ہوئی کہ کانگریس نے لفظ سوراج کے معنی کامل آزادی، متعین کر دئے۔

کیا اسکے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان کسی حالت میں سلطنت برطانیہ کے ساتھ رہنے کو تیار نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ایسی منفی پابندی کا تحمل اس کی کامل آزادی کا تصور نہیں کر سکتا۔ کامل طور پر آزاد ہندوستان ممکن ہے کہ آج بھی سلطنت برطانیہ کا رکن بننے پر آمادہ ہو جائے بشرطیکہ وہ ویسا ہی رکن ہو جیسے کنیڈا ہے جیسے جنوبی افریقہ اور اسٹریلیا ہیں۔ اگر انگلستان اسکے لئے تیار ہے تو ہندوستان کی طرف سے غالباً کبھی صلح کا دروازہ بند نہ ہوگا لیکن اگر ایسا نہیں تو ڈومینین مرتبہ کا ذکر دھوکا ہے اور جانکر سیاست میں کون دھوکا کھاتا ہے

ہم جانتے ہیں کہ ہم نے کامل آزادی کے متعلق جو لکھا ہے کانگریس کے ذمہ دار لوگوں کا بھی یہی خیال ہے لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہماری سیاست ملکی میں ایک ایسے گروہ کا اثر روز بروز بڑھ رہا ہے۔ جو تحریک سیاسی کو ایک خاص قسم کے جماعتی انقلاب کا ذریعہ بنانا چاہتا ہے۔ اس جماعتی انقلاب کے مقاصد اگرچہ ابھی متعین نہیں ہیں لیکن ہوا کا رخ بتلاتا ہے کہ اس آندھی کے جھونکے روس کی طرف سے آرہے ہیں۔ ہمارے نزدیک مفکرین سیاسی کا فرض ہے کہ روس کے معاملات کا غور سے مطالعہ کریں۔ اسلئے کہ ہمارے خیال میں انقلاب روس تاریخ انسان کی سب سے عبرتناک ٹریجڈی ہے۔ اسکے بعض مفید نتائج سے انکار ممکن نہیں لیکن اسکی بنیادی غلطی سے انکار بھی اسی قدر مشکل ہے۔ زندگی کی گوناگونی کو کسی ایک کٹے چھٹے منطقی اصول کے تحت لے آنے کی سعی ناکام، ملکیت شخصی کو مٹانے کے لئے اٹھنا اور نہایت وسیع پیمانے پر ملکیت اراضی کے حق قائم کرا دینا۔ آزادی کے لئے انقلاب کرنا اور کروڑوں انسانوں کی آزادی ضمیر تک چھین لینا فرقوں کے امتیاز کو مٹانیکا دعوے کرنا اور آج دس سال گذر جانے تک ان نوجوانوں کو مدرسوں تک

[illegible]

ہمیں انگلستان اور دنیا سے اپنا معاملہ طے کر لینے سے پہلے اس [illegible]
پڑے گا۔ دنیا میں اب تک سیاست میں عموماً یہ ہوتا رہا ہے کہ سیاست خارجہ کے مسائل [illegible]
روش کو متعین کیا ہے۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ جہاں وزارت خارجہ سے ہدایت آئی مثلاً کہیں [illegible]
بند ہو جانا چاہیے ورنہ خارجی سیاست پر اثر پڑیگا اور وہ قصہ بند ہو جاتا تھا۔ آج ساری [illegible]
بدل گئی ہے۔ اس وقت داخلی ملکی سیاست نے خارجی سیاست کو پس پشت ڈال دیا ہے [illegible]
ہر جگہ داخلی سیاست کی گتھیاں سلجھانا مدبر کا پہلا فرض بن گیا ہے۔ سیکنڈا [illegible] ابھی داخلی [illegible]
کھا رہی، اسٹریلیا اپنے دستور اساسی کی ترمیم میں مصروف ہے تو اسٹالین بھی روسی کسانوں کی [illegible]
گھرا ہوا نہیں۔ [illegible] کی سیاست کا اہم ترین مسئلہ اگر اس وقت جنرل ریویرا کے [illegible]
ہے تو امریکہ بھی خارجی معاملات سے زیادہ اپنے مالی اور معاشی مسائل کے حل [illegible]
ہندوستان کی خارجی سیاست کی کامیابی بھی اس کے اندرونی مسائل سیاسی و [illegible]
منحصر ہے۔ اب وہ وقت بظاہر گذرا ہوا معلوم ہوتا ہے جب ایک قومی [illegible]
حقوق کے مطالبہ کو ملتوی کر دیں، یا [illegible] نفس حقوق کے خیال کو ذہن [illegible]
آزاد کرانے والوں کے لئے، مصیبت حال کو [illegible]
[illegible] ہوتا ہے کہ کیا ہندوستانیوں کے [illegible] سیاست [illegible]
[illegible]

فہرست مضامین رسالہ "جامعہ" بابتہ جلد ۱۳

از جولائی تا دسمبر ۱۹۲۹ء

اسلامیات

تاریخ

ادب

میں نہ داخل ہونے دنیا جن کا تصور صرف یہ ہو کہ وہ کسی سابقہ سرمایہ دار کی اولاد ہیں۔ ...
اور دردناک چیزیں ہیں کسی ایسی کوشش کی نقل کے خلاف تنبیہ کرنیکے لئے کافی ہیں ...
ہمارے سیاسی رہنما ان حقیقتوں کی طرف سے غفلت برتیں اور جب بھونچال آئے تو ...

ہمیں انگلستان اور دنیا سے اپنا معاملہ طے کرنیکے لئے پہلے اس اندرونی مسئلہ کے لئے تیار ہونا پڑے گا۔ دنیا میں ابتک سیاست میں عموماً یہ ہوتا رہا ہو کہ سیاست خارجہ کے مسائل نے سیاست ملکی کی روش کو متعین کیا ہو۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ جہاں وزارت خارجہ سے ہدایت نامہ نکلا کہ اس وقت بس فلاں قصہ بند ہو جانا چاہئے ورنہ خارجی سیاست پر اثر پڑیگا اور وہ قصہ بند ہو جاتا تھا۔ آج ساری دنیا میں یہ صورت بدل گئی ہو۔ اسوقت داخلی ملکی سیاست نے خارجی سیاست کو پس پشت ڈالدیا ہے۔ آج دنیا میں ہر جگہ داخلی سیاست کی گتھیاں سلجھانا مدبر کا پہلا فرض بنگیا ہو۔ میکڈانلڈ کو اپنی داخلی دشواریاں ہیں، ناروے کو اپنی، اسٹریلیا اپنے دستور اساسی کی ترمیم میں مصروف ہو تو اسٹالین بھی روسی کسانوں کی مخالفت سے کم گھبرایا ہوا نہیں۔ اسپین کی سیاست کا اہم ترین مسئلہ اگر اس وقت جنرل ریویرا کے اختیارات کا تعین ہو تو امریکہ بھی خارجی معاملات سے زیادہ اپنے مالی اور معاشی مسائل کے حل میں مصروف ہو۔ ہندوستان کی خارجی سیاست کی کامیابی بھی اس کے اندرونی مسائل سیاسی ومعاشی کے حل پر منحصر ہو۔ اب وہ وقت بظاہر گذرا ہوا معلوم ہوتا ہو جب ایک قومی فتح کی امید پر غریب اپنے حقوق کے مطالبہ کو ملتوی کردیں، یا اقلیتیں تحفظ حقوق کے خیال کو دماغ سے نکالدیں۔ ہندوستان کو آزاد کرانے والوں کے لئے یہ صورت حال گویا انکی دشواریوں میں بہت تکلیف دہ اضافہ ہو۔ لیکن ہر بڑا کام مشکل ہوتا ہو۔ کیا ہندوستانیوں کے تدبر سے یہ توقع کرنا کہ سیاست ملکی میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے وہ داخلی مسائل کے تصفیہ کیطرف پہلے توجہ کرینگے اور انکو معقولیت کے ساتھ طے کرلیں۔ کوئی ناممکن توقع ہو؟ ہم تو ایسا نہیں سمجھتے۔ لیکن اس سوال کا صحیح جواب بڑی حد تک ہمارے اگلے سال کی سیاسی زندگی سے ملیگا۔

فہرست مضامین رسالہ "جامعہ" بابتہ جلد ۱۳

از جولائی تا دسمبر ۱۹۲۹ء

اسلامیات

تاریخ

ادب

تاریخ ادب

آرٹ

افسانہ

فہرست مضمون نگاران

حسین حسان صاحب ندوی
خالدہ ادیب خانم
درد کاکوروی
دل شاہجہانپوری
ذاکر حسین خاں (ڈاکٹر)
سعید انصاری صاحب
سلما لاگرلاف
سلیم الزمان (ڈاکٹر)
عابد حسین (ڈاکٹر سید)
عبدالجلیل صاحب ندوی (مولنا)
غلام الحسنین صاحب فاضل پانی پتی
لالہ لاجپت رائے آنجہانی
محمد مجیب (پروفیسر)
محمود حسین خاں صاحب جامعی از ہائڈلبرگ
محمد یحییٰ تنہا صاحب وکیل غازی آباد
محمد حسین (مولنا) محوی صاحب از اورنگ آباد
نذیر (سید نیازی صاحب
نصیرالدین ہاشمی صاحب اڈیٹر س
وہاج الدین صاحب

اعلان

امید دے چہ قوم تہ بہ دا خوشحالی مقام دی چہ سرے دست پښتو اکیډمی مندرجہ ذیل
کتابونہ بہ د ضرورت او سپین چاپ کښی کړل موږ تہ د خپل قوم د علم دوستئ نہ پورہ
یقین دے چہ هغوی بہ اکیډمی د کوشش استقبال وکړی او زر تر زرہ بہ د خپل
حسب المنشا کتابونو آرډر راکړی فقط

قیمت		نام کتاب
روپئے	صر	پښتو فارسی لغات
״	صر	״ عربی لغات
״	صہ	״ انګریزی لغات
״	عہ	״ جرمن ډکشنری
״	صہ	״ صرف نحو
״	عا	حقیقت الافغانی
״	للعہ	Pushto-English Grammar

ملنے کا پتہ

پاسبان پښتو اکیډمی کردی سکنہ و ڈاکخانہ ګردی ضلع پشاور

(صوبہ سرحدی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری ، ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

جلد ۱۴	بابتہ ماہ فروری سنہ ۱۹۳۰ء	نمبر ۲

فہرست مضامین

ازمنہ وسطیٰ کے بعض ہندو شاعروں پر اسلامی اثر

دورسے اور سطحی طور پر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اسلام اور ہندو دھرم نے باوجود تقریباً آٹھ سو برس پہلو بہ پہلو رہنے کے ایک دوسرے کا کوئی گہرا اثر نہیں قبول کیا۔ دنیا ان دونوں مذہبوں کے اختلاف کو جانتی ہے۔ دنیا یہ نہیں جانتی کہ ان دونوں مذہبوں کے رسم و خیال کی تاریخ میں ایسی کوششیں بھی ہوئی ہیں، دانستہ اور کبھی غیر دانستہ جن کا منشا ہندوؤں اور مسلمانوں کے خیال و عمل کی زندگی میں ایک طرح کی ہم آہنگی پیدا کرنا تھا۔ ہندوستان کی ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ میں ان اعتقادی تصوروں کا جائزہ لینا بہت ضروری ہے جو باہمی ہندوی اسلامی اثر سے پیدا ہوئے اور جنہوں نے بعد میں تحریکوں اور مستقل اداروں کی شکل اختیار کر لی۔ بیشتر اس قسم کے مذہبی رواداری کے خیال شہری زندگی کی خود غرضیوں سے دور گاؤں کے رہنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں میں پیدا ہوئے جو آپس میں مل جل کر سیدھی سادی زندگی بسر کرتے تھے۔ اور جن کا تخیل تصنع سے اسی قدر پاک تھا جس طرح کہ اُنکا خلوص بے لاگ تھا۔ شمالی ہند میں اسلام اور ہندو دھرم کی پہلی مڈبھیڑ کے وقت ہمیں بہت سے ایسے ہندو بھگت شاعر ملتے ہیں جن کے خیال اور زندگی کو دیکھنے کے انداز پر اسلامی رنگ کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ یہ شاعر محض شعر ہی نہیں کہتے تھے بلکہ اپنی تعلیم اور زندگی سے ہندو دھرم کی اصلاح بھی کرنا چاہتے تھے۔ ازمنہ وسطیٰ کی مذہبی تحریک بھگتی انہیں شاعروں کی تعلیمات سے عبارت ہے۔ ہم ذیل میں ان شاعروں کا ذکر کرتے ہیں۔

ان میں سے ایک نامدیو ہوئے ہیں۔ انکے بھجن گرنتھ صاحب میں ملتے ہیں۔ بھگت مالا

کے بیان کے مطابق نامدیو پنڈھارپور ضلع شولاپور میں پیدا ہوئے۔ انکے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ چھیپی (کپڑا چھاپنے کا کام کرنے والے) تھے اور بعض دوسرے بیانوں کے مطابق وہ درزی کے گھر میں پیدا ہوئے۔ انکی پیدائش اور موت کی کوئی قطعی تاریخ ابتک نہیں معلوم۔ وہ خود ایک جگہ ترکوں کی بت شکنی کا ذکر کرتے ہیں جس سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ علاء الدین خلجی کے زمانے میں کسی وقت دکن میں تھے۔ ممکن ہے کہ وہ کبیر داس کے ہمعصر ہوں یا یہ کہ انکے پیروؤں میں سے ہوں۔ اس لئے کہ انکی تعلیمات بیشتر وہی ہیں جو کبیر داس کی۔ انکا سماجی زندگی اور روح کے متعلق بھی وہی نقطۂ نظر ہے جو کبیر کا تھا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ نامدیو کی اندرونی زندگی کی فیصلہ کن تبدیلی اونڈانگناتھ کے مندر میں واقع ہوئی۔ وہ مندر میں مہاشیو اتری کے دن بیٹھے اپنے بھجن گا رہے تھے۔ چاروں طرف مخلوق جمع تھی۔ ہر کوئی بھجنوں کے خلوص سے متاثر تھا۔ ایک طرف سے کہیں چند برہمن آرہے تھے۔ مندر کے مجاور نے انکے لئے راستہ صاف کرنے کو لوگوں کو مجبوراً تتر بتر کر دیا تاکہ یہ مقدس ہستیاں عوام الناس کی چھوت سے دور رہیں۔ نامدیو پران نیچ ذات والوں کی بے بسی کا بڑا اثر ہوا۔ انہوں نے دل میں ٹھانی کہ کسی نہ کسی طرح برہمنوں کے غرور کو نیچا دکھائیں گے۔ سفر سے واپسی پر انہوں نے اپنی زندگی تحریک بھگتی (خلوص و عقیدت) کو عام لوگوں میں پھیلانے کے لئے وقف کر دی وہ اپنے شخصی خدا کو وٹھو یا بٹھل کے نام سے پکارتے ہیں اور برہمنی ذہنی علوم کے خلاف عقیدہ کو نجات کا بہترین ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ کبیر کی طرح انہوں نے بھی ذات پات کی امتیازات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ وہ نہایت بلند آہنگی سے بت پرستی کی ان لفظوں میں برائی کرتے ہیں۔

آنیلے کبھ بھرے لے اودک ٹھاکر کو اشنان کراؤں
بیالیس لکھ جی جل ہی ہوتے بٹھلو میلا کاہے کراؤں
آنیلے پھول پرومی لے مالا ٹھاکر کی ہوں پوج کراؤں

پہلے باسولے ہے بھورا جھلا بھیلا کا نی کراؤں
کنبلے دود حری دہی سے کھیر ٹھاکر کو نیویڈ کراؤں
پہلے دود ھو بٹا ریو بھرے جھلو کانے کراؤں
اپنسے جھل اوبے ٹھل نو سنسارو نا ہیں

(میں بت کو اشنان کرانے کے لئے ایک برتن میں پانی بھر کے لاتا ہوں۔ پانی میں بیالیس لاکھ جاندار ہیں۔ اے بھائی! میں ٹھل (خدا) کے لئے کیا کروں؟ میں بت کے لئے پھول لاتا ہوں اور ہار پروتا ہوں تاکہ پوجا کے وقت اسے چڑھاؤں۔ بھونرے نے پہلے ہی پھولوں کی خوشبو اڑالی۔ اے بھائی! میں ٹھل کے لئے کیا کروں؟ میں دودھ لاتا ہوں۔ کھیر بناتا ہوں تاکہ بت کے سامنے پیش کروں۔ بچھڑے نے پہلے ہی دودھ کو بگاڑ دیا۔ اے بھائی! میں ٹھل کے لئے کیا کروں؟۔ خدا یہاں بھی ہے خدا وہاں بھی ہے۔ بغیر خدا کے دنیا نہیں قائم رہ سکتی)

دوسرے موقع پر نامدیو بت پرستی کے متعلق یوں کہتے ہیں:

ایکے پاتھر کیجے بھاؤ   دوجے پاتھر دھرئے پاؤ
جو اہو دیو تو اوہو بھی دیوا   کہی نامدیو ہم ہری کے سیوا

(ایک پتھر کو لوگ پوجتے ہیں اور دوسرے پر پاؤں دھرتے ہیں۔ اگر ایک ہے تو دوسرا بھی خدا ہوا۔ نامدیو کہتا ہے کہ میں تو ہری کی سیوا کرتا ہوں)

اسلام اور ہندو دھرم کے امتزاج کا خیال بھی کبیر کی طرح نامدیو کی شاعری میں پایا جاتا ہے۔ وہ نہایت بے تکلفی سے عربی فارسی الفاظ ہندی تلفظ کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔

میں گریب میں سکین تیرا نام ہے ادھارا
کریما رحیما اللہ تو گنی
دریاؤ تو دھنہ تو بسیار تو دھنی
دہی لہی ایک تو دیگر کوئی نہیں

تم دانا توں بینا میں کیا کری
ہندوا ترکو کانا
دوہن تے گیانی سیانا
ہندو پوجے دہرا مسلمان مسیت[1]
نامے سوئی سیویا جہاں دہرا نہ مسیت

ذات پات کی تمیز انکے نزدیک بیکار ہے۔ زندگی کی نجات وہ اعتقاد میں سمجھتے ہیں۔

کہا کرو جاتی کہا کرو پاتی
رام کو نام جیودن راتی

تیرتھ کی بے معنی رسوم کے متعلق نامدیو کی رائے سنئے :

گنگا جاؤ گوداوری جائے تے
کمبھی[2] جاؤ کیدار نا ہیو
گومتی کہس گودان کیجے
کوڑی جو تیرتھ کرے
تو جو ہوا لے گا رسے
رام نام تسری تو نہ پوجے

(تم گنگا اور گوداوری کو تیرتھ کرنے جاتے ہو۔ کیدار ناتھ ہر بارہویں سال نہانے جاتے ہو گومتی کے لئے ہزار گائیں نذر کرتے ہو۔ چاہے تم ایک کروڑ تیرتھ کرو، چاہے تم اپنے جسم کو ہمالیہ میں (برف میں) گاڑ دو۔ لیکن یہ سب کچھ رام کے نام کی پرستش کے لئے ناکافی ہے)

نامدیو کبیر[2] کی طرح انسان دوست (humanist) ہیں وہ انسانی خلوص

---

(۱) مسجد

(۲) ملاحظہ ہو ہمارا مضمون "کبیر داس اور انکی شاعری" رسالہ اردو۔ جنوری ۱۹۳۰ء

گہرائیوں کو رسم و آئین کے معیار سے نہیں جانچنا چاہئے نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا میں تمام جگہ انسان دوستی کے مشرب نے بشریت کے احترام کو مذہبوں اور قانونوں سے بالاتر سمجھا ہے اور انسانی شخصیت کے حقوق کو برقرار رکھنے کے لئے رسوم کی سخت گیریوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے اس قسم کے انسان دوستی کے مشرب اکثر دو مختلف شائستگیوں کے آپس میں ملنے سے وجود میں آتے ہیں۔ شائستگیوں کے ملاپ سے افراد جو مدتوں کے جامتی رویہ اور چلن سے اپنی ذاتی شخصیت کھو بیٹھے ہیں، از سرِ نو بیدار ہوتے ہیں اور پھر سے اپنا کھویا ہوا اعتماد حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ انسان دوستی (humanism) کی تحریک ہندوستان کی ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ میں مسلمانوں کی رہین منت ہے۔

نامدیو کا خطاب کبیر کی طرح ہندوؤں اور مسلمانوں سے ہے۔ وہ ایک جگہ کس سادگی سے اس امر کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ مسجد کا وجود عبادت کے لئے ضروری نہیں۔ انسانی خلوص در و دیوار اور اینٹ گارے کا شرمندۂ احسان کیوں ہو؟

دیہی مسجدی من مولانا
سہج نیاج گجارے

(جسم مسجد ہے۔ دل مولانا ہے۔ جب یوں ہو تو نیاز گذارنا کیسا آسان ہے)

نامدیو کے خیال کی گہرائیوں میں ہندوی ہمہ اوستی تصوف کی صاف جھلک نظر آتی ہے۔ وہ ایک خدا کو پوجتے ہیں لیکن انکا خدا متصوفانہ داخل و ساری (immanent) خدا ہے۔

آپن دیو دھرا آپن آپ لگاوے پوجا
جل تے ترنگ تے ہی جل کہن سنن کو دوجا
آپہی گاوے آپہی ناچے آپ بجاوے تورا
کہت نامدیو تو میرو ٹھاکر جن اورا تو پورا

(وہ خود بت ہے خود مندر ہے۔ خود اپنی پوجا آپ کرتا ہے۔ پانی سے لہر بنتی ہے اور لہر خود

پانی ہے۔ یہ پس کہنے سننے کو دو الگ چیزیں ہیں۔ وہ خود ہی گاتا ہے۔ ناچتا ہے اور آپ ہی مجیرے بجاتا ہے۔ نامدیو کہتا ہے کہ تو میرا آقا ہے۔ آدمی میں کچھ بھی نہیں۔ تو مکمل ہے۔

پندرہویں صدی عیسوی میں ایک ہندو صوفی دھرم داس ہوئے ہیں۔ انکے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ کبیر کے شاگردوں میں ہیں۔ یہ بھی اونچی ذات کے آدمی نہیں۔ انکے خاندان ریوا کے کسودن بنیوں میں سے تھا۔ یہ تعجب کی بات نہیں کہ پندرہویں سولہویں صدی کے بیشتر ہندی صوفی دھگت نیچی ذاتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہندوستان کی مذہبی تاریخ میں ایسی اور مثالیں اس کثرت اور تواتر سے کسی اور عہد میں نہیں ملتیں۔ اس کی وجہ سوائے اسلامی اثر کے اور کیا ہو سکتی ہے؟ اسلام کا وجود بجائے خود ہندوستان میں ذات پات کے خلاف ایک مستقل پروپگنڈے کا حکم رکھتا ہوگا۔ اس لئے اس بات پر کوئی تعجب نہیں کہ اسلام کے ہندوستان میں آنے کے فوراً ہی بعد اس ملک کے تمام حصوں میں اور خصوصاً شمال میں جہاں اسلامی قوت سیاسی اور معاشرتی، زیادہ زوردار تھی، ایسے مفکر پیدا ہوئے جنہوں نے اسلامی خیال اور شائستگی کا اثر جذب کرنے کے بعد ہندو دھرم کی برائیوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ دھرم داس بھی اور بھگت مصلحوں کی طرح اپنے پیام کو شاعری کی زبان سے لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ ہم انکی شاعری کے بعض نمونے یہاں پیش کرتے ہیں:-

واکرتا کو سیئے جن سرشٹی اپجائے
کوٹن برہما وید پڑھی پڑھی جنا گنوائے
کوٹن وشنو ہوئی گئے کوئی پار نہ پائے

اس خدا کی پرستش کرنی چاہئے جس نے دنیا پیدا کی۔ کروڑوں برہمن وید پڑھ پڑھ کر اپنی جان کھو دیتے ہیں۔ کروڑوں وشنو کو مانتے ہیں لیکن کوئی بھی پار نہیں ہوتا۔

تیرتھ اور دوسری مذہبی رسموں کے متعلق بھی دھرم داس کی رائے سنئے:-

تیرتھ گئے کوئی ناتیرے چلی چلی جھر جائے

جل بیچ آس لگائی کے گرتی پاسے۔
جھوٹے پنڈت وید پڑھی پڑھی جگ بورایئے
لٹکے پر کھا مرجی گئے ان کو ہ تاجیا ئی
کہ کبیر دھرم داس سے ہنسا سمجھائی

(جو تیرتھ کے لئے چلتے چلتے مرجاتے ہیں وہ تیرتے نہیں۔ انکی امیدوں کی بنا پانی ہے۔ یہ مگر مچھ کا دوسرا جنم لیں گے۔ جھوٹے پنڈتوں نے وید پڑھ پڑھ کر دنیا کو دھوکے میں ڈالا ہے۔ انکے جو بزرگ مر گئے انہیں (منتروں) سے زندہ کیوں نہیں کر لیتے؟ کبیر نے دھرم داس کو ہنس[1] یوں سمجھایا ہے۔

دھرم داس اپنے گرو کبیر کے متعلق ان لفظوں میں ذکر کرتے ہیں:

میرے من بسی گئے صاحب کبیر
ہندو کے تم گرو کراؤ مسلمان کے پیر
دو دین سے جھگڑا مانڈیو پیو نہیں سریر
شیل سنتوش دیا کے ساگر پریم پرتیت متی دھیر
وید کتیب میٹ کے آگر دو دین کے پیر
ہنسے سنتن شکری اکشر امر سریر
دھرم داس کی بنو گوسائیں ناؤ لگاؤ تیر

(میرے دل میں کبیر صاحب سماگئے ہیں۔ تم (کبیر) ہندوؤں کے گرو ہو اور مسلمانوں کے پیر ہو۔ دونوں مذہب ایک دوسرے سے لڑتے رہے اور انہیں تمہارا جسم نہیں ملا[2]۔ تم

---

(۱) بھگت شاعروں کے ہاں "ہنس" روح کے لئے استعمال ہوا ہے۔ کبیر جب روح کا ذکر کرتے ہیں تو ہنس کی تمثیل استعمال کرتے ہیں۔

(۲) اشارہ ہے کبیر کی موت کی طرف۔ ہندو جلانا اور مسلمان دفن کرنا چاہتے تھے۔ اسی بات پر ہندو مسلم فساد ہوا۔ کہتے ہیں کہ لاش غائب ہو گئی۔ کچھ پھول ملے جنہیں ہندوؤں نے جلایا اور مسلمانوں نے دفن کیا۔ یہ دیسے

سماس، لطف وکرم۔ مہر ومحبت، علم وعقل کے سمندر ہو۔ تم وید قرآن پر حاوی ہو اور دونوں مذہبوں کے پیر ہو۔ تم بڑے بڑے اولیا کے دوست ہو۔ تمہارا جسم ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ اے میرے آقا! دھرم داس کو پاک کر دو اور اس کی کشتی کو پار لگا دو)

ایک اور بھگت شاعر چمار تھے۔ انکا نام رائے داس ہے۔ یہ راما نند کے شاگردوں میں سے تھے۔ اور اس لئے کبیر کے پیر بھائی ہوئے۔ یہ اپنی عوامی زبان میں تعلیم وتلقین کرتے تھے۔ انکے ہاں اسلامی رنگ کی جھلک ذرا اور زیادہ صاف نظر آتی ہے۔ یہ بھی ہندوں کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ اور اس لئے بے معنی رسوم کی تنقید میں یہ ذرا سا بھی جھجکتے نہیں۔ کہتے ہیں:

کہا بھیو جے چرن پکھارے جو لو تتوا نہ چینھے
کہا بھیو جو مونڈ منڈا ئے کہا تیرتھ برتا کینھے

(پیر دھونے سے کیا فائدہ جب تک کہ اس ذات کا خیال نہ کیا جائے۔ سر منڈانے سے کیا فائدہ اور تیرتھ اور روزوں میں کیا رکھا ہے؟)

دیگر

تھوتھی کایا تھوتھی مایا تھوتھی ہری بن جنم گنوایا
تھوتھی پنڈت تھوتھی بانی تھوتھی ہری بن سبے کہانی
تھوتھی مندر بھوگ بلاسا تھوتھی آن دیوا کی آسا

(جسم خالی (بیکار) ہے، مایا (دنیا) خالی ہے۔ زندگی بغیر ہری کے خالی ہے اور گم ہر پنڈت اور اسکے وعظ خالی ہیں۔ بغیر ہری کے سب کہانیاں خالی ہیں۔ مندر خالی ہے اور عیش و طرب خالی ہے۔ کسی دوسرے خدا میں (۱) (سوائے خدا کے) امید رکھنا خالی ہے)

تو ایک عوامی اور ناقابل یقین روایت ہے لیکن اسکی گہرائیوں میں ہماری قومی زندگی کا ایک بڑا اہم مسئلہ پوشیدہ ہے جس کا کوئی حل اب تک نہ مل سکا۔ عوامی تخیل بڑی بڑی حقیقتوں کو یوں ہی سیدھی سادی روایتوں میں بیان کرنے کا عادی ہے۔

(۱) الا اللہ

اپنی نیچی ذات کا وہ ایک جگہ یوں ذکر کرتے ہیں :-

ناگر جسنم میری جاتی بھیات چمارن
ردے رام گوبند گن سارن
سر سری سل کرت بارونی
اے سنت جن کرت نہیں پانن
سورا اپاوتر نتا اوراجل
اے سر سری ملت نہیں ہوئے آنن

(اے شہر کے رہنے والو! میری ذات پات مشہور ہے۔ میں چمار ہوں۔ میرے دل میں رام اور گووند تمام صفات کی روح بنکر رہتے ہیں۔ اگر شراب گنگا کے پانی سے ملاکر بنائی جائے تو بھی نیک لوگ اسے نہیں پیتے۔ شراب ناپاک ہے۔ اور دوسرا پانی ملنے سے بھی ناپاک رہتی ہے لیکن بہتی گنگا کے پانی میں اگر شراب ڈالدی جائے تو وہ ناپاک نہیں ہوتا)

دوسری جگہ کہتے ہیں :

برہمن ویش شدر ار و کھتری
ڈوم چنڈار ملیچھ من سوئی
ہوئی پُنیت بھگونت بھجن تے
آپ تاری تارے کل دوئی

(برہمن، ویش، شدر، کھتری، ڈوم، چنڈال اور ملیچھ[1] سب کی ایک روح ہے۔ اعتقاد وعبادت سے جو پاک ہوجائے بس وہی خود کو اور اپنے خاندان کو پار لگا سکتا ہے)

---

(۱) مدتوں تک برہمن مسلمانوں کو ملیچھ یعنی "ناپاک اجنبی" کے لفظ سے یاد کرتے تھے۔ مسلمانوں کی تخصیص نہیں۔ یونانی اور سیتھین قبائل بھی اس وقت تک قدیم ہندی کتابوں میں اسی نام سے یاد کئے جاتے ہیں جب تک کہ وہ ہندویت میں بالکل جذب نہ ہوگئے۔

مانے داس کو یہ فخر حاصل ہے کہ اسے رانی میرا بائی جیسات گرد ملا۔ میرا بائی والی مارواڑ راؤ کی پوتی تھیں سیسودیا کے شاہی خاندان میں سنگھا جی کے بیٹے بھوج راج سے انکی شادی ہوئی۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ میرا بائی کی تلسی داس اور بادشاہ اکبر سے بھی خط و کتابت تھی ایک مرتبہ خود اکبر مع تان سین میرا بائی سے ملنے کے لئے ملدوار آیا تھا۔ اگرچہ تاریخی ثبوت ا واقع کی تصدیق میں موجود نہیں لیکن ممکن ہے کہ اس عوامی روایت میں تھوڑی بہت صحت ہو۔ کے لئے جو خود ایک ایسا مذہب بنانا چاہتا تھا کہ جو اسلام اور ہندو دھرم دونوں کے عناصر پر مبنی ہو یقیناً میرا بائی سے ملنے میں ایک خاص دلچسپی ہو گی۔

میرا بائی بھی دوسرے بھگت شاعروں کی طرح انسان دوستی کے مشرب کو بطور اپنے مذہ اور روحانی ہدایت کے سمجھتی تھی۔ اس کی بھگتی کا قبلۂ مقصود، بخلاف کبیر، دھرم داس اور رلب داس کے جو رام پر اعتقاد رکھتے تھے، سری کرشن تھے۔ وہ سری کرشن کو گردھر گوپال کے لق سے پکارتی ہے۔ اس کے ہاں خدائے واحد کا تخیل بڑی نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ اس نے عہد پران کی روایتوں اور بھگتی کی جذباتی اعتقادی تحریک سے ملاکر اپنا ایک الگ خدا پیدا کر لیا تھا۔ اس کی شاعری میں ایک ایسا اعتقادی جوش ہے جو اس عہد سے پہلے ہندو خیال اور شاعری میں نہیں پایا جاتا۔ ممکن ہے کہ میرا بائی تھوڑی بہت فارسی جانتی ہو کیونکہ اس زمانہ میں فارسی ہندوستانی شائستگی کی زبان تھی اور ہندو امرا کے یہاں بھی اسی زبان میں کارروائی تھی۔ وہ فارسی کے الفاظ نہایت بے تکلفی سے استعمال کرتی ہے۔ مثلاً

سب میں رہیا تیری دیکھی کدرت(۱) کے کربان(۲)
مجھ پر تو پربھو کرپا کیجے بندی اپنی جان

---

(۱) قدرت

(۲) قربان

(ہر چیز میں تیری شان دیکھی۔ میں تیری قدرت کے قربان جاؤں ۔ اے میرے پربھو مجھ پر کرم کرو اور اپنی لونڈی سمجھو)

ہندو دھرم کی رسوم کے خلاف وہ کہتی ہے :

اس دیہی کا گرب نہ کرنا ماٹی میں ملجاسی
کہا بھیو تیرتھ برت کینہے کہا لئے کروٹ کاسی
کہا بھیو ہے بھگوا پہریاں گھر تج بھئے سنیاسی
جوگی ہو یا جگتی نہیں جانی الٹی جنم پھراسی

(تیرتھ اور روزوں میں کیا رکھا ہے ؟ بھلا بنارس (کاشی) کی طرف کروٹ لیکر سونے سے کیا حاصل ؟ اس جسم پر غرور بیکار ہے ۔ یہ تو مٹی میں عنقریب ملجائے گا ۔ رنگے ہوئے کپڑے پہننے اور گھربار چھوڑ کے سنیاسی بننے کا کیا نتیجہ ؟ لوگ جوگی ہوجاتے ہیں لیکن صحیح جگت (فقیری) سے ناواقف ہیں اور اپنی زندگی کو الٹا راستہ چلاتے ہیں)

میرا بائی کی شاعری میں ایک خاص زور اور جوش ہے ۔ وہ اپنے عشق کا اظہار اُس زبان میں کرتی ہے جسے یا تو عورتیں جانتی ہیں یا صوفیا ۔ مثال کے طور پر ہم چند شعر نقل کرتے ہیں :-

میرے تو گردھر گوپال دوسرا نہ کوئی
دوسرا نہ کوئی سادھو دوسرا نہ کوئی
پریم کا متھنیاں ساتھی بھگتی سے بلوئی
گھرت گھرت کاڑی لینو چھاچھ پیو کوئی
آنسواں جل سینچی سینچ پریم بیلی بوئی
اب تو بیل پھیل گئی آنند پھل ہوئی
سنتن ڈھگ بیٹھ بیٹھ لوک لاج کھوئی

چھاڑ دی کل کی ریت کیا کری ہے کوئی
آئی میں بھگتی کاج جگت دیکھ موہی
داسی میرا گردھر پربھو تار واب موہی

(میرے تو گردھر گوپال[1] ہیں اور کوئی دوسرا نہیں۔ اور کوئی دوسرا نہیں۔ ارے بھلے لوگو! اور کوئی دوسرا میرا نہیں۔ محبت کی متھانی سے میں متھتی ہوں اور اس متھانی کو اعتقاد خلوص گھماتے ہیں۔ گھی گھی سارا میں نے لے لیا اب باقی مٹھا جو بچا تو جو چاہے پی لے۔ آنسوؤں کے پانی سے محبت کی بیل کو میں نے جایا ہے۔ اب بیل پروان چڑھی اور اسکا پھل اصلی خوشی (آنند) ہے سنتوں کی صحبت میں بیٹھ بیٹھکر میں نے دنیا کی شرم و حیا کھو دی۔ ذات پات کی سا رسمیں چھوڑ دیں۔ بھلا دیکھوں کوئی میرا کیا کرے؟ میں یہاں اپنا خلوص تدر چڑھانے آئی ہوں ا ساری دنیا مجھے دیکھتی رہے۔ اے میرے مالک اپنی لونڈی میرا کو پار اتار دو)

دیگر

ہری میں تو پریم دوانی میرا درد نہ جانو کوئی
سولی اوپر سیج ہماری کس بدھی سونا ہوئی
درد کی ماری بن بن ڈولوں ویدی ملا نہیں کوئی
میرا کے پربھو پیر مٹے گی جب وید سانولیا ہوئی

(اے ہری! میں تو محبت کی دیوانی ہوں۔ میرے درد کا حال کسی کو نہیں معلوم۔ میرا بستر سولی پر ہے، بھلا میں کیسے سو سکتی ہوں؟ درد کے مارے بنوں میں ماری ماری پھرتی ہوں کوئی اس درد کو دور کرنے والا طبیب نہیں ملا۔ اے میرا کے مالک! میرا کا دکھ تو اسی وقت دا

---

(۱) گردھر بمعنی پہاڑ کو تھامنے والا اور گوپال گڈریے کو کہتے ہیں۔ یہ دونوں لفظ سری کرشن کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔

ہوگا جب سانولے رنگ والا اسکا طبیب ہوگا)

انہیں بھگت شاعروں کے سلسلہ میں ایک دادو دیال ہوئے ہیں کبیر کے بعد انکا اثر سب سے زیادہ گہرا اور پھیلا ہوا ہے۔ ان کی تعلیمات کی بھی یہ خصوصیت ہو کہ انہوں نے اسلام اور ہندو دھرم کے بہترین روحانی عناصر کو ملا کر ایک اعتقادی نصب العین اپنے دیس والوں کے لئے پیش کیا۔ انکے ماننے والے آجتک راجپوتانے اور وسط ہند میں ملتے ہیں۔ یہ لوگ دادو پنتھی کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ دادو دیال نے، گجراتی، ماڑواڑی، ہندی اور فارسی میں شعر کہے ہیں۔ دادو دیال کے مذہبی اصول میں کوئی نئی بات نہیں ملتی۔ انسان اور خدا کے متعلق انکے خیالات بالکل وہی ہیں جو کبیر کے تھے۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ہندوستان میں ازمنہ وسطے کی پوری اعتقادی تحریک کا مبدا، کبیر اور اسکی تعلیمات ہیں۔ کبیر کا وجود اس عہد کے خیال اور مذہب کی تاریخ میں مرکزی صورت رکھتا ہے۔

دادو دیال کی تعلیمات کا خلاصہ ایچ ایچ ولسن نے ان لفظوں میں دیا ہے:

"اُس کو قبلۂ توجہ بناؤ جس نے سب کچھ پیدا کیا۔ پنڈت اور قاضی پاگل ہیں۔ انہوں نے جو کتابوں کا ڈھیر جمع کیا ہے اس سے کیا حاصل؟ ویدوں کو پڑھنے میں اپنی زندگی مت برباد کرو۔"(۱)

دادو دیال بلا واسطہ طور پر اپنے مشن کا روحانی تعلق کبیر سے یوں بتاتے ہیں:-

کبیر بچارہ کہی گیا بہت بھانتی سمجھائے
دادو دنیا باوری تاکے سنگ نہ جائے

(کبیر بچارہ نے طرح طرح سے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن اے دادو! دنیا

---

(۱) "دی ریلیجن آف دی ہندوز"، صفحہ ۱۹۲

بولی ہے اس کے ساتھ نہیں ملتی)

معلوم ہوتا ہے داؔدو نے مسلمان صوفیوں کے ساتھ اچھا خاصہ وقت گذارا۔ وہ صوفیوں کے اصطلاحی نقطے بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں:

اللہ تیرا ذکر فکر کرتے ہیں۔
عاشک مشاک تیرے ترس ترس مرتے ہیں
ملک سیش دگر نیس بیٹھے دن بھرتے ہیں۔
دایم دربار تیرے گیر محل ڈرتے ہیں
تن شہید من شہید رات دن لرتے ہیں
گیان تیرا دھیان تیرا عشق آگ جلتے ہیں
جان تیرا جند تیرا پاؤں سر دھرتے ہیں
داؔدو دیوان تیرا زر شریہ گھر کے ہیں

دیگر

دادو میں ہی میرا عرس میں ہی میرا تھان
میں ہوں میرو ٹھور میں آپ کہے رحمٰن

دیگر

نور ہی کا دھر نور ہی کا گھر
نور ہی کا بار و میرا
نور ہی کا میلا نور ہی کا شیلا
نور اکیلا
نور ہی منجھی بسیرا
نور ہی کا انگ

نورہی کا سنگ
نورہی کا رنگ میرا[1]
نورہی راتا نورہی ماتا
نورہی شاتا دادو تیرا

دیگر

دادو الکھ اللہ کا کہو کیسا ہے نور
بے حد واکو حد نہیں سکل رہا بھرپور

(اے دادو! ان دیکھے اللہ کا ذکر کرو۔ اسکا نور کیا ہے؟ وہ بے حد ہے۔ اسکی کوئی حد نہیں۔ وہ ہمیشہ بھرپور قائم رہتا ہے)

دادو کے ہاں کبیر کی طرح خدا کی وحدانیت کا تخیل بالکل متعین ہے: مثلاً

انتر جامی ایک تو آتم کے آدھار
جو تم چھوڑو ہاتھ تے کون سنوارھار

(اندرونی (یعنی روحانی) زندگی کو بس تو ہی اکیلا درست کرنے والا ہے۔ تو ہی روح کی ڈھارس ہے۔ اگر تو اپنا مدد کا ہاتھ چھڑا لے تو مجھے اور کون سہارا دے سکے گا؟)

دیگر

راکھن ہارا ایک تو مارن ہارا انیک
دادو کو دیا نہیں تو ن ہی آپ ہی دیکھ

(تو ایک اکیلا ہی حفاظت کرنے والا ہے۔ مارنے والے بے گنتی ہیں۔ دادو کے لئے اور کوئی دوسرا نہیں ہے۔ تو خود دیکھ)

---

(۱) صبغۃ اللہ۔ بالکل اسلامی اور سامی خیال ہے۔ اسلام سے پہلے ہندوی مذہبی خیال اس سے ناآشنا تھا۔

دیگر

دادو یاہ تن پنجرا ماہیں من سووا۔
ایک ناؤں اللہ کا پڑھی پڑھی حافظ ہووا

(اے دادو! یہ تن ایک پنجرا ہے جس میں دل ایک طوطے کی طرح قید ہے۔ یہ دل ایک اللہ کا نام پڑھ پڑھ کے اس کا حافظ ہوگیا ہے۔)

دیگر

صاحب میرا کپڑا صاحب میرا کھان
سو صاحب سر تاج ہے صاحب پنڈ پران

(صاحب (اللہ) ہی میرا لباس ہے۔ صاحب ہی میری خوراک ہے۔ وہی صاحب میرا سرتاج ہے اور میرا بدن اور روح بھی وہی ہے۔)

دیگر

سوئی گیانی سوئی جنگما سوئی صوفی سوئی سیش
سوئی سنیاسی سے بڑے دادو ایک ادیش
سوئی کاجی سوئی ملا سوئی مومن مسلمان
سوئی سیانے سب بھلے جے جانے رحمن
رام نام کو بنجیا بیٹھے آپے ہاٹ
سائیں سوں سودا کرے دادو کھولی کپاٹ

(وہی عالم ہے۔ وہی اصلی سادھو ہے۔ وہی صوفی اور شیخ ہے۔ وہی سنیاسی سے بڑا ہے جو اے دادو ایک خدا کی تشریح کرے۔ وہی قاضی اور ملا ہے، وہی مومن اور مسلمان ہے۔ وہی عاقل اور سچا ہے جو رحمن سے محبت رکھے۔ میں نے رام کے نام کی تجارت کر رکھی ہے اور ایک ہاٹ بچا رکھا ہے۔ سائیں سے سودا کرنے میں دادو نے (دل کے یا دکان کے) دروازے کھول

کے پاٹ کھول دیئے ہیں۔

دادو دیدار الٰہی کو صوفیوں کی طرح اپنی زندگی کی نجات سمجھتے ہیں:-

دین دُنی صدقے کروں دیکھن دے دیدار

تن من چھن کروں بہشت دوجگ بھی وار

(میں دین اور دنیا دونوں صدقہ کرتا ہوں۔ مجھے اپنا دیدار دیکھنے دے۔ تن من اور جنت دوزخ سب (اس دیدار کی خاطر قربان)

ہندو اور مسلمانوں کے مذہبی رسموں کے اختلاف پر اور اس اہمیت پر جو اس اختلاف کو دی جاتی ہے۔ دادو بہت افسردہ خاطر ہو کر یوں کہتے ہیں:

ہندو ترک نہ جالو دونی

سائیں سبنی کا سوئی ہوئی

اور نہ دوجا دیکھوں کوئی

کوئی رام کوئی اللہ ساوی

پنی اللہ رام کا بھید نہ پاوی

کوئی ہندو کوئی ترک کری مانی

پنی ہندو ترک کی کھبری نہ جانی

دادو دیکھی آتم ایک

کہیبا سنیبا اننت انیک[1]

(ہندو اور ترک (مسلمان) دونوں ناواقف ہیں۔ خدا سب کا ایک ہی ہے مجھے دوسرا

---

(۱) "دادو دیال کا شبد" صفحہ ۱۴۷۔ ہم نے دادو کے سب دوہے اور شبد اس کتاب یا "دادو دیال کا بانی" ہردو مطبوعہ ناگری پرچارنی سبھا سے لئے ہیں۔

خدا انہیں دکھائی دیتا۔ کوئی اللہ کہتا ہے اور کوئی رام کہتا ہے لیکن رام کا اصلی بھید انہیں نہیں معلوم۔ کوئی اپنے کو ہندو کہتا ہے اور کوئی ترک لیکن یہ سب ہندو اور ترک بننے کے راز سے بے خبر ہیں۔ دادو کو تو ہر جگہ بس ایک روحِ مطلق نظر آتی ہے اور وہ اُسی ابدی ایک کا ذکر کرتا سنتا ہے)

اُسے ہندو کے بت سے بھی اتنی ہی کم دلچسپی ہے جتنی کہ مسلمان کی مسجد سے اس لئے کہ وہ بقول غالب دونوں کو راہِ شوق میں تھکے ہوؤں اور پست ہمتوں کی پناہیں سمجھتا ہے۔ (۱) کہتا ہے :۔

ہندو لاگے دیوہرا مسلمان مہجتی
ہم لاگے ایک الکھ سوں سدا نرنتر پریتی

(ہندو بت پوجتا ہے۔ مسلمان مسجد میں عبادت کرتا ہے۔ ہم ایک ان دیکھے سے تعلق رکھتے ہیں جس کی محبت میں ابدیت ہے)

وحدانیت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی ؟

اوپر کے صفحوں میں ازمنہ وسطیٰ کی عوامی مذہبی تحریک کے مصلح شاعروں کا سرسری ذکر کیا گیا ہے۔ ان شاعروں کی تاریخ پیدائش و وفات کی صحیح تعیین اس قدر مشکل ہے جتنی کہ اُن کے کلام کی لسانیاتی تنقید۔ بعض دفعہ ایک ہی شاعر کی طرف مختلف عہدوں کی زبان منسوب کی گئی ہے۔ ہوا اصل میں یہ ہے، جیسا کہ اور دوسری جگہ بھی ہوا ہے، کہ بعد کی آنے والی

---

(۱) دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا
واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں
(نسخۂ حمیدیہ)

نسلوں نے نام سے فائدہ اٹھانے کے لئے اور خود اپنی باتوں کو موثر بنانے کے لئے اپنے متقدین کی طرف اشعار منسوب کرنے میں کوئی اخلاقی ہرج نہ سمجھا۔ خصوصاً کبیر کے ہاں اس قسم کی بہت سی مثالیں ملیں گی۔ یہ عہد ہمارے مورخ اور ادیب دونوں کے لئے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جس قدر اہمیت زیادہ ہے اتنا ہی کم کام اس عہد کی تاریخ وادب پر کیا گیا ہے۔ اس مذہبی تحریک کی سب سے بڑی اور نمایاں خصوصیت اسلامی تہذیب و تعلیم کا وہ گہرا اثر ہے جو ہندو خیال اور تمدنی نظاموں پر پڑا۔ سوائے اسلامی اثر کے اور وہ کیا تھا جس کے باعث چودھویں پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی میں شمالی ہند کا کونا کونا وحدانیت سے بھرے ہوئے گیتوں اور ذات پات کے نظام کے خلاف صدائے احتجاج کے شور سے گونج اٹھا۔ ہم نے جن بھگت شاعروں کا اوپر ذکر کیا انہیں کا روحانی سلسلہ برابر اٹھارھویں صدی عیسوی تک قائم رہا۔ ملوک داس، ہری چند، یاری صاحب (مسلمان بھگت شاعر ہوئے ہیں) دھرنی داس، دریا صاحب بہاری (مسلمان) سب کے سب ایک ہی راگ الاپنے والے تھے۔ ان سب کی تعلیمات وہی ہیں جو کبیر کی اور ان سب کے مخاطب گاؤں کے لوگ تھے۔

یہ سب بھگت شاعر صوفی تھے۔ اور تصوف ایک گہرا انفرادی نفسی تجربہ ہے۔ مجذوبیت بھی جو اس سے پیدا ہوتی ہے نیا رنگ ہے۔ جب وہ ادارہ بنتا جاتا ہے تو اس کے لئے تشکیل لازمی ہے۔ اور تشکیل بغیر رسم و آئین کے ممکن نہیں۔ یہ دیکھ کر کچھ تعجب نہیں ہوتا کہ جنہوں نے ذات پات کو مٹانا اپنی تعلیم کا سنگ بنیاد قرار دیا تھا انہیں کے پیروؤں نے خود اپنے آپ کو ذات پات کے تنگ دائرہ میں محدود کر دیا اور امتداد زمانہ سے اُن کے ہاں بھی سخت گیریوں اور رسوم کی پابندی کو وہی جگہ حاصل ہو گئی جو ہندوؤں کے دوسرے طبقوں میں پہلے سے موجود تھی۔ مجھے اس کا پورا یقین ہے کہ کبیر اور اس کے اسکول

کے دوسرے صوفی مصلحوں کا یہ ہرگز منشاء نہ تھا کہ ان کی تعلیم کو سننے اور ماننے والوں کے الگ گروہ بن جائیں۔ یہ سب لوگ انسان دوست تھے اور انسان دوستی کی ذہنی اور روحانی آزادیوں کو ہندو سماج میں رائج کرنا چاہتے تھے۔ اسلام ان کے خیال و ذہن کے لئے محرک بنا۔ لیکن انکے بس کی بات نہ تھی کہ اپنے پیروؤں کو الگ ذات بننے سے روک سکتے۔ دنیا میں ہر جگہ یہ ہوا ہے کہ خیال اپنی موثری کے لئے تشکیل چاہتا ہے۔ یہی تشکیل ادارہ بن جاتی ہے۔ اداروں کا اصلی خیال سے قریب تر ہونا اُن کے حاملوں کے روحانی اور ذہنی توازن پر بیتی ہے۔ انسانی غرضوں نے اس توازن کو نایاب بنادیا ہے۔

مسئلہ افلاس ہند

اور

جدید معاشیاتی تحقیقات

(گذشتہ سے پیوستہ)

مسئلہ توازن تجارت اور افلاس ہند[1]

ہمیں معلوم ہو چکا کہ ہندوستانی زرعی پیداوار پر دو صحیح اعتراضات کئے جاتے ہیں اول تو یہ کہ ہندوستانی باوجود استطاعت کے اس قدر دولت ہی پیدا نہیں کرتے جو تمام آبادی کے لئے کافی ہو۔ دوسرے یہ کہ یہاں کی معاشی دولت زیادہ تر متوسط اور ادنیٰ درجہ کی ہوتی ہے اس بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہمیں دیکھنا ہے کہ مسئلہ توازن تجارت کا تعلق افلاس ہند سے کیا ہے۔

توازن تجارت سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ کسی ملک کی درآمد و برآمد میں توازن رہے یعنی یہ کہ جس قدر قیمت کا مال کسی ملک میں داخل ہو اسی قیمت کا مال ملک کے باہر جائے، فرض کیجئے کہ ایران سے ہر سال بیس کروڑ کا مال جاتا ہے اور سولہ کروڑ کا مال آتا ہے۔ یہ چار کروڑ کی زائد برآمد مروجہ اصول کے مطابق ایران کے لئے "بچت ہے" اُس کے حق میں "مفید" ہے لہذا معاشیین اس قسم کی تجارت کو تجارت موافق (Favourable Trade.) کہتے ہیں۔ اگر ایران سولہ کروڑ کا مال دوسرے ممالک کو بھیجے اور دوسرے ممالک سے بیس کروڑ کا مال ایران میں داخل ہو تو یہ تجارت اُس کے لئے مضر ہے لہذا معاشیین اُس کو "ناموافق تجارت" سے تعبیر کرتے ہیں ثبوت میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ملکی درآمد و برآمد شخصی آمدنی و اخراجات کے مماثل ہے جس طرح کسی شخص کی آمدنی سے اس کے اخراجات کا زائد ہونا معاشی پسماندگی کی علامت ہے اور آمدنی کا اخراجات سے زائد ہونا ترقی کی نشانی ہے ایسا ہی حال اقوام و ممالک کی درآمد

برآمد کا ہے کیونکہ درآمد برآمد سے بڑھی رہی تو دوسروں سے رقم واجب الوصول ہوتی ہے جو معاشی ترقی کی نشانی ہے لیکن اگر درآمد برآمد سے بڑھی رہے تو ملک کو رقم ادا کرنی پڑتی ہے جو معاشی تنزل کی علامت ہے لہذا زاید درآمد افلاس سے اور زائد برآمد دولتمندی سے تعبیر کیجاتی ہے۔ اسی غرض سے کہتے ہیں کہ مجموعی درآمد اور مجموعی برآمد کی قیمتوں میں توازن مطلوب ہوتا ہے۔

معاشئین سمجھتے رہے ہیں کہ درحقیقت توازن تجارت کا نظریہ صحیح و مکمل ہے لیکن جدید معاشیاتی تحقیقات نے یہ بات واضح کردی ہے کہ نظریہ توازن تجارت صرف محدود معنی میں صحیح ہے اور وہ عام طور پر منطبق نہیں کیا جاسکتا لہذا درآمد برآمد سے بڑھی رہے تو یہ ہمیشہ اخذ نہیں کیا جاسکتا کہ ملک مفلس ہو رہا ہے اور برآمد درآمد سے بڑھی رہے تو ملک معاشی ترقی کر رہا ہے کیونکہ بسا اوقات درآمد کا برآمد سے کم رہنا زوال کی نشانی ہے اور یہی ہندوستان کا حال ہے۔

ہندوستانی درآمد و برآمد کے اعداد و شمار کا جب مقابلہ کیا جاتا ہے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی تجارت کا رجحان تدریجی اضافۂ برآمد کی طرف ہے جو حسب ذیل اعداد سے عیاں ہے۔[۵۱]

سنہ	خالص زاید برآمد	سنہ	خالص زاید برآمد
۱۸۷۰	۱۸ کرور	۱۹۱۷	۳۶ کرور
۱۸۸۰	۱۴ "	۱۹۱۹	۴۹ "
۱۹۰۰	۹ "	۱۹۲۳	۶۲ "
۱۹۱۰	۴۳ "	۱۹۲۴	۵۳ "
۱۹۱۳	۲۱ "	۱۹۲۵	۹۹ "

انگریزی حکما، ماہرین سیاسیات اور عام اخبار نویس اس سے (خیالی نظریۂ موافق ناموافق توازن تجارت کے بموجب) یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ہندوستان امیر ہوتا جارہا ہے اور

---

۵۱ ماخوذ از Indian Economics مصنفہ بیری اور جاتھر مطبوعہ تاراپوروالا ۱۹۲۹ء جلد دوم صفحہ ۲۶۹

اُسے زاید برآمد کی وجہ سے یہ مفید اور قابل رشک موقع مل رہا ہے کہ دوسروں سے کام کرائے یہی وجہ ہے کہ برطانوی عہدہ دار و سپاہی ہندوستان میں کام انجام دے سکتے ہیں اگر اس کی برآمد اُسکی درآمد سے بڑھی نہ ہوتی تو اسے سخت مشکل کا سامنا ہوتا بہر طور ہندوستان کی مثال اس امیر کی سی ہے جس کی آمدنی بتدریج بڑھ رہی ہے اور جیسے جیسے اُس کی دولت و آمدنی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے وہ زیادہ نوکر رکھتا ہے، زیادہ کھیل تماشہ دیکھتا ہے، زیادہ خدمات لیتا ہے، غرضکہ بحیثیت مجموعی بہتر زندگی بسر کرتا ہے۔

عام تعلیم یافتہ حضرات کا یہ خیال صحیح ہوتا اگر توازن تجارت کا نظریہ بھی صحیح ہوتا۔ مگر جیسا کہ ہم ابھی ثابت کرنے کی کوشش کرینگے یہ نظریہ قطعی طور پر صحیح نہیں، اور موافق و ناموافق توازن تجارت اور معاشی ترقی و تنزل میں کوئی ربط و تناسب نہیں، لہٰذا کسی ملک کی مادی بہبودی کا اندازہ کرنے کے لئے توازن تجارت پر کلی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

نظریۂ توازن تجارت کی قطعیت کے خلاف دلائل

فرض کیجئے کہ ہندوستان کا ایک تاجر دس ہزار روپیہ کا مرادآبادی سامان فروخت کی غرض سے جاوا بھیجتا ہے اور ہندوستان کے برآمد کے رجسٹر میں ۱۰,۰۰۰ کی رقم درج کیجاتی ہے، اور یہی تاجر اپنے نمائندہ مقیم جاوا کو لکھتا ہے کہ جو کچھ رقم مرادآبادی سامان کے فروخت کرنے سے حاصل ہو اُسکی شکر تم ہندوستان بھیجدو اس مثال میں بین الاقوامی تجارت کی سہل ترین ضرورت و رپیش ہوتی ہے۔ صرف سہولت تفہیم کی خاطر ہم نے اس سہل ترین صورت کو پیش نظر رکھا ہے۔ حالانکہ درحقیقت تجارت میں بالعموم دو فریق اور اقسام دولت ہی نہیں ہوتے بلکہ مختلف خریدار و فروشندے اور مختلف اقسام دولت ہوا کرتے ہیں۔ بہر طور دنیا کا کاروبار اسی نہج پر چل رہا ہے۔

یہی مرادآبادی سامان جاوا پہنچکر ۱۲۰۰۰ روپیہ کا ہوجاتا ہے کیونکہ تاجر کو سامان کے پیکنگ اور حمل و نقل کے اخراجات اور جاوا کا درآمدی محصول ادا کرنا پڑتا ہے، ان حالات میں دو صورتیں ممکن ہیں:-

اول یہ کہ مراد آبادی سامان کی قسم عمدہ نہ ہونے کے باعث اور سامان خوش وضع اور جاوا والوں کے احتیاجات کے لئے ناموزوں ہونے کے باعث اس کی مانگ جاوا میں زیادہ نہ ہو، اور اس سبب سے مال کسی طرح ۵۰۰ سے زیادہ پر نہ بک سکے۔ پس جاوا کے نمائندے نے مجبوراً ۵۰۰ کی شکر ہندوستان روانہ کی جو اخراجات حمل و نقل کو ملا کر مراد آباد پہنچنے پر ۶۰۰ کی ہوئی اور یہی رقم ہندوستان کے درآمد کے رجسٹر میں داخل کر دی گئی۔

موازنہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۰۰۰ کا مال بھیجا گیا اور ۶۰۰ کا مال خریدا گیا جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ توازن تجارت ہندوستان کے لئے موافق ہوا اور نظریہ توازن کے مطابق ہندوستان کو ۴۰۰ کی رقم واجب الوصول ہے (کس طرح ؟ کس سے ؟) اس نظریہ کے حامی کہتے ہیں کہ ہندوستان نے ۱۰۰۰ کا مال بیچا اور ۶۰۰ کا خریدا، لہذا وہ منافع میں رہا مگر ہم کہتے ہیں کہ ہندوستان کو ۱۲۰۰ کے مال کے معاوضہ میں صرف ۶۰۰ کا مال ملا لہذا ہندوستان کو ۶۰۰ کا نقصان ہوا۔

اس تبادلۂ دولت کی دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اسی قدر مراد آبادی سامان عمدہ قسم کا ہونے، خوش وضع اور خوشنما ہونے، اور جاوا والوں کے احتیاجات کے مناسب بنائے جانے کے باعث ۲۰۰۰ روپیہ میں بکا اور جاوا والے نمائندے نے مراد آبادی تاجر کو ۲۰۰۰ کی شکر بھجوا دی اور ہندوستان کے درآمدی رجسٹر میں ۲۰۰۰ کی رقم داخل کر دی گئی۔ نتیجہ موازنہ یہ کہ ہندوستان کے حق میں یہ ناموافق تجارت ہے۔ کیونکہ اس مرتبہ ہندوستان نے ۲۰۰۰ کا مال منگوایا حالانکہ اس نے صرف ۱۰۰۰ کا مال بھیجا تھا یہ زاید درآمد توازن تجارت کے "زریں" اصول کے مطابق ہندوستان کا نقصان ہے مگر جدید معاشیاتی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ اس صورت میں ہندوستان کا سراسر نفع ہے کیونکہ ہندوستانی تاجر کو ۱۰۰۰ کا سامان بھیجتے وقت ۲۰۰ حمل و نقل کے لئے دینے پڑے۔ اور شکر منگانے کے لئے ۳۰۰ اس طرح کل ۵۰۰ کا مزید خرچ ہوا مگر ۲۰۰۰ کی شکر حاصل ہوئی یعنی ۵۰۰ کا منافع ہوا۔ مگر اس نظریہ کے خلاف رائے

رکھنے والے، جو اس گہری نظر سے معاشی حقائق کا مطالعہ کرنے سے قاصر ہیں، اور حقیقت معاشیات سے واقف نہیں، یہی گمان کرتے ہیں: درآمد زیادہ برآمد کم نتیجہ معاشی تنزل!!

گویا موافقین نظریۂ توازن تجارت کی منطق کے مطابق اعلیٰ تنظیم، اعلیٰ کارکردگی، عمدہ مذاق اور عمدہ قسم سامان ہو تو نتیجہ معاشی تنزل ہوتا ہے اور بدنظمی، ادنیٰ کارکردگی، پھوہڑپن، بدمذاقی سے معاشی ترقی حاصل ہوتی ہے!!

نظریہ توازن تجارت کے سراسر ناقابل اعتماد ہونے کے ثبوت میں بہترین مثال یہ پیش کی جا سکتی ہے:- فرض کیجئے کہ وہ جہاز جو مرادآبادی سامان جاوا لیجا رہا تھا کسی وجہ سے غرق ہو جائے ظاہر ہے کہ جاوا والا نمائندہ اس مرتبہ ایک روپیہ کا بھی سامان اپنے مرادآبادی مالک کو نہ بھیج سکیگا۔ نظریہ توازن تجارت کے قائل فوراً اعداد و شمار سے یہ نتیجہ نکال لیں گے کہ برآمد ۱۰۰۰۰ اور درآمد ندارد۔ ہندوستان کی موافق تجارت بقدر دس ہزار ہے جو دوسروں سے وصول طلب ہیں (جہاز کے ساتھ سامان بھی غرق ہو گیا تو پھر رقم کس سے اور کیونکر وصول ہوا؟)

جن لوگوں میں فہم عامہ اور صحیح ذہنیت موجود ہے، جن لوگوں کا دماغ سطحی معاشی نظریات سے مرعوب نہیں ہوتا، اور اصول معاشیات کے جاننے کے باوجود حقیقی حالات کے پہچاننے کی صلاحیت رکھتا ہے، جس سے نظریاتی معاشیات پڑھتے پڑھتے ذاتی غور و فکر کی طاقت سلب نہیں ہو گئی ہے۔ وہ لوگ جانتے ہیں کہ یہ طرز استدلال صحیح نہیں، اور نظریۂ توازن تجارت کسی طرح قطعیت کا دعویدار نہیں ہو سکتا اور موافق و ناموافق توازن تجارت سے کسی ملک کی مرفہ الحالی یا معاشی تنزل کا پتہ نہیں چل سکتا۔

توازن تجارت کی موافقت و ناموافقت کے غلط تصورات اس قدر عام ہیں کہ وہ ماہرین سیاسیات، مصلحان قوم و معاشرت، رہبران سیاست، مقالہ نویسوں، رسالہ نگاروں اور عام پڑھے لکھے اشخاص کے علاوہ خود گروہ معاشئین میں پائے جاتے ہیں چنانچہ معاشیات کی اکثر "مستند" اور جامع کتب میں بھی توازن تجارت کی محدود صلاحیت انطباق (Limited range of

[illegible] پر علق بحث نہیں ہوتی۔

اس غلطی و غلط فہمی کے اسباب کا پتہ چلانا آسان نہیں اس کے لئے نظریات قدر و قیمت کا بیان کرنا ضروری ہوگا، اور مسئلہ توازن تجارت و مسئلہ زر (توازن داد و ستد) کے باہمی تعلقات ظاہر کرنے پڑیں گے۔ اگر مجھ سے یہ کام انجام پاسکے تو بھی یہاں اس کے تذکرہ کا کوئی موقع نہیں۔ مجبورًا اس اجمال پر اکتفا کرتا ہوں کہ توازن تجارت کا مسئلہ اس وجہ سے بھی غلط ہے کہ دار و مدار قیمت اشیاء (بوقت درآمد و برآمد) پر رکھا گیا ہے اور زیادہ تر مقدار زر کا لحاظ کیا جاتا ہی توازن تجارت کے اعداد و شمار سے بندرگاہوں پر چیزوں کی جو قیمت ہوتی ہے اُسکا اندازہ کیا جاتا ہی۔ اُن چیزوں کا کیا حشر ہوتا ہی، آیا وہ کم قیمت پر فروخت ہوتی ہیں، یا زیادہ داموں بکتی ہیں۔ وہ صرف میں آتی بھی ہیں یا یونہی اکارت جاتی ہیں، ان واقعات کا کچھ بھی لحاظ نہیں کیا جاتا۔ میرے خیال سے توازن تجارت کا نظریہ اس وقت تک قابل اطمینان نہیں ہوسکتا جبتک کہ اس کی بنیاد دولت اور اُس کی اضافی و مطلق قدر پر نہ رکھی جائے۔ اسی طرح درآمد و برآمد کے اعداد ناقابل اعتماد ہیں اور اسپر نظر کرتے ہوئے علم و عمل میں بین اختلافات رہیں گے۔

یہ تو ثابت ہوگیا کہ موافق توازن تجارت بھی ملک کی معاشی تنزل کا سبب ہوسکتا ہے اور حقیقت حال یہ ہی کہ موجودہ زمانہ میں ہندوستانی تجارت کی حالت کچھ ایسی ہی ہے جو مال ہندوستان سے برآمد ہوتا ہی وہ زیادہ تر متوسط اور ادنیٰ درجہ کا ہوتا ہے، یعنی ہماری تنظیم و کارکردگی ادنے ہونے کے باعث ہمارے مال کی قدر غیر ممالک میں زیادہ نہیں ہوتی اسی وجہ سے ہم بہت سامان کم قیمت میں بیچتے ہیں، اور تھوڑا مال زیادہ قیمت پر خریدتے ہیں جس کی وجہ یہی ہی کہ اُن کی تنظیم و کارکردگی اعلیٰ اور ہماری ادنے ہوتی ہے چونکہ ہم بشکل زر خریدتے کم ہیں اور بیچتے زیادہ ہیں (حالانکہ اشیاء کی حقیقی قدر کا لحاظ کرتے ہوئے ہماری چیزیں مقابلۃً بہتر ہوتی ہیں[1]) ہمیں حقیقی

---

[1] یہاں یہ اصولی اعتراض ممکن ہی کہ جس چیز کی قدر زیادہ ہی اس کی قیمت کیونکر کم ہوسکتی ہی اور اسی طرح کم قدر

نقصان ظاہرہ منافع کی شکل میں دکھائی دیتا ہے اور ہم اپنی نادانی و لاعلمی میں خوش و خرم ہیں اور "موافق توازن تجارت" کے حقیقی راز سے واقف نہیں۔ شکایت اگر کرتے ہیں تو صرف اس کی کہ ۴
ہندوستان میں توازن تجارت قائم نہ ہونے کے باوجود توازن ادا دوستند قائم ہے اور مالی کاروبار میں کوئی ابتری نہیں ہونے پاتی، وہ زیادہ تر "مطالبات وطن" کی وجہ سے جس سے ہندوستان پر بہت بڑا بار پڑتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی تجارت کی درآمد سے برآمد اوسطاً بقدر ۶۰ کروڑ سالانہ بڑھی رہتی ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ہندوستان کو یہ رقم دوسرے ممالک سے وصول بھی ہوتی ہے۔ کچھ حصہ اس کا تو قدر و قیمت میں تفاوت کے باعث بلاشبہ خود بخود غائب ہو جاتا ہے، اور بقیہ رقم جو واجب الوصول ہوتی ہے، اس کی ادائی نقد رقم کی شکل میں نہیں ہوتی۔ نہ اس قیمت کا مال ہندوستان بھیجا جاتا ہے اور نہ اس کے ذمہ قرض رہتا ہے بلکہ اس رقم کی ادائی خدمات کے ذریعہ کر دی جاتی ہے۔

ہندوستان ہر سال تقریباً ۳۴۰ کروڑ کا سامان بھیجتا ہے اور ۲۰۰ کروڑ کے قریب کا سامان درآمد
ہوتا ہے جو رقم ہندوستان کو واجب الوصول ہوتی ہے وہ حقیقتاً ادا نہیں کی جاتی بلکہ زیادہ تر "مطالبات وطن" کی مد میں صرف ہو جاتی ہے۔ یہ ہندوستان والوں کی عام شکایت ہے کہ مطالبات وطن ہندوستان پر بیجا بار ہیں۔ اس معرکۃ الآرا مسئلہ کی بحث کا یہاں کوئی موقع نہیں اور نہ اس کی ضرورت ہے جدید معاشیاتی تحقیقات سے جو کچھ روشنی اس مسئلہ پر ڈالی جا سکتی ہے ہمیں صرف اسی کے متعلق تذکرہ کرنا ہے[۵]۔ ۵

کی چیزیں کیونکر زیادہ قیمت میں بک سکتی ہیں اصولاً یہ بات صحیح ہے مگر عملی تجارتی واقعات سے جو لوگ واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ کس طرح ہندوستانی مال کم قیمتوں خریدا جاتا ہے اور وہاں کا مال زاید قیمت پر فروخت ہوتا ہے۔ زیادہ تر تو "تجارتی چالاکیوں" کا نتیجہ ہے مگر ہندوستانیوں کی لاعلمی، عدم واقفیت، نااتفاقی وغیرہ بھی اہم اسباب ہیں۔

۵ کسی قدر تفصیلی بحث کے لئے دیکھئے (Indian Economics) از جاتھر و بیری

[illegible] معاشیات بنیاد اور تقسیم محنت و دولت

مطالبات وطن کو [illegible] کہ وہ [illegible] خود [illegible]
مفید و مضر [illegible] کس حد تک ، اسی تقسیم [illegible]
دولت و محنت سے بخوبی واقف ہو جائیں ۔

تقسیم دولت محنت

مگر انسانی ضروریات کے بموجب دولت کی تقسیم [illegible] انسانی
احتیاجات یکساں اہمیت نہیں رکھتے ہیں کیونکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک قسم کی دولت جو انسانی [illegible]
دفعیہ بھوک ، پیاس ، پناہ ، کے پورا کرنے کے لئے مستعمل ہو ، ہم بحیثیت معاشی دولت سے تعبیر کریں
مثلاً صحت بخش غذا ، توانائی پیدا کرنے اور بڑھانے والی غذا ، رہنے سہنے کے لئے صاف ستھرے
مکان ، تن کو دھوپ اور سردی کی تکالیف سے بچانے کے لئے کپڑا ، یہ سب چیزیں [illegible]
[illegible] نسل کے لئے ضروری ہیں لہٰذا ہم اس قسم کی دولت کو جو انسان کی بدیہی ضروریات
پورا کرتی ہو بحیثیت دولت اور جس محنت سے یہ اشیاء تیار ہوتی ہیں [illegible]
ہوں یا غیر مادی محنت قسم اول کہتے ہیں مثلاً ماہر طبیب کی محنت ، کسان کی محنت [illegible]
کی محنت ، معمار کی محنت ، دوم اس قسم کی دولت کو جو انسان کی لابدی [illegible]

[illegible] Taraporevala بمبئی ۱۹۲۸ء جلد دوم صفحہ ۲۰۰ تا ۲۳۲ [illegible]
[illegible] اس اہم موضوع پر ابتک انگریزی زبان میں بھی کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی گئی اور [illegible]
کو کسی نے مرتب کرنے کی کوشش کی ہے خصوصاً جبکہ مطالبات وطن معاشیات ہند کے [illegible]
طلب مسئلہ Drain, ہندوستان [illegible] بنیاد ہے نظریہ ڈرین ابتک مکمل طور پر کبھی [illegible]
کس درجہ نامکمل صورت میں ہے اسکا اندازہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ [illegible]
معاشیات ہند نے اس کا اندازہ ۲۱۸ (دو سو اٹھارہ!) کروڑ کا کیا ہے [illegible]
[illegible] and Khambata "The wealth + Taxable
Capacity of India تاراپوری والا ۱۹۲۴ء صفحہ ۲۰۳ اور ۲۳۴

بلکہ تمدنی احتیاجات کو پورا کرنے یعنی بقائے حیات ونسل انسانی کے علاوہ کسی قدر چین وآرام ترقی وخوشحالی کے لئے ضروری ہوں ہم تمدنی دولت سے تعبیر کرتے ہیں، مثلاً میز کرسی، پلنگ، سائیکل، سینے کی مشین، ادبی کتابیں، سبق آموز اور مہذب دلچسپ ناولیں، شائستہ اخبار، مفید رسالے وغیرہ۔ تمدنی دولت کو پیدا کرنیوالی محنت کو محنت قسم اوسط کہہ سکتے ہیں۔ سوم:- دولت کی تیسری قسم وہ ہے جو انسان کی حقیقی یا تمدنی احتیاجات وضروریات کو نہیں بلکہ انسان کی نفسانی خواہشات کو پورا کرتی ہو۔ یعنی وہ دولت جو عیش وعشرت، نمود ونمائش اور نفس پرستی کے لئے کام آتی ہو۔ مثلاً تمام مشروبات، تمباکو، سگریٹ، زیورات، سونے چاندی کے برتن محض جنسی جذبات کو مشتعل کرنے والے ناول، مضر اخلاق، فضول، لغو خبریں شائع کرنیوالے اخبار اور رسالے، اس قسم کی دولت آسائشی دولت ہے، اور وہ محنت جس سے عیش وعشرت میں کام آنے والی دولت پیدا کیجاتی ہے اسے ہم محنت قسم ادنیٰ کہتے ہیں۔

ٹھیٹ دولت کے متعلق تو کسی کو زیادہ اعتراض نہیں ہوسکتا کہ اس میں کونسی چیزیں داخل کیجاتی چاہئیں مگر تمدنی دولت اور شاید آسائشی دولت کے متعلق یہ قطعی طور پر فیصلہ نہیں کیا جاسکتا، ساتھ ہی فہم عامہ سے مدد لے کر انسان تمیز وتفریق ضرور کرسکتا ہے مثلاً کسی شخص کے برتن مٹی یا تامچینی کے اور کانٹے چمچے برمن سلور کے ہوں تو ہم بآسانی اسکو تمدنی دولت تصور کرسکتے ہیں۔ اور اگر کسی کے ہاں سونے کے برتن، چاندی کی رکابیاں اور نہایت نفیس خوشنما گلاس اور چمچے ہوں تو اس دولت کو بلاشبہ آسائشی دولت میں شمار کرینگے۔

ٹھیٹ دولت، تمدنی دولت، آسائشی دولت اور محنت قسم اعلیٰ اوسط اور ادنیٰ کا مطلب سمجھ جانیکے بعد ہم اس کے چند کلیے بیان کرتے ہیں، جن کا جاننا بھی ضروری ہے، تاکہ مسئلہ افلاس ہند کا ان سے تعلق بھی ظاہر ہو جائے۔

فرض کیجئے کہ افریقہ کے دو گاؤں ہیں جو ایک دوسرے اور باقی دنیا سے بالکل الگ معاشی زندگی بسر کرتے ہیں۔ پہلے گاؤں میں اگر فرض کیجئے کہ ۱۰۰ میں سے نصف بیکار پڑے

بستے ہیں اور بقیہ نصف میں سے ۳۰ محنت قسم اونیٰ کرنیوالے مثلاً گانے بجانے، ڈھول پیٹنے، مسخرہ پن کرنے والے بھانڈ وغیرہ ہیں اور صرف ۲۰ آدمی ملکر کھیتی باڑی اور مزدوری کام کاج کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس گاؤں کی مادی بہبودی زیادہ نہیں ہوسکے گی کیونکہ تقسیم کار اقسام محنت کے اعتبار سے صحیح نہیں۔ دوسرے گاؤں میں فرض کیجئے کہ سو میں سے صرف پانچ بیکار رہتے ہیں، پانچ کھیل تماشے، نقالی وغیرہ کرتے ہیں، ۱۰ فیصدی آسائشی دولت مثلاً شراب وغیرہ تیار کرتے ہیں اور پندرہ فیصدی تمدنی دولت پیدا کرنے میں مصروف ہیں اور بقیہ ۶۵ ٹھیٹ دولت پیدا کرتے ہیں، تو ہم یہ توقع کرینگے کہ اس گاؤں کی مرفہ الحالی زیادہ ہوگی۔

مثال بالا سے حسب ذیل کلیے اخذ کئے جاسکتے ہیں اور انکی تشریح بھی آسان ہے۔

اقسام دولت ومحنت اور مرفہ الحالی کے اصول

(۱) جس قدر جس ملک میں تقسیم کار کا عمل اقسام محنت کے اعتبار سے صحیح ہوگا اسی قدر اس ملک کی مادی بہبودی مستحکم اور دیرپا ہوگی۔

(۲) جس قدر جس ملک میں محنت قسم اعلیٰ کرنیوالے یعنی ٹھیٹ دولت پیدا کرنے والے زیادہ ہوں گے اسی قدر اس ملک کی مرفہ الحالی زیادہ ہوگی۔

(۳) کسی ملک میں اگر ادنے محنت کرنیوالے حد سے زیادہ ہوں گے تو اُس ملک کی معاشی زندگی دشوار ہوجائیگی۔

تبادلہ مختلف اقسام دولت کا افلاس ہند پر اثر

مسئلہ افلاس ہند کی تحلیل کے لئے مبادلہ دولت کا سوال نہایت ضروری ہے فرض کیجئے کہ دو گاؤں بلکہ معاشی زندگی بسر کرتے ہیں اور بقیہ عالم سے انکے کوئی تعلقات نہیں۔ ایک گاؤں کے لوگ باقاعدہ محنت ومشقت کرکے ضروری سامان مہیا کرتے ہیں، اور دن دن بھر محنت کرکے دولت پیدا کرتے ہیں، اور دوسرے گاؤں سے ہر روز چار چار پانچ پانچ آدمی آکر کھیل تماشے دکھاتے ہیں چند لوگ آکر گانا گاتے ہیں غرضیکہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ خوش کرکے بہت سا غلہ وغیرہ لیجاتے ہیں پہلے گاؤں والے اس طرح روز کھیل تماشے اور گانے بجانے کو پسند تو کرتے نہیں مگر کمزور طبیعت ہونے کی وجہ سے مستقل علاج

[illegible] اور دوسرے گاؤں والے کی [illegible] پورا [illegible] دولت [illegible]
[illegible] اپنی گاؤں [illegible] [illegible]

چونکہ [illegible] نہیں ہو سکتا [illegible] اگر دونوں گاؤں کی معاشی [illegible] کو [illegible]
[illegible] دولت میں تخفیف ہوگی اور دوسرے گاؤں کی دولت میں اضافہ
ہوگا [illegible] محنت قسم اعلیٰ کا تبادلہ محنت قسم ادنیٰ سے ہوا۔ ایک سے دوسرے
گاؤں [illegible] علی الاطلاق استحصال کیا۔

اسی طرح فرض کیجیے کہ دو گاؤں ہیں، اور دونوں میں کاشت بھی ہوتی ہے مصنوعات بھی تیار
ہوتی ہیں۔ ایک گاؤں دوسرے گاؤں کو چاول دیتا ہے اور اسی قدر قیمت کا گیہوں [illegible] اسی
طرح مصنوعات میں بھی تبادلہ ہوتا ہے اور ایک گاؤں کے لوگ دوسرے گاؤں جا کر [illegible]
اور [illegible] ہیں تو دوسرے گاؤں کے لوگ پہلے گاؤں جا کر [illegible]
ہیں۔ اس طرح محنت قسم اعلیٰ کا تبادلہ قسم اعلیٰ سے، محنت قسم وسطیٰ کا قسم وسطیٰ سے، محنت قسم ادنیٰ
کا قسم ادنیٰ سے ہوتا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ اس تبادلہ سے دونوں گاؤں میں کسی کی دولت کم
نہیں ہوئی بلکہ دونوں کو اس اعتبار سے کہ موافق مبادلہ عمل میں آیا۔ فائدہ پہنچا۔

جس طرح ہم نے دو گاؤں اور دو تین چیزیں فرض کر لی تھیں، اسی طرح ہم کئی فریق اور
کئی قسم کی دولت فرض کر لیں تو ہمارے پیش نظر بین الاقوامی کاروبار کا ایک خاکہ ہو جائے گا۔
نتیجہ وہی نکلے گا کہ اقسام دولت کے اعتبار سے تبادلہ اس طرح ہونا چاہیے کہ کیفیت دولت
کے [illegible] کیفیت دولت دی جائے۔ اگر کمتر قسم کی دولت کے [illegible] کیفیت دی جائے گی
تو [illegible] دولت دینے والے کا نقصان ہوگا۔

ان اقسام دولت و محنت کا مفہوم سمجھ لینے اور ان کے تبادلہ کے اثرات سے بخوبی واقف
ہو جانے کے بعد ہمیں ان اصول و قوانین کو حالات پر منطبق کر کے دیکھنا ہے کہ [illegible]
کیا اثر پڑتا ہے۔

[illegible] ہر سال [illegible] ملی چیزیں بھیجتا ہے جس کے معاوضہ میں

[illegible] ہیں کہ حقیقت دولت کیا ہوتی ہے۔ مثلاً

ہر سال لنکا شائر [illegible] سگریٹ وغیرہ ہندوستان آتے ہیں، اور ہر سال ہندوستان [illegible] کا

[illegible] ہمیشہ پاس رہتے ہمارے چند گھنٹے تو لطف دیتے ہیں [illegible] ہیں مگر

[illegible] ہم ہی کو بھگتنا پڑتا ہے۔ کیونکہ ہمارے ہی لوگ قلت غذا کی وجہ سے [illegible] پر مجبور

ہوتے ہیں۔ [illegible] نقطۂ نظر سے اس تبادلے میں ہمیں نقصان ہوتا ہے۔ محض اس وجہ سے کہ اقسام

دولت میں فرق تھا۔ اگر یورپی مشروبات کے معاوضہ میں یہاں سے دیسی شراب جاتی تو ظاہر ہے کہ

ہندوستانی بازار اناج پر اس تبادلہ کا مطلق اثر نہ پڑتا، نہ تو چیزیں گراں ہو جاتیں اور نہ آبادی پر

گرانی کے مضر اثرات پڑتے۔

اسی طرح جب ہندوستانی نواب، راجہ، سیٹھ ساہوکار نمود و نمائش اور عیش و عشرت کے
لئے Rolls Royce موٹریں خریدتے ہیں اور جب ہندوستانیوں کو "خوش" کرنے کے
لئے کروڑہا قیمت کی سینما فلمیں آتی ہیں اور ہزار ہا روپیہ کے ٹھاٹ آتے ہیں تو ہندوستان سے
اسی قدر قیمت کا آسائشی سامان نہیں جاتا بلکہ ہزاروں کپاس کے گٹھے بیرونی ممالک کو روانہ کئے
جاتے ہیں۔ ودیسیوں نے تو کھیل تماشے کر کے نسبتاً تھوڑی محنت و مشقت سے فلمیں تیار کر دیں
مگر ہندوستان کو اس کے معاوضے میں قریب قریب اسی قیمت کی خام پیداوار بھجوانی پڑی، جس
کے لئے زیادہ محنت اور درد سری کرنی پڑتی ہے۔

ان مثالوں سے واضح ہوا کہ اقسام دولت میں اہم فرق ہونے کے باعث جو مبادلہ ہوتا ہے
وہ ہندوستان کے حق میں سراسر مضر ہے۔

یہاں تک تو درآمدی و برآمدی سامان کے تبادلے سے ہندوستان کو جو نقصان پہنچتا ہے
اس کا ذکر تھا۔ اب دیکھنا ہے کہ "مطالبات وطن" کے کیا اثرات پڑتے ہیں۔

مطالبات وطن کے ہندوستانی افلاس پر اثرات

مطالبات وطن سے مراد اس معاوضہ سے ہے جو ہندوستان

انگلستان کو انگریزی اصل اور انگریزوں کے حالیہ یا گذشتہ خدمات کے صلہ میں پیش کرتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ سب کا سب حق بجانب ہے یا نہیں ہمارا نظریہ (جس کو میں امید کرتا ہوں کہ میں نے ثابت کر دیا ہے) حسب ذیل ہے:۔

اگر ٹھیٹ دولت کا تبادلہ ٹھیٹ دولت سے، تمدنی دولت کا تمدنی دولت سے یا آسائشی دولت کا آسائشی دولت سے ہوتا ہے تو فریقین کو کوئی نقصان نہیں بلکہ فائدہ ہوگا۔ اگر جب دولت قسم اعلیٰ کا تبادلہ دولت قسم اوسط یا ادنیٰ سے ہو تو آخر الذکر کو فائدہ اور اول الذکر کو نقصان ہوگا، اور جس قدر زیادہ تبادلہ ٹھیٹ دولت کا آسائشی دولت سے ہوگا اسی قدر نقصان ٹھیٹ دولت دینے والے کو ہوگا۔

ان بدیہات کو تسلیم کر لینے کے بعد غور کر کے دیکھئے کہ افلاس ہند میں کس طرح اضافہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر افواج ہند کو لیجئے:۔ معاشی نقطۂ نظر سے چونکہ امن و امان کا ہونا لازمی ہے اور سرشت بشری کچھ ایسی ہے کہ بغیر فوج و پولیس کے کام نہیں چلتا تو ماننا پڑے گا کہ وہ افواج اور پولیس جو بیرونی اور اندرونی دشمنوں اور بدمعاشوں سے ملک کو محفوظ رکھتے ہیں، ہمارے لئے قطعی ضروری ہیں یعنی یہ کہ وہ لوگ محنت قسم اعلیٰ کرتے ہیں اور اگر ہندوستانی محنت قسم اعلیٰ کر کے ٹھیٹ دولت معاوضہ میں دیں تو کوئی مضائقہ نہیں چونکہ محنت قسم اعلیٰ کے لئے محنت قسم اعلیٰ کی گئی مبادلہ جائز اور فریقین کے لئے مفید ہے۔

برعکس اس کے افواج کا وہ حصہ جو دوسروں کو ڈرانے دھمکانے یا محض شان و شوکت یا رعب داب قائم رکھنے کے لئے، یعنی نفسی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے رکھا جاتا ہے، معاشی نقطۂ نظر سے غیر ضروری ہے۔ پس افواج کا یہ غیر ضروری زائد حصہ (جدید عمرانیاتی تحقیقات کے بموجب) محنت قسم ادنیٰ کرتا ہے۔ مگر ہندوستان اس کے بھی معاوضہ میں ٹھیٹ دولت دیتا ہے۔ پس یہ دولت ہندوستان کی رائگاں جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ افلاس ہند میں اس فوجی پالیسی سے اضافہ ہوتا ہے۔

اب صرف یہ تحقیقات طلب ہے کہ ہندوستانی فوج صرف ہندوستان کی حفاظت کے لئے رکھی گئی ہے یا یہ کہ اُس کا کچھ حصہ جبر و تشدد و نمود و نمائش یا کسی اور مصلحت سے رکھا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس پر رائے دینے کا مجھے کوئی حق نہیں، لہذا میں دوسروں کے اقوال نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

نیم سرکاری طور پر جو برطانوی ممالک کا انسائیکلوپیڈیا مرتب کیا گیا ہے اس میں صاف صاف لکھا ہے کہ " برطانوی حکومت ہند تقریبًا ساڑھے چار لاکھ فوج رکھتی ہے، تاکہ وہ ملک کی حفاظت کرے اور وقت ضرورت برطانوی سلطنت کی فوجی امداد کرسکے[1]" اسی طرح انگلستان کے معروف محقق معاشیات سر رابرٹ گفن کہتے ہیں: " ہندوستانی فوج سے برطانوی اغراض اور عام ضرورتوں کے لئے اکثر کام نکالا جاتا ہے اور صرف ملک کی حفاظت کے لئے اس سے کام نہیں لیا جاتا[2]"

برطانیہ کے موجودہ وزیر اعظم مسٹر ریمزے میکڈانلڈ اپنی کتاب "حکومت ہند" میں لکھتے ہیں کہ " ہندوستانی افواج کا ایک بڑا حصہ (کم سے کم نصف) ایسا ہے جو ہم شہنشاہی ضرورتوں کے لئے استعمال کرتے ہیں، لہذا اُس کے اخراجات کی ادائی برطانوی خزانے سے ہونی چاہئے[3]"

ان مختلف بیانات سے ظاہر ہوگیا کہ ہندوستانی فوج کا کچھ حصہ بیجا طور پر رکھا جا رہا ہے۔ اور یہ معاشی نقطۂ نظر سے بلا سبب ہونیکی وجہ سے ناجائز ہے، اور قومی معاشی نقطۂ نظر سے یہ

I "The Encyclopedia of the British Empire" Published by Rankin, Bristol 1923 Vol II P. 734

II "Economic Inquiries and Studies" مطبوعہ Bell لندن ۱۹۲۳ء جلد دوم صفحہ ۳۰۵

III The Swarthmore مطبوعہ The Government of India Press لندن ۱۹۲۰ء صفحہ ۱۵۶

مزید برآں فوجی اخراجات جو رقم اس سلسلہ میں ہندوستان کو ادا کرنی پڑتی ہے - اس سے ہندوستانیوں کے [illegible] میں بانسبت خالص منافع کا ہوتا ہے اس طرح ثابت ہوا کہ مطالبات یا ہوم چارجز کا اس حصہ کا صرف ہندوستانیوں کی غربت پر خراب اثر پڑتا ہے۔

افواج کے علاوہ انگریزوں کی خدمات انتظامی امور، سیاسی رہبری، عدالتی معاملات اور تعلیمات کے لئے حاصل کئے جاتے ہیں۔

ان خدمات کے متعلق رائے دہی گو کسی قدر دشوار ہے اور شخصی رائے کو بہت دخل ہے مگر پھر بھی ہندوستانیوں کو یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ دو تہائی کام جو عہد برطانیہ میں ہمارے ملک میں انجام پایا وہ اوسط قسم کا تھا، نہروں کے بنانے میں، بعض ریلوں کے افتتاح کرنے میں اور بعض عمارتوں کے تعمیر کرنے میں جو محنت انگریزوں کی صرف ہوئی وہ بلاشبہ محنت قسم اعلیٰ تھی مگر جو انصاف انگریزی ججوں کے ذریعہ ہندوستانیوں کے حق میں کیا جاتا ہے جو معمولی کام، انگریز حکام عہدہ دار، بڑے چھوٹے افسر مختلف یونیورسٹیوں کے علوم فطری و ذہنی کے پروفیسر انجام دیتے ہیں وہ اوسط قسم کا ہوتا ہے جن کی خدمات کا صلہ دہی ٹیٹ دولت کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔

ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک کا حال دیکھئے - امریکہ باوجود اس قدر امیر ہونے کے دوسرے ممالک سے صحیح طور پر تبادلہ کرتا ہے - امریکہ سے دس بارہ پروفیسر ہر سال جرمانیہ یونیورسٹیوں میں [illegible] کا ادبیات و علوم کے متعلق اگر لکچر دینے جاتے ہیں تو ہر سال جرمانیہ سے بھی دس بارہ پروفیسر جرمانی علوم و فنون کے متعلق لکچر دینے امریکہ جاتے ہیں - امریکن طالب جرمانیہ اور جرمانوی طالب امریکہ جاتی ہیں - اسی طرح جرمن کتب امریکہ اور امریکی کتب جرمانیہ بھیجی جاتی ہیں۔ غرضیکہ صحیح اصول پر عمل ہو رہا ہے - جس کی وجہ سے طرفین فائدہ میں رہتے ہیں نہ یہ کہ مثل ہندوستان کے ایک کو فائدہ اور دوسرے کو نقصان ہو۔

بہرطور جدید عمرانیاتی تحقیقات سے یہ بھی ثابت ہوا کہ ہم محنت قسم اعلیٰ کر کے ٹیٹ دولت پیدا کرتے ہیں، مگر اپنی لاعلمی و نادانی سے اس کا تبادلہ تمدنی بلکہ اکثر مجبور توں میں آسائشی دولت سے کر

کرتے ہیں جن سے ہم کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ اور دوسرے ہماری نادانی سے استحصال کرتے ہیں

آخر میں اگر ہم اس مضمون کا لب لباب بیان کرنا چاہیں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جدید معاشیاتی جغرافیائی تحقیقات کے بموجب موافق توازن تجارت سے یہ لازمی طور پر نہیں اخذ کیا جا سکتا کہ ہندوستان کی دولت و مرفہ الحالی میں مطلقاً یا نسبتہ اضافہ ہو رہا ہے۔ ہندوستانیوں کی غربت و بیکسی کا باعث گوناگوں اسباب ہیں جن میں مضر طریق مبادلہ اور مطلق و اضافی اسراف بھی داخل ہیں۔ بیشتر اسباب غربت ہم ہی لوگوں کی بے خبری، لاعلمی و ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ ہیں یہ خصوصیات اعلیٰ تنظیم کی ضد ہیں لہذا اگر ہم ایک مختصر جملہ میں مسئلہ افلاس ہند اور جدید معاشیاتی تحقیقات کا تعلق ظاہر کرنا چاہیں تو صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ "ہندوستان کی غربت کا اصلی سبب ناقص و ناکافی تنظیم ہے" اور اس جملہ میں ہندوستانیوں کی تمام سیاسی سماجی اور معاشی ابتری کا راز مضمر ہے۔

۳

بہائیت

سید علی محمد باب

سید علی محمد جو "باب" کے لقب سے مشہور ہیں جنوبی ایران کے مشہور شہر شیراز میں یکم محرم ۱۲۳۵ھ (مطابق ۲۰ اکتوبر ۱۸۱۹ء) پیدا ہوئے "باب" خاندان سادات میں سے تھے۔ بچپن ہی میں انکے سر سے سایۂ پدری اٹھ گیا۔ اس لئے بچپن میں انکی دیکھ بھال تعلیم و تربیت انکے ماموں نے نہایت توجہ سے کی۔

قدیم رسم کے مطابق انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی جس میں قرآن شریف کا حفظ کرنا ور معمولی حساب و کتاب کا جاننا تھا۔ اُن کے ماموں بوشہر میں رہتے تھے اور تجارت کرتے تھے۔ س لئے باب کو بھی تجارت ہی کا پیشہ اختیار کرنا پڑا۔ جوں جوں انکا سن بڑھتا گیا انکا تورع و تقویٰ بھی روز بروز بڑھتا گیا۔ انکی شرافت، محبت، اخلاق اور خشیۃ اللہ زبان زد عوام تھی۔ باب کے خالف جنہوں نے انہیں ہر قسم کی جانی مالی اور وطنی تکالیف پہنچائیں وہ بھی انکی شرافتِ طبع اور چال لمن پر حملہ نہ کر سکے۔ ہاں البتہ انہوں نے یہ کہا کہ کثرت ریاضت سے اُنکا دماغ چل گیا ہے۔

پچیس برس کی عمر میں یعنی سنہ ۱۲۶۰ھ (مطابق ۱۸۴۴ء) میں انہوں نے "بابیت" کا دعویٰ یا۔ اس وقت ایران کے مختلف حصوں سے بہت سے لوگوں نے انکے دعوائے "بابیت" کی صدیق کی اور باب کے پیرو کہلائے۔ ان لوگوں میں سے اٹھارہ لوگوں کو منتخب کیا اور ایران ے مختلف حصوں میں روحانی حقائق کی تعلیم کے لئے روانہ کیا باب نے ان مبلغین کی روانگی سے بتر انکے سامنے "بابیت" کی مکمل تشریح کردی اور کہا کہ اسکا مقصد یہ ہے کہ میں ایک آسمانی معلم لم کے ظہور کے لئے بطور باب یا مبشر کے ہوں۔ یعنی قدرت کی طرف سے ایک مبشر کی حیثیت سے

بیگانی کو شیاہ کر سکتا ہوں میں نے دنیا سے روحانی معلم کے استقبال کے لئے لوگوں کو تیار کرنے کے لئے آیا ہوں تاکہ تمام لوگ اپنے آپ کو تمام آلائشوں سے پاک و صاف کر سکیں "من یظہرہ اللہ" کی آمد کے منتظر ہیں۔

باب نے اپنے ان شاگردوں کو جنہوں نے انکے پیغام کو ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلایا۔ "حروف حیی" کا لقب دیا۔ اس کے بعد باب حج بیت اللہ کے ارادے سے مع اپنے ایک مرید کے مکہ معظمہ کو روانہ ہوئے انہوں نے ایک لاکھ حاجیوں کے سامنے اپنا دعوے مہدیت پیش کیا اور لوگوں کو ایک آنے والے کی بشارت دی۔ حج کے بعد بوشہر واپس آئے۔ اس عرصہ میں انکے پیرووں نے ایران کے گوشہ گوشہ میں انکی تعلیمات کو پھیلایا اور باب کا نام ہر شخص کی زبان پر جاری تھا۔ ایرانی مجتہدوں نے باب کی سخت مخالفت کی۔ اب یہاں سے باب کی تکالیف اور مصائب کا دور شروع ہوتا ہے۔

باب بوشہر سے شیراز گئے جہاں مجتہدین انکے ساتھ نہایت سختی سے پیش آئے اور حکومت کی طرف سے بھی نہایت سختی سے نگرانی کی جانے لگی اور اپنے گھر میں نظر بند کئے گئے۔ یہاں تک کہ تمام بیرونی دنیا سے انکے تعلقات منقطع کئے گئے تاہم انکے شیدائی ان تک پہنچنے کی کوشش کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ باب کی تعلیمات کا سلسلہ وسیع ہوگیا چنانچہ ان کے پیرووں میں ہر قسم کے لوگ شامل ہو چکے تھے جن میں امیر، غریب، علما، فضلا اور شعرا سب ہی قسم کے لوگ شامل تھے۔ باوجود سخت مخالفت اور رکاوٹ کے لوگ باب کے پاس آتے اور اظہار عقیدت کرتے تھے۔ دنیا کی مخالفت انکی ہمت اور استقلال کے سامنے پرکاہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ صبر و استقلال اور ہمت انکے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔ دنیا کی کوئی طاقت انکے ارادے میں حائل نہیں ہو سکتی تھی۔

باب نے دوسرا سفر اصفہان کی طرف کیا جہاں انکے پیرووں کی کافی تعداد ہو چکی تھی وہاں کے گورنر نے باب کا استقبال نہایت شاندار طریقہ پر کیا اور ان کی دعوت کو لبیک کہا۔ مختلف

طریق سے اظہار عقیدت کیا۔ اور اس نے باب کے قیام کے لئے ہر طرح کی آسانیاں بہم پہنچائیں اور عوام الناس کو انکے پاس آنیکا موقع دیا۔

ان واقعات سے صفاہانی مجتہدین کے غصہ کو بڑھا دیا۔ یہانتک کہ وہ انکے قتل کے لئے تیار ہوگئے۔ مجبوراً گورنر نے باب کو حکومت ہی کے مکان میں پوشیدہ رکھا مگر چند دنوں کے بعد اس گورنر کا انتقال ہوگیا۔ لوگوں کو باب کے قیام گاہ کا علم ہوگیا۔ اور ایران کی مرکزی حکومت کی طرف سے انکی گرفتاری کا حکمنامہ صادر ہو چکا تھا۔ کہ انکو طہران روانہ کیا جائے، باب نہایت سخت نگرانی میں دارالسلطنت کی طرف روانہ کئے گئے راستہ میں جو شہر اور گاؤں پڑتے تھے لوگ جوق در جوق جمع ہو جاتے تھے اور باب کا پیغام سنتے تھے۔ یہاں تک کہ پہرہ داروں نے بھی انکے دعوے بابیت کی تصدیق کی۔ اور بابی بن گئے۔

حکومت بابی تحریک کی روز افزوں ترقی دیکھ کر ڈری اور خیال کیا کہ ایسا نہ ہو کہ علمائے طہران برافروختہ ہو کر بلوہ کر دیں چنانچہ باب کو ایران کے ایک قلعہ ماکو نامی میں قید کر دیا اس سفر کی وجہ سے باب کی شہرت اور تعلیم لوگوں کے دلوں میں بیٹھ گئی۔

باب کے متبعین میں ایک مشہور شاعرہ اور خطیبہ عورت قرۃ العین نامی بھی تھیں جو علمی فضیلت اور خداداد قابلیت، عزم و استقلال اور دین کی محبت میں شہرۂ آفاق تھیں۔ اس خاتون نے دور ابتلاء وفتن میں نہایت جوش سے اس نئے دین کو پھیلایا۔ آخرالامر انہیں گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا۔

جب حکومت نے دیکھا کہ تعلیمات تمام قلمرو میں نہایت سرعت کے ساتھ پھیل رہی ہیں تو اس نے باب کو ماکو سے منتقل کر کے چہریق میں مقید کر دیا اور مجتہدین ایران نے عوام الناس اور حکومت کو باب کے خلاف اکسایا۔

بالآخر یہ طے ہوا کہ مجمع عام میں تحقیق کیجائے اس مقصد کے لئے ایک مجلس منعقد ہوئی جس میں باب کو چہریق سے بلایا گیا۔ بجائے بحث و مباحثہ اور تحقیق و تفتیش کے باب کی تذلیل کی گئی

بعد ازیں باب کو عوام الناس کے سامنے کوڑے لگوائے گئے اور پھر چہریق میں دوبارہ قید کر دیا گیا۔ اب وہ زمانہ شروع ہوتا ہے جبکہ بابیوں کا قتل عام ہونے لگا۔ مجتہدین نے انکے مال اور خون کو عوام الناس کیلئے حلال کر دیا۔ بابی ہونا ہی جرم کے لئے کافی تھا۔ نہایت بے دردی اور سنگدلی کے ساتھ بابی بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کو قتل کیا گیا اور انکے مکانوں کو جلایا گیا۔ ان واقعات کی تفصیل نہایت درد انگیز ہے۔ جگہ جگہ بابیوں پر ظلم حملے کئے گئے اگرچہ بابیوں نے بھی کسی کسی جگہ مدافعانہ مقابلہ کیا لیکن ٹڈی دل کے مقابلہ میں قتل ہو گئے۔ مگر یہ مظالم بجائے رکاوٹ کے تحریک بابیت کی ترقی کا باعث ہوئے۔

آخرالامر صدر اعظم ایران نے بابی تحریک کی روز افزوں ترقی دیکھکر باب کے قتل کا حکم صادر کیا صدر اعظم کا یہ خیال تھا کہ یہ معاملہ اسی طرح ختم ہو جائے گا مگر اس کے برخلاف ہوا۔ باب چہریق سے صوبہ کے صدر مقام تبریز میں لائے گئے۔ اور وہیں ۹ر جولائی ۱۸۵۰ء میں شہید کر دئے گئے۔

یہ واقعہ اس طریقہ سے بیان کیا گیا ہے کہ انکو مع انکے ایک فدائی کے قتل گاہ میں لایا گیا اور دونوں کو ایک دیوار کے ساتھ رسی سے جکڑا گیا۔ اور فوج کے ایک دستہ نے اُن پر گولیاں چلائیں گولی چلی اور دھوئیں کے چھٹ جانے کے بعد حاضرین کو یہ دیکھ کر حیرت اور استعجاب ہوا کہ باب مع فدائی کے نہایت اطمینان اور تبسم کے ساتھ گفتگو میں مشغول ہیں اور تمام رسیاں جل چکی ہیں۔ گولی چلانے والے سپاہیوں نے دوبارہ گولی چلانے سے انکار کر دیا تب افسر نے دوبارہ دوسرے سپاہیوں کو گولی چلانے کا حکم دیا چنانچہ اب گولیاں کاری تھیں اور چہرہ کے سوا تمام جسم گولیوں سے چھلنی ہو گیا۔ اور باب اور انکے فدائی نے ہمیشہ کے لئے دنیا کو خیرباد کہا۔

حکومت کی طرف سے باب کی نعش کی نہایت سختی سے نگرانی کی گئی مگر انکے شیدائی لاش کو نہایت جرأت اور دلیری سے اٹھا کر لے گئے اور مختلف اوقات میں مختلف جگہوں پر منتقل کرتے رہے۔ یہانتک کہ ۱۹۰۹ء میں تمام دنیا کے بہائی زائرین کے سامنے باب کے جسم کو عبدالبہاء نے کوہ کرمل (علاقہ شام) میں دفن کیا۔

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ باب نے بالکل ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی لیکن ان کی علمی قابلیت کے سامنے بڑے بڑے مجتہد نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ باب نہایت تیز لکھنے والے تھے۔ چند گھنٹوں میں انہوں نے بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھ ڈالیں۔ باب نے اپنی قید و بند کے زمانہ میں چند الواح اور توقیعات تحریر کیں تھیں جن کا مضمون زیادہ تر "من یظہرہ اللہ" کی بشارت ہے۔ ان الواح اور توقیعات میں باب نے اپنے پیرووں کو نہایت تاکید اور تکرار کے ساتھ حکم دیا ہے کہ جب "من یظہرہ اللہ" ظاہر ہو۔ تم لوگ اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔

بیان باب کی مشہور تصنیفات میں سے ہے جو فارسی اور عربی دونوں میں الگ ہے اسمیں قرآن مجید کے سربستہ اسرار کو ظاہر کیا گیا ہے۔ خاصکر قیامت و حشر اور دیدار خدا کی نسبت مفصل بیانات ہیں۔ ایک کتاب قیوم الاسماء اور "تفسیر سورہ یوسف" بھی اسی سلسلہ کی ایک مشہور کتاب ہے۔

بہاء اللہ

میرزا حسین علی نوری جو بہاء اللہ کے نام سے مشہور و معروف ہیں۔ ماہ نومبر ۱۸۱۷ء طہران پایہ تخت ایران میں پیدا ہوئے۔ انکا خاندان تمام ایران میں شریف و نجیب اور متمول خیال کیا جاتا تھا۔ بہاء اللہ کے والد اور دوسرے رشتہ دار حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر مامور تھے۔ والد کے انتقال کے بعد بہاء اللہ نے خاندان کی نگرانی اپنے ذمہ لی اور تمام جائداد کی دیکھ بھال اور اپنے چھوٹے بھائیوں اور بہنوں کی تعلیم و تربیت میں مصروف رہتے تھے۔ بچپن ہی سے بہاء اللہ اپنے حسن اخلاق اور ذہانت کی وجہ سے مشہور تھے۔

بہاء اللہ اگرچہ معمولی لکھے پڑھے آدمی تھے مگر انکی علمی قابلیت اور فضیلت شہرۂ آفاق تھی۔ جس وقت باب نے "بابیت" کا اعلان کیا اور شیراز سے اپنے شاگردوں کو ملک کے اطراف و اکناف میں روانہ کیا اس وقت بہاء اللہ کی عمر ۲۷ برس کی تھی اور طہران میں مقیم تھے۔ جوں ہی باب کی

خبر طہران میں پہنچی بہاء اللہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اس کی تصدیق کی اور "بابیت" کی نشر و اشاعت کے لئے ہمت و استقلال سے کھڑے ہوگئے اپنے قصبہ نور اور اس کے گرد و نواح میں بابیت کی اشاعت کرتے رہے۔

یہ معلوم ہونا چاہئے کہ باب اور بہاء اللہ کا آپس میں کوئی خاندانی تعلق نہ تھا کیونکہ باب عربی النسل تھے اور بہاء اللہ خالص ایرانی النسل۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہو کہ دونوں کی کبھی ملاقات بھی نہیں ہوئی۔ لیکن دونوں کا قلبًا، روحًا اور خیالًا ایک زبردست تعلق تھا باب کے قتل تک دونوں کے درمیان خط و کتابت جاری تھی۔

جب باب کو معلوم ہوا کہ تبریز کی طرف منتقل کئے جا رہے ہیں اور قتل کی سزا ملنے والی ہو تو اس وقت انہوں نے اپنے مخلص پیرو کے ذریعہ تمام نوشتجات، قلمدان اور مہر ایک صندوقچہ میں بند کرکے بہاء اللہ کو پہنچا دی۔ بہاء اللہ اگرچہ باب کے زبردست حامیوں اور مددگاروں میں سب سے زیادہ مشہور تھے۔ مگر یہ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ یہی شخص آنے والا معلم روحانی ہو۔ باب کے قتل کے بعد بابیوں پر مصائب و آلام کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک نوجوان بابی جو باب کی تعلیمات سے بالکل بے خبر تھا اپنے احباب کے مصائب دیکھکر متاثر ہوا اور جوش مذہبی کی وجہ سے اس سے آپے میں نہ رہا گیا اور اپنے ہم مذہبوں کی بہتر حالت بنانے کے لئے اس نے شاہ ایران پر حملہ کیا۔ یہ شخص مجرم تھا گرفتار ہوا اور وہیں درباریوں کے ہاتھوں قتل کیا گیا۔ مگر وزرائے حکومت نے بغیر تحقیق و تفتیش کے اس جرم کو تمام بابی جماعت کی طرف منسوب کیا۔ کتنے بے گناہ بابی قتل کئے گئے کتنے بچے یتیم کئے گئے کتنی عورتیں بیوہ کی گئیں۔ صرف یہ خیال ہی ثبوت جرم کے لئے کافی تھا کہ اگر کوئی شخص یہ شبہ کرے کہ فلاں شخص بابی ہو تو اسکی سزا دار کا تختہ تھی۔ اسی بابی عوام الناس میں تقسیم کئے گئے جن کو طرح طرح کی تکلیفیں دیکر قتل کیا گیا۔

نمونہ کے طور پر چند واقعات ان بابیوں کے یہاں نقل کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے ہنستے

ہوئے اپنی جانیں اپنے محبوب کے اشتیاق میں دیں اور مستانہ اداؤں سے اپنے جلادوں اور قاتلوں کے لئے باعث عبرت اور تحیر بنے۔ ایک بابی کو جلاد نے گردن مارنے کی ضرب لگائی۔ اسکا سبز عمامہ سر سے گر گیا اس بوڑھے بابی نے عمامہ کو اٹھایا اور یہ کہتے ہوئے اپنے سر پر رکھ لیا۔

اے خوش آں عاشق سرمست کہ در پائے حبیب　　سر و دستار نداند کہ کدام اندا زد

ایک دوسرے بابی کو جلاد قتل گاہ کی طرف پا بزنجیر لیجا رہے تھے اور وہ جلادوں کو مصری کی ڈلیاں بانٹتا جارہا تھا اور کہتا تھا کہ تمہارے ذریعہ آج مجھکو بڑی عزت ملنے والی ہے اس کی خوشی میں تمہارا منہ میٹھا کرنا چاہتا ہوں۔

ایک نوجوان بابی حاجی سلیمان نامی کے بدن میں لوگ زخم کر کے جلتی ہوئی موم بتیاں ٹھونستے جاتے تھے اور شہر کا گشت لگوا رہے تھے وہ ہنستا بولتا اور خوش ہوتا چلا جارہا تھا اور گیت گا رہا تھا جس کا پہلا شعر یہ تھا ؎

بازآمدم بازآمدم از راہ شیراز آمدم　　با عشوہ و ناز آمدم ہذا جنون العاشق

اگرچہ بابیوں پر تمام دنیا کی مصائب و ابتلا ڈالی گئیں مگر وہ اس قدر ثابت قدم رہے کہ ایک انچ بھی نہ ہٹے تمام بلیات اور مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کیا ایک یوروپین سیاح ان واقعات کے مشاہدہ کرنے کے بعد لکھتا ہو کہ "جب مورخ ایران کی تاریخ لکھے گا تو ان واقعات کو نہایت جلی حرفوں میں لکھے گا"

اس مصائب و آلام کے زمانے میں بہاء اللہ اپنی عجیب و غریب شجاعت کے ساتھ دست با مظلولوں کی امداد کے لئے آگے بڑھے۔ حکومت نے چار سال تک بہاء اللہ کو نہایت سخت قید و محن میں بند رکھا جب تحقیق ہوئی اور یہ بات ثابت ہوئی کہ بابیوں کا دامن سازش سے بالکل پاک ہو تو بہاء اللہ حکومت ایران اور ترکی کی باہمی مفاہمت سے ایشیائی ترکی کے شہر بغداد میں جلاوطن کئے گئے۔ اس کی وجہ یہ خیال کی گئی کہ بہاء اللہ کا تعلق بابیوں سے منقطع رہے گا۔

اور یہ لوگ انکی رہنمائی سے محروم رہیں گے۔

چنانچہ بارہ برس کے قریب بہاء اللہ بغداد میں نظر بند رہے اسی زمانہ میں انکا ایک رشتہ دار سفیر بغداد ہوکر آیا اور اسکے خلاف ایک سازش میں ساتھ دیا اور حکومت ایران کو شکایت لکھی کہ "بہاء اللہ کا بغداد میں رہنا ایران کے مومنین کے لئے اچھا نہیں ہے کیونکہ بہت سے ایرانی باشندے عتبات عالیہ کی زیارت کو جاتے ہوئے بغداد سے گذرتے ہیں اور بعض بابیوں سے ملکر بابی ہوجاتے ہیں" چنانچہ سفیر کی یہ کوشش کامیاب ہوئی۔ حکومت ایران نے حکومت عثمانیہ کو درخواست کی کہ بہاء اللہ کو بغداد سے ہٹائے۔ سلطان عبدالعزیز نے سب کو قسطنطنیہ بلایا اور پانچ ماہ تک وہاں نظر بند رکھا۔ اور اس کے بعد ادرنہ (ایڈریانوپل) بھیجدیا۔ جہاں وہ ایک عرصہ تک مصائب و آلام میں گرفتار رہے۔ ایڈریانوپل میں بہاء اللہ نے اعلان کیا کہ جس شخص کی بشارت باب نے دی اور جس کی راہ میں انہوں نے اپنی جان قربان کی تھی وہ میں ہوں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے آپ کو من یظہرہ اللہ کہا۔ سب لوگوں نے انکے دعوے کو سچا مانا مگر ایک شخص جو صبح ازل کے نام سے مشہور تھا اس نے انکار کیا اور آخر وقت تک بہاء اللہ کے دعوے کو نہ مانا۔

اس کے بعد بہاء اللہ نے سب سے پہلا یہ کام کیا کہ دنیا کے تمام بادشاہوں اور حکمرانوں کے نام خط لکھے۔ ان خطوط میں سے جو خط شاہ ایران کے نام تھا اور جس کو ایک شخص بدیع نامی شاہ ایران کے پاس لے گیا اس خط کے آخری الفاظ یہ ہیں۔

"خدا کی قسم! اگر دکھ درد کے صدمے مجھے کمزور بنا دیں بھوک اور پیاس کی تکلیفیں مجھے ہلاک کر دیں۔ سخت پتھر میرا بستر بنا دیا جائے اور جنگل کے جانور اور درندے میرے مونس و ہمدم کردئے جائیں تو میں مطلق فریاد و زاری نہ کروں گا۔ خدا کی مدد سے جو ازل کا مالک اور قوموں کا پروردگار ہے ویسا ہی صبر کروں گا جیسا کہ دوراندیش اور اپنے ارادے پر ثابت قدم رہنے والوں نے کیا ہے۔ میں ہر حالت میں خدا کا شکر ادا کروں گا ۔ ۔ ۔ ۔

آخر میں اس جملہ پر یہ خط ختم ہوتا ہے "کہ ہمیشہ بلا و مصائب کی موجودگی میں خدا کا حکم جاری

ہوا ہے۔ یہی خدا کی سنت ہے جو اگلے وقتوں سے اسی طرح جاری ہے۔"

خط لانے والا یعنی بدیع شاہ ایران کے حکم سے طرح طرح کے دکھ دینے کے بعد مار دیا گیا۔ تین سال تک بہاراللہ اپنے متبعین کے ساتھ ایڈریانوپل میں نظربند رہے۔ تکالیف و مصائب میں بجائے کمی کے اور اضافہ ہوا اب دشمنوں نے بہاراللہ کے خلاف مختلف الزام لگائے آخر میں سلطان نے تنگ آکر بہاراللہ اور اس کے ساتھیوں کو مختلف مقامات پر جدا جدا قید کر کے بھیجنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ سب لوگوں کو صدمہ ہوا بہاراللہ کے بڑے بیٹے عبدالبہا عباس آفندی نے اس حکم کو منسوخ کرانیکا ارادہ کر لیا ایک ہفتہ کی محنت کے بعد عبدالبہا عباس آفندی اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ اس اثناء میں غلطی سے کسی نے بہاراللہ کے ایک فدائی کو خبر دی کہ حکم ابھی تک منسوخ نہیں ہوا ہے۔ اس نے اپنا گلا کاٹ لیا اور کہا کہ اگر اس دنیا میں ہم اپنے محبوب کے ساتھ نہیں رہ سکتے ہیں تو دوسری دنیا میں جا کر انتظار کریں گے لیکن زخم کاری نہ تھا خود بہاراللہ نے اس کو بچا لیا۔

اب حکومت ترکیہ نے بہاراللہ کو ایڈریانوپل سے جلاوطن کر کے عکہ (جو شام میں ہے) بھیجنے کا حکم صادر کیا۔ بہاراللہ اور انکے ساتھی سب اکٹھے روانہ ہوئے ابھی تک ان لوگوں کے دلوں میں یہ خیال موجود تھا کہ مبادا حکومت انکو مختلف مقامات پر جداجدا قید کر کے روانہ کرے۔ ہمراہی افسر بھی انکے دلوں میں اس خیال کو تازہ کر رہے تھے۔ راستہ میں جہاں جہاں جہاز بدلتا تھا سب لوگ ایک ہی کشتی میں سوار ہوتے تھے اس خیال سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک دوسرے سے جدا کئے جائیں چنانچہ ایک فدائی نے جسے دوسری کشتی میں بٹھا کر جدا کرنا چاہتے تھے اس نے سمندر میں کود کر اپنے آپ کو عمیق موجوں کے حوالہ کیا ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ بہاراللہ کے فدائی اس سے کس قدر محبت و عقیدت رکھتے تھے۔

۱۸۶۸ء میں بہاراللہ شہر عکہ میں نظربند کی حیثیت سے لائے گئے اور انکے ساتھ ۷۰ فدائی تھے جو ایران اور مختلف ملکوں کے بڑے بڑے لوگ تھے جو اپنی عیش و عشرت کو خیرباد کہہ کر

ہمیشہ کے لئے بہاء اللہ کے ساتھ رہنا اپنی خوش نصیبی خیال کرتے تھے۔

۱۸۶۸ء سے لیکر ۱۸۹۲ء تک بہاء اللہ عکہ میں نظر بند رہے اور پچہتر سال کی عمر میں چار سال کی سخت قید اور چالیس سال کی متواتر نظر بندی کے بعد عکہ سے ایک میل کے فاصلہ پر باغ بجی میں رحلت کی اور اپنا کام اپنے بیٹے عبد البہاء عباس آفندی کے سپرد کیا۔

بہاء اللہ کی شخصیت کے متعلق مشہور مستشرق پروفیسر براؤن اپنی رائے ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے :۔

"میرا رہنما ایک پردہ کے قریب تھوڑی دیر ٹھہرا۔ یہانتک کہ میں نے اپنے بوٹ اتار اس کے بعد میں پردہ اٹھا کر ایک وسیع کمرہ میں داخل ہوا۔ میرے سامنے ایک مسند تھا اور دروازہ کے قریب دو تین کرسیاں رکھی تھیں مجھے کچھ یونہی سا خیال پیدا ہوا کہ کہاں لیجایا جا رہا ہوں اور کس سے ملاقات کرنے والا ہوں۔

دو تین سکینڈ گذرے ہوں گے کہ رعب اور تعجب سے میرا دل دھڑکنے لگا کیونکہ وہ کمرہ خالی نہ تھا مگر وہاں مسند پر ایک صاحب وقار اور محترم بزرگ کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ ایک ٹوپی جو درویشوں کے تاج کی طرح تھی بلکہ اس سے ذرا اونچی انکے سر پر تھی اور اس تاج کے گرد ایک سفید چھوٹا سا عمامہ لپٹا ہوا تھا۔ اس چہرہ کو جس پر میری نظر پڑ رہی تھی کبھی نہیں بھول سکتا ہوں اگرچہ اسکا بیان کرنا میری قوت سے باہر ہے چمکتی ہوئی آنکھیں جو انسان کی روح کو دیکھتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں کشادہ پیشانی جس سے جلال و بزرگی ہویدا تھی۔ پیشانی اور چہرہ کی جھریاں جو کبرسنی کا اظہار کر رہی تھیں۔ انکے سیاہ بال اور سیاہ داڑھی اس کی تردید کر رہے تھے یہ بات بتلانے کی ضرورت نہیں کہ میں کس کے حضور میں کھڑا تھا۔ تقدیم مراسم تعظیم کے لئے اس کے سامنے جھک گیا جس کی ایسی محبت کیجاتی ہے کہ اولو العزم شہنشاہ رشک کرتے ہیں۔

ایک ملائم مگر پر رعب آواز نے مجھے بیٹھنے کا حکم فرمایا۔" الحمد للہ تم فائز ہوئے۔ تم ایک

قیدی، جلاوطن سے ملنے کے لئے آئے ہو۔" اس کے بعد یوں اپنے ارشاد کو جاری کیا۔ "ہم لوگ بجز اصلاح عالم کے کچھ نہیں چاہتے ہیں مگر ہم لوگوں سے مفسدوں کا سا سلوک کیا جاتا ہے ہم چاہتے ہیں کہ تمام قومیں متحد ہو جائیں۔ تمام انسان بھائی بھائی بن جائیں۔ انسانوں میں محبت و اخوت کا رشتہ مضبوط ہو جائے مذہبی اور قومی تنازعات انکے درمیان سے اٹھ جائیں۔ ان باتوں میں کیا عیب ہے! یہ تمام جھگڑے اور تباہ کن لڑائیاں برطرف ہو جائے گیں۔ انکے بجائے صلح اکبر قائم ہو گی۔"

عبدالبہا عباس آفندی

عبدالبہا عباس آفندی ۱۸۴۴ء مئی کی اسی جمعرات کو پیدا ہوئے جس جمعہ کو باب نے "بابیت" کا دعوے کیا تھا۔ عبدالبہا کی زندگی کا آٹھواں سال تھا کہ جسمانی آرام کا زمانہ ختم ہو گیا انکے والد بہاء اللہ طہران میں قید کر دئے گئے اور اس کے بعد تمام موروثی جائداد منقولہ و غیر منقولہ ضبط ہو گئی اور جو بچی کھچی تھی وہ بھی لٹ گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ باب تازہ قتل کئے گئے تھے اور بابیوں کے خلاف ایران میں ایک محشر بپا تھا۔ اگر کوئی جھوٹ موٹ بھی بابی مشہور ہو جاتا تو جان کی خیر نہ تھی تمام بابی مخفی طور پر زندگی گذارتے تھے۔ رات کو تہ خانوں میں بغیر چراغ اندھیرے میں ایک دوسرے سے ملاقات کرتے تھے۔

غرض عبدالبہا بھی کمسنی میں ان مصائب میں گرفتار ہوئے اپنے باپ کے ساتھ بغداد میں جلاوطنی اختیار کی مصائب و تکالیف میں باوجود کمسنی اپنے باپ کے دست و بازو بنے۔ عبدالبہا نے کسی کالج یا مدرسہ میں بالکل تعلیم نہیں پائی تھی کیونکہ موقع ہی نہیں ملا تھا۔ ہاں البتہ کچھ ابتدائی تعلیم اپنے باپ یعنی بہاء اللہ سے حاصل کی تھی۔ باوجود کمی تعلیم کے بغداد کے بڑے بڑے علما انکے تبحر علمی سے متحیر تھے۔ ایک مرتبہ ایک صوفی علی شوکت پاشا نامی نے بہاء اللہ سے اس حدیث کا مطلب پوچھا "کنت کنزاً مخفیاً" بہاء اللہ نے عباس آفندی کی طرف اشارہ کیا اور اس کے لکھنے

کا حکم دیا۔ عبدالبہا عباس آفندی اس وقت پندرہ سولہ برس کے تھے۔ ایک رسالہ مندرجہ بالا حدیث کی تفسیر میں لکھا۔ اس رسالہ نے صوفی مذکور کو ورطۂ حیرت میں ڈالدیا۔ یہ رسالہ علمی دنیا میں کافی شہرت رکھتا ہے۔ اور اسکا نام "شرح کنت کنزاً مخفیاً" ہے۔ عبدالبہا اپنی نوجوانی میں اپنے اوقات کا ایک بہت بڑا حصہ غربا کی خدمت، بیماروں کی تیمارداری اور جاہلوں کی تعلیم میں صرف کرتے تھے۔ دوران نظر بندی ایڈریانوپل میں عبدالبہا کی ہردلعزیزی مشہور تھی۔ عوام الناس ان کو "سرکار آغا" کے لقب سے پکارتے تھے۔ عکہ میں جب عبدالبہا اپنے باپ کے ساتھ نظر بند تھے۔ اس وقت بیماروں اور ناداروں کی خدمت کرنا انکا سب سے بڑا مشغلہ تھا۔ بیماروں کو خود اپنے ہاتھوں سے نہلاتے اور خود کھانا تیار کرکے ضعیفوں اور ناداروں کو کھلاتے تھے۔ چنانچہ ہر شخص عبدالبہا سے محبت کرنے لگا۔ اور عکہ میں "حامی الغربا والمساکین" کے لقب سے مشہور ہوئے۔

بہاراللہ کے انتقال کے بعد عبدالبہا نے تمام کام اپنے ذمے لیا۔ اور بڑی شدومد کے ساتھ "بہائیت" کی نشر واشاعت کی کوشش کی۔ عبدالبہا نے اپنے باپ کی ہدایت کے مطابق کوہ کرمل کے ایک پہلو میں ایک عمارت بنوا رہے تھے۔ جس میں باب کا مقبرہ اور کچھ کمرے عبادات اور مجلس روحانی کے انعقاد کی غرض سے بنائے گئے تھے۔

دشمنوں نے عبدالبہا کے خلاف حکومت سے شکایت کی کہ یہ شخص ایک قلعہ اس مقصد سے تعمیر کرا رہا ہے کہ حکومت کے خلاف لڑے اور ملک شام پر قبضہ کرے۔

چنانچہ ترکی حکومت نے عبدالبہا اور اس کے متبعین کو عکہ کی فصیل میں نظر بند کر دیا۔ یہ صرف عکہ کے اردگرد چند میل تک آجا سکتے تھے۔ سات سال تک عبدالبہا اسی نظر بندی کی حالت میں رہے مگر مذہب بہائی کی اشاعت باوجود اس رکاوٹ کے نہ رک سکی۔ امریکہ اور یورپ سے لوگ آتے تھے اور ہدایات لیکر پھر اپنے کام میں مشغول ہو جاتے تھے

سنہ۱۹۰۴ء اور سنہ۱۹۰۷ء میں حکومت ترکیہ کی طرف سے ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر ہوا تاکہ وہ ان الزامات کی تحقیق کرے جو عبدالبہا کے خلاف لگائے گئے تھے۔ عبدالبہا نے نہایت خندہ پیشانی سے ان الزامات

کی تردید کرتے ہوئے ہر اس حکم کو جو کمیشن انپر لگانا چاہتا تھا قبول کیا۔

اسی اثنا میں اٹلی کے قنصل نے متعدد بار عبدالبہا سے درخواست کی کہ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کے لئے جہاز بہم پہنچا سکتا ہوں اور جہاں چاہیں وہاں پہنچا دوں۔

مگر عبدالبہا نے کہا کہ میں صبر و استقلال کے ساتھ ان تمام مصائب اور مشکلات کا مقابلہ کروں گا جو مجھ پر ڈالی جائیں گی۔ اور بہاء اللہ کے واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ باپ نہیں بھاگا بیٹا بھی نہیں بھاگے گا۔

۱۹۰۸ء میں کمیشن نے اپنا کام ختم کیا قسطنطنیہ واپس گیا۔ اور باب عالی کے سامنے کمیشن نے اپنی رپورٹ پیش کی۔ عام طور پر یہ خیال کیا جانے لگا کہ عبدالبہا کو یا تو جلاوطن کیا جائے گا یا سولی دیدی جائے گی۔ مگر عجیب اتفاق ہوا کہ ٹرکی میں انقلاب واقع ہو گیا اور نوجوان ترکوں نے تمام مذہبی قیدیوں کو رہائی دیدی۔ ۱۹۰۸ء میں عبدالبہا کو جبکہ انکی عمر چونسٹھ سال تھی قید سے آزادی ملی۔ چنانچہ فوراً انکو یورپ اور امریکہ سے دعوتیں آئیں۔

۱۹۱۱ء میں عبدالبہا مغربی دنیا کے پہلے سفر پر روانہ ہوئے۔ اس سفر میں عبدالبہا کو ہر خیال کے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اسی سال ستمبر میں عبدالبہا لندن پہنچے ایک ماہ تک وہاں قیام کیا۔ انگلستان کے پریس نے بہائی مذہب پر مضامین شائع کئے اور عبدالبہا کی تصویر شائع کی۔

اس عرصے میں عبدالبہا نے بڑے بڑے مجمعوں کے سامنے لکچر دئے۔ جو بڑے زبردست فصیح و بلیغ ہیں اور جدید فارسی لٹریچر میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے بعد عبدالبہا فرانس پہنچے وہاں بڑے بڑے مجمعوں کے سامنے موجودہ ضروریات و مسائل پر خطبے دئے جس سے تمام فرنچ پریس گونج اٹھا۔ اس سفر کے بعد عبدالبہا مصر واپس آئے کچھ دن مصر میں آرام کیا۔ اس کے بعد لاتعداد ریاستہائے متحدہ امریکہ سے پرزور دعوت نامے آئے۔ چنانچہ اپریل ۱۹۱۲ء میں عبدالبہا امریکہ کے سفر پر روانہ ہوئے۔ امریکہ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک

سفر کیا۔ ہر قسم کے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ بڑے بڑے پروفیسروں، پادریوں اور لامذہبوں سے ملاقاتیں ہوئیں اور تمام یونیورسٹیوں میں لکچر دئے اور سب لوگوں کو صلح اور آشتی کا پیغام دیا اور امتیازات نسلی کے مٹانے کے لئے اپیل کی۔ مرد اور عورت کو برابر حقوق دینے پر زور دیا۔ امریکہ سے واپسی میں عبدالبہا پھر انگلستان گئے جہاں چھ ماہ تک قیام رہا۔ اسی اثنا میں لورپول، لندن اور اڈنبرا میں شہرہ آفاق لکچر دئے جو بہائی لٹریچر میں خاص حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے بعد جرمنی اسٹریا ہوتے ہوئے مصر میں اپنے اس تبلیغی سفر کو ختم کیا۔

ستمبر ۱۹۱۳ء میں عبدالبہا حیفا (علاقہ شام) میں واپس آ گئے۔ یورپ اور امریکہ کے طویل سفر نے عبدالبہا کے جسمانی قوٰے کو کمزور بنا دیا چنانچہ اس زمانے میں عبدالبہا نے چند الواح لکھی ہیں جس میں اپنے متبعین کو بہائی ازم کے پھیلانے کی دعوت دیتے ہیں جن میں سے ایک لوح کا مختصر اقتباس پیش کرتا ہوں وھو ہذا۔

"اے دوستو! وقت آ رہا ہے کہ میں تمہارے ساتھ نہ ہوں گا جو کچھ مجھ سے ہو سکتا تھا میں کر چکا۔ امر بہائی کی میں نے استعداد بھر خدمت کی۔ اپنی زندگی میں دن رات اس کی خدمت میں مشغول رہا ہوں۔"

عبدالبہا نے اپنی زندگی کے بقیہ دن حیفا میں گذارے۔ زیادہ وقت بہائیوں کی تنظیمی اور تعلیمی اسکیموں کے تیار کرنے پر صرف کیا چنانچہ تنظیمی ترتیب کا ایک خاکہ یہ ہے۔

۱۔ ولیّ امر اللہ یعنی ایک واحد قومی سردار کا انتخاب۔

۲۔ ایادی امر اللہ یعنی مبلغین دین کا نظام مرتب کرنا۔

۳۔ محافل روحانی۔ مقامی اور بین الاقوامی کا قیام۔

۲۸ نومبر ۱۹۲۱ء کو عبدالبہا نے نہایت اطمینان و سکون کی حالت میں حیفا میں انتقال کیا اور اپنے پیچھے ایک کارکن جماعت چھوڑی۔

شوقی آفندی ولی امراللہ

عبدالبہا نے شوقی آفندی کو ولی امراللہ مقرر کیا۔ شوقی آفندی عبدالبہا کی سب سے بڑی بیٹی ضیا خانم کے بڑے بیٹے ہیں اور انکے والد کا نام میرزا ہادی شیرازی ہے۔ جو سید باب کے خاندان کے ایک فرد ہیں۔

مسند ولایت پر بیٹھتے وقت شوقی آفندی کی عمر پچیس برس کی تھی اور اس وقت اکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ وہاں سے بلائے گئے اور ولایت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی۔ سب سے پہلے شوقی آفندی نے یہ کام کیا کہ محافل روحانی تمام بہائی آبادیوں میں قائم کرائیں اور باقاعدہ ایک نظام کے ماتحت تبلیغ اصول بہائی کے لئے نظام قائم کیا۔ اور تمام بہائی مردوں، بچوں اور عورتوں کی تعلیم کا انتظام کیا شوقی آفندی نے بہائی نظام کو اسقدر منظم کیا ہے کہ بڑی بڑی حکومتوں کے نظام بھی اس کے سامنے ہیچ ہیں۔ اس وقت شوقی آفندی کی عمر ۳۲ سال کی ہے۔ انگریزی۔ عربی، فارسی ترکی اور فرانسیسی زبان پر کامل دستگاہ رکھتے ہیں۔ انکی علمی اور اخلاقی قابلیت کا سکہ تمام ملنے والوں کے دلوں پر بیٹھ جاتا ہے۔ حد درجہ منکسر مزاج ہیں انہوں نے اپنے تمام تبعین کو ہدایت کر دی ہے کہ مراسلات میں انکے لئے بڑے بڑے القاب نہ استعمال کریں۔ ہر بات میں مساوات اور اخوت کا خاص خیال رکھتے ہیں۔

مختلف ممالک کے اخبارات اور رسائل شوقی آفندی کی تصویر اور انکے موجودہ نظام پر مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ چند ماہ ہوئے کہ ٹائمز آف انڈیا کے ہفتہ وار ایڈیشن نے انکا فوٹو شائع کیا تھا وراس کے ساتھ ساتھ بہائی مذہب پر ایک سلسلہ مضمون بھی شائع کیا تھا۔ جس کے کچھ حصہ کا ترجمہ بہت غیرہ میں نکل چکا ہے۔

اب میں چاہتا ہوں کہ مختصر الفاظ میں بہائی اصول اور تحریک بہائی کی موجودہ رفتار ترقی کا ایک مجمل خاکہ پیش کر کے اس مضمون کو ختم کروں۔

تعلیمات بہائی

خدا:- غیب لایدرک ہی اسکی حقیقت کو کسی نے نہیں سمجھا مگر اس کی ہستی پر ہر ایک ضمیر و وجدان اور عقل فہم گواہ ہی جس پر کافی سے زائد علمی دلائل موجود ہیں۔ خدا کی قدرت اب بھی ویسی ہی ہے جیسے پہلے تھی۔ اس کی کوئی قوت کم نہیں ہوئی ہے وہ اپنی صفات کمال میں یکساں ہے وہ اپنی کائنات میں اپنی قدرت کے نئے نئے ظہور دکھاتا رہتا ہے۔ مختلف زبانوں میں اس کے نام اور اس کی نسبت مختلف بیانات ہیں لیکن سب کا مقصد ایک ہی۔ اس کی قدرت کی کوئی ابتدا و انتہا نہیں وہ ہمیشہ سے خالق و مالک ہی اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کی صفات میں کبھی حدوث نہیں ہوا نہ کبھی تعطل ہوتا ہے۔ وہ وقتاً فوقتاً ایک باقاعدہ پروگرام کے اندر دنیا کو ہدایات دیتا رہتا ہے خاص خاص لوگوں کو اپنے کلام کا جلوہ گاہ مقرر کرکے اصلاح خلق کے لئے مبعوث کرتا رہتا ہے یہ سلسلہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ کیونکہ یہ اس کی صفت ربوبیت کا تقاضا ہے اور خدا کی کوئی صفت کبھی بھی مفقود نہیں ہوسکتی ہے۔

پیغمبر:- اس کی شان ہدایت سے مظہر ہوتے ہیں۔ سب پیغمبر برحق ہیں۔ انکی شریعتیں خدائی پروگرام کے مطابق اپنے اپنے وقت کے لئے نہایت پرحکمت اور ضروری تھیں۔ ان سب کا مقصد ایک ہی تھا یعنی وہ انسانی دنیا کی بہبودی اور ترقی چاہتے تھے۔ سب پیغمبر واجب التعظیم ہیں۔ پیغمبر ہر ملک میں آئے ہیں۔ ہر پیغمبر کی عزت کرنی چاہئے۔ سب پیغمبر دنیا کے لوگوں کو اتحاد و اتفاق کی تعلیم دیتے ہیں۔

دین:- وہ حقیقت جس کا خدا کی طرف ظہور ہوا اور جو انسانوں کی بہبودی کا صحیح ذریعہ ہے۔ حقیقت ایک ہی جو متعدد نہیں ہوتی اس لئے دین بھی ایک ہی۔ ہاں وہی حقیقت لباس جدید میں جلوہ گر ہوتی رہتی ہے اس لئے وہ مختلف صورتوں میں نظر آتی ہے لیکن ہے وہی ایک ہی حقیقت اس واسطے وحدت ادیان یا اتحاد مذاہب ایک زبردست بنیاد ہے جس پر تمام قوموں کے

اتحاد کی تعمیر ہوگی۔ دین کے اصول کبھی نہیں بدلتے لیکن جزئیات ضرور بدلتے رہتے ہیں تاکہ دنیا کی ترقی کے ساتھ ساتھ نوع انسان کے لئے ترقی کی راہیں صاف ہوتی جائیں۔ دین ہمیشہ تجدد حاصل کرتا رہتا ہے جیسا کہ حضرت آدم سے تا ایندم ہوتا چلا آیا ہے۔ بہائیوں کے عقیدہ میں آج دین حقیقت ایک نئی شکل میں جلوہ گر ہوا ہے۔

الہامی کتابیں:۔ سب ایک ہی سرچشمہ سے ظاہر ہوتی ہیں۔ انکے لانے والے اگرچہ مختلف زمانوں میں ہوئے ہیں لیکن ان کا مدعا ایک ہی تھا۔ سب کتابیں حقیقت کی تعلیم دیتی ہیں۔ سب محبت سکھاتی ہیں وہ سب ایک ہی منزل پر لیجاتی ہیں۔ ہر دور میں جو خدا کی طرف سے ایک مقررہ مقدار کا ہوتا ہے۔ ایک الہامی کتاب شریعت نازل ہوتی ہے۔ اس کا دور ختم ہونے پر اس کتاب کی روحانی تاثیر بہت ہی کم پڑجاتی ہے۔ اس لئے اس کے ماننے والے قرون اولیٰ کی طرح ایمان و ایقان میں چست اور کامل نہیں ہوتے۔ اس وقت پھر خدا اپنے فضل سے جدید کتاب نازل کرتا ہے جو زندگی کا تازہ جام پلاتی ہے۔ خدا کی کتاب ہی حجت کاملہ ہوتی ہے۔ لوگوں کے تفسیری خیالات الہامی کتابوں کے برابر نہیں ہوسکتے ہیں۔ الہامی کتاب میں جو قدرتی طاقت ہوتی ہے وہ ایک نئی قوم بناتی ہے یا بالفاظ دیگر مردہ قوموں کو زندہ کرتی ہے۔ بکھری ہوئی جماعتوں کو ملاتی ہے۔

ترک تعصبات: بہائی تعلیمات میں سے ایک تعلیم ترک تعصبات ہے یعنی جنسی، وطنی، مذہبی، نسلی لسانی وغیرہ ہر قسم کے تعصبات کا چھوڑ دینا ایک بہائی کا فرض ہے۔ دنیا میں مختلف قوتوں کا خیال بالکل باطل ہے۔ تمام عالم صرف ایک ہے یعنی "انسان"، ہر طرح کی قومی تفرقیں جھگڑے ہیں انہیں دور کرنا چاہئے۔ تمام روئے زمین انسان کا وطن ہے۔ تمام زبانیں انسان کی ہیں جن کا مقصد اظہار ما فی الضمیر ہے۔ کسی کو کسی زبان سے نفرت نہیں کرنی چاہئے۔ لیکن زبانوں کی کثرت کی وجہ سے انسانی تعلقات میں بہت کچھ مشکلات پیش آرہی ہیں۔ اسلئے بہائی تحریکات میں سے ایک تحریک لسانی عمومی کی بھی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ

تمام دنیا میں ایک مشترکہ زبان قائم کیجائے چنانچہ "اسپرنٹو" زبان کی ترقی میں بہائی سب سے آگے آگے ہیں جس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ دنیا کی عمومی زبان ہوسکیگی۔

مساوات مرد وزن: بہائی تعلیمات میں سے ایک تعلیم یہ ہے کہ مرد اور عورت کے حقوق برابر ہیں یعنی مالی اور تعلیمی حقوق میں فرد اور عورت کو یکساں ہونا چاہئے۔ عبدالبہا کہتے ہیں کہ عالم انسانی ایک پرند کے مانند ہے جس کے دو بازو ہیں ایک مرد اور دوسرا عورت جب پرند کے بازو یکساں صحیح اور تندرست اور برابر قوت کے ہوں گے تو پرند خوب پرواز کرسکتا ہے۔ لہذا مرد و عورت کی مساوات ضروری ہے ورنہ عالم انسانی کا پرند ہوائے ترقی میں پرواز نہ کرسکے گا۔

تحصیل علم: بہائی تعلیمات میں سے ایک تعلیم فرضیت تحصیل علم ہے۔ نماز کی طرح ہر انسان پر فرض ہے کہ اپنے بچوں کو تعلیم دلائے ابتدائی تعلیم جبری ہونی چاہئے

کسب معاش: ہر بہائی پر فرض ہے کوئی نہ کوئی کام کرے جس سے دولت و ثروت پیدا کرے اپنے خاندان اور ناداروں کی امداد کرے اس کے ساتھ ساتھ گداگری بالکل قطعی حرام ہے۔ ہاں اگر اپاہج لوگ ہیں تو انکے لئے متمول اور با ثروت لوگوں کو چاہئے کہ ہر شہر میں محتاج خانے بنوائیں۔

انسداد غلامی:۔ بہائیوں کے نزدیک غلاموں کا خریدنا بیچنا قطعی حرام ہے۔ بہائیوں کے نزدیک ہر طرح کی غلامی یعنی ذہنی اقتصادی اور دماغی غلامی کو دنیا کے تختہ سے اڑا دینا چاہئے بہائی مقاصد میں سے ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ پیر و مرشد، مذہبی ملا شخصی حکومت اور سرمایہ داری غلامی کی زنگار زنجیریں انہیں توڑ دینا چاہئے۔ مگر تشدد سے نہیں بلکہ قوت ضمیر اور تدبر سے۔

جمعیۃ الاقوام: بہائی تعلیمات میں سے ایک تعلیم یہ بھی ہے کہ دنیا میں ایک بیت العدل قائم کیا جائے جس میں تمام اقوام کے نمائندے متحد ہو کر تنظیم عالم کی تدابیر اختیار کریں جنگ کو دنیا سے اٹھادیں۔ ہتھیاروں کو کم کردیں۔ باہمی رقیبانہ جذبات کو محبت کے جذبات سے بدل دیں۔

بہائیوں کے عقیدے میں یہ مندرجہ بالا احکامات خدائی احکام ہیں جو بہاء اللہ کے ذریعہ نازل ہوئے اور اس کے ساتھ ساتھ بہائی اسکو بھی مانتے ہیں کہ یہ سب باتیں ایک دن دنیا میں قائم ہو کر رہیں گی۔

بہائی تحریک کی موجودہ رفتار ترقی

اس کے متعلق مختصراً عرض ہے کہ اس وقت دنیا کا ایسا کوئی ملک نہیں ہے جہاں بہائی کافی تعداد میں موجود نہ ہوں۔ ہر ملک میں بہائیوں کے اپنے ادارے موجود ہیں جس کے ماتحت بہائی مذہب کی نشر و اشاعت کرتے ہیں۔ ہر ملک اپنی قوت سے کام کر رہا ہے۔ ہر ملک میں بہت سے عالم فاضل مرد اور عورتیں بہائی تحریک کو پھیلانے میں مصروف ہیں لیکن دنیا میں سب سے زیادہ ترقی اس تحریک کو امریکہ میں ہے امریکہ کی ایک کروڑپتی خاتون مسز ساف لاکرنے اپنی زندگی بہائی ازم کی تحریک کے نشر و اشاعت کے لئے وقف کر دی ہے۔ مسز موصوفہ نے سفر ہندوستان کے وقت ہماری جامعہ میں بھی تشریف لاکر بہائی تعلیمات پر ایک لیکچر دیا تھا۔ اور اسی طرح اعلحضرت ملکہ رومانیہ بھی اسی تحریک کو ہر دلعزیز بنانے کے لئے کوشش کر رہی ہیں۔

بہائی پریس

تعلیمات بہائی کی اشاعت کے لئے دنیا کے مختلف ملکوں میں مختلف ادارے ہیں۔ اخبارات اور رسائل کے نام تحریر کرتا ہوں۔

بہائی ایئر بک:۔ یہ ضخیم اور مصور مجلہ نیویارک امریکہ سے سال میں ایک مرتبہ نکلتا ہے۔ جس میں تمام بہائی دنیا کی سالانہ رپورٹیں ہوتی ہیں۔

لا نوو ایل اگو:۔ یہ ماہانہ رسالہ اسپرنٹو زبان کی ترویج کے لئے شائع ہوتا ہے۔ اسکا مقام اشاعت برلن ہے۔

ہیرلڈ آف دی ساؤتھ:- یہ ہفتہ وار بہائی اصول کا آرگن ہے جو کہ لینڈ نیوزی لینڈ سے نکلتا ہے۔

اسٹار آف دی ویسٹ:- یہ رسالہ ماہواری ہے انگریزی زبان میں شکاگو امریکہ سے شائع ہوتا ہے۔

خورشید خاور:- یہ رسالہ بھی ماہواری ہے اور فارسی و ترکی زبان میں عشق آباد روس سے نکلتا ہے۔

اسٹار آف دی ایسٹ:- یہ ماہانہ رسالہ انگریزی زبان میں ٹوکیو دار السلطنت جاپان سے شائع ہوتا ہے۔

چلڈرنس نیوز:- یہ ماہوار رسالہ کیلیفورنیا سے بہائی بچوں کے لئے شائع ہوتا ہے۔

کوکب ہند:- یہ رسالہ ہر انیسویں دن بہائی مہینہ کی پہلی تاریخ کو دہلی سے اردو زبان میں شائع ہوتا ہے۔ اور علاوہ ازیں یہ ادارہ بہائی اصول پر اردو کتابیں اور چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کرتا ہے۔

ریل کی سڑک اور قبرستان

(۲)

(گذشتہ سے پیوستہ)

ایک سال کے اندر اندر لارس مجلس نابین کا صدر ہوگیا۔ سیونگ بنک کا بھی پریزیڈنٹ ہوگیا اور عدالت ثالثی کا سب سے زیادہ ذی اثر رکن بن گیا۔ الغرض جس جس عہدے اور منصب کی امیدواری کا اس کو استحقاق ہوسکتا تھا، ان سب پر وہ بذریعہ انتخاب عام فائز ہوگیا!،

ضلع کی مجلس نمائندگان میں داخل ہونے کے ایک سال تک وہ مہر بہ لب رہا۔ لیکن دوسرے سال کے سیشن میں ایک خاص موقع کو منتخب کرکے اُس نے وہی پرہیجان منظر پیدا کر دیا جس کی نظیر وہ گرجا کی مجلس نابین میں نڈ کے خلاف کر چکا تھا! یہاں بھی جو شخص جز و کل کا مالک اور سیاہ و سفید کا مختار رہا تھا اس کی مخالفت میں اچانک میدان میں آکر اُس نے ایسی اُس کی ہوا بگاڑی کہ اُس کو کامل شکست کا اعتراف کرنا پڑا۔ اور لارس پورے طور پر مظفر و منصور ہوکر آئندہ اس نئے حلقۂ حکومت میں فرمان فرما بن گیا! اور یہاں پہنچکر اُس نے ملک کی پارلیمنٹ کی ممبری کی آخری معراج کی طرف پیشقدمی کی جہاں اُس کا شہرہ مقدمۃ الجیش بن کر پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ لیکن دارالعلوم کے اس زبردست سیاسی اکھاڑے میں مدمقابل حریفوں کی کچھ کمی نہ تھی، یہی وجہ تھی کہ یہاں وہ کسی قدر دبا دبا رہتا تھا اگرچہ اپنی ذاتی پوزیشن کو سنبھالنے میں پورا مضبوط و مستقل تھا۔ وہ کسی ایسے حلقے میں صدارت و ریاست کے مرکز پر قبضہ کرنیکی کبھی ناعاقبت اندیشانہ کوشش نکرتا تھا جہاں لوگ اُس سے پورے طور پر شناسا اور اُسکی قابلیتوں کے پورے مرتبہ داں نہ ہوں! اس کو یہ بھی منظور نہ تھا کہ پارلیمنٹ میں کسی نمود و اقتدار کی جگہ پر گرفت حاصل کرنے کی ناکام جدوجہد میں وہ اپنے وطن اور ضلع کی مقامی مجالس کی علمبرداری بھی کھو بیٹھے!

اس لئے کہ اپنے گھر کی وہ حاکمانہ زندگی اُس کے لئے بہت ہی لذت انگیز تھی جس وقت اتوار کے دن وہ گرجے کی دیوار کے پاس کھڑا ہوتا اور ساری نماز گذار جماعت آہستہ اور مودب انداز میں اُس کے بازو سے گذرتی ہوئی اس کو "سلام نیاز" پیش کرتی اور گوشہائے چشم سے مشتاق اور دزدیدہ نگاہوں کے ساتھ اُس کو دیکھتی جاتی اور یہاں اسی پرشوکت جلوس کے کسی فرد سے (اُس کو کھڑا کر کے) از راہ التفات دو چار باتیں کر لیتا، تو سچ مچ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے "تنکے" کے بل پر گرجا کی ساری سلطنت پر ایک مطلق العنان شہنشاہ کی سی حکومت کر رہا ہے!

واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنے اس اعزاز و اقتدار کا بجا طور سے مستحق تھا۔ گرجا کے لئے جو خدمات اُس نے انجام دی تھیں اُنکا اعتراف نہ کرنا ناممکن تھا۔ چنانچہ اُس نے گرجا کو جانیوالی سڑک کو کھلوا دیا تھا، وہ نیا گرجا جس میں لوگ اب جماعت یا اجلاس کیا کرتے تھے، اُسی نے تعمیر کرایا تھا، اور یہ سب باتیں۔ معہ شئے زائد کے۔ گرجا کے نئے قائم شدہ سیونگ بنک کے منافعوں کے اولین اثمار تھے! بنک کی یہ سرسبزی اور بارآوری بھی اُسی کی آبیاری کی رہین منت تھی کیونکہ وہی اُسکا منتظم و مہتمم تھا۔ گرجا کی جائداد و وسائل میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا تاآنکہ وہ تمام دوسرے کلیساؤں اور مذہبی اوقاف کے لئے حکومت خود اختیاری اور عمدہ نظم و نسق کی ایک شاندار، قابل تقلید مثال بن گیا!

نڈا آکرے پبلک سرگرمیوں کے میدان سے بالکل ہٹ آیا تھا۔ شروع شروع میں اس نے مجلس کی بعض نشستوں میں شرکت کی تھی کیونکہ اس نے بعض لوگوں سے یہ وعدہ کر لیا تھا کہ وہ حتی المقدور اس مذہبی مرکز کے لئے اپنی ناچیز خدمات پیش کرتا رہے گا، اگرچہ اس میں اُس کو اپنی غیرت و خودداری کو تھوڑا مجروح ہی کرنا پڑے! مگر جب اُس نے اپنی نئی حیثیت سے پہلی تجویز پیش کی تو اس نے دیکھ لیا کہ اُس کے لئے میدان بالکل تنگ ہو گیا ہے اور اس کے کامیاب رقیب نے اُسکے لئے گرجا کی پبلک خدمت کی زمین اس قدر گرم کر دی ہے کہ وہاں اب اُسکے قدم جمنا مشکل ہے چنانچہ نڈا کی مولہ بالا قرارداد کی پیشی کے وقت مشاق لارس نے پہلی اصطلاحی مشکل یہ پیدا کی کہ صاحب تجویز

سے یہ درخواست کی کہ وہ از راہ کرم اُس کی تمام تفصیلات و جزئیات پر خدا روشنی ڈالیں۔ تڈ کچھ لیبا
سراسیمہ ہوا کہ فردمات کے اس مطالبہ کو قبل از وقت قرار دینے کی کوشش میں اُس کی زبان سے نکل گیا ۳۰
کہ "جب کلبس نے امریکہ کو دریافت کیا تھا تو اُس نے وہاں آبادکاری کے پہلے ہی قدم پر ملک کو
کلیسائی حلقوں میں نہ تقسیم کیا تھا بلکہ یہ سب ارتقائی منازل رفتہ رفتہ از خود ظہور میں آگئی تھیں!" لامحا
نے اس خطیبانہ انداز بیان پر فوراً گرفت کی اور اپنے جواب میں کہا کہ "تب ہم کو یہ سمجھنا چاہئے کہ ہمارے
دوست تڈ آکرے کی تحریک ایک ایسا ہی عظیم الشان اور معرکۃ الآرا تاریخی کارنامہ ہے جیسا کہ براعظم امریکہ
کا اکتشاف!"

یہ ہجو ملیح ایک قیامت تھی! اُسی دن سے غریب تڈ کا نام ہی مجلس میں "اکتشاف امریکہ"
پڑگیا!!

تڈ نے جان لیا کہ اپنا "عہد اقبال" اب ختم ہو چکا ہے! اب عوام اُس کو بجز مذاق کا نشانہ
بنانے کے کسی اور مصرف کا نہیں سمجھتے۔ چنانچہ اُس نے پبلک خدمات کے تمام اخلاقی مقتضیات کی
ذمہ داری سے اپنے کو بری سمجھ لیا، اور مجلس نگراں کار کے آئندہ انتخابات میں اپنے کو پیش کرنے
سے انکار کر دیا!

لیکن اس نے اپنے بعض مشاغل کو ترک نہیں کیا اور انہیں پوری تندہی سے انجام دیتا رہا
اور اپنی قسمت سے یہ امید وابستہ رکھی کہ ممکن ہے میں آئندہ کبھی کسی کام کا اہل سمجھا جاؤں۔ چنانچہ
اُس نے اپنے سنڈے اسکول پر توجہ مرکوز کی، اُس کو کافی وسعت دی۔ اور مختلف قسم کے چھوٹے
اور بڑے چندہ دن اور مالی امانتوں سے وہ اسکو اس حیثیت میں لے آیا اور اُس کے سارے
سررشتہ کا خود ہی "خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ" کے بمصداق مختار و سربراہکار قرار پایا
اس مرکز کی شاخیں اور شعبے دور دور گرد و نواح کے اضلاع میں بھی تھے۔ تڈ کی اس جدوجہد پر لارسا
نے یہ معنی خیز فقرہ کسا کہ "جب تڈ آکرے کسی مقصد کے لئے روپیہ جمع کرتا ہے تو وہ پہلے سے طے
کر لیتا ہے کہ یہ رقم وطن سے ہزار ہا میل کے فاصلہ پر خلق اللہ کو فیضیاب کرے گی!"

لیکن دونوں کے حلقۂ کار کے حدود اب اس قدر علیحدہ تھے کہ آپس میں کسی تصادم کا موقع نہ رہا تھا، اور آئی وست و گریبانی بالفعل ختم ہو گئی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے ملتے بھی نہ تھے، لیکن کوچہ و بازار میں جب کبھی اتفاقیہ مڈبھیڑ ہو جاتی تو رسمی علیک سلیک اور مزاج پرسی ہو جاتی! لارس کا خیال ہی آنے پر نڈ کے دل میں ایک ٹیس پیدا ہوتی لیکن وہ اس جذبۂ کاوش و کاہش کو دبا تا اور اپنے دل کو سمجھاتا کہ تقدیر ہی میں یہ لکھا تھا کہ ایک نطاہر ادنٰے حریف سے ایسی زک اٹھانی پڑی، شاید صورت معاملات ہی اس طرح آن پڑی تھی کہ اپنا یہ انجام ناگزیر تھا! الغرض اُس نے اپنے دل کو ڈھارس دے لی تھی اور لارس کی طرف سے شاید تمام خلش و پرخاش کو نکال دیا تھا۔

اب یہ سالہا سال کے بعد ایک محفل شادی کا موقع تھا۔ نڈ اور لارس دونوں اس تقریب میں شریک تھے اور دونوں بہت خوش خوش تھے۔ نڈ ایک کرسی پر کھڑا ہوا اور لارس کے اعزاز میں ایک مداحانہ تقریر شروع کی! اُس نے "گرجا کی مجلس ناہین کے صدر اور کلیسائی حلقے کے اولین نمائندۂ پارلیمنٹ" کے شاندار القاب سے لارس کی شخصیت کی طرف اشارہ کیا اور اپنے وطن کی اس مایہ ناز ہستی کا جام صحت تجویز کیا! نڈ اپنی تقریر سے خود متاثر ہونے لگا اور گویا اپنے سامعین میں وہ خود ہی سب سے زیادہ ہمہ تن گوش تھا! حسب معمول اس نے اپنے خیالات بڑی خوبصورتی و خوش اسلوبی سے بیان کئے۔ سب لوگ نڈ کی عالی ظرفی" اور سینہ بے کینہ" کے قائل ہو گئے۔

لارس بھی قدم بڑھا کر اُس کے پاس آیا اور کسی قدر حجاب اور دزدیدہ نگاہی کے ساتھ اس نے مجمع کو خطاب کر کے کہا کہ "اس وقت کا طرز عمل نڈ آگرے جیسی ممتاز شخصیت کے عین شایاں شان تھا! سچ یہ ہے کہ مجھکو جو کچھ آتا ہے وہ سب میرے اسی محسن و مربی کے فیض صحبت کا طفیل ہے اور میری اس وقت جو کچھ بھی حیثیت ہے اُس کے لئے تمام و کمال میں اپنے اسی محترم دوست کا مرہون احسان ہوں!"

ان دیرینہ دوستوں میں خوشگوار تعلقات کی بحالی کا یہ نتیجہ ہوا کہ آئندہ انتخاب میں نڈ گرجا کی مجلس نگران کار کا پھر پریزیڈنٹ تھا!

لیکن لارس کو کچھ معلوم نہ تھا کہ اس کے بعد کیا ہوگا ؟! اگر وہ ان غیر نیرنگیوں کے ظہور کی پیش بینی کر لیتا تو اس وقت وہ ٹنڈ کا کبھی حامی و مددگار نہ ہوتا اور اپنے اثر و رسوخ سے کام لیکر اس کو ہرگز اس منصب پر نہ پہنچاتا!

جس وقت ٹنڈ دوبارہ گرجا کی نمائندہ مجلس میں داخل ہوا ہے تو وہاں ایک خاص نقشہ پیش تھا۔ لارس کے زمانۂ قیادت میں مجلس کے ارکان کے اندر ذاتی کاروبار کرنے کا ایک بُرا دستور قائم ہوگیا تھا اور یہ چسکا اب اس قدر ترقی کر گیا تھا کہ بالکل ایک "جنون" سے تعبیر کیا جاسکتا تھا۔ ناتجربہ کارانہ اور قمار بازانہ طریق تجارت نے ایسے تباہکن نتیجے پیدا کئے تھے کہ ہر شخص کی مالی حیثیت سخت معرض خطر میں تھی اور یہ ناعاقبت اندیشانہ شوق اپنی قربانگاہ پر اب قربانیاں مانگ رہا تھا! عام طور پر کہا جاتا تھا کہ اس اندوہناک صورت حالات کا بانی مبانی لارس ہاگسٹیڈ ہے کیونکہ اسی نے بالارادہ تعلیم و تلقین کر کے اپنا یہ غلط تاجرانہ مذاق ساری مجلس میں عام کر دیا تھا۔ خود مجلس نگرانکار اپنی سرکاری حیثیت میں ایک سخت جوئے باز جماعت تھی اور وہی دوسرے متوسلین کلیسا کے لئے ایک گمراہ کن مثال بنی تھی۔ اب اس خبط کی ہمہ گیری کا یہ حال تھا کہ دو پیسہ کا مزدور بھی سٹہ باز بننے کے لئے تیار تھا اور ایک ایک کے چار چار کرنے کی دھن میں تھا! لوگ اس زر پرستی میں جیسے حریص بن گئے تھے ویسے ہی فضول خرچ اور اپنی عادات میں بے اصول بھی ہو گئے تھے۔ اس جنگ زرگری کا ایک سب سے ناگوار نتیجہ یہ تھا کہ روپیہ کمانے کی جد و جہد اور کشمکش میں لوگ ایک دوسرے کو حریف و رقیب ہوگئے تھے۔ آپس میں رشک و حسد کا مادہ پیدا ہوگیا تھا، جو نفرت و عداوت کی شکل میں مبدل ہو رہا تھا! "مسجد کے زیر سایہ خرابات" کا یہ رنگ حد درجہ افسوسناک تھا! اب نوبت یہ تھی کہ باہمی بد دیانتیوں اور بد معاملگیوں کے نتیجہ میں عدالتوں میں ایک دوسرے پر مقدمے قائم ہوئے تھے۔ یہ سعادت بھی گرجا ہی سے منسوب کیجاتی تھی اس لئے کہ لارس نے چیرمین بن کر جو پہلی اصلاحی و تادیبی کارروائی کی تھی وہ گرجا کے کہن سال اور محترم امام پر بعض مشتبہ اور خیانت آمیز کارروائیوں کے سلسلے میں مقدمہ بکا چلاہی تھا! اگرچہ اس مواخذۂ قانونی میں لارس کو کامیابی ہوئی تھی لیکن گرجا کی ایک مقدس ہستی

کو عدالتی دارو گیر میں جکڑنا اور اس طرح اس کو رسوا کرنا بجائے خود ایک نازیبا اور بیدردانہ بات تھی، چنانچہ اس مقدمہ پر اگر بعض لوگوں نے لارنس کے عمل کو حق بجانب اور قابل تعریف بتایا تو بعض نے اس کی مذمت بھی کی۔ اس لئے کہ غریب امام کو اس ثابت شدہ الزام کے سلسلے میں اپنے کلیسائی منصب سے مستعفی بھی ہونا پڑا تھا۔

اب لارنس کی بے راہ رویوں اور مجتہدانہ کارروائیوں کے نتائج بد سامنے تھے۔ آپس کی چپقلش اور اُس کے سلسلہ میں نزاعوں اور مقدمہ بازیوں کا یہ انجام ہوا تھا کہ ہر شخص قلاشی اور تباہ ہو گیا تھا۔ لارنس کے عہد حکومت کے زیر سایہ گرجا اور نواح گرجا میں ان مصائب کا آخر رنگ لایا اور رائے عامہ میں گرجا کی مجلس نگران کار کی اس رہنمائی کے اثر و ہر دلعزیزی کے بارے میں ایک یکسر انقلاب ہو گیا! اور ان باغیانہ خیالات کو سربراہی کے لئے بہت جلد ایک لیڈر بھی مل گیا۔ یہ نڈاکرے تھا جس کو لارنس ہی نے "مار آستین" بنا کر مجلس میں صدارت کے عہدے پر فائز کرا دیا تھا!

معرکہ آرائی فوراً شروع ہو گئی۔ وہ سارے نوجوان جنہوں نے اپنے زمانہ طالبعلمی میں نڈا کے سامنے زانوے ادب تہ کیا تھا اب بڑے ہو گئے تھے۔ پبلک معاملات میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا اور گرجا کی مجلس نائبین کے بھی بڑے کامیاب اور صاحب اثر ممبر تھے۔ مجالس کی کارروائیوں میں وہ خوب طاق و مشاق ہو گئے تھے اور ان کے مالہ وماعلیہ پر پورا عبور رکھتے تھے۔ یہی لوگ نڈاکرے کے علم کے نیچے جمع ہونے والے تھے اور لارنس کا انہی سے مقابلہ تھا۔ یہ ساری جماعت بچپن ہی سے لارنس پر خار کھائے ہوئے بیٹھی تھی اور اُس سے انتقام لینے کے لئے موقع کی منتظر تھی۔ ایک دن شام کے وقت جبکہ مجلس نائبین کا ایک طوفانی اجلاس ختم ہو چکا تھا لارنس اپنے مکان کے پیش دروازے پر کھڑا ہوا تھا اور سامنے نظر آنیوالے گرجا، اُسکی اراضیات ومتعلقات ایک خاص منظر پیش کر رہے تھے، ابر آلود مطلع میں اس نے زبردست رعد و برق سنی۔ ان سماوی تنبیہوں کو لارنس کے واہمہ نے سیاسی موسم کے خوفناک تغیر کی علامات سے تعبیر

کیا۔ اُس نے اپنے دل میں کہا کہ "جس دن ان لوگوں کی اقتصادی مصیبتیں اپنے عروج کو پہنچیں کوئی حادثہ پیش لائیں اُسی دن سے گرجا کے سیونگ بنک کا بھی خاتمہ ہے۔ اور اُسی کے ساتھ میرے اقتدار کا بھی جنازہ اُٹھ جائے گا۔"

اسی کشمکش و پیچاپش اور یاس و نا امیدی کا وقت تھا کہ ریلوے کے کمشنروں کی ایک جماعت بسلسلہ تحقیقات اُدہر نکل آئی۔ یہ لوگ ایک نئی مجوزہ ریلوے لائن کے پیمائش و معائنہ پر مامور کئے گئے تھے۔ یہی گشت کرتے ہوئے ایک دن شام کو یہ انجنیر ہالسٹیڈ (لارس ہاگسٹیڈ کا گاؤں اور مسکن) میں وارد ہوئے۔ گرجا کے متعلقہ حلقہ اراضی میں داخل ہوئے۔ ہاگسٹیڈ پہلا قطعہ تھا۔ ریلوے کمشنروں سے گفتگو کے دوران میں یہ حقیقت بے نقاب ہوئی کہ صیغہ ریلوے کے ارکان کے ہاں یہ تجویز زیر غور ہے کہ آیا جدید لائن اسی وادی سے نکالی جائے جس میں ہاگسٹیڈ وغیرہ کی زمینیں پڑتی تھیں۔ یا اُسی کے متوازی ایک دوسری وادی سے۔

ایک برق مثال تیزی سے اُس کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ "اگر میں ریل کو اپنی زمین میں سے گذرنے کی اسکیم کو حکام ریلوے ہاں مقبول کرانے کی جد وجہد میں کامیاب ہو جاؤں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یکبارگی ان گرد و پیش کی اراضیات کی قیمتیں دوچند سہ چند ہو جائیں گی اور نہ صرف میں اس آنے والی تباہی سے بچ جاؤں گا بلکہ میرا نام زندہ جاوید ہو کر پشتہا پشت تک مشہور ہو جائے گا۔ یہ اتنا دلفریب اور امید پرور خیال تھا کہ اُس کی دلکشی کے تصور میں وہ ہمہ تن غرق ہو گیا اور خوشی کی شدت میں ساری رات اس کو نیند نہ آئی۔ وہ ایک نظروں کو خیرہ کرنیوالی روشنی اپنے عالم تخیل میں دیکھتا تھا اور انہماک و استغراق میں اس کو کبھی کبھی ریلوے ٹرین کی گھڑگھڑاہٹ تک مسموع ہوتی تھی!

دوسرے دن صبح جب ریلوے والے زمین کو دیکھنے کے لئے نکلنے لگے تو اُس نے اپنا گھوڑا گاڑی اُنکو لیجانے کے لئے پیش کی، چنانچہ گاڑی انکو لے بھی گئی اور واپس بھی لائی۔ لارس اس تمام "گرد آوری" میں اُنکے ہمرکاب تھا۔ دوسرے دن جب وہ دوسری وادی کے

معائنہ کے لئے جانے لگے تو اس دن بھی اس کی سواری انکے لئے حاضر تھی اور وہ خود بھی حسب معمول انکی دمبالہ روی میں تھا۔ کمشنر لوگ ہاگسٹیڈ کے موقع کی خوبصورتی سے بیحد متاثر ہوئے۔ روانگی کے وقت ان لوگوں کے اعزاز میں ایک عظیم الشان الوداعی جلسہ کا لارنس نے اہتمام کیا اور گرجا کی آبادی کے تمام سربرآوردہ لوگوں کو شرکت کی دعوت دی جلسہ بہت کامیاب رہا اور اسکی ہنگامہ خیزیاں شام سے صبح تک جاری رہیں! لیکن افسوس کہ اصلی غرض وغایت کے اعتبار سے یہ ساری مصیبتیں بیسود ثابت ہوئیں کیونکہ ریلوے کے مہندسین جتنا غور کرتے تھے اس فیصلہ کی معقولیت ان پر ظاہر ہوجاتی تھی کہ زیر پیمائش لائن کا ہاگسٹیڈ والے خطے سے لیجانا غیر ضروری مصارف کو برداشت کئے بغیر ممکن نہیں ہے۔
اس وادی کا دروازہ ایک تنگ اور دشوار گذار درہ میں سے ہو کر تھا اور جو ندی اس میں بہتی تھی وہ برسات کے موسم میں اس نواح میں ایک سیلابی کیفیت پیدا کر دیتی تھی۔ پس اس طرح دو ہی چارہ کار تھے: یا تو لائن پہاڑی کے پہلو بہلو معلومہ پیدل شاہراہ کے محاذ میں نکالی جائے اور اس طرح اُس کو بلا وجہ ایک غیر معمولی بلندی تک لیجایا جائے اور ساتھ ہی ندی کو دو جگہ سے عبور کرنے کے لئے دُہرے دُہرے پُل تعمیر کئے جائیں، اور یا پھر یہ ریل کی سڑک بخط مستقیم چلے اور اس قدیم قبرستان میں سے گذرے جو اب غیر مستعمل تھا۔ گرجا کو اس موقع سے منتقل کئے ہوئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا اور ماضی قریب ہی میں آخری میت کی تجہیز و تکفین کے مراسم یہاں عمل میں آئے تھے۔

واقعی کون تھا سچّا شاعر؟

از جناب احتشام الدین صاحب ایم اے

گزرے اُردو کے ہر ایک عہد میں صدہا شاعر
شہر قصبات میں دیہات میں ہر جا شاعر

مختلف قسم پہ ہے یہ بھی جماعت تقسیم
کوئی ادنیٰ کوئی اوسط کوئی اعلےٰ شاعر

چند اقسام پہ اور اُن کی ہے ممکن تقسیم
کوئی کورا کوئی کچا کوئی پکا شاعر

ہیں جو انسان تو ہیں عیب زدہ بھی بے شک
کوئی اندھا کوئی کانا کوئی لنگڑا شاعر

ذوق ہر ایک کا جدا طرز جدا رنگ جدا
کوئی میٹھا کوئی پھیکا کوئی روکھا شاعر

محفل شعر میں غول شعرا کیا دیکھا
کوئی ٹیڑھا کوئی بانکا کوئی بونگا شاعر

بعض کی وضع سے ظاہر ہے پٹیچر ہونا
کوئی گدڑا کوئی چیتھڑا کوئی اُدھڑا شاعر

بعض فی "احسن تقویم" کے پتلے یعنی
کوئی پھپّس کوئی لمبا کوئی بد ڑا شاعر

خوشنوائی کا سر بزم یہ عالم دیکھا
کوئی گونجا کوئی کڑکا کوئی ریکا شاعر

لحن داؤد بھی بعضوں کو دیا قدرت نے
کوئی بلبل کوئی طوطی کوئی مینا شاعر

جس کے اشعار کہے جا سکیں اچھے نہ برے
بے مزہ اُس کا کلام اور وہ پھیکا شاعر

جو قصیدہ و غزل مثنوی تینوں میں کسی
صنف میں چل نہ سکے، ہے وہی لنگڑا شاعر

بعض بحروں میں طبیعت ہو رواں بعض میں بند
ایک طرف سے اُسے کہہ سکتے ہیں کانا شاعر

صرف موزوں ہو کوئی بات نہ جس میں نکلے
اور کیا کہئے جو نہ کہئے اُسے کورا شاعر

درد اور لطف سے اشعار ہوں خالی جس کے
کیا کلام اس میں جو کہئے اُسے روکھا شاعر

کر سکے جو نہ رجز اور رمل میں تمیز
شاعروں میں وہ بلا شبہ ہے اندھا شاعر

جو سر بزم غزل اپنی سناتے شرمائے
مردوا ہو کے وہ بنتا ہے زنانہ شاعر

جو غزل اور کی سنکر نہ غزل اپنی سنائے
گو جگہ سے نہ ٹلے ہے وہ بھگوڑا شاعر

جو سنانے میں غزل شعر کی صورت بن جائے
نقل محفل ہو وہ آپ اپنا تماشا شاعر

گا کے محفل میں جو داد اپنے سخن کی چاہے
کیا خبر ہے وہ سخنور کہ گویا شاعر

زہد اور تقوے سے لبریز ہوں جس کے اشعار
زیب دیتا ہے لقب اسکا ہو مُلّا شاعر

جس کو تعقید و غلو اور اضافت کا مرض
نہیں شاعر وہ حقیقت میں ہے بنتا شاعر

شوق شاگردوں سے ہو جسکو اور اصلاح کا خبط
"کام شاعر" پھرے آواز لگاتا شاعر

جس کے ممدوح بکثرت ہوں قصیدے ازاں
بھیک کیوں مانگے نہ وہ لیکے طنبورا شاعر

جس کے اشعار میں ہو حسن طلب کی کثرت
شعر کہتا ہے وہ یا پیٹ بجاتا شاعر

ہم بتائیں گے تو وہ رائے ہماری ہوگی
کیا خبر کون ہو مرغوب تمہارا شاعر

جرأت و سوز کوئی مصحفی و میر کوئی
کوئی چرکین و زٹل اور کوئی انشا شاعر

جتنے شاعر ہیں غرض اتنی ہی قسمیں ان کی
ایک سے ایک مشابہ نہیں پورا شاعر

غالب و میر و نظیر اکبر آبادی تینوں
آگرے میں ہوئے یہ نام کو پیدا شاعر

ہے مگر یہ بھی مسلم نہیں محتاج ثبوت
ان کو دلی ہی کی گلیوں نے بنایا شاعر

لیکے دیوان نہ خود دیکھ لو کیا پوچھتے ہو
کون اچھا تھا یہاں کون برا تھا شاعر

گرچہ سچا تھا مگر کچا تھا افسوس نظیر
اور غالب وہ تصنع سے بھرا تھا شاعر

چیستاں طرز سخن، معنی و مطلب مجہول !
عرض مطلب میں جو قاصر ہو وہ گونگا شاعر

سیل و طوفان و غریو طبل جنگ کہو
سید انشا تھا غرض زور بلا کا شاعر

درد میں درد و تصوف کا مزا ملتا ہے
اور مومن کو بھی سب کہتے ہیں اچھا شاعر

پختہ سودا تھا ہوا ذوق بھی کامل فن میں
مانتے اس کو مخالف بھی ہیں پورا شاعر

- جرأت و مصحفی و سوز ہر ایک میں ایک بات!
کوئی پورا کوئی آدھا کوئی پونا شاعر

انگلی ایک ناک پہ انداز سے بولے رنگیں
جان صاحب بھی تھا کیا کوئی نگوڑا شاعر؟

میرجعفر کی زٹل میں بھی ہے جدت موجود
گو کہ پرکین بھی موجد تھا پہ گندا شاعر

سادگی لطف زبان طرز ادا کی شوخی
ان سے تسلیم ہوا داغ بھی یکتا شاعر

پختہ شاعر تھے امیر احمد مینائی بھی
کہنہ مشاق مگر قافیہ پیما شاعر

جو دو غزلے بھی بڑھ جائے سہ غزلے لکھے
شعر کہتا نہیں ہے جان کو آتا شاعر

مرثیہ قوم کا حالی نے بھی اچھا گایا
بن گیا قوم کا ممدوح وہ بگڑا شاعر

شاعری چیزے دگر چیزے دگر استادی
سخت مشکل کسی استاد کا ہونا شاعر

کم ہوئی جمع یہاں شاعری و استادی
شعر و فن دونوں میں کامل تو ہے عنقا شاعر

ہاں مگر میر کہ شاعر بھی ہے استاد بھی ہے
جس کو ہر عہد کے استاد نے مانا شاعر

آج بھی جس نے کلام اسکا پڑھا بول اٹھا
میر تھا میر تقی میر تھا تنہا شاعر!

انتخاب میر

حضرت میر تقی میر رح کے کلام کا دلکش انتخاب معہ حالات و مقدمہ جس میں آپ
کی خصوصیات و امتیازات شاعری پر دلچسپ بحث ہے از مولٰنا نور الرحمٰن صاحب
بی۔اے (علیگ) خوبصورت و مضبوط جلد عمدہ طباعت و کتابت۔

قیمت صرف ایکروپیہ (عہ)

غزل

از حضرت اصغر

یہ راز ہے میری زندگی کا — پہنے ہوئے ہوں کفن خودی کا
پھر نشترِ غم سے چھیڑتے ہیں — اک طرز ہے یہ بھی دلدہی کا
کونین پہ اک نگاہ نفریں — اللہ رے دماغ بے دلی کا
پھر ڈھونڈھ رہا ہوں بیخودی میں — کھویا ہوا لطف آگہی کا
مجکو نہیں جسم و جاں کی پروا — سودا ہے اک اور زندگی کا
او لفظ و بیان میں چھپنے والے — اب قصد ہے اور خامشی کا
مرنا تو ہے ابتدا کی اک بات — جینا ہے کمال منتہی کا
عالم یہ ہے اک سکون بیتاب — یا عکس ہے میری خامشی کا
ہاں! سینۂ گل کی طرح کر چاک — دے مر کے ثبوت زندگی کا
یاس ایک جنون ہوشیاری — امید فریب زندگی کا

جنگی بیڑے

آج کل لندن میں مختلف دول کے نمائندوں کا جو اجتماع اس غرض سے ہوا ہے کہ جنگی بیڑوں کی روز افزوں قوت کے لئے کوئی حد مقرر کرے۔ اس کی کارروائی ہر اس شخص کے لئے نہایت اہمیت رکھتی ہے جسے دنیا کے سیاسی مستقبل سے کچھ بھی تعلق ہے۔ ذیل میں ہم چند اعداد و تشریحات اس لئے درج کرتے ہیں کہ اس کانفرنس کی کارروائی کو صحیح طور پر سمجھنے میں مدد ملے۔ ۱۹۱۴ء میں جرمن بیڑے کی بڑھتی ہوئی قوت نے انگلستان کو جنگ میں شریک کرایا۔ اور دنیا کو اس مصیبت میں مبتلا کیا جو جنگ عظیم کے نام سے تاریخوں میں یاد رہے گی۔ لیکن ۱۹۱۴ء میں جرمن بیڑے پر سالانہ جو خرچ ہوتا تھا اس سے سہ چند سے بھی زیادہ ریاستہائے متحدہ امریکہ نے گذشتہ سال میں اپنے بیڑے پر خرچ کیا یعنی ایک ارب ۱۲ کروڑ اڑتیس لاکھ روپیہ کے قریب! انگلستان نے بھی اس سال میں کوئی ۸۲ کروڑ روپے اپنے بیڑے پر صرف کئے۔

جرمنی کے پاس ۱۹۱۴ء میں جتنا بیڑا تھا آج امریکہ کے پاس اس سے ۳ لاکھ ٹن زیادہ وزن کا بیڑہ موجود ہے۔

دنیا کی سربرآوردہ دول کے بیڑوں کے وزن درج ذیل ہیں:-

ملک	تیار جہاز (ٹن)	جو جہاز تیار ہو رہے ہیں (ٹن)	میزان (ٹن)
امریکہ	۱۳۲۹۳۵۴	۲۰۴۰۲۰	۱۵۳۳۳۷۳
برطانیہ	۱۵۸۷۰۳۷	۱۷۸۶۴۰	۱۷۶۵۶۷۷
جاپان	۹۱۵۵۴۷	۹۰۹۴۰	۱۰۰۶۴۸۷
فرانس	۵۴۸۵۶۳	۱۶۱۰۰۳	۷۰۹۵۰۶
اٹلی	۴۰۷۴۰۵	۱۱۶۹۷۹	۵۲۴۳۸۴

ملک	تیار جہاز (ٹن)	جو جہاز تیار ہورہی ہیں (ٹن)	میزان (ٹن)
جرمنی	۱۲۳۲۹۰	۳۴۰۰۰	۱۵۷۲۹۰
روس	۱۳۳۰۲۶	۱۵۲۰۰	۱۴۸۲۲۶

ان ملکوں کے جنگی بیڑوں میں جو آدمی کام کرتے ہیں اُنکی تعداد یہ ہے :-

امریکہ	۹۳،۳۲۲
برطانیہ	۸۹،۰۰۷
جاپان	۸۱۵۹۵
فرانس	۶۰۸۳۴
اٹلی	۴۵۳۹۷
جرمنی	۱۴۹۱۷
روس	۳۲۰۰۰

پچھلے پچیس سال کے اندر جنگی بیڑوں پر سالانہ خرچ میں جو حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے (سوائے جرمنی اور روس کے جہاں کمی ہورہی ہے) وہ اعداد ذیل سے ظاہر ہوجائے گا :-

ملک	سنہ ۱۹۰۴	سنہ ۱۹۲۹	اضافہ یا تخفیف
امریکہ	۱۰۹۱۹۶۱۲۳	۳۷۴۶۰۸۰۵۴	۲۶۵۴۱۱۹۳۱+
برطانیہ	۱۷۳۵۴۸۰۵۸	۲۷۸۴۸۷۰۰۰	۱۰۴۹۲۹۹۴۲+
جاپان	۱۷۵۵۳۲۷۹	۱۳۱۲۲۲۷۲۲	۱۱۳۶۶۹۴۴۳+
فرانس	۵۹۷۴۰۲۲۲	۹۹۵۶۸۰۰۰	۳۹۸۲۷۷۷۸+
اٹلی	۲۳۵۲۲۴۰۰۰	۶۳۶۲۲۹۸۲	۴۰۱۰۰۵۸۲+
جرمنی	۵۰۵۴۴۰۰۰	۴۷۰۶۴۰۱۹	۲۷۷۹۹۸۱-
روس	۶۰۰۱۸۸۹۵	۴۲۳۲۹۲۸۹	۱۷۶۸۹۶۰۶-

کانفرنس میں جو جو قومیں شریک ہیں ان میں سے بعض چاہتی ہیں کہ بڑے جنگی جہاز بالکل بند یا کم کردئے جائیں۔ کوئی آبدوزوں کے خلاف ہے کوئی کروزروں کی تعداد گھٹانا چاہتا ہے۔ اس لئے یہ معلوم ہونا بھی مفید ہوگا کہ ان مختلف اقسام کے جہازوں کی تیاری پر کیا لاگت آتی ہے اور سال بھر میں ہر ایک پر کتنا خرچ پڑتا ہے :-

اوسط جنگی جہاز تقریباً ۱۰ کروڑ روپیہ میں تیار ہوتا ہے۔

اوسط کروزر " ۵ کروڑ میں

اوسط آبدوز " پونے دو کروڑ میں

ایک جنگی جہاز پر کل سالانہ خرچ تقریباً ۶۰ لاکھ روپیہ ہوتا ہے۔

ایک کروزر پر " " ۴۰ لاکھ روپیہ ہوتا ہے

ایک آبدوز پر " " ۱۳ لاکھ روپیہ ہوتا ہے

شذرات

"خود ہمارے ملک میں کیا کم کانفرنسیں ہوتی ہیں کہ ہم لوگ دنیا کے دوسرے سیاسی یا دیگر اجتماعوں کو بھی مستحق توجہ سمجھیں" یہ وہ جواب ہے جو لندن بحری کانفرنس کا ذکر آنے پر ہمارے ملک کے ایک ممتاز سیاسی کی زبان سے سنا گیا۔ اگر اس کے معنی ان بے معنی کانفرنسوں سے بیزاری کے ہیں جو صرف دفع الوقتی یا شخصی اقتدار کی خاطر ہمارے ہاں آئے دن ہوتی ہیں تو بہت اچھا ہے۔ لیکن اگر دنیا سے بے تعلقی یا سیاسی قوتوں کے باہمی تاثرات سے بے خبری اس کی وجہ ہو تو افسوس ہے۔ شاید لندن کانفرنس ہم ہندوستانیوں کے لئے بڑی دلچسپی کی چیز بن جائے اگر ہم کو معلوم ہو کہ اس کے فیصلوں کی وجہ سے ممکن ہے کچھ عرصہ بعد ہندوستانی سپاہی اسی فرانس کو فتح کرنے کے جائیں جس کو جرمن "بربریت" سے بچانے کے لئے انہوں نے ۱۵ سال قبل اپنا خون پانی کی طرح بہایا تھا۔ اور اسی جرمنی میں جہاں ہمارے سپاہی صرف جنگی قیدی کی طرح جاتے تھے۔ ہماری افواج کا خیر مقدم تہذیب و تمدن کے محافظوں کی حیثیت سے ہو۔ اسی طرح ہم اس کانفرنس کی روداد سے بے تعلق نہ رہیں اگر ہم جانیں کہ اٹلی اور فرانس کے باہمی تعلقات پر اثر ڈال کر یہ سارے شمالی افریقہ کے مستقبل پر کتنا گہرا اثر ڈالے گی اور بالواسطہ ترکوں کے انگلستان و اٹلی کے ساتھ یا روس و فرانس کے ساتھ ہو جانے کا فیصلہ بھی شاید اسی کانفرنس کے نتائج پر مبنی ہو۔

ہم لندن کانفرنس کے ظاہری مقصد یعنی مختلف دول کی بحری قوت پر پابندیاں عائد کرنے کی کوشش کے متعلق کسی دوسری جگہ چند اعداد دیتے ہیں جن سے معلوم ہو سکے گا کہ دنیا کی یہ عاقل فرزانہ قومیں طاقت کے کس جنون میں مبتلا ہیں۔ کانفرنس کے پوشیدہ سیاسی نتائج و امکانات پر کسی

آئندہ اشاعت میں کچھ لکھیں گے۔ اس وقت ہم ناظرین کی توجہ موجودہ یورپین سیاست کی ایک خصوصیت کی طرف منعطف کرانا چاہتے ہیں جو خود ہمارے لئے سبق آموز ہو سکتی ہے۔

جنگ عظیم سے قبل کا یورپ باوجود اپنی اندرونی رقابتوں کے جنہوں نے بالآخر اس مہلک جنگ کی شکل اختیار کی، ایک مشترک خیال رکھتا تھا یعنی مغربی تہذیب کے دوسرے تمدنوں اور تہذیبوں سے برتر و افضل ہونے کا یقین اور ان 'پست' اور 'نیم متمدن' قوموں سے ہر قسم کا سیاسی اور معاشی فائدہ حاصل کرنے کا خداداد حق۔ جنگ نے اس یقین کو متزلزل کر دیا اور اس حق کو تقریباً مٹا دیا۔ خود ساری مغربی دنیا دو ٹکڑے ہو گئی اور جنگ کے ختم ہونے کے ۷۔۸ سال بعد تک یہ ٹولیاں تقریباً اس طرح بندھی رہیں۔ لیکن یورپ نے محسوس کر لیا کہ معاملہ اس طرح زیادہ دن نہیں چل سکتا۔ دشمن دوست کی پرانی تقسیمیں آخر کب تک قائم رکھی جائیں۔ دول یورپ نے پھر اپنے تعلقات کو استوار کرنے کی کوشش شروع کی۔ ۲۶-۱۹۲۵ء میں یورپین سیاست نے ایک کروٹ لی۔ سیاسی فضا بدلی، ہر طرف اتفاق و اتحاد کے پرچے ہونے لگے۔ اور سب ملکوں کے سیاسی خطیبوں کی متحدہ کوشش نے وہ چیز پیدا کر دی۔ جسے "لوکارنو کی ذہنیت" کہا جاتا ہے۔ لیکن خطیبوں کا پیدا کیا ہوا اتحاد بہت اتھلا اتحاد ہوتا ہے۔ چنانچہ یورپ میں بھی تھوڑے دن تو اتحاد و اتفاق کی یہ غیر حقیقی فضا رہی۔ مگر جب ہر ملک کے مدبروں نے اس فضا میں اپنے حقیقی مسائل کا حل نکالنا چاہا تو یہ اتفاق و اتحاد مشکل نظر آیا اور ہر قوم نے سمجھ لیا کہ ایک متحدہ یورپ بنانے کے لئے پہلے اپنے مخصوص مقاصد کی نگہبانی کر لینی چاہئے تاکہ جب مغربی تہذیب کے متحدہ ایوان کی بنیادیں پڑیں تو انکا مخصوص گوشہ نظر انداز نہ کر دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کی سب بااثر اور مقتدر قومیں آج یورپ اور دنیا کے مستقبل کو اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے دیکھ رہی ہیں۔ ہر ایک کسی خیال، کسی تصور کا حامل اور حامی بنا ہوا ہے اور اس سے اپنی سیاست میں کام لے رہا ہے۔

انگلستان اور ریاستہائے متحدہ امریکہ اینگلو سیکسن نسل اور انگریزی زبان کے اتحاد کے تصور کے زیر اثر اپنی رقابتوں کو طے کرنے پر آمادہ ہیں۔ خود برطانیہ میں سلطنت کے تصور کو پھر بہت فروغ دیا جا رہا ہے۔ ہوور اور میکڈانلڈ کی گفتگوؤں میں امریکہ کے صدر نے اگرچہ بالکل واضح کر دیا کہ ہمیں یورپ کے معاملات میں دخل دینے کی خواہش نہیں۔ یہ کام اینگلو سیکسن دنیا کی طرف سے انگلستان کو انجام دینا چاہئے، اور اس وقت سے یورپین سیاست میں انگریزی وزارت خارجہ کی بات کا وزن بہت بڑھ گیا ہے۔ لیکن موجودہ وزارت بظاہر بالڈون کی کمزور وزارت سے بھی زیادہ احتیاط سے کام لے رہی ہے اور یورپ کی سیاسی الجھنوں میں آلودہ ہونے کے بجائے پوری کوشش کر رہی ہے کہ سلطنت برطانوی کے تصور کو زیادہ قوی کیا جائے۔ لارڈ بیوربروک نے اپنے سارے اخبارات اس خیال کی حمایت و اشاعت کے لئے وقف کر دئے ہیں، لارڈ ملجت نے معاشی حلقوں کو اسکا ساتھی بنا دیا ہے۔ مصر کے معاملہ اور ہندوستان کو کانفرنس کا بلاوا اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ اس سال سلطنت برطانیہ کی جو کانفرنس ہوگی اس سے بھی تصور اتحاد کو بہت کچھ تقویت دیجائے گی۔

اپنے مخصوص مقاصد اور جدا نصب العین کا احساس اٹلی میں بھی بہت قوی ہے۔ اس نے فاشزم کے نئے مسلک کو فروغ دے کر اپنی ساری قومی زندگی کو اس کے تحت میں لانے کی کوشش کی ہے۔ نیز دیگر ممالک میں جہاں پارلیمنٹی حکومت کے نقائص ظاہر ہو رہے ہیں اس تصور کو پھیلانے کی کوشش کر رہا ہے وہ جنوب و مغربی یورپ میں بھی اپنا تسلط چاہتا ہے۔ اور شمالی افریقہ میں بھی۔ لیکن قوم میں ریاست کا ایک نیا تصور پیدا کر کے ایک نئے خیال کی تخلیقی اور توسیعی قوت سے کام لے کر۔

فرانس کے جذبہ وطنیت اور اپنی تاریخی و تمدنی قوتوں پر اعتماد کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ وہ

رپ ہی میں نہیں، افریقہ میں بھی اپنی رندی و ہوسناکی کا سکہ جمانے کے درپے ہے ۱۹۲۴-۲۵ء
یں یورپ کے اندر اسکا بنا ہوا نقشہ ذرا بگڑنے لگا تھا. لیکن ۱۹۲۶ء سے یہ برابر اس کو مضبوط
رنے میں ساعی ہے۔ اس کی سیادت میں ائتلاف صغیر کی ریاستوں نے جو فوجی او رمعاشی
معاہدے کئے ہیں ان سے اسکا ثبوت ملتا ہے۔ فرانس ہی یورپ میں اس وقت ایسی قوم ہے
جس نے دس سال سے بھی زیادہ ریاستوں کا ایک جتھا بنا رکھا ہے جس پر اس کے نزدیک
یورپ کے آئندہ امن چین کا بڑی حد تک دار و مدار ہے۔ یہی ایک ملک ہے جو اپنی مخصوص
روایات، اپنی ملک پرستی کے باعث اپنے ماحول کے تغیرات و انتشارات سے سب سے
کم متاثر ہے۔

جرمنی جو ابھی تک جنگ عظیم کے زخموں سے چور ہے وہ بھی جہاں یورپ کی دوسری قوموں
کے اختلافات سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے وہاں اس سے بھی بے خبر نہیں کہ
بغیر اپنے کسی مخصوص قومی خیال اور مقصد کے اسکا آگے بڑھنا مشکل ہے۔ اس نے بھی جرمانی اللسان
وسطی یورپ کے اتحاد کو اپنا قومی مقصد بنایا ہے۔ اور اس کے لئے نہایت مستعدی اور بہت
کچھ کامیابی کے ساتھ ساعی ہے۔

روس تو تہذیب حاضر کی بنیادوں ہی کو بدل دینے کے درپے ہے اور اس نے
اپنے نئے خیال کے ساتھ بے مایہ اور نادار طبقہ کی ذہنی روحانی اور کرب قلبی کو ملا کر دنیا کی سیاست
اور دنیا کی ذہنیت میں ایسے انقلاب کی طرح ڈالی ہے جس کی کامیابی یا ناکامی نتائج و عواقب
کی اہمیت و ہمہ گیری کے لحاظ سے تاریخ عالم کی بڑی سے بڑی تحریک کی کامیابی یا ناکامی
کے ہم پلہ ہوگی۔

ان سب باتوں کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت اس لئے پڑی کہ ان سے ہندوستان کی موجودہ سیاست خصوصاً مسلمانانِ ہند کی سیاست کے لئے سبق ملتا ہے۔ یورپ کی طرح ہندوستان میں بھی تقریروں اور نظموں اور جلسوں اور اخباری تحریروں کے زور پر جسمِ سیاسی کے دو اہم ترین حصوں، ہندو اور مسلمانوں میں، اتحاد و تعاون کی سبیل نکالی گئی تھی۔ یہ کوشش کامیاب ہوئی لیکن دیرپا نہ ہوسکتی تھی نہ ہوئی۔ یورپ کی طرح ضرورت تھی کہ مقرروں کی جگہ مرتب ذہن اور ٹھنڈے مزاج کے لوگ قومی مقاصد کا تعین کرکے معاملات میں مفاہمت کی کوشش کریں۔ مفاہمت نہ ہوسکے اور اختلافات اصولی ہوں تو ہاں لڑیں جھگڑیں بھی۔ لیکن یہ جانکر کہ کس چیز کے لئے لڑ جھگڑ رہے ہیں اور ایسی چیز کے لئے جس پر لڑنا جھگڑنا کسی جماعت کے شایاں شان ہو، ایسی چیزوں کے لئے جن میں عملی انہماک اس بات کا زندہ ثبوت دیتا ہو کہ یہ جماعتی زندگی کے لئے اصولی چیزیں ہیں جنہیں پس پشت نہیں ڈالا جاسکتا۔

ہندوؤں میں ہندو مہاسبھا نے مخصوص ہندو اغراض کی تنگ دلی اور کوتہ بینی کے ساتھ ترجمانی کی لیکن ایک نہایت محدود قسم کی وطن پرستی کے علاوہ جو ایک مخصوص گروہ کی فلاح کی کوشش سے عبارت تھی اس نے خود ہندو قوم کے سامنے کوئی مثبت تصورِ تعمیری پیش نہیں کیا۔ تنفر اور بیزاری کے منفی جذبوں پر اپنے کام کی بنیاد رکھکر اس نے اس کام کی ناپائداری اور بے وقعتی کا انتظام کر لیا ہے۔ مسلمانوں میں بھی کسی جماعت نے کوئی مثبت مطمحِ نظر سیاسی اور تمدنی زندگی کا نہ اپنے لئے بنایا نہ دوسروں کے سامنے پیش کیا۔ افسوس کہ مقرروں اور خطیبوں کے بعد جن مدبروں کی ضرورت تھی وہ ہم میں نہ نکلے۔ اور ہم جب ملک کی دوسری جماعتوں سے ملے تو اس وقت بھی کوئی مخصوص اسلامی مطمحِ نظر ہم نے پیش نہیں کیا، کوئی مطمحِ نظر جو ہمارے مخصوص حقوق کو حق بجانب ہی نہ بناتا بلکہ خود ملک کی سیاسی اور تمدنی زندگی کو اپنے اثر سے بہتر اور جامع تر بنا سکتا۔ ہم جب ملے تو اس وقت بھی ہم نے تمدنی

ندگی کے کسی خاص تشکیل، قومی زندگی کے کسی خاص ذہنی عنصر کی خاطر ایسا نہیں کیا یا اگر کیا تو بے جانے
ورا اوروں کو جتائے بغیر۔ ہر شخص مسلمانوں کے لئے مخصوص نیابت کا حق مانگتا ہے، ہر شخص انکے لئے
جگہیں محفوظ کرانا چاہتا ہے، نیابتی جماعتوں ہی میں نہیں ملازمتوں میں، مدرسہ میں طالبعلموں کی تعداد
میں، وظائف میں، خطابوں میں، انعامات میں۔ لیکن کوئی خدا کا بندہ یہ نہیں بتلاتا کہ حیات قومی میں مسلمان
کن مفید چیزوں کے حامل ہیں، کن اچھے مقاصد کے حامی ہیں، زندگی اور اسکے مسائل کے حل
کے لئے کیا خاص نقطۂ نظر انکے اثر سے فروغ پا سکتا ہے، یہ خود اپنی کن چیزوں کی حفاظت کے لئے
نمائندگی و نیابت میں تحفظ کے طالب ہیں، اب اس وقت اپنی کوشش اور عمل سے اپنی جماعتی زندگی
سے انئے ان چیزوں کے ضروری ولابدی ہونے کا کیا اور کتنا ثبوت دے رہے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے
کہ خود ہماری سیاسی زندگی میں آج جتنا انتشار ہے شاید پچھلے پچاس سال میں کبھی نہیں ہوا۔ کوئی
مسلمانوں کے نام سے اپنی حیثیت کے سدھارنے یا برقرار رکھنے میں ساعی دکھائی دیتا ہے، کوئی اپنے
لئے نوکری چاہتا ہے، کوئی اپنے عزیزوں کے لئے، کوئی خطاب کا طالب ہے، کوئی بس ایک تبسم لطف
آمیز کا۔ یہ سب چیزیں محدود ہیں اور کچھ کو ملجائیں تو لازماً کچھ کو محروم رہنا پڑتا ہے۔ اس لئے ہر شخص
کامیابوں کے زمرہ میں داخل ہونے کے لئے دوسروں کی ناکامی کا ارادۃً یا بلا ارادہ سامان کرتا ہے۔
اگر مسلمانوں کا مطالبہ حقوق واقعی چند اشخاص کے شخصی فائدہ یا نقصان کا معاملہ ہوتا تو اس میں
کچھ زیادہ فکر کی بات نہ تھی۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس ملک کی حیات اجتماعی میں مسلمانوں کے بعض
مخصوص وظائف ہیں جن کا صحیح طور پر انجام پانا مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ ملک اور انسانیت
کے لئے ضروری ہے۔ اگر مسلمان اکثر ہندوستان کی توہم پرستی میں آزادی خیال کے حامی رہے
ہیں اور رہ سکتے ہیں، اگر بیجا جماعتی پابندیوں کی فضا میں یہ شخصیت انفرادی کے حق کی اہمیت جتا کر
ایک صحیح جماعتی توازن پیدا کرنے کے باعث ہوئے ہیں اور ہو سکتے ہیں۔ اگر تنگ نظر ملک پرستی
کی غلطی نے انکی وسعت نظر سے اصلاح پائی ہے اور اب بھی پا سکتی ہے، اگر انکی بین الاقوامی حیثیت
سے آزاد ہندوستان کی سیاست کے لئے نہایت قیمتی خدمات انجام پا سکتی ہیں، اگر تمدن ہند

میں انکا حصہ، زبان میں، ادب میں، تعمیرات اور فنون لطیفہ میں، مذہبی اور معاشرتی تحریکوں میں ایسا رہا ہے کہ اس حصہ کا تلف ہو جانا ہندوستان کے تمدن کو اپنی موجودہ حیثیت سے بدرجہا پست کر سکتا اور جس کا ترقی پانا اس تمدنی زندگی کو چار چاند لگا سکتا ہے۔ تو ان صفات کے حاملوں کو بہ حیثیت جماعت، قائم رکھنا، اور ان کی ترقی کے وسائل بہم پہنچانا مسلمانوں کی خاطر نہیں بلکہ ہندوستان اور انسانیت کی خدمت ہے۔ مسلمانوں کا کام ہے کہ وہ اپنے ان مخصوص وظائف کا احساس اپنے اندر پیدا کریں اور اپنے عمل سے سب پر ثابت کریں کہ انکی جماعتی زندگی کی غایت انہیں مقاصد و خدمات کا پورا کرنا ہے۔ مسلمانوں کی جماعتی زندگی کی سب سے اہم ضرورت ایسی قیادت ہے جو انکے تخیل کی سطح کو شخصی اغراض کی پستی سے اٹھا کر مخصوص جماعتی صلاحیت خدمت کے احساس پر پہنچا دے۔ اور ایسی جماعتیں جو ان مخصوص وظائف کو اس وقت سے بلا لحاظ اس کے کہ کوئی ہمارے حقوق کو تسلیم کرے یا نہ کرے، ہم کسی سے ملے ہوں یا روٹھے ہوں، استقلال و پامردی سے انجام دیتی رہیں کہ یہی مخصوص حقوق کے تسلیم کرنے کی تنہا ضمانت ہے۔ ان دونوں چیزوں کو افسوس کہ آنکھیں ڈھونڈتی ہیں پر نہیں پاتیں۔ نہ ہم میں وہ مفکر ہیں جو ہمارے سرمایۂ ذہنی کو زندہ رکھیں اور ترقی دیں، نہ وہ خطیب و مبلغ ہیں جو اس سرمایہ کو ساری جماعت کی ذہنی ملک بنا دیں، نہ وہ اہل دل ہیں جو دوسرے کے دلوں میں ان اعلیٰ مقاصد کو عمل کا جامہ پہنانے کی لگن لگا دیں، نہ وہ مستقل مزاج کارکن ہیں جو ناکامی و کامیابی کی دھوپ چھاؤں سے بے نیاز اپنے کام میں لگے رہیں۔

اپنی محفل میں نہ دیوانے نہ فرزانے رہے

کیا یہ توقع بیجا ہوگی کہ مسلمانوں کی تعلیم گاہیں بہ حیثیت ذہنی مرکزوں کے اس صورت حال کے بدلنے میں کچھ مدد دے سکیں گی؟ اگر کچھ امید ہے تو انہیں سے ہے۔ باقی تو اللہ کا نام ہے اور بس۔

مطبوعات

ہندوستانی اکاڈمی صوبہ متحدہ

۱- ازمنہ وسطیٰ میں ہندوستان کے معاشرتی اور اقتصادی حالات — از علامہ عبداللہ یوسف علی ایم اے ایل ایل ایم سی بی ای - مجلد قیمت ایک روپیہ چار آنے - غیر مجلد ایک روپیہ -

۲- اردو زبان اور ادب - از سید مسعود حسن رضوی - قیمت ایک روپیہ

۳- مغلوں سے پہلے عرب اور ہندوستان کے تعلقات — از مولٰنا سید سلیمان صاحب ندوی

قیمت چار روپے (للعہ)

زیر طبع

۱- مسلمانوں کے تمدن پر ہندوؤں کا اثر - از مولنا محمد امین صاحب عباسی

۲- قرون وسطیٰ کا ہندوستانی تمدن - از رائے بہادر مہامہوپادھیایہ پنڈت گوری شنکر ہیراچند اوجھا

۳- ہندی شاعری - از ڈاکٹر اعظم کریوی -

۴- ناتن (جرمن ڈراما) ترجمہ مولانا محمد نعیم الرحمن صاحب ایم اے - ایم آر اے ایس

۵- ترقی زراعت - از خانصاحب مولوی محمد عبدالقیوم ڈپٹی ڈائرکٹر زراعت الہ آباد

ملنے کا پتہ: جنرل سکرٹری ہندوستانی اکیڈمی (یو - پی) الہ آباد

Hosain. Bin Salih
Student of Secondary II
Jamia Millia Islamia
Karol Bagh
Delhi

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی

جلد ۱۴	بابتہ ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۰ء	نمبر ۴

فہرست مضامین

مسیح الملک مرحوم کا سفرنامہ یورپ

مسیح الملک مرحوم ومغفور کی وفات کے بعد ہی میں نے کوشش کی تھی کہ ان کے کاغذات ومسودات کو محفوظ کر دیا جائے اور جہاں تک میری دسترس تھی میں نے جستجو کی، لیکن یہ ایک تعجب انگیز اور تکلیف دہ حقیقت ہے کہ سوائے چند منتشر پرچوں اور دس بیس خطوط کے مرحوم کے سامان میں اور نیز دفتر میں کاغذات کا کوئی ایسا ذخیرہ نہ ملا جو انکے کسی سوانح نگار کے کام آسکتا۔ مسیح الملک مغفور اپنی زندگی میں ذاتی طور پر ہمیشہ بے سروسامان رہے، دولت اور عزت کی بہت بلند سطح پر پہنچنے کے بعد انکی زندگی میں معمولی ضروریات کا سامان بھی اسقدر کم تھا کہ جب کوئی لمبا سفر درپیش ہوتا تھا تو اکثر دھوبی کے یہاں سے دُھلے ہوئے کپڑے منگائے جانے کی فکر کیجاتی تھی، گاڑھے کے چند کرتے اور پاجامے اور چند اچکنیں ایک پرانے سوٹ کیس میں، یہ سب سامان تھا جو انکے لئے کافی ہوا کرتا تھا اور اپنے اس توشہ خانہ کی بھی انکو کبھی خبر نہ ہوتی تھی کہ کتنے کپڑے پھٹ گئے اور کتنے باقی ہیں۔ خاص خاص نیازمندان چیزوں پر نظر رکھتے تھے اور جب کبھی اس "توشہ خانہ" کی خراب حالی کا ان میں سے کسی کو علم ہوجاتا تھا تو پانچ چار کرتے پاجامے تیار ہوجاتے تھے، مجھے یاد ہے ایک دفعہ غریب خانہ پر تشریف لے گئے تو تین برس کا ایک پرانا جوتہ پاؤں میں تھا جو غالباً سوداگر کی دوکان سے آنے کے بعد کبھی معمولی کپڑے سے بھی صاف نہیں کیا گیا تھا، پالش یا روغن کا تو ذکر ہی کیا! چمڑا گھس کر اُدھارہ گیا تھا، ٹانکے گھس گھس کر کھل گئے تھے لیکن وہی جوتہ ہز ہائنس نواب صاحب رامپور کے ایرانی قالینوں پر بھی بے تکلف جاتا تھا اور بڑے بڑے عالی مقام رفیقوں

مسیح الملک مرحوم کے سفر نامہ کا ایک صفحہ

عام طور پر (ہندوستانیوں) کہا جاتا ہے کہ جب انگریز عہدہ دار جب جہاز پر سوار ہوتے ہیں تو ان کی وہ شان نہ
کمزوریاں جو ہندوستان میں دیکھی جاتی ہیں بہت کم ہو جاتی ہیں اور یہ بڑی حد تک صحیح ہیں لیکن اسکے
ساتھ ہی اتنا ضرور ہے کہ دوسرا رخ کو بھی دیکھنا چاہیئے اور [illegible] یہ کہ جہاز پر سوار ہونا خود
جو ہندوستانیوں کی بابت ہوتی ہے۔ اور وطن سے باہر نکلتے ہوئے جہازی زندگی کا ان پر کیا اثر ہوتا ہے
میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ "کیرو ہائنز" (کھوٹ) ایک مسلح اور بڑی ہوئی طاقت ہے۔ اور یہ ایک چھوٹا سا
مظہر جہازی زندگی میں ہے جہاں ایک طرف انگریز غرور کی فضا سے دور ہونے کی وجہ سے کچھ تبدیلیاں ہی
دکھائی دیتے ہیں دوسرے معلوم ہوتا ہے کہ انفرادی ذات اور کمیشن کی فضا کو ترک کرنے کی وجہ سے نسبتاً آزادی کی
ہوا میں سانس لیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں لیکن ہندوستانی باشندوں کی جہازی زندگی میں جو کچھ کمزوریاں
معلوم ہوتی ہیں اور جو سفر کے آخری لمحوں تک آتی ہیں وہ اکثر دن کی وہ ساز رہتی ہیں وہ انکی کورانہ
تقلید ہے جس کا آغاز وہ جہازی زندگی سے عام طور پر کرتے ہیں۔ انکی رفتار، گفتار اور انکی کردار
میں بالکل تبدیلیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ گو وہ خیال کرتے ہوں مگر واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی غلامی کے اثرات

میں سے یورپ میں تہذیب اور شائستگی کی تقلید بھی ایک ایسا اثر ہے جو اس قوم سے دور رہنا چاہیئے
جو کسی آئندہ زمانہ میں اپنی قومیت کو اپنی روایات، اپنی شائستگی اور اپنی تہذیب کے برقرار رکھنے
کی وجہ سے محفوظ رکھنے اور ایک ایشیائی قوم کی حیثیت سے ترقی کرنا چاہتی ہے۔

یہ تقلید گو ہندوستان کے ہر ایک فرد کے لئے باعث شرم ہو سکتی ہے لیکن اس جہاز کی بعض ہندوستانی
خواتین کی حرکات و سکنات ہم سب کے دلوں کو زیادہ دکھا رہی ہیں جس کی وجہ صرف ایک ہی ہے کہ ہم بدقسمتی
سے اپنی تعلیم و تربیت کے خود مالک نہیں ہیں۔ اور جس راستہ پر ہم اپنی قومی تعلیم و تربیت کو لانا چاہتے ہیں
نہیں لا سکتے۔ یہ سب چیزیں ہندوستانیوں کو اسی وقت میسر ہو سکتی ہیں جبکہ وہ اپنے ملک کے انتظام
کی باگ اپنے ہاتھوں میں لے سکیں اور اسکے ساتھ ہی ملکی اور قومی نقطہ نگاہ سے تعلیم و تربیت
کا بندوبست کر سکیں۔ موجودہ حالت میں جبکہ گورنمنٹ [illegible] نے ہماری خود [illegible] قومی مسائل کی باگ اپنے
ہاتھ میں لے رکھی ہے ہمیں یوں سمجھنا چاہیئے کہ ہم اپنے ملک کی کوئی چھوٹی سی خدمت بھی [illegible] سے انجام دے سکتے ہیں۔

Murari Art Press Delhi

کی آراستہ کوٹھیوں پر بھی۔ مجھے جوتے کی یہ حالت نہ دیکھی گئی تو بازار سے ایک نیا جوتہ منگوا کر میں نے دروازے پر رکھوا دیا اور پرانے جوتے کو وہاں سے اٹھوالیا جب موٹر میں سوار ہونے کے لئے اُٹھے تو اتفاقاً جوتہ پر نظر پڑ گئی یا شاید پاؤں نے نئے اور پرانے جوتے کے فرق کو محسوس کیا، پاؤں آگے بڑھا کر نئے جوتے کو دیکھا پھر میری طرف دیکھا، مسکرائے، اور خاموش ہوگئے! میلی اچکن پرانی ٹوپی بوسیدہ جوتے، مسلمانوں کے سب سے بڑے لیڈر اور بہترین انسان کی یہ شان اور یہ وضع تھی، دولت اور شہرت سے انکا نفس مستغنی تھا اور جسم و جان کی آرایش سے وہ ہمیشہ بے پروا رہتے تھے جس انسان کی بے نفسی کا یہ عالم ہو وہ دنیا میں اپنی بڑائی اور عالی مقامی کی کاغذی سندیں کیوں چھوڑ کر جائے! اس گذری ہوئی زندگی کا ایک افسانہ انکے نیازمندوں کی زبانوں پر ہے۔ کتابوں اور اخبارات کے صفحات پر وہ اصلی تصویریں نہیں مل سکتیں جس کو ہماری آنکھوں نے ایک دفعہ دیکھ لیا اور پھر کبھی نہ دیکھیں گی۔

۱۹۲۵ء میں جب صحت کی خاطر مرحوم کو سفر یورپ اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا، تو خوش قسمتی سے میں بھی اُس زمانے میں فرانس میں مقیم تھا اور عرصہ تک اس سفر میں مرحوم کے ساتھ رہا۔ اُس زمانہ میں انکے کچھ کاغذات میں نے ایک بکس میں محفوظ کر دئے تھے، وہی ایک چھوٹا سا بکس انتقال کے بعد میرے ہاتھ آیا۔ اور وہی اُنکے سوانح نگار کا سارا کاغذی سرمایہ ہے۔ ان کاغذات میں ایک نامکمل مسودہ حالات سفر کا بھی ہے جس کو انہوں نے سفرنامے کے رنگ میں لکھنا شروع کیا تھا، لیکن غالباً ہندوستان واپس آکر اس کو مکمل کرنے کا وقت نہ ملا۔ اور وہ اوراق منتشر حالت میں مجھ تک پہنچے، اُس مسودہ کے چند صفحات جو آج شائع ہوتے ہیں،"جامعہ" کے ناظرین کے لئے محض ایک تبرک ہے جس میں کہیں کہیں

مسیح الملک مغفور کے خیالات کی ایک جھلک بھی نظر افروز ہوگی ۔

عبدالغفار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

تمہید میں اس سے پہلے ۱۹۰۴ء میں ہندوستان سے باہر عراق کی سیاحت کی غرض سے گیا تھا اور کچھ یادداشت سفر بھی لکھیں تھیں لیکن وقت نہ ملنے کی وجہ سے میں اُسے مکمل نہ کرسکا اور اس وجہ سے سفر عراق کے نتائج جو میرے دماغ میں تھے اُنہیں اوراق تک لانیکی نوبت نہ آئی ۔

دوسرا سفر میں نے ۱۹۱۱ء میں یورپ کا کیا اس سفر میں انگلینڈ، فرانس، جرمنی آسٹریا اور ٹرکی کی سیاحت کی لیکن یہ سیاحت اُسی قسم کی تھی جیسی کہ آجکل امریکن مسافر کیا کرتے ہیں اسکے علاوہ میں نے دوران سفر میں کوئی یادداشت بھی نہیں لکھی تھی اس لئے یہ سفر بھی نتائج کے لحاظ سے عقیم رہا جس کا وہ مستحق بھی تھا۔

اب ۱۹۲۵ء میں پھر میں ہندوستان سے باہر جارہا ہوں اور یہ ارادہ کرتا ہوں کہ حالات سفر برابر لکھتا رہوں گا کہ واپسی پر احباب کے سامنے ایک حقیر ہدیہ پیش کرسکوں ۔

یہ تیسرا سفر دماغ اور اعصاب کو جن کی حالت برسوں کی متواتر تکان کی وجہ سے واقعی طور پر قابل رحم ہوگئی تھی آرام وسکون پہنچانے اور اس وجہ سے جو صدمہ عام صحت کو پہنچ گیا تھا اُسے دور کرنے کی غرض سے ناگزیر طور پر اختیار کیا گیا ہے ۔

میرے محترم بھائی ڈاکٹر انصاری صاحب نے ایک دن مجھ سے کہا کہ اگر تم آرام کرنے کے خیال سے سفر کرنا چاہتے ہو تو میں تمہارے ہمسفر برابر رہوں گا۔ اُنکی اس برادرانہ محبت وہمدردی نے جس کا میں شکرگذار ہوں بالآخر مجھے اس سفر پر آمادہ کردیا۔

میرے ارادۂ سفر کی وجہ سے میرے عزیز دوست قمر شاہ خانصاحب بیرسٹرایت لا بھی

جو رامپور کے ایک معزز اور شریف خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور آج کل ہوڈیشل سکرٹری کی خدمات کو ریاست مذکور میں انجام دیتے ہیں آمادہ سفر ہو گئے لیکن وقت پر بعض موانع کی وجہ سے وہ اپنی آمادگی پر قائم نہ رہے اور اس طرح سے افسوس ہے کہ ہمارے مثلث کا یہ زاویہ قائم نہ رہ سکا مگر اسے زیادہ عرصہ نہیں گزرنے پایا تھا کہ برادر مکرم نواب سر امیر الدین خانصاحب بہادر کی آمادگی سفر نے اس نقصان کی تلافی کر دی جو عزیز قمر شاہ خانصاحب کے ترک ارادہ کی وجہ سے اس مثلث کو پہنچا تھا۔

نواب صاحب کے ہمراہ حکیم محمد نبی صاحب سند یافتہ طبیہ کالج دہلی بھی بطور ایک سکرٹری کے تھے جن کی وجہ سے انہیں اور مجھے دونوں کو آرام مل رہا ہے۔

بہرحال ہم تین دوستوں کا مختصر گروہ بمبئی میں پہنچ گیا اور ۱۰ اپریل ۱۹۲۵ء کو "رزمک" جہاز پر دوپہر کے بعد سوار ہو گیا۔

بمبئی سے مارسیلز تک جہازی سفر

جس جہاز پر ہم سوار تھے اور جس کا نام رزمک ہے اس کا وزن دس ہزار ٹن ہے گو یہ جہاز بڑا نہیں ہے لیکن نیا بنا ہوا اور صاف ہے۔ ہندوستان سے مارسیلز کا سفر اس کا پہلا سفر ہے۔

اس جہاز کے پہلے اور دوسرے درجہ کے تمام مسافروں کی مجموعی تعداد ۱۸۳ ہے جس میں چھوٹی عمر کے لڑکے اور لڑکیاں شامل نہیں ہیں۔ اس جہاز کی رفتار فی گھنٹہ سولہ سترہ ناٹ کی ہے جو بحری میل ہے اور جو ہندوستان کے میل سے کسی قدر کم ہے

"رزمک" کے ممتاز مسافروں میں سے ہز ایکسلنسی لارڈ ریڈنگ، مہاراجہ صاحب گوالیار اور سر ہارکورٹ بٹلر گورنر برہما ہیں۔ انکے علاوہ اور بہت سے ہندوستانی احباب بھی ہیں جنکا ذکر اس حصہ سفر میں کسی نہ کسی جگہ آجائے گا لیکن غلطی ہوگی اگر ان احباب کی فہرست میں سے ایک دوست کو نمایاں جگہ نہ دیجائے۔ جو قابل اور بالیاقت ہونے کے علاوہ خاص خصائل کے مالک بھی ہیں۔ بہت کم آدمی انہیں انکے قیافہ سے سمجھ سکتے ہیں۔ یہ دیکھنے میں سیدھے ہیں لیکن

جب کوئی بات تحقیق کی غرض سے انہیں سپرد کیجائے تو ایسا معلوم ہوگا کہ سوراج کے زمانہ میں غالباً یہی شخصیت سی۔ آئی۔ ڈی کے محکمہ میں سب سے اوپر آنے والی ہے۔ انہیں بات کرنے کی بہت کم عادت ہے اور بظاہر بہت پُر تمیلے ہیں لیکن ضرورت کے وقت اپنے کھانیکی میز سے تیسری یا چوتھی میز کے کسی مرد یا عورت سے بے تکلف باتیں کرلیا کرتے ہیں۔ ان کا مقولہ ہے کہ بات کرنے کے لئے کسی تعارف یا شناسائی کی ضرورت نہیں ہے۔

جہاز کی زندگی

جب کوئی شخص جہاز پر سوار ہوتا ہے تو وہ اپنے گرد وپیش کو بہت ہی تنگ دائرہ میں دیکھتا ہے اور اس وجہ سے اس کی مصروفیتیں بہت ہی محدود ہوجاتی ہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ واقعی طور پر چونکہ اُس کے پاس کوئی خاص کام باقی نہیں رہتا اسلئے وہ اس مختصر دنیا میں بھی اپنے لئے مناسب اشغال پیدا کرلیتا ہے۔

صبح کی بیداری پر پہلا کام بستروں پر چائے نوشی ہوتی ہے۔ اور اس کے بعد غسلخانوں پر حملہ شروع ہوجاتا ہے اس سے اور تبدیل لباس سے جب فراغت حاصل ہوتی ہے تو صبح کی حاضری کی گھنٹی جو ڈھنڈورے کی طرح جہاز کے ہر درجے میں ایک آدمی بجاتا ہوا تیزی کے ساتھ نکل جاتا ہے اُسے کھانیکے کمرہ میں پہنچا دیتی ہے اس حاضری سے جب نجات ملتی ہے تو "ڈک" کی چہل پہل کا آغاز ہوتا ہے۔ رات کی نیند کی مزاج پرسیاں شروع ہوتی ہیں موسم کی گرمی یا خشکی پر گفتگو ہوتی ہے۔ سمندر کی لطیف ہوا پر تبادلِ افکار ہوتا ہے۔ اور وہ لوگ جو ڈاکٹر انصاری اور میری طرح بدقسمتی سے خوش قسمت یا خوش قسمتی سے بدقسمت نہیں ہیں۔ تنہا گردش کرتے ہوئے یا کرسیوں پر بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں۔

عام طور پر "ڈک" کی مشغولیتوں کو اگر تقسیم کیا جائے تو ذیل کے نمبروں میں انہیں محدود کرکے بیان کیا جاسکتا ہے۔

(۱) گشت

(۲) کتاب بینی

(۳) نیند اور خراٹے

(۴) رقص و سرود

(۵) جہاز کی رفتار پر شرط بازی

اگرچہ گشت کا سلسلہ دن بھر کم و بیش جاری رہتا ہے لیکن اس کی اہمیت اور دلچسپی رات کے کھانے کے بعد بڑھ جاتی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جہازی ان گھڑیوں کا آغاز جو دن بھر کی سست زندگی میں کسی قدر چستی پیدا کر دیتی ہیں رات کے کھانے کے بعد سے ہوتا ہے۔ اور اس وقت تک خوشدلی باقی رہتی ہے جب تک کہ مسافر اپنے اپنے بستروں پر نہیں جاتے ہیں۔

عام طور پر ہندوستان میں کہا جاتا ہے کہ اس کے انگریز عہدہ دار جب جہاز پر سوار ہوتے ہیں تو انکی وہ انسانی کمزوریاں جو ہندوستان میں دیکھی جاتی ہیں بہت کم ہو جاتی ہیں اور یہ بڑی حد تک صحیح بھی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی تصویر کے دوسرے رُخ کو بھی دیکھنا چاہئے اور بتانا چاہئے کہ جہاز پر سوار ہونے کے بعد خود ہندوستانیوں کی کیا حالت ہوتی ہے اور وطن سے باہر نکلتے ہوئے جہازی زندگی کا اُن پر کیا اثر ہوتا ہے۔ میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ "کمپرومائز" (سمجھوتہ) ایک مسلّم اور مانی ہوئی طاقت ہے۔ اور اس کا ایک چھوٹا سا مظہر جہازی زندگی بھی ہے جہاں ایک طرف انگریز غرور کی فضا سے دور ہونے کی وجہ سے کچھ بہتر حالت میں دکھائی دیتے ہیں وہاں غلام قوم کے افراد بھی ذلت اور نکبت کی فضا کو ترک کرنے کی وجہ سے نسبتہً آزادی کی ہوا میں سانس لیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ہندوستانی بھائیوں کی جہازی زندگی میں جو مجھے کمزوریاں معلوم ہوتی تھیں اور جو سفر کے آخری لمحوں تک ان میں سے اکثروں کی دمساز رہتی ہیں وہ انکی کورانہ تقلید ہے جس کا آغاز وہ جہازی زندگی سے عام طور پر کرتے ہیں، اُن کی رفتار، گفتار اور انکی کردار میں نمایاں تبدیلیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ گو وہ خیال کرتے ہوں مگر واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی غلامی کے اثرات میں سے یورپین تہذیب اور شائستگی کی تقلید بھی ایک ایسا اثر ہے جو اُس قوم سے دور رہنا چاہئے جو کسی آئندہ زمانہ میں اپنی قومیت کو اپنی روایات

اپنی شائستگی اور اپنی تہذیب کے برقرار رکھنے کی وجہ سے محفوظ رکھنا اور ایک ایشیائی قوم کی حیثیت سے ترقی کرنا چاہتی ہے ۔

یہ تقلید گو ہندوستان کے ہر ایک فرد کے لئے باعث شرم ہو سکتی ہے لیکن اس جہاز کی بعض ہندوستانی خواتین کی حرکات و سکنات ہم سب کے دلوں کو زیادہ دکھا رہی تھیں جس کی وجہ صرف ایک ہی ہے کہ ہم بد قسمتی سے اپنی تعلیم و تربیت کے خود مالک نہیں ہیں ۔ اور جس راستہ پر ہم اپنی قومی تعلیم و تربیت کو لانا چاہتے ہیں نہیں لا سکتے ۔ یہ سب چیزیں ہندوستانیوں کو اُسی وقت میسر آ سکتی ہیں جبکہ وہ اپنے ملک کے انتظام کی باگ اپنے ہاتھوں میں لے سکیں اور اُس کے سایہ میں ملکی اور قومی نقطۂ نگاہ سے تعلیم اور تربیت کا بندوبست کر سکیں ۔ موجودہ حالت میں جب گورنمنٹ نے ہماری ضرورتوں کی ساجری اپنے ہاتھ میں لے رکھی ہے ہمیں یوں سمجھنا چاہیئے کہ ہم اپنے ملک کی کوئی چھوٹی سی خدمت بھی مشکل سے انجام دے سکتے ہیں ۔

ہمارا جہاز گو عدن ٹھہرنے والا نہیں تھا لیکن یہ سُنا گیا کہ ہز اکسلنسی لارڈ ہارڈنگ کے نام بعض ضروری چٹھیاں عدن پہنچی ہوئی ہیں اس لئے " رزمک " کوئی پون گھنٹے کے لئے بندرگاہ سے آدھ میل کے فاصلہ پر ٹھہرا اور پھر سوئز کی طرف روانہ ہو گیا ۔

۱۷ اپریل کو ہم نے عرب و افریقہ کے ساحلی خشک پہاڑوں کو دیکھا اور دن بھر دیکھتے رہے اس نظارہ نے میرے دل پر خاص اثر کیا ۔ گذشتہ زمانے میں یہ دونوں جانب کی وسیع سرزمین اسلامی آزاد سلطنتوں یا ریاستوں کے تصرف میں تھیں لیکن اب وہ محکوم قوموں کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہیں ۔ ہمارے سیدھے ہاتھ پر جو ملک ہے (عرب و فلسطین و شام) وہ ایک زمانہ میں انبیا علیہ السلام کا گہوارہ تھا ۔ اس کے ہر ایک ذرہ سے روحانی انوار اور حقیقی آزادی کے اطوار نمایاں تھے لیکن آج وہ یا تو شقاق و نفاق کا مرکز ہے اور یا محکومی و غلامی کی بدترین زندگی کا نمونہ ۔ ان گہرے اور غم آلود خیالات کے ساتھ یہ دن ختم ہوا اور رات کے پردہ نے ان پُر حسرت مناظر کو ہماری آنکھوں سے اوجھل کر دیا ۔

ہمارا جہاز رات کو تین بجے سوئز پر لنگر انداز ہوا لیکن جب ہم صبح کو اٹھے تو پھر سوئز میں
ستہ آہستہ آٹھ دس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہا تھا۔ اول تو ہمیں کوئی آبادی نظر نہیں آئی
نہ وہ ریلوے جو قاہرہ سے پورٹ سعید گئی ہے اور اس کے تاروں کے کھنبے ہمارے
یں ہاتھ پر برابر دکھائی دیتے تھے۔ ایک عرصہ کے بعد پھر کہیں کہیں سوئز کی چوکیاں دکھائی دیں
ر جس قدر ہم پورٹ سعید کی طرف بڑھتے گئے اسی قدر آبادی کے آثار بھی بتدریج نمایاں ہوتے
ئے۔ راستہ میں اسماعیلیہ سے بھی گذرے جہاں دو چار کوٹھیاں بنی ہوئی ہیں اور گذشتہ جنگ
ے زمانے میں جہاں سے ترکی فوج کا ایک حصہ عارضی پل کے ذریعہ سے نہر کو عبور کرکے ہماری
ئیں جانب کی مصری حدود میں داخل ہوگیا تھا۔ اس کے بعد ہم القنطرہ سے گذرے جو گذشتہ
ک کے زمانے میں انگریزی افواج کا جنگی مرکز تھا گو یہ اب ویران نظر آتا ہے لیکن اس وقت
د عارضی مکانات بنائے گئے تھے انکا ایک معقول حصہ اب بھی یہاں موجود ہے۔ اور اس
ن کا ابتدائی اسٹیشن بھی اسی القنطرہ میں ہے جو فلسطین کو جاتی ہے اس اسٹیشن پر عربی جلی حروف میں
و جہاز سے بھی نظر آتے ہیں "سکہ حدید سینا الحربیۃ" لکھا ہوا ہے۔

ہم سہ پہر کو چار بجے پورٹ سعید پہنچے ہمارا جہاز شہر سے کسی قدر فاصلہ پر لنگر انداز ہوا چونکہ
یخ محمد ماضی ابوالعزائم صاحب صدر لجنۃ التحضیریۃ العلیا للمجلس الخلافۃ کے دو عنایت نامے میرے
اس دہلی میں مسئلہ خلافت کے متعلق آئے تھے اور میں انکے جواب نہیں لکھ سکا تھا اس لئے بمبئی
ے چلتے وقت میں نے انکے نام قاہرہ میں تار دیدیا تھا جس میں نے انکے خطوط کی رسید دی تھی اور
بھی لکھا تھا کہ میں پورٹ سعید سے رزمک پر گذر رہا ہوں اس لئے اور نیز اس وجہ سے کہ بھائی
شوکت علی صاحب نے جیسا کہ ہمیں پورٹ سعید پہنچکر معلوم ہوا تھا قاہرہ میں ایک تار اس مضمون کا
دیدیا تھا کہ ہم دونوں (یعنی ڈاکٹر انصاری اور میں) رزمک کے ذریعہ گذر رہے ہیں المقطم، الاخبار
ور دیگر مقامی اخباروں میں ہمارے پورٹ سعید سے گذرنے کی خبر شائع ہوگئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ
شیخ ابوالعزائم صاحب اور چند مصری و ہندی بھائی جن کے نام آئندہ لکھوں گا، قاہرہ سے زحمت

گوارا کرکے اس ماہ رمضان میں پورٹ سعید پہنچ گئے۔

ہم جہاز سے اُترنے اور پورٹ سعید جانے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ ایک کشتی میں ہمارے چند مصری بھائی ہم سے ملنے اور ہمیں شہر میں لیجانیکی غرض سے آئے۔ ان بھائیوں میں سے چند کے نام ذیل میں لکھ دینے مناسب معلوم ہوتے ہیں۔

(۱) عبدالحمید سعید بے ایک ترکی مصری خاندان کے معزز رکن جن کے دل میں خاص طور پر اسلامی درد ہے اور جنکی خدمات اسلام کے لئے درجۂ امتیاز رکھتی ہیں جو مصر کی مشہور سیاسی جماعت حزب الوطنی کی جانب سے آئے تھے۔

(۲) سید حسنی ماردینی دمشقی (جو ازہر کے تعلیم یافتہ ہیں اور خلافت کیلئے کام کر رہے ہیں اور اسی سلسلہ میں ہندوستان بھی آچکے ہیں۔

(۳) سید محمود سلامہ

(۴) سید محمود ماضی } یہ دونوں شیخ ابوالعزائم کے صاحبزادے ہیں۔
(۵) سید احمد ماضی

(۶) کامل بک عثمان، وکیل المرکزیہ

(۷) ابراہیم محمد طوبجی تاجر المنیا

یہ سب صاحب سوائے عبدالحمید سعید بے کے شیخ ابوالعزائم کی طرف سے اس غرض سے تشریف لائے تھے کہ ہمیں پورٹ سعید لیجائیں جہاں شیخ موصوف اور دوسرے مصری بھائی ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ انکے علاوہ ابوالنصر سید احمد صاحب بھوپالی (جو کہ ریاست بھوپال کی جانب سے یہاں کی یونیورسٹی میں پڑھ رہے ہیں) اور سید عبدالکریم صاحب حیدرآبادی (جو کہ ریاست حیدرآباد کی جانب سے دارالعلوم میں زیر تعلیم ہیں) بھی ہم لوگوں سے ملنے کے لئے زرک تک تشریف لائے۔

چونکہ جہاز کی روانگی کے ٹھیک وقت کا بھی اس وقت تک علم نہیں ہوا تھا اور اور جس وقت علم ہوا تو وقت زیادہ باقی نہیں رہا تھا اس لئے ڈاکٹر انصاری صاحب اور میں نے عذر کیا

اور سب وقت کی تنگی کی وجہ سے پورٹ سعید پر نہ اترنے کی معافی چاہی اور شیخ ابوالعزائم صاحب کی خدمت میں بھی زبانی پیام معذرت کہلا بھیجا۔

تھوڑے عرصہ کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ شیخ صاحب خود جہاز پر معہ اپنے چند ہمراہیوں کے تشریف لے آئے ہیں اسلئے ہم اُن سے ملنے کیلئے گئے اور انکی تکلیف فرمائی کا مناسب الفاظ میں شکریہ ادا کیا۔ شیخ صاحب ایک بزرگ عالم ہونیکے علاوہ خلافت اور اسلامی معاملات کے ساتھ خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ انکی ملاقات کا ہم لوگوں کے دلوں پر اچھا اثر ہوا لیکن افطار کا وقت قریب آگیا تھا اس لئے مغرب سے کچھ پہلے واپس تشریف لے گئے۔

ہمیں یہ معلوم ہوکر افسوس ہوا کہ مصری خلافت کے متعلق دو گروہ ہیں ایک گروہ جس میں علمائے ازہر بھی شامل ہیں خلافت کی خدمت ملک فواد (سلطان مصر) کو سپرد کرنا چاہتا ہے اور دوسرا گروہ اس سے اختلاف رکھتا ہے۔ اس مسئلہ کے علاوہ خلافت کے سلسلہ میں اور بھی چند مسائل ہیں جن میں دونوں گروہ آپس میں ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔

معتزلہ

اسلام ایک ایسا سیدھا سادہ دین ہے جس کو ایک عامی سے عامی شخص بھی بآسانی سمجھ سکتا ہے بخاری میں ہے کہ ایک صحابی کو مسلمان غلام آزاد کرنا تھا وہ آنحضرت صلعم کی خدمت میں ایک حبشیہ کو جو صد درجہ احمق تھی لے آئے، اور آپ سے دریافت کیا کہ کیا یہ مسلمان ہے، آپ نے اس سے پوچھا کہ خدا کہاں ہے، اس نے آسمان کی طرف انگلی اٹھا دی آپ نے فرمایا لیجاؤ یہ مسلمان ہے بشروع شروع میں جبتک صحابہ زندہ تھے اسلام اپنی اسی سادگی پر باقی رہا وہ مافوق الفہم اسرار جن کے سمجھنے کی حیات انسانی کو حاجت نہیں اور نہ عملی زندگی کے لئے انکا علم ضروری تھا۔ اس کو اسی طرح سربستہ چھوڑ کر آگے بڑھ جاتے تھے، وہ اس آیت کے مصداق تھے جو قرآن کی ابتدائی سورۃ میں بیان کیا گیا ہے

آمن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمؤمنون کل آمن باللہ وملئکتہ وکتبہ ورسلہ لانفرق بین احد من رسلہ (بقرہ)

پیغمبر پر جو کچھ بھی اس کے خدا کی طرف سے اترا اس پر وہ اور تمام مومنین ایمان لائے، خدا پر اس کے تمام فرشتوں پر اسکی تمام کتابوں پر اور کل کے کل پیغمبروں پر وہ ایمان اور یقین رکھتے ہیں، اس کے پیغمبروں میں سے کسی ایک کی تفریق نہیں کرتے۔

یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک وبالآخرۃ ہم یومنون (بقرہ)

جو کچھ تجھ پر اور تیرے پیشروں پر اترا اسپر وہ (برگزیدہ لوگ) ایمان لائے ہیں اور آخرت پر بھی انکا ایمان ہے۔

اور حقیقتاً انکا یہ عمل منشاء ایزدی کے بالکل مطابق تھا چنانچہ ایک جگہ پر ارشاد ہوتا ہے۔

ہو الذی انزل علیک الکتاب منہ آیات محکمات ہن ام الکتاب واخر متشابہات

خدا نے تجھکو یہ کتاب دی جس میں کچھ آئین واضح اور صاف ہیں اور وہ اصل کتاب ہیں بعض متشابہ ہیں جو کج دل

فاما الذین فی قلوبہم زیغٌ فیتبعون ما تشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ وابتغاء تاویلہ وما یعلم تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم یقولون امنا بہ کل من عند ربنا وما یذکر الا اولوا الالباب

ہیں وہ فتنہ انگیزی اور اس کے مطلب کو حل کرنے کے لئے متشابہات کے پیچھے پڑتے ہیں حالانکہ جو معنی کہ اس کے حقیقی ہیں وہ بجز خدا کے کوئی نہیں جانتا اور جو لوگ کہ علم میں پختہ ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے یہ سب خدا کی جانب سے ہیں۔ اور عقلمندوں کے سوا کوئی عبرت نہیں پکڑتا۔

آیت بالا سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ قرآن کی صحیح تعلیم یہی ہے کہ لوگ خواہ مخواہ ان باتوں کے پیچھے نہ پڑیں جن کا علم انکو کسی حالت میں مفید نہیں وہاں یہ حقیقت بھی آشکارا ہو جاتی ہے کہ عرب کے بعض افراد باوجود اپنی فطری سادگی اور میلان طبع کے قرآن کی بعض آیتوں میں ردو قدح جھوٹی تاویلیں اور بلا ضرورت بہت سی باتیں من گھڑت بیان کیا کرتے تھے، احادیث کی روشنی میں بھی ہم اس حقیقت کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک روز آنحضرت نے مذکورہ بالا آیت ہو الذی الخ تلاوت فرمائی اور پھر کہا اذا رایتم الذین یتبعون ما تشابہ منہ فاولئک الذین سمی اللہ فاحذرہم، جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو متشابہات کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں تو جان لو کہ یہ وہی ہیں جن کا خدا نے نام لیا ہے تو تم ہمیشہ ان لوگوں سے بچتے رہو۔ اس کے علاوہ عربوں کی شاعری میں بھی اگر ہم ایسے لوگوں کا کھوج کریں تو یقین ہے کہ آسانی سے پاسکیں گے۔

مصنف ملل ونحل کا خیال ہے کہ یہ منافق لوگ تھے جنہوں نے خواہ مخواہ اپنی خاص غرض کو پوشیدہ رکھکر آیات متشابہات کی تاویلیں کیں اور اس طرح فتنہ کا ایک دروازہ کھولدیا چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

یہ تمام شبہات[1] جو آخر زمانے میں پیدا ہوئے کفار اور منافقین کے پیدا کردہ ہیں جنہوں

---

(۱) الملل والنحل شہرستانی صفحہ ۱۷-۱۸-۱۹

نے ابتدائی زمانہ اسلام میں اسکی تخم ریزی کی یہ لوگ پیغمبر کے بتائے ہوئے راستہ پر نہ چلے بلکہ غیر ضروری باتوں میں خیال آرائی کی جس چیز کے غور و خوض سے منع کیا گیا اسی کے متعلق خواہ مخواہ سوالات کئے، غلط اور باطل باتوں میں مجادلہ اور مباحثہ کیا چنانچہ حدیث ذی خویصرہ التمیمی سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلعم سے کہا کہ اے محمد عدل کر تو عدل نہیں کرتا۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ اگر میں عدل نہیں کرتا تو کون کرے گا۔ اس پر بھی وہ لعین باز نہ آیا اور کہا کہ کیا تو اسی تقسیم سے اللہ کی خوشنودی چاہتا ہے، یہ صریح نبی پر خروج نہیں تو اور کیا ہے اگر وہ شخص جو سچے امام پر اعتراض کرتا ہے خارجی ہو جاتا ہے پھر تو بدرجہ اولیٰ وہ شخص جو سچے رسول پر اعتراض کرے خارجی ہوگا تو کیا یہ نص اور امر الہی کے مقابلہ میں اپنی ذاتی عقل کا قیاس نہیں ہے؟ اس بنا پر آنحضرت نے فرمایا کہ عنقریب اس سے ایک ایسی قوم پیدا ہوگی جو دین سے کوسوں دور ہوگی جیسے کہ تیر کمان سے، اور یہی حال ان منافقین کا تھا جنہوں نے غزوہ احد میں کہا تھا کہ ہل لنا من الامر شی یعنی کیا کچھ ہمارا بھی اختیار ہے؟ اور نیز یہ بھی کہا تھا کہ اگر ایسا ہوتا تو ما قتلنا ہہنا یعنی ہم یہاں قتل نہ ہوتے، کیا یہ صریحاً قدر نہیں ہے، ایک دوسرا گروہ مشرکین کا تھا جو یہ کہتے تھے کہ اگر خدا چاہتا تو ہم بجز اس کے کسی کی عبادت نہ کرتے، لوشاء اللہ ما عبدنا من دونہ من شی، اور ایک جماعت ایسی بھی تھی جو کہتی تھی کہ کیا ہم اس کو کھلائیں جس کو خدا خود کھلا نہیں چاہتا انطعم من لو یشاء اللہ اطعمہ، کیا یہ صریحاً جبر نہیں، اور اسی طرح اس جماعت کا بھی خیال کر جس نے اللہ کے جلال اور اس تصرف افعال میں بحث کی، یہاں تک کہ انکو اس آیت سے روکا گیا، ویرسل الصواعق فیصیب بہا من یشاء وہم یجادلون فی آیت اللہ وہو شدید المحال، یہ واقعات سب اس زمانے کے ہیں جب آنحضرت زندہ اور صحیح و سالم تھے، اور یہ سب کچھ منافقین

نے کیا جو ظاہر میں اسلام کا اظہار کرتے لیکن باطن میں وہ منافق تھے۔

اسمیں شک نہیں کہ ابتدا سے ایک جماعت ایسی تھی جس کا مقصد یہی تھا کہ اسلام کی تعلیمات کو خلط ملط کرے لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ مومنین کے دل میں اس قسم کے خیالات کبھی پیدا ہی نہیں ہوئے۔ وہ بھی ان آیتوں سے جو بظاہر ایک دوسرے کی مخالف تھیں کھٹکے لیکن انکے قلب کی روشنی اور حضور کے فیض صحبت نے ان کے عقیدہ میں کسی قسم کا فتور نہ آنے دیا۔ چنانچہ حدیث[1] میں آیا ہے کہ ایک آیت میں دو صحابہ کو آپ نے لڑتے ہوئے سنا تو آپ چہرے سے باہر آگئے چہرے پر غصہ کے آثار تھے فرمایا کہ تم سے پہلی قومیں کتاب میں اختلاف کی وجہ سے ہلاک و برباد ہوئیں، اس کے علاوہ ترمذی میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور ابن ماجہ میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے کہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آپ باہر تشریف لائے کچھ صحابہ آپس میں بیٹھے ہوئے بحث و مباحثہ کر رہے تھے۔ آپ نے پوچھا کہ کس مسئلہ پر گفتگو ہے کہا گیا کہ مسئلہ تقدیر پر، یہ سنتے ہی آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا، راوی کا بیان ہے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا کسی نے روئے مبارک پر انار کے دانے نچوڑ دئے ہیں، آپ نے فرمایا کہ کیا تم کو اسی کا حکم دیا گیا ہے؟ کیا تم اسی لئے پیدا کئے گئے ہو؟ کیا میں یہی پیغام لیکر آیا ہوں؟ کیا تمہاری پیدائش کا یہی مقصد ہے؟ قرآن کی ایک آیت کو دوسری آیت پر پٹکتے ہو، تم سے پہلے بہت سی قومیں اسی بنا پر ہلاک ہوئیں۔ میں تاکید سے کہتا ہوں کہ اس میں جھگڑا مت کرو۔

بہر حال عقائد میں اختلاف گو منافقین کی طرف سے پیدا کرنیکی کوشش کی گئی اور صحابہ بھی کبھی کبھی خصوصی مسائل میں چونکنا ہوئے لیکن آنحضرت جب تک زندہ رہے اختلاف رونما نہ ہو سکا، عہد صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں کبھی کبھی اس قسم کا خطرہ پیش بھی آیا تو خلفاء راشدین

---

(۱) مسلم جلد دوم صفحہ ۳۲۹

کے اثر و اقتدار نے انکو ابھرنے نہ دیا اس کے علاوہ فتوحات اور اشاعت اسلام نے اس طرف توجہ کا موقعہ بھی کم دیا، البتہ بنو امیہ(۱) اور عباسیہ کے زمانے میں جب فتوحات اسلامی کا سیلاب طرف اور اطراف سے گزر کر دور دراز مقام تک پہنچ گیا تھا مختلف قومیں دائرہ اسلام میں داخل ہوئیں تو اپنی اپنی فطرت کے مطابق اسلامی عقائد میں نکتہ چینی شروع کیں اور وہ تمام خیالات جو انکے قدیم مذہب میں تھے، قرآن کی آیتوں سے منطبق کرنا چاہا، کسی نے ان الفاظ سے جو ہاتھ، پیر، آنکھ ناک کے ہم معنی تھے مجازی معنی لئے کسی نے اس کے حقیقی معنی مراد لیکر خدا کو ایک بزرگ اور مقدس انسانی پتلا تصور کیا جو عرش پر بیٹھکر دنیاوی خداوندوں کی طرح حکومت کرتا ہو، اس کے علاوہ وہ اور بہت سے دوسرے مسائل جو کبھی دبا دئے گئے تھے ابھر آئے۔ الغرض اسی قسم کی اور بہت سی باتیں پیدا ہوگئیں جو علوم و فنون کی اشاعت کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئیں۔

ایک طرف یہ تھا تو دوسری طرف امامت و خلافت کی بحث نے اختلاف عقائد اور مذہب کا ایک وسیع دروازہ کھولا اور وہ اس طرح پر کہ جب آنحضرت صلعم کا انتقال ہوگیا تو جہاں اور بہت سے سوالات(۲) پیدا ہوئے، مثلاً نبی صلعم آسمان کی طرف اٹھائے گئے ہیں، جو لوگ یہ کہتے کہ عام انسانوں کی طرح فوت ہوئے وہ غلط کہتے ہیں، دفن کا کونسا مقام ہوگا، نبی کی اولاد وارث بنی بن سکتی ہے یا نہیں، سب سے اہم سوال یہ پیدا ہوا کہ آنحضرت کا خلیفہ کون بنے اور وہ کس خاندان کا ہو، لیکن بحمد اللہ یہ تمام اختلافات صحابہ رضوان اللہ علیہم نے دانائی اور ہوشیاری سے مٹا دئے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت تک کوئی خاص اختلاف رونما نہ ہوسکا البتہ حضرت عثمان رض کے ملکی اور سیاسی طرز عمل سے تین جماعتیں پیدا ہوئیں، ایک علویہ تھی جن کا خیال تھا کہ خلافت اور امامت کا حق صرف حضرت علی رض اور انکے خاندان تک

(۱) تفصیلی بحث کے لئے مولانا شبلی کا الکلام دیکھو

(۲) الملل والنحل للشہرستانی صفحہ ۱۹ و ۲۰

محدود ہے ، دوسری عثمانی تھی جو حضرت عثمان رضی اللہ کے حامی تھے ، اور ایک تیسری جماعت خوارج کی تھی جو دونوں کے مخالف تھی ۔ عثمانیہ تو تھوڑے دنوں کے بعد ختم ہو گئے لیکن علویہ اور خوارج نہ مٹ سکے ۔ یہ جماعتیں ہمیشہ اپنے کو برسر حق اور دوسرے کو کافر کہتیں اور اس معاملے میں ان سب کی دلیل قرآن کی یہ آیت من قتل مومنا متعمدا فجزاء جہنم خالدا فیہا تھی ، بہرحال یہ حال ایک عرصہ تک قائم رہا کہ بنو امیہ برسر اقتدار رہوے ۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ ظلم اور سفاکی کا بازار اکثر گرم رہتا ، اس لئے بہت سی طبیعتیں بنی امیہ سے متنفر ہو رہی تھیں ، انکا روحانی اثر ختم ہو رہا تھا کہ ملکی ضرورت سے بنو امیہ کی ایک طرفدار جماعت پیدا ہوئی ، اور یہ جہمیہ تھے جنہوں نے کہا کہ یہ زیادتیاں محض اس لئے ہیں کہ خدا کو ایسا کرانا منظور ہے ہمارے اعمال کی یہ سزا ہے ورنہ خدا چاہتا تو کیا روک نہ سکتا تھا ، انسان مجبور محض ہے وہ اپنے اعمال کا بالکل مختار نہیں اب جہمیہ کے مخالف ایک دوسرا مذہبی گروہ قدریہ[1] کا پیدا ہوا اس نے قرآن کی بعض آیتوں کی بنا پر یہ دعوی کیا کہ انسان اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے خدا نے اس کو اس کے افعال پر قدرت دے رکھی ہے ، اس خیال کے پھیلانے میں بہت سے لوگ جان سے مارے گئے ۔ معبد[2] معبد کے بعد غیلان دمشقی اور پھر کچھ دنوں کے بعد جہم بن صفوان ، یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے سختی اور ظلم کے بعد اس مسلہ کو عام کرنا دین و مذہب کا ایک بڑا رکن بنا لیا ۔ بہر حال یہی قدریہ آگے بڑھکر معتزلہ کے لقب سے پکارے گئے ۔

اسلام میں فرقہ سازیاں یہیں ختم نہیں ہوتیں بلکہ دن بدن اسمیں اضافہ اور زیادتی ہوتی رہی ، بنو عباسیہ کے زمانے میں جب بہت سے علوم و فنون عربی زبان میں منتقل کئے گئے یونانی فلسفہ کا چرچا ہر علمی اور مذہبی سوسائٹی میں ہونے لگا علاوہ ازیں ہر شخص کو رائے اور مذہب

---

(۲) ملل ونحل للشہرستانی میں پوری تفصیل ہے۔

کی عام آزادی دیدی گئی تو بیسوں فرقے اور پیدا ہوگئے ، مولنا شبلی لکھتے ہیں کہ

ملکی ضرورت[1] نے اگرچہ صرف جبر و قدر کے مسئلہ پر توجہ دلائی تھی لیکن جب ایک دفعہ کسی وجہ سے خیالات میں حرکت پیدا ہوئی تو بڑھتی ہی گئی یہانتک کہ بنو امیہ کا دور ختم نہیں ہوچکا تھا کہ خلق قرآن ، تنزیہ و تشبیہ ، صفات باری وغیرہ کی بحثیں چھڑ گئیں اور جس کے منہ سے جو بات نکلی ایک مذہب بن گئی

بانی معتزلہ

اوپر کہیں ذکر کیا جاچکا ہے کہ قدریہ بنو امیہ کے ابتدائی زمانے میں پیدا ہوا تھا لیکن پھر بعد میں بعض ایسے حالات اور واقعات پیش آئے کہ اسی خاندان کے دور آخر میں انکی وہ پہلی شان نہ رہ سکی لیکن باوجود اس کے خیالات کا بیج جب ایک دفعہ بو یا جاچکا تھا تو بالکل جڑ سے اکھاڑ پھینکنا مشکل تھا ، اس لئے ٹھیک اس وقت (دوسری صدی ہجری) جب کوفہ اور بصرہ علوم و فنون کے مرکز بن رہے تھے ، ہر طرح کے لوگ اور ہر فن کے امام وہاں موجود تھے ، علما ، تو علما عوام کو بھی حق رائے آزادی کے ساتھ حاصل تھا ، اور پھر اس کے علاوہ یہ دونوں شہر ایسی جگہ پر واقع تھے ، جہاں کہ فارس کی وہ موجیں جو شیعہ اور خوارج کی پیدا کردہ ہوتیں بآسانی آتی جاتی تھیں ، ان تمام اسباب کا لازمی نتیجہ تھا کہ وہ آگ جو بنو امیہ کے ابتدائی دور میں کبھی جلی تھی اور دمشق میں بجھنے والی تھی اس کی ایک معمولی چنگاری یہاں ان رنگین طبیعتوں کو بھڑکانے کے لئے کافی تھی چنانچہ سب سے پہلے بصرہ میں واصل بن عطا نے اس آگ کو روشن کیا اور یہی وہ شخص ہے جس نے مذہب اعتزال کی بنا ڈالی ۔

وجہ تسمیہ یہ جماعت خود اپنے کو اہل توحید اور عدل کے نام سے موسوم کرتی لیکن عوام اس کو

---

(۱) الکلام جلد اول صفحہ ۱۹

قدریہ کہتے، اس لئے کہ انکا عقیدہ یہ تھا کہ انسان اپنے اعمال پر قادر ہے جیسا کہ انکے پیشروں معبد جہنی اور غیلان وغیرہ کا مسلک تھا۔ ان لوگوں کو معتزلہ کہے جانے کی بہت سی وجہیں بیان کی گئی ہیں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جب واصل بن عطا نے اپنے شیخ حسن بصری سے اس ایک خاص مسئلہ میں اختلاف کیا کہ جو شخص گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے اس کو کیا کہا جائے، شیخ کی رائے یہ تھی کہ وہ کافر ہے، واصل بن عطا نے ان سے اختلاف کیا اور کہا کہ ایسا شخص نہ مومن ہے نہ کافر بلکہ ان دونوں کے درمیانی منزل میں ہے، یہ کہتے ہوئے جماعت سے اٹھ آئے، شیخ موصوف نے کہا لقد اعتزل عنا اسی مناسبت[1] سے یہ اور انکی جماعت معتزلہ کے لقب سے پکاری گئی لیکن بعض دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ واصل[2] نے اس مسئلہ میں ایمہ سے اعتزال (علٰحدگی) اختیار کیا جن کا یہ عقیدہ ہے کہ مرتکب گناہ کبیرہ مومن ہے لیکن فاسق کہا جائیگا، ایک تیسری جماعت بھی ہے جس کی وجہ تسمیہ یہ بتائی ہے کہ اکثر اس مذہب کے شیوخ نے دنیا سے اعتزال (علٰحدگی) اختیار کی اس بنا پر انکا نام معتزلہ رکھا گیا

معتزلہ کا مختلف فرقوں میں منقسم ہونا

ڈھائی سو سال کی مدت میں یہ جماعت بتدریج بائیس[3] شاخوں میں منقسم ہوگئی، بغدادی نے اس میں سے دو حائطیہ اور حماریہ کو غلاۃ میں شمار کیا ہے لیکن شہرستانی اور مقریزی نے معتزلہ میں انکو رکھا ہے۔ معتزلہ کے ان تمام فرقوں کے تدریجی حالات اور انکے مخصوص خیالات سے ناظرین کو روشناس کرنیکے لئے میں بہتر طریقہ یہ سمجھتا ہوں کہ انکو انکے حالات کے

---

(۱) ملل ونحل شہرستانی

(۲) الفرق بین الفرق

(۳) تعلیق، استاذ نلیب جشی علی مختصر الفرق بین الفرق

لحاظ سے تین بڑے بڑے تاریخی دور میں تقسیم کروں لیکن اس سے پہلے انکے عام عقائد کا مطالعہ جس پر کہ سبھی کا اتفاق ہے ضروری ہے۔

عام عقائد[1]

(۱) خدا سے صفات ازلی کا انکار یعنی جس کے معنی صاف لفظوں میں یہ ہیں کہ اللہ بذاتہ زندہ ہے قادر ہے صاحب ارادہ ہے حیات، قدرت اور علم و ارادہ کی وجہ سے نہیں، زمان، مکان، جسم وجوہر کے قیود سے آزاد ہے، اسی عقیدہ کی بنا پر وہ اپنے کو اہل توحید کہتے تھے، اس لئے کہ وہ تمام صفات کا انکار محض اس لئے کرتے تھے کہ شرک باری تعالیٰ نہ لازم آئے، غالباً یہ افلاطون اور غیر دڈوٹس کے عقیدہ سے متاثر ہوکر یہ عقیدہ ان میں قائم ہوا یہ دونوں اس بات کے قائل تھے کہ خدا نہ کسی خاص صفت کے ساتھ موصوف کیا جا سکتا ہے اور نہ ادراک کیا جا سکتا ہے وغیرہ وغیرہ

(۲) دوسرا عقیدہ یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال کا خود مختار ہے، خدا انسانوں کے افعال اور اعمال کا خالق نہیں، وہ خود اپنے اچھے برے کے آپ ذمہ دار ہیں اس لئے کہ خدا عادل ہے، انکے اس قول کی بنیاد قرآن کی بعض آیتیں ہیں مثلاً کل نفس بما کسبت رہنیۃ (مدثر) من عمل صالحاً فلنفسہ ومن اساء فعلیہا وما ربک بظلام للعبید (حم سجدہ) قد جاء بصائر من ربکم فمن ابصر فلنفسہ ومن عمی فعلیہا وما انا علیکم بحفیظ (انعام) اس عقیدہ کی بنیاد پر اپنے کو وہ اہل عدل کہتے تھے

(۳) فاسق کے متعلق انکا یہ عقیدہ ہے کہ وہ نہ مومن ہے نہ کافر بلکہ ان دونوں کے بیچوں بیچ والی منزل میں ہے۔

---

[1] الفرق بین الفرق، شہرستانی علی ہامش الملل والنحل لابن حزم اور تاریخ تمدن عربی نکلسن دیکھو۔

(۴) اس بات پر انکا اجماع ہے کہ کلام الہی حادث ہے قدیم نہیں (اناجعلناہ قرآناعربیا) جعلنا کے معنی خلقنا کے ہیں۔

(۵) جمہور مسلمانوں کے خلاف انکا یہ عقیدہ ہے کہ خدا کو ان آنکھوں سے دیکھنا ممکن نہیں نہ وہ خود اپنے کو دیکھ سکتا ہے اور نہ کوئی دوسرا اس کو دیکھ سکتا ہے اور اس کے علاوہ (۶) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر مومن پر فرض ہے۔

پہلا دور

یہ دور دوسری صدی ہجری کے ساتھ ساتھ شروع اور ختم ہوتا ہے گو اس زمانے میں اس کو وہ اثر واقتدار حاصل نہیں ہوا تھا جو آئندہ چلکر ہونیوالا تھا مگر پھر بھی واصل بن عطا اور عمر بن عبید (جن کا تذکرہ ابھی کرنا ہو) کی کوششوں سے اعتزال نے خواص میں کچھ کچھ مقبولیت حاصل کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس دور کا سب سے پہلا اور مشہور عام فرقہ واصلیہ ہے جو بانی فرقہ معتزلہ واصل کے نام سے منسوب ہے، اور دوسرا فرقہ عمریہ جس کی نسبت عمر بن عبید کی طرف کی گئی ہے لیکن عام طور پر مورخین ان دونوں فرقوں کو ایک شمار کرتے ہیں اس لئے کہ جسوقت واصل بن عطا اپنے استاد سے اس مسلہ خاص میں جس کا تذکرہ اوپر کیا جاچکا ہے اختلاف کرکے استاد کے حلقہ درس سے اٹھ آئے عمر بن عبید کو یہ یقین تھا کہ واصل سے بحث و مباحثہ کرکے استاد کے حلقہ درس میں دوبارہ شامل کر دیں گے لیکن صاحب موصوف نے ان سے مناظرہ کیا تو بجائے اس کے کہ انکو اپنی رائے سے متفق کرتے خود انکے جال میں گرفتار ہوگئے، واصل نے اپنی بہن سے انکا نکاح کر دیا اور اس طرح تعلقات کی مضبوطی کے ساتھ ساتھ دونوں اپنے خاص معتقدات کی اشاعت میں مشغول ہوگئے واصل کا شمار اپنے زمانے کے مشہور متکلمین میں تھا اور نہ صرف یہی بلکہ لغت وادب کے ماہر تھے، انکے ایک ہمعصر نے انکی مدح میں یہ شعر کہا۔

علیہم بابدال الحروف وقامع   لکل خطیب یغلب الحق باطلہ

ابن خلکان کی روایت کے مطابق واصل ایک بڑا مصنف بھی تھا چنانچہ اسکی لکھی ہوئی کتابیں حسب ذیل ہیں: کتاب فی اصناف المرجیہ۔ کتاب فی التوبہ۔ کتاب المنزلہ بین المنزلین۔ کتاب معانی القرآن، کتاب السبیل الی معرفت الحق، کتاب الخطب فی التوحید والعدل۔ کتاب بینہ وبین عمر بن عبید، کتاب فی الدعوۃ، کتاب طبقات اہل العلم والجہل،

واصل کی پیدائش مدینہ میں ۸۰ھ میں ہوئی بصرہ میں ۱۳۱ھ کو انتقال ہوا واصل اور عمر یہ دونوں ہوالی عرب سے تھے، واصل نے معتزلہ کے عام معتقدات کے علاوہ جس چیز کا اضافہ کیا تھا وہ اصحاب[1] جمل اور خوارج کے بارے میں تھا جمہور مسلمان حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور طلحہ نہ علی رضی اللہ عنہا کو کافر سمجھتے ہیں لیکن واصل کا عقیدہ اس کے بالکل برعکس یہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ بعد تصفیہ تحکیم ایک حیثیت سے کافر اور عائشہ رضی اللہ عنہا وطلحہ رضی اللہ بھی دوسری حیثیت سے کافر تھے۔

دوسرا دور

تیسری صدی ہجری معتزلا کا دوسرا دور بعض حالات اور واقعات کی بنا پر خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے یہی وہ زمانہ ہے جب جوق جوق بہت سے علما[2] اور وزرا اس جماعت کے رکن بنے، اعتزال نے حکومت پر جگہ حاصل کی، امام احمد[3] بن حنبل کو اور دوسرے[4] بزرگوں کو

---

(۱) مختصر الفرق بین الفرق

(۲) وہ علما، جو اپنے زمانہ کے ممتاز اور با اثر لوگوں میں تھے اور مذہب اعتزال اختیار کر لیا تھا ان کے اسماء گرامی یہ ہیں، احمد بن داؤد، جاحظ، ابن عباد

(۳) قاضی احمد بن داؤد نے جو کہ معتزلین کا سردار تھا مامون الرشید کے کان میں مسئلہ خلق قرآن کو پھونک دیا اور اس عقیدہ فاسد نے مامون کو اس بات پر آمادہ کیا کہ اس مسئلہ کی اشاعت کی کوشش کرے (بقیہ صفحہ پر)

سخت سے سخت مصیبتیں خلیفہ مامون الرشید اور معتصم کے ہاتھوں اٹھانی پڑیں اس زمانہ کا نقشہ مولانا ابوالکلام نے تذکرہ میں یوں کھینچا ہے :

تیسری صدی کے اوائل میں جب فتنۂ اعتزال و تعمق فی الدین اور بدعۂ مضلۂ تکلم بالفلسفہ وانحراف از اعتصام بالسنہ نے سر اٹھایا، اور صرف ایک ہی نہیں بلکہ لگاتار تین عظیم الشان

(بقیہ حاشیہ صفحہ)

سنہ ۲۱۸ھ میں اسحٰق بن ابراہیم خزاعی کو بغداد میں لکھا کہ علما ئے بغداد کو خلق قرآن کی طرف جبراً متوجہ کرے بعض روپوش ہوگئے اور بعضوں نے توریہ کیا، اور انکے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے حسب منشاء قبول کیا، امام احمد بن حنبل انکار کے جرم میں خلیفہ کی خدمت میں بھیجے گئے جس وقت امام موصوف رقہ میں پہنچے مامون کے مرنے کی خبر طوس میں آئی، اثنائے راہ سے بغداد کو واپس گئے، لیکن مامون نے مرتے وقت اپنے جانشین سے یہ وصیت کی تھی کہ میرے مرنے کے بعد مسئلہ خلق قرآن میں وہ بھی ایسی ہی کوشش کرے چنانچہ جب معتصم خلیفہ ہوا تو اس نے بہت بیدردی سے امام موصوف کو قید کیا، چار چار بوجھل بیڑیاں پیروں میں ڈالی گئیں پہن لیں، اسی حالت میں بغداد سے طرطوس لے چلے اور حکم دیا گیا کہ بلا کسی مدد اور سہارے کے خود ہی اونٹ پر چڑھیں اور اتریں امام موصوف بوجھل بیڑیوں کی وجہ سے ہل نہیں سکتے تھے۔ اُٹھتے تھے اور گر پڑتے تھے۔ عین رمضان المبارک کے آخر عشرہ میں بھوکے پیاسے جلتی دھوپ میں بٹھا دئے گئے اور لگاتار کوڑے اس طرح مارے گئے کہ ہر جلاد دو ضربیں پوری قوت سے لگا کر پیچھے ہٹ جاتا اور پھر دوسرا تازہ دم جلاد اسکی جگہ لیتا لیکن اس کے باوجود وہی رٹ القرآن کلام اللہ غیر مخلوق کی جاری تھی آخر باوجود سیکڑوں معتصم کی ترغیبات کے وہ اپنے عقیدے سے باز نہ آئے بلکہ اور سخت ہوتے گئے اور بالآخر رقہ میں ۲۸ روز قید رہکر اسی مصیبت میں امام موصوف کا انتقال ہوا (ابن خلکان، تذکرہ ابوالکلام، المامون رسالہ ابن تیمیہ وغیرہ دیکھو)

(۴) عبداللہ بن عمر القراریری اور حسن بن حماد وغیرہ دیگر علما بھی قید ہوئے لیکن تاب تشدد نہ لاکر اقرار کرکے چھوٹ گئے۔

فرمانرواؤں یعنی مامون، معتصم، واثق باللہ کی شمشیر استبداد اور قہر حکومت نے اس فتنہ کا ساتھ دیا حتیٰ کہ بقول علی مدنی کے فتنہ ارتداد و منع زکوٰۃ (بعہد حضرت ابوبکرؓ) کے بعد یہ دوسرا فتنہ عظیم تھا جو اسلام کو پیش آیا۔

بغدادی نے اس زمانے میں جتنے فرقے معتزلہ کے پیدا ہو گئے تھے گیارہ بتایا ہے لیکن شہرستانی وغیرہ نے حماریہ[1]، حایطیہ[2]، مریسیہ[3] کو شمار کر کے ۱۴ بتائے ہیں۔ ہذیلیہ[4]، نظامیہ[5]، اسواریہ[6]، معمریہ[7]، بشریہ[8]، ہشامیہ[9]، مرادیہ[10]، جعفریہ[11]، اسکافیہ[12]، ثمامیہ[13]، جاحظیہ[14]۔

ہذیلیہ۔ یہ فرقہ[1] ہذیل علاف مولیٰ عبدالقیس کی جانب منسوب ہے، شیخ موصوف بصرہ کی معتزلہ جماعت کے سردار تھے، بہت بڑے عالم تھے اپنے مذہب کے ثبوت میں بعض خاص مقالات لکھے ہیں بعض چھوٹے چھوٹے فرقے معتزلہ کے مثلاً نظامیہ، بشریہ، ہشامیہ جن کا تذکرہ آگے آئے گا اور جو بعد میں پیدا ہوئے بعض خیالات میں شیخ موصوف کے خوشہ چیں ہیں۔

ابو ہذیل[2] سنہ ۱۳۵ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۲۲۶ھ میں فوت ہوئے، وہ خاص خیال جس کی وجہ سے یہ ایک الگ اور مستقل جماعت بن گئی وہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کسی چیز کے فنا ہو جانے کے بعد از سرنو اس کے بنانے پر قادر نہیں ہے۔

نظامیہ۔ یہ اپنے بانی ابراہیم بن سیار نظام کی جانب منسوب ہے یہ مدینہ میں سنہ ۱۶۰ھ میں پیدا ہوئے اور عراق میں سنہ ۲۳۱ھ کو وفات ہوئی، ان کا بھی شمار معتزلہ کے اہم لوگوں میں تھا فن بیان اور بلاغت کے امام تھے، جس کا ثبوت یہ ہے کہ جاحظ جو مشہور امام فن بلاغت کا گزرا ہے صاحب موصوف کا شاگرد اور انہیں کا تربیت یافتہ تھا۔ وہ خاص مسائل جن میں انہوں نے عام جماعت سے اختلاف کیا وہ یہ ہیں (۱) جو صلاحیت جس چیز میں موجود ہوتی ہے اس کے

---

(۱) مختصر الفرق بین الفرق

(۲) ابن خلکان جلد اول صفحہ ۶۰۴

خلاف اگر خدا چاہے کہ اس کی اس خاصیت کے ماورا نتیجہ ظہور میں آئے تو یہ ناممکن ہے۔ بالفاظ دیگر جیسا کہ ہذیلیہ (نعوذ باللہ) خدا کے عجز کے قائل تھے یہ بھی ہیں (۲) کسی چیز کی کمی (الیٰ غیر النہایت) انتہائی تقسیم نہیں ہو سکتی۔ (۳) یہ لوگ اعجاز قرآن کے قائل نہ تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر لعن وطعن کرتے اس لئے کہ انہوں نے نبی صلعم کی وفات میں شبہ کیا، یوم حدیبیہ کے موقعہ پر شک کیا۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو میراث سے محروم کیا۔

اسواریہ۔ یہ فرقہ گو نظامیہ کی ایک شاخ تھی بہت کم ایسی باتیں ہیں جس میں ان سے اختلاف کیا۔

معمریہ۔ یہ جماعت معمر بن عباد سلمی کی متبع تھی جن کا زمانہ وفات ۲۲۰ھ ہے۔ زمانہ پیدائش میں بہت زیادہ اختلاف ہے۔ انکا خاص عقیدہ یہ تھا کہ خدا نے بجز مادے کے کچھ پیدا نہیں کیا جو تغیرات کہ مخلوقات عالم میں روز دیکھتے ہیں وہ انہیں مادے کے خواص ہیں جن کا ظہور ان کی طبیعت اور خاصیت کے لحاظ سے ہوا کرتا ہے۔ خدا کو (نعوذ باللہ) اسمیں مطلق دخل نہیں ہے۔

بشریہ۔ اسکا بانی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے بشر بن معتمر ہیں انکے معتقدات تقریباً وہی ہیں جو ہذیل علاف کے تھے انکا مخصوص عقیدہ یہ ہے کہ کل کے کل افعال متولدہ ہیں انکا فاعل کوئی نہیں اور یہ عقیدہ بہت زیادہ معمر بن سلمی اور ثمامہ بن اشرس جن کا تذکرہ آگے آتا ہے کے زیادہ مشابہ ہے۔ ایک خاص عقیدہ عام معتزلہ کے عقیدہ کے خلاف یہ ہے کہ خدا صاحب ارادہ ہے اس معنی کر کے کہ ارادہ اسکی صفت ازلی ہے۔

ہشامیہ۔ انکا سردار ہشام بن عمرو الفوطی ہیں انہوں نے قرآن کی اکثر آیتوں کی تاویلیں بہت غلط طریقہ سے کیں ہیں۔ یہ بھی علاف کی طرح خدا کے عجز کے قائل تھے۔

اسکافیہ جعفریہ۔ ان دونوں کا عقیدہ عام سے بالکل الگ یہ تھا کہ گناہ کبیرہ سے محفوظ محض گناہ صغائر کی وجہ سے عذاب میں مبتلا نہ ہوگا۔

ثمامیہ۔ معتزلہ کے اہم ترین فرقوں میں اس فرقہ کا شمار کیا جاتا ہے، اسکا شیخ ثمامہ بن اشرس

الخیری ہیں، یہ شخص مامون الرشید کا ہم عصر تھا۔ اس جماعت کا خیال یہ ہے کہ عالم کی پیدائش خدا کی مشیت سے نہیں ہوئی، بلکہ مادہ پہلے سے موجود تھا جس نے رفتہ رفتہ موجودہ شکل اختیار کی، عالم ازلی ہے جیسا خدا خود ازلی ہے۔ عقل اچھائیوں برائیوں کی پرکھنے والی ہے، اس لئے شریعت خواہ آئے نہ آئے ہر حالت میں اللہ کی معرفت انسان کو واجب ہے۔

جاحظیہ۔ ثمامیہ کے بعد اس جماعت کا نمبر ہے اس کی نسبت جاحظ جو عربی کا مشہور کاتب ہے اس کی طرف منسوب ہے، جاحظ نے نظام کی تلقین سے مذہب اعتزال اختیار کیا، معتزلہ جن وجوہ اور بنا پر مورد الزام ٹھہرائے جاتے ہیں اس نے اپنے زور قلم سے بہت حد تک ان الزامات کو دور کرنے کی کوشش کی اور کم از کم اپنے زمانہ میں تو کسی قدر کامیاب ہو ہی گیا تھا۔ اس کا عقیدہ[1] یہ تھا کہ کسی کو دائمی عذاب نہ دیا جائے گا بلکہ گنہگار شخص سختیوں اور مصائب کے جھیلنے کے بعد پاک و صاف ہو جائیگا۔

ان فرقوں کے علاوہ دو فرقے اور ہیں حایطیہ اور حماریہ جس کو بغدادی نے غلاۃ میں شمار کیا ہے لیکن اور دوسرے مصنفین نے جیسا کہ اوپر ذکر کر چکا ہوں معتزلہ میں گنا ہے۔ حایطیہ کا خاص عقیدہ یہ ہے کہ خدا ایک نہیں بلکہ دو ہیں دوسرے حضرت عیسیٰ ہیں، اور حماریہ تناسخ کے قائل ہیں بغدادی نے انکے عقیدوں کی بنا پر یہ رائے قائم کی ہے کہ یہ قطعاً معتزلہ نہیں ہو سکتے اس لئے کہ توحید جو معتزلہ کا بنیادی اصول ہے اسی چیز کا یہاں انکار ہے۔

اوپر جتنے فرقوں کے نام ابھی گنائے گئے ہیں سب اسی دور کی پیداوار ہیں جن میں سے بہت سے فرقے ہم عصر ہیں، اور اکثر بہت کم عرصہ تک زندہ رہے، البتہ پانچ جو بڑے فرقے تھے ہذیلیہ، نظامیہ، عمریہ، بشریہ اور جاحظیہ انکا اثر زیادہ دن تک قائم رہا۔ ان پانچوں میں بھی نظامیہ اور جاحظیہ کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔

تیسرا دور

مامون، معتصم اور واثق باللہ کے دور حکومت تک معتزلہ کا بہت زیادہ اثر رہا لیکن اس کے

(۱) الفکر العربی و مقالہ فی التاریخ

بعد واثق اور متوکل نے ساتھ نہ دیا۔ متوکل نے تو اس درجہ ان پر سختیاں کیں کہ وہ بے دست و پا ہو کر منتشر ہو گئے۔ کچھ عرصہ تک جاحظ نے اپنے زور قلم سے اس کی ساکھ باقی رکھنے کی کوشش کی مگر کچھ زیادہ عرصہ تک نبھ نہ سکی اور رفتہ رفتہ زوال شروع ہو گیا اور یہی حالت اس کی اس تیسرے دور میں پیش آئی، مگر اب بھی شامیہ، خیاطیہ[1]، اور کعبیہ، جشمیہ وغیرہ نامی جماعتیں پیدا ہوئیں لیکن جیسا کہ ظاہر کر چکا ہوں کہ حالات نامساعد تھے اس لئے اب یہ فرقے کچھ ترقی نہ کر سکے مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ معتزلہ ہمیشہ کے لئے مٹ گئے۔ انکی اس آزاد خیالی کو دیکھکر بعض وہ فرقے جو زمانہ مابعد یا انکے زمانہ میں پیدا ہوئے، مستفید ہوئے۔ انشاء اللہ آئندہ اگر توفیق ہوئی تو ہمارے آئندہ مضمون میں جو قرامطہ یا باطنیہ پر ہوگا، آپ دیکھیں گے کہ ان پر انکا کچھ اثر تھا یا نہیں۔

---

(۱) خیاطیہ جس کی جانب یہ فرقہ منسوب ہے، انکی لکھی ہوئی ایک قدیم کتاب کا علم ابھی حال ہی میں ہوا ہے۔ اس کتاب کا نام کتاب الانتصار ہے۔ اسمیں صراحت کے ساتھ اس جماعت کے عقائد وغیرہ بیان کئے گئے ہیں اس کتاب کو اپسالا یونیورسٹی (سویڈن) کے ایک استاد ڈاکٹر نیبرگ نے اسکو قاہرہ کے کتب خانہ سلطانی کے ایک نادر الوجود نسخہ سے لیکر ایک مفصل عربی دیباچہ کے ساتھ ۱۹۲۵ء میں شائع کیا ہے (معارف جلد ۱، ماہ اگست ۱۹۲۶ء) مضمون لکھتے وقت معارف کے ذریعہ اس کتاب کا علم ہوا مگر دستیاب نہ ہو سکنے کے باعث اس سے استفادہ کا موقعہ نہ ملا۔ بہرحال اس مفید کتاب کے علاوہ جن جن کتابوں کی مدد سے یہ لکھا گیا ہے اسکا بیچ بیچ میں حوالہ دیدیا گیا ہے۔

الخبیری ہیں، یہ شخص مامون الرشید کا ہم عصر تھا۔ اس جماعت کا خیال یہ ہے کہ عالم کی پیدائش خدا کی مشیت سے نہیں ہوئی، بلکہ مادہ پہلے سے موجود تھا جس نے رفتہ رفتہ موجودہ شکل اختیار کی، عالم ازلی ہے جیسا خدا خود ازلی ہے۔ عقل اچھائیوں برائیوں کی پرکھنے والی ہے۔ اس لئے شریعت خواہ آئے نہ آئے ہر حالت میں اللہ کی معرفت انسان کو واجب ہے۔

جاحظیہ۔ ثمامیہ کے بعد اس جماعت کا نمبر ہے اس کی نسبت جاحظ جو عربی کا مشہور کاتب ہے اس کی طرف منسوب ہے۔ جاحظ نے نظام کی تلقین سے مذہب اعتزال اختیار کیا، معتزلہ جن وجوہ کی بنا پر مورد الزام ٹھہرائے جاتے ہیں اس نے اپنے زور قلم سے بہت حد تک ان الزامات کو دور کرنے کی کوشش کی اور کم از کم اپنے زمانہ میں تو کسی قدر کامیاب ہو ہی گیا تھا۔ اس کا عقیدہ[1] یہ تھا کہ کسی کو دائمی عذاب نہ دیا جائے گا بلکہ گنہگار شخص سختیوں اور مصائب کے جھیلنے کے بعد پاک وصاف ہو جائیگا۔

ان فرقوں کے علاوہ دو فرقے اور ہیں حائطیہ اور حماریہ جس کو بغدادی نے غلاۃ میں شمار کیا ہے لیکن اور دوسرے مصنفین نے جیسا کہ اوپر ذکر کر چکا ہوں معتزلہ میں گنا ہے۔ حائطیہ کا خاص عقیدہ یہ ہے کہ خدا ایک نہیں بلکہ دو ہیں دوسرے حضرت عیسیٰ ہیں، اور حماریہ تناسخ کے قائل ہیں بغدادی نے انکے عقیدوں کی بنا پر یہ رائے قائم کی ہے کہ یہ قطعاً معتزلہ نہیں ہوسکتے اس لئے کہ توحید جو معتزلہ کا بنیادی اصول ہے اسی چیز کا یہاں انکار ہے۔

اوپر جتنے فرقوں کے نام ابھی گنائے گئے ہیں سب اسی دور کی پیداوار ہیں جن میں سے بہت سے فرقے ہم عصر ہیں، اور اکثر بہت کم عرصہ تک زندہ رہے، البتہ پانچ جو بڑے فرقے تھے ہذیلیہ، نظامیہ، عمریہ، بشریہ اور جاحظیہ انکا اثر زیادہ دن تک قائم رہا۔ ان پانچوں میں بھی نظامیہ اور جاحظیہ کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔

تیسرا دور

مامون، معتصم اور واثق باللہ کے دور حکومت تک معتزلہ کا بہت زیادہ اثر رہا لیکن اس کے

(۱) الفکر العربی و مقالہ فی التاریخ

بعد واثق اور متوکل نے ساتھ نہ دیا۔ متوکل نے تو اس درجہ انپر سختیاں کیں کہ وہ بے دست و پا ہو کر منتشر ہو گئے۔ کچھ عرصہ تک جاحظ نے اپنے زور قلم سے اس کی ساکھ باقی رکھنے کی کوشش کی مگر کچھ زیادہ عرصہ تک نبھ نہ سکی اور رفتہ رفتہ زوال شروع ہو گیا اور یہی حالت اس کی اس تیسرے دور میں پیش آئی، مگر اب بھی شامیہ، خیاطیہ(۱)، اور کعبیہ، حشمیہ وغیرہ نامی جماعتیں پیدا ہوئیں لیکن جیسا کہ ظاہر کر چکا ہوں کہ حالات ناساعد تھے اس لئے اب یہ فرقے کچھ ترقی نہ کر سکے مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ معتزلہ ہمیشہ کے لئے مٹ گئے۔ انکی اس آزاد خیالی کو دیکھکر بعض وہ فرقے جو زمانہ مابعد یا انکے زمانہ میں پیدا ہوئے، مستفید ہوئے۔ انشاء اللہ آئندہ اگر توفیق ہوئی تو ہمارے آئندہ مضمون میں جو قرامطہ یا باطنیہ پر ہو گا، آپ دیکھیں گے کہ ان پر انکا کچھ اثر تھا یا نہیں۔

---

(۱) خیاطیہ جس کی جانب یہ فرقہ منسوب ہے، انکی لکھی ہوئی ایک قدیم کتاب کا علم ابھی حال ہی میں ہوا ہے۔ اس کتاب کا نام کتاب الانتصار ہے۔ اسمیں صراحت کے ساتھ اس جماعت کے عقائد وغیرہ بیان کئے گئے ہیں اس کتاب کو اپسالا یونیورسٹی (سویڈن) کے ایک استاد ڈاکٹر نیبرگ نے اسکو قاہرہ کے کتب خانہ سلطانی کے ایک نادر الوجود نسخہ سے لیکر ایک مفصل عربی دیباچہ کے ساتھ سنہ ۲۵ء میں شائع کیا ہے (معارف جلد ۱۰، ماہ اگست سنہ ۲۶ء) مضمون لکھتے وقت معارف کے ذریعہ اس کتاب کا علم ہوا مگر دستیاب نہ ہو سکنے کے باعث اس سے استفادہ کا موقعہ نہ ملا۔ بہرحال اس مفید کتاب کے علاوہ جن جن کتابوں کی مدد سے یہ لکھا گیا ہے اسکا بیچ بیچ میں حوالہ دیدیا گیا ہے۔

مالیات ہند

ہندوستان کے آئندہ دستور اساسی کے مرتب کرنے میں دیگر فرقہ وارانہ اور سیاسی مسائل کے ساتھ ساتھ بعض ایسے اہم مسائل بھی درپیش ہیں جن کو حل کئے بغیر کوئی دستور اساسی کامیابی کے ساتھ نہیں چل سکتا ہے۔ چنانچہ سائمن کمیشن نے مسٹر ڈبلو۔ ٹی لیٹن جو مالیاتی مسائل کے ماہر سمجھے جاتے ہیں خاص اسی غرض سے مقرر کیا تھا کہ صوبجات اور مرکزی حکومت کے فرائض کا لحاظ رکھکر انکے لئے ذرائع آمدنی کی تقسیم کے متعلق علحدہ تحقیقات کریں اور اپنی تجاویز پیش کریں جو سائمن کمیشن کی رپورٹ میں شامل کرلی جائے گی۔ گذشتہ معاشی کانفرنس منعقدہ الہ آباد میں بھی یہ مسئلہ زیر بحث رہا اور مختلف الخیال ماہرین فن نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے اظہار خیال کیا جس سے مسئلہ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

۱۸۵۰ء سے ۱۹۱۰ء تک برطانوی ہند کے تمام محاصل حکومت ہند وصول کرتی تھی اور وہی اس کو صرف کرنے کی ذمہ وار تھی۔ صوبجات کو ان کی ضرورت کے مطابق مرکزی حکومت کی طرف سے گویا روپیہ تقسیم ہوتا تھا۔ محاصل میں اضافہ یا تخفیف کا اختیار صرف مرکزی حکومت کو تھا۔ لیکن ۱۹۱۰ء کی اصلاحات میں صوبجاتی حکومتوں کو ایک طرف تو اکثر معاملات میں مرکزی حکومت کے اثر سے بالکل آزاد اور خود مختار کردیا گیا اور دوسری طرف صوبجاتی حکومت کی مجالس قانون ساز میں انتخابی عنصر کو بڑھاکر قوم کے سامنے ایک حد تک جوابدہ بنا یا گیا۔ اس لئے ناگزیر تھا کہ صوبجاتی حکومتوں کے مدات محاصل کو مرکزی حکومت کے مدات محاصل سے علحدہ کیا جائے۔ اور صوبجاتی حکومتوں کو اپنے محاصل وصول کرنے اور صرف کرنے نیز ان میں اضافہ کرنے اور تخفیف کرنے کے اختیارات تفویض کردئے جائیں تاکہ فرائض اور خدمات صوبجات پر عائد کئے گئے ہیں ان کو وہ بحسن وخوبی مرکزی حکومت کی "بالادستی" سے آزاد ہوکر انجام دے سکیں۔

اصلاحات سے قبل حکومت ہند کے ذرائع آمدنی میں سے خاص خاص قابل ذکر مدات مالگذاری، آبکاری، انکم ٹکس، کرورگیری، افیون اور نمک کا محصول اور سرکاری ریلوں کا منافع شمار کیجاتی تھیں۔ ان میں سے مالگذاری اور انکم ٹکس کی آمدنی مرکزی اور صوبجاتی حکومتوں کے درمیان تقسیم ہوجاتی تھی۔ آبکاری کی آمدنی بعض صوبوں کو پوری کی پوری ملجاتی تھی اور بعض صوبوں میں مرکزی حکومت کا حصہ بھی ہوتا تھا۔

اصلاحات کے بعد تقسیم آمدنی کا یہ اصول ترک کردیا گیا اور بعض ذرائع آمدنی کلیتہً صوبجاتی حکومتوں کے انتظام میں دیدئے گئے اور بعض کلیتہً مرکزی حکومت کی تحویل میں دئے گئے چنانچہ مالگذاری اور آبکاری کی آمدنی صوبجات کے حصہ میں آئی اور باقی محصول کرورگیری، انکم ٹکس محصول افیون اور نمک اور ریلوں کا منافع مرکزی حکومت کے قبضہ میں رہا۔

لیکن گذشتہ سال دس برس کے تجربہ کے بعد اب اس میں کوئی شک باقی نہیں رہا ہے کہ جس طرح صوبجاتی حکومت میں دوعملی کا طریقہ اصولی اور دونوں حیثیتوں سے ناقص اور ناقابل عمل تھا۔ اسی طرح نئے دستور کو چلانے کے لئے ذرائع آمدنی کی جو تقسیم کی گئی تھی وہ بھی بہت ناقص تھی۔ صوبجات ذمہ دار قرار دئے گئے ہیں قومی تعمیر اور مفاد عامہ کے تمام امور کہ جس میں شعبہ جات تعلیم، صنعت وحرفت، زراعت، صحت عامہ، ہسپتال وغیرہ سب شامل ہیں۔ ان شعبہ جات کی ترقی پر قوم وملک کی ترقی اور فلاح کا دارومدار ہے اور ظاہر ہے کہ جس قدر روپیہ انپر لگایا جائے وہ کم ہے لیکن صوبجات کی آمدنی کے جو سب سے بڑے دو ذریعے ہیں یعنی مالگذاری اور آبکاری وہ اول تو اضافہ پذیر نہیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ رائے عامہ اخلاقاً اور اصولاً ان دونو ذرائع سے اضافہ آمدنی کے خلاف ہے۔

ملک کی موجودہ غربت اور افلاس اور خصوصاً زراعت پیشہ طبقہ کی پست حالت سے دنیا واقف ہے اور جن لوگوں نے معاشی حالات کا بغور مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ زراعت پیشہ طبقہ کی افسوسناک حالت بہت حد تک مالگذاری کے موجودہ نظام اور بندوبست کی مرہون منت ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ جس وقت سے قوم کو اپنے میزانیہ پر رائے زنی کا حق دیا گیا اس وقت سے برابر مالگذاری کی تخفیف اور نظام بندوبست میں تبدیلی اور ترمیم پر ہر صوبہ میں زور دیا جا رہا ہے۔ آبکاری کا محصول بھی ہندوستان کے ایسے ملک میں جہاں مذہب پرست ہندو اور مسلمان بستے ہیں کبھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا اور اب تو کچھ عرصہ سے ہر صوبہ میں حکومت کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ انسداد شراب نوشی کو مقصد قرار دے کر ملک کو اس لعنت سے اس طرح پاک کر دیا جائے کہ ہمارے میزانیہ سے محصول آبکاری کی مد بالکل غائب ہو جائے۔ غرض جب ان بڑی مدات آمدنی کی مخالفت میں قوم کی رائے عامہ کا یہ حال ہو اور دوسری طرف یہ مطالبہ بھی ہو کہ ان شعبہ جات پر سوگنا اور ہزار گنا زیادہ روپیہ صرف کیا جائے جن کا تعلق براہ راست قوم کی ترقی اور خوشحالی سے ہے تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں کوئی صوبجاتی حکومت اپنے فرائض اور خدمات کو قوم کی منشا کے مطابق انجام نہیں دے سکتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ صوبہ کی حکومتیں گو انسداد شراب نوشی کے اصول کو تسلیم کر چکی ہیں مگر محصول آبکاری کے اعداد و شمار کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ مالگذاری میں بھی بجائے تخفیف کے ہر بندوبست میں اضافہ ہی کیا جاتا ہے۔ لیکن گذشتہ جو کچھ بدحالی میں پیش آیا اس سے حکومت اور ملک کو زراعت پیشہ طبقہ کی معاشی حالت کا اندازہ ہو گیا ہے اور صوبجاتی حکومتوں کو اپنی اُن یادداشتوں میں جو سائمن کمیشن کے سامنے پیش کی گئی ہیں یہ اقرار کرنا پڑا کہ ان مذکورہ مدوں میں اضافہ آمدنی کی بالکل گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔

اب مرکزی حکومت کے ذرائع آمدنی کا جائزہ لیجئے تو معلوم ہوگا کہ انکم ٹکس اور کروڑگیری دونوں مدیں ایسی ہیں کہ ملک کی خوشحالی، تجارت کے فروغ، صنعت و حرفت اور زراعت کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان میں روزافزوں اضافہ کی گنجایش ہے۔ اور حقیقتاً کسی ملک کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ یہی دو مدیں ہوا کرتی ہیں۔ لیکن اگر آمدنی کے ذرائع کے مقابلہ میں ان خدمات اور فرائض کو دیکھا جائے جو حکومت ہند کو انجام دینا پڑتی ہیں تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ذرائع آمدنی کی تقسیم

میں صوبجات کے ساتھ بڑی ناانصافی کی گئی ہے، اس وقت اس میں شک نہیں کہ مرکزی حکومت فوجی مصارف کے بارے اس قدر لدی ہوئی ہے کہ کل آمدنی تقریباً نصف حصہ اس "سفید ہاتھی" کو کھلانے، اور اس کے رکھ رکھاؤ پر صرف ہو جاتا ہے، جس سے ہندوستان کو سو میں سے ایک حصہ فائدہ بھی بمشکل پہنچتا ہے، اور اگر ہندوستان کے لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں تو ایشیا، اور افریقہ کی قومیں اس کی شہادت دیں گی کہ ہندوستان کی فوج اور سپاہ ہندوستان کی حفاظت کے لئے نہیں بلکہ ہندوستان کو انگلستان کے قبضہ میں رکھنے کے لئے اور ایشیا، اور افریقہ میں برطانوی شہنشاہیت کے قیام اور استحکام کے لئے تیار کی گئی ہے۔ قوم کی آواز حکومت کے ایوانوں میں ہزار بار اس فوجی پالیسی کے خلاف اٹھ چکی ہے لیکن ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ ہندوستان کی غیر ذمہ دار حکومت تاج انگلستان کے زیر نگیں رہ کر برطانوی مفاد کے مقابلہ میں ہندوستان کے مفاد کا خیال کرے! بہر حال اگر آئندہ کبھی قوم کو اپنے معاملات میں دخل ہوا سب سے پہلی چیز جس میں قطع و برید کی جائے گی وہ حکومت ہند کے فوجی مصارف کی مد ہے۔ اس وقت بھی قوم کی مسلسل احتجاجات کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ حکومت نے اپنے فوجی مصارف کو بتدریج کم کرنیکا وعدہ کیا ہے اور اسی سے ہوا کا رُخ معلوم ہوتا ہے اس لئے اگر اس مد میں معقول تخفیف کی ضرورت تسلیم کر لیجائے تو پھر حکومت ہند کے موجودہ ذرائع آمدنی سے جو رقم وصول ہوگی وہ اس مصارف سے صوبجات کے مقابلہ میں نسبتاً بہت زیادہ ہوگی۔ دراں حالیکہ صرف کی مدات میں علاوہ فوج کے کوئی ایسی مد نہیں ہے جس سے قوم کی تعمیر اور فلاح کا براہ راست تعلق ہو۔

اب مندرجہ بالا حالات کو پیش نظر رکھکر صوبجات کی مالیاتی مشکلات کو دور کرنے کی دو ہی تدبیریں ہوسکتی ہیں یا تو محصول میں اور زیادہ اضافہ کیا جائے اور خون کے چند قطرے جو کسانوں کے جسم میں رہ گئے ہیں ان کو بھی چوس لیا جائے اور اسی کے ساتھ ساتھ شراب نوشی اور دیگر منشیات کو رواج دیا جائے تاکہ ایک طرف تو شراب کے نشہ میں چور ہو کر نہ ان کو بھوک کی

شدت معلوم ہو۔ جسم کی برہنگی کا احساس رہے اور دوسری طرف بلا وقت محصول میں بھی اضافہ ہوتا رہے۔ دوسری تدبیر یہ ہوسکتی ہے کہ ذرائع آمدنی کی موجودہ تقسیم میں تبدیلی کی جائے۔

پہلی تجویز سے غالباً کوئی شخص اصولاً یا اخلاقاً اتفاق نہیں کرسکتا اور اگر حکومت اصول واخلاق کو پس پشت ڈالکر انہیں دو مدوں سے اپنی تمام ضروریات کے لئے آمدنی فراہم کرنا چاہے تب بھی علاوہ ازیں یہ ممکن نظر نہیں آتا۔ البتہ دوسری تجویز قابل غور ہے اور یہ ممکن ہے کہ صوبجات کو بھی کوئی ایسا ذریعہ آمدنی دیا جائے جو اول تو اضافہ پذیر ہو دوسرے یہ کہ رائے عامہ اصولاً اور اخلاقاً اس کے خلاف نہ ہو۔ اس وقت تمام مدات آمدنی میں صرف دو ہی مدات ایسی ہیں جن کو اصطلاحاً اضافہ پذیر کہا جاسکتا ہے۔ یعنی کروڑگیری اور انکم ٹکس۔ کروڑگیری کا محصول علاوہ ساحلی صوبوں کے دوسرے تمام صوبوں کے حصہ میں نہیں آسکتا۔ اور اگر ایسا ممکن بھی ہوتا تب بھی اصولاً ایسا کرنا مناسب نہیں تھا اس لئے کہ پھر کروڑگیری کے محصول میں یکسانیت باقی نہیں رہ سکتی دوسری مد انکم ٹکس کی ہے۔ اس کے متعلق البتہ تمام صوبجات شروع سے مطالبہ کررہے ہیں۔ خصوصاً بمبئی اور بنگال کے صوبے اس وجہ سے کہ ان دونوں صوبوں میں آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ یہی ایک مد ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ صوبجات کا یہ مطالبہ ہر لحاظ سے صحیح اور جائز ہے۔ چنانچہ مسٹن کمیٹی نے بھی دبی زبان سے یہ تسلیم کیا تھا کہ ”صوبجات کو ایک عرصہ تک انکم ٹکس کی آمدنی میں شریک نہ کرنا نہ تو ممکن ہی اور نہ درست“۔

لیکن اگر صوبجات کی مالیاتی دشواریوں کو دور کرنے کے لئے انکم ٹکس کی آمدنی کلیتہً صوبجات کی تحویل میں دیدی جائے تو بعض عملی دشواریاں اس انتظام میں ایسی پیدا ہوں گی جن کو بحالات موجودہ نظرانداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔ پہلی چیز تو یہ ہو کہ اس تبدیلی سے مرکزی حکومت

کے موجودہ مصارف جو بیشتر فوجی مصارف پر مشتمل ہیں کسی طرح پورا نہ ہو سکیں گے اور آئندہ بھی حکومت ہند برطانوی بحری اور ہوائی بیڑہ کی حفاظت میں رہنے کی بجائے خود اپنا ہوائی اور بحری بیڑہ تیار کرنا چاہے تو مرکزی حکومت کے لئے بھی معقول آمدنی کا انتظام ہونا چاہئے۔ اس دشواری کا حل سردست تو یہ ہے کہ انکم ٹکس کو صوبجاتی مد قرار دیا جائے اور آبکاری کو مرکزی۔ اس انتظام میں مرکزی حکومت کو بجائے فوری نقصان کے تین کرور روپیہ سالانہ کا فائدہ ہوگا۔ اس وجہ سے اس وقت انکم ٹکس کی کل آمدنی سے محکمۂ آبکاری کی آمدنی بقدر تین کرور روپیہ کے زیادہ ہوتی ہے۔ اکثر صوبجات کو وقتی طور پر اس انتظام سے نقصان ہوگا لیکن آئندہ کی توقعات پر غالبًا وہ تمام صوبہ اس نقصان کو برداشت کرنا پسند کرینگے۔

محصول آبکاری پر جو اعتراض اخلاقی حیثیت سے اس وقت ہے وہ بہرحال قائم رہیگا اور حکومت ہند کو جلد یا بدیر انسداد شراب نوشی کو اپنا مقصد بنانا پڑے گا اور اس مد کی آمدنی میں تخفیف گوارا کرنا پڑے گی۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رہنا چاہئے کہ اگر آبکاری کی آمدنی میں تخفیف کے لئے قوم کا مطالبہ کچھ کم زور دار نہیں ہے اور حکومت کو اس معاملے میں بھی ایک دن سر تسلیم خم کرنا پڑے گا۔ اس طرح حکومت ہند کو مستقبل قریب میں اس کا کوئی اندیشہ نہیں ہونا چاہئے کہ میزانیہ کے دونوں سرے اس تجویز کو قبول کر کے نہیں ملائے جا سکتے۔

ایک اور دشواری بھی انکم ٹکس کو صوبجاتی مد قرار دینے میں پیش آئے گی اور وہ یہ ہے کہ بہت سی صورتیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں کہ کسی شخص یا ایک کمپنی کی تجارت کئی صوبوں اور ریاستوں میں پھیلی ہوئی ہے اور جو آمدنی ہوتی ہے وہ تنہا ایک صوبہ سے نہیں بلکہ مختلف صوبوں کی بدولت۔ ایسی صورت میں انکم ٹکس کس صوبہ کو ملے گا؟ یہ سوال اور بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے، جب یہ دیکھا جائے کہ مرکزی حکومت کے قائم کردہ ذرائع آمد و رفت سے سب سے زیادہ فائدہ بڑی بڑی تجارتی کمپنیاں اور بڑے بڑے تجار اٹھاتے ہیں۔ پھر مرکزی حکومت اگر اپنی خدمات کا معاوضہ طلب کرے تو کیا بیجا ہے

اس دشواری کا حل یہی ہو سکتا ہے کہ شخصی آمدنی کا ٹکس تو صوبجاتی حکومت کو دیا جائے اور کمپنی یا شرکتوں کی آمدنی کا محصول مرکزی حکومت کو دیا جائے۔ زرعی صوبے اب بھی بمقابلہ صنعتی صوبوں کے نقصان میں رہیں گے۔ لیکن زرعی صوبے ہمیشہ زراعت ہی کی ایک صنعت پر قانع نہیں رہینگے اس لئے ابتدائی دور کا یہ نقصان آئندہ کی توقعات کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ دوسرے ممالک جہاں اتحادی نظام ریاست رائج ہے مثلاً ریاستہائے متحدہ امریکہ، کناڈا۔ اور اسٹریلیا ان ممالک میں بھی یہی طریق عمل ہے اور اس وجہ سے اور بھی ذرائع آمدنی کی تقسیم جو بطور بالا میں تجویز کی گئی اصولی اور عملی دونوں حیثیتوں سے مناسب اور معقول معلوم ہوتی ہے۔

مسئلہ تاوان جنگ

جنگ عظیم کے ختم ہونیکے بعد سے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے ساتھ اخبارات میں تاوان جنگ کے مسئلہ کے متعلق بے شمار خبریں اور لاتعداد مضامین چھپتے رہے ہیں، پچھلے دنوں ہی جب ہیگ میں تاوان جنگ کے مسئلہ کا تصفیہ کرنے کے لئے دول عظمیٰ کی ایک کانفرنس ہو رہی تھی اخباروں کے کالم اس کی خبروں سے پر ہوتے تھے۔ لیکن ہمارا گمان ہے کہ رسالہ جامعہ کے ناظرین کی واقفیت کے لئے ہم ذیل میں مسئلہ تاوان جنگ کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کرتے ہیں۔ امید کہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

جنگ کی تاریخ میں یہ کوئی نئی بات نہیں کہ فاتح مفتوح سے تاوان وصول کرتا ہے۔ جب جنگ عظیم شروع ہوئی تو جرمنی کی طرف سے برابر اعلان ہوتے کہ وہ ختم جنگ پر اپنے مخالفوں سے جی بھر کے تاوان وصول کریگا۔ لیکن جب جنگ نے طول کھینچا اور جرمنی کی کامیابی اتنی یقینی نہ رہی تو اعلان ہوا کہ اس جنگ کا نتیجہ کچھ ہو نہ کسی کا ملک چھینا جائے گا نہ کسی سے تاوان لیا جائے گا۔ ادھر انگلستان اور فرانس نے جنگ کے شروع میں تاوان اور ملک گیری کا ذکر ہی نہ کیا وہ حریت وجمہوریت کے اصولوں کی خاطر میدان جنگ میں اترے تھے، ایسی پست باتوں کا کیا ذکر کرتے لیکن جب کامیابی کی امید بندھی تو انہوں نے کہنا شروع کیا کہ ہم کو جنگ سے جو جو نقصانات ہوئے ہیں ان سب کا معاوضہ جرمنی سے وصول کیا جائے گا۔

جنگ ختم ہوئی تو جرمنی کو تاوان جنگ کی ادائیگی کا اقرار کرنا پڑا۔ مسٹر لائڈ جارج انگریزی وزیراعظم اور موسیو کلیمانسو وزیر فرانس نے جو مطالبہ کیا اس کے اعداد ایسے تھے کہ جیسے نجوم میں تاروں کے فاصلہ کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ اور صلح کانفرنس میں مہینہ تک یہ لوگ اپنے نقصانات کی فہرست مرتب کر سکے نہ اس کی رقم کا تخمینہ کر سکے اور جرمنی سے کہا گیا کہ تم ان

نقصانات کی تلافی کا اقرار کرلو۔ رقم تمہیں یکم مئی ۱۹۲۱ء کو بتادی جائے گی لیکن اس وقت تک تم ۲۰ ارب مارک سالانہ دیتے رہو (ایک مارک تقریباً ۱۲ کے برابر ہوتا ہے) اور روپیہ نہ ہو تو مال و اسباب کی شکل میں ادا کرو۔ چنانچہ جرمنی نے ریلیں، جانور، جہاز، اس رقم کو پورا کرنے کے لئے دئے۔ اور جب یکم مئی ۱۹۲۱ء آئی تو جرمنوں نے بتلایا کہ وہ اس مدت میں تقریباً ۸ ارب کا سامان دے چکے اور اس سے دو سال کا جو مطالبہ تھا وہ پورا ہو چکا۔ لیکن فرانس کے اثر سے تاوان کے کمیشن نے فیصلہ کیا کہ جرمنی نے ۲۰ ارب میں سے کل ۶ ارب دئے ہیں، غیر جانبدار امریکن ماہرین کی رائے میں بھی جرمنوں نے کم سے کم ۲۰ ارب مارک ادا کردئے تھے۔ مئی ۱۹۲۱ء میں بالآخر فرانس اور انگلستان وغیرہ نے اپنے نقصانات کا اندازہ لگا کر جرمنی کو بتلایا کہ تمہیں کل ایک کھرب ۳۲ ارب مارک بطور تاوان دینے ہیں۔ اور اس کے علاوہ بلجیم کو ۴ ارب مارک دینے ہونگے۔ جرمنی بہت چیخا چلایا کہ اتنی رقم ادا کرنا اس کے لئے ممکن نہیں۔ لیکن زبردست مارے اور رونے نہ دے لاچار جرمنی کو اس ناممکن رقم کے ادا کرنے کا اقرار کرنا پڑا۔ لیکن اس وقت چونکہ جرمنی کوئی معتد بہ رقم نہیں دے سکتا تھا اسلئے قرار یہ پایا کہ جرمنی اسی وقت ۵۰ ارب کا قرضہ ۶ فیصدی شرح سود پر لے اور بعد کو بقیہ ۸۲ ارب کا بھی اسی طرح انتظام کیا جائے۔ اور فی الحال جرمنی ۵۰ ارب پر سالانہ ۳ ارب مارک بطور سود ادا کرتا رہے۔ اور اگر اس رقم کی ادائیگی ناممکن ہو تو کم سے کم ۲ ارب
۹ سود تو ضرور سال کے سال دے دیا کرے۔ یوں وہ ایک کھرب ۳۲ ارب کا قرضہ واجب الادا تو برقرار رہے اور جرمنی سالانہ کم سے کم ۲ ارب بطور سود ادا کرتا رہے۔

کوئی ڈیڑھ برس تک تو جرمنی نے یہ رقم ادا کرنیکی کوشش کی اور اسے حتی الوسع اجناس کی شکل میں ادا کرتا رہا۔ لیکن بالآخر اس نے کندھا ڈالدیا۔ ادھر فرانس والے اپنی تباہ شدہ علاقوں کی درستی پر اربوں روپیہ صرف کر رہے تھے اور جرمنی سے روپیہ ملتا نہ تھا۔ جو کچھ ملتا اس میں بلجیم کا حق سب سے اول رکھا گیا تھا۔ چنانچہ فرانسیسی بگڑ گئے اور انہوں نے

جرمنی کے صنعتی علاقے رہور پر قبضہ کرلیا تاکہ اس طرح جرمنوں سے رقم وصول کریں۔ مگر اس کا اثر الٹا ہوا۔ رہور کے کان کنوں نے ہڑتال کردی، جرمنی میں اس فعل سے فرانس کے خلاف سخت نفرت پھیل گئی اور جرمنی کے سکہ کی رہی سہی بین الاقوامی قیمت بھی ختم ہوگئی۔

لیکن فرانس کے اس قبضہ سے جہاں بہت سی برائیاں پیدا ہوئیں وہاں ایک یہ اچھی بات ضرور ہوئی کہ حالات ناقابل عمل ہونے کا یقین سب کو ہوگیا اور ڈاز کمیشن نے صورت حال کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ اس کمیشن نے ۱۹۲۴ء میں جرمنی کے سکہ کو اس طرح درست کیا کہ پرانے کاغذ کے نوٹوں کو بالکل تلف کرادیا اور اس کے بجائے دوسرے نوٹ تیار کرائے جن کی تعداد محدود تھی اور جن کی ادائیگی کے لئے کافی سونا محفوظ کرلیا گیا تھا۔ تاوان کے متعلق اس کمیشن نے یہ طے کیا کہ پہلے سال جرمنی ایک ارب مارک ادا کرے، اور اس میں رفتہ رفتہ اضافہ کرکے ۵ سال بعد ۱۹۲۹ء میں ۲½ ارب۔ اس کے بعد جوں جوں جرمنی کی مالی اور معاشی حالت بہتر ہوتی جائے اس رقم میں اضافہ ہوتا رہے۔ اس نے یہ بھی طے کیا کہ فرانس رہور سے اپنی فوجیں ہٹالے

ڈاز کمیشن کے فیصلے، سابقہ بے عنوانیوں کے مقابلے میں بہت معقول تھے۔ لیکن اب تجویز ینگ کے نام سے اس کو بھی بدل دیا گیا ہے۔ اس نئی قرارداد کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے ایک کھرب ۳۲ ارب کی ناقابل ادائیگی رقم اور اس پر ایک غیر معین مدت تک سود کے بار کو جرمنی کے سر سے ہٹا دیا ہے اور اس کے بجائے یہ طے کردیا ہے کہ ستمبر ۱۹۲۹ء سے مارچ ۱۹۸۸ء تک یعنی ۵۸½ سال تک جرمنی ایک مقررہ رقم ادا کرتا رہے یعنی ۳۷ سال تک اوسطاً ۲ ارب مارک اور اس کے بعد ۲۲ برس تک تقریباً ۱½ ارب سالانہ۔ اس روپیہ کے لین دین کے لئے سوئٹزرلینڈ کے شہر بازل میں ایک بین الاقوامی بنک قائم ہوگا جس کے مہتمموں میں دول متعلقہ کے نمائندے ہونگے۔ امید ہے کہ یہ بنک اس قدر فائدہ کمائے گا کہ آخری سال کی رقم تاوان کا بڑا حصہ اس کے منافع سے ادا ہوسکیگا۔ اس نئی تجویز کی رو سے جرمنی جو رقم ادا کرے گا اس سے سب وہ قرضہ ادا ہوجائینگے جو جنگ کے لئے دول فاتح نے امریکہ سے

لئے تھے اور اس کے بعد انہیں اپنے نقصانات کی تلافی کے لئے بھی رقم بچ رہے گی۔ برطانیہ کو البتہ جرمنی سے اس سے بہت کم ملیگا جتنا اسے امریکہ کو دینا ہے لیکن اسے فرانس، اٹلی اور اپنے دوسرے قرضداروں سے اتنا ملجائے گا کہ اس تاوان کی رقم کو شامل کر کے وہ امریکہ کا قرضہ اتار سکے گا

قرضوں کی ادائیگی کی صورت مختصر یوں ہو گی کہ جرمنی ۱۹۳۰ء میں فرانس کو ۲۱۴ ملین ڈالر دے گا۔ برطانیہ کو ۳۶۶ ملین اور مجموعی طور پر سب قرضخواہوں کو ۴۰۷ ملین ڈالر۔ ادہر امریکہ کو فرانس ۳۵ ملین ڈالر دیگا، انگلستان ۱۶۰ ملین اور سب قرضدار مجموعی طور پر ۲۱۴ ملین ڈالر۔ ان رقموں میں ہر سال مناسب تغیر ہوتا رہے گا اور ۱۹۶۶ء میں جرمنی فرانس کو ۳۰۹ ڈالر دیگا۔ برطانیہ کو ۹۰ ملین اور سب کو ملا کر ۵۰۰ ملین۔ اُدہر امریکہ فرانس ۱۲۵ ملین ڈالر واپس کرے گا، برطانیہ ۱۰۲ ملین اور سب قرضدار مل کر ۳۷۹ ملین ڈالر۔

۱۹۶۷ء میں جرمنی فرانس کو ۱۸۹ ملین ڈالر دیگا، برطانیہ کو ۸۵ ملین اور سب کو ملا کر ۳۸۳ ملین، اُدہر امریکہ کو فرانس ۱۲۵ ملین ڈالر واپس کرے گا، برطانیہ ۱۰۱ ملین اور سب قرضدار ملکر ۳۸۰ ملین۔

۱۹۸۸ء میں جرمنی فرانس کو ۱۰۹ ملین ڈالر دیگا۔ برطانیہ کو ۸۵ ملین اور سب قرضخواہوں کو ملا کر ۲۱۳ ملین۔ امریکہ کو اس وقت کوئی رقم نہیں ملے گی۔ آخری ۳ سال میں سلطنت برطانوی کو اپنے سابقہ حلیفوں سے رقمیں ملیں گی جنہیں وہ بین الاقوامی بنک میں داخل کردیگی۔

ہمارا خیال ہے کہ ینگ کی تجاویز جنہیں دول متعلقہ نے منظور کرلیا ہے اگرچہ گذشتہ تمام تجاویز سے زیادہ معقول اور قابل عمل ہیں تاہم ۱۰۔ ۱۵ سال کے اندر انہیں بھی بدلنے کی ضرورت ہوگی۔ اس میں شک نہیں کہ جرمنی نے ۱۹۲۴ء کے بعد سے حیرت انگیز صنعتی ترقی کی ہے اور باوجود ان نقصانات کے جو صلحنامہ ورسائی سے اسے پہنچ چکے ہیں اس نے اکثر اعتبار سے اپنی جنگ سے قبل والی مرفہ الحالی حاصل کرلی ہے لیکن اس مطالبہ تاوان جنگ کی ادائیگی

کے لئے ضرورت ہے کہ اسکی برآمد اجناس سالانہ درآمد سے بقدر تقریباً ۲ ارب مارک کے زیادہ ہو۔ کہ وہ ۲ ارب سالانہ بطور تاوان اور ایک ارب بطور سود قرضہ خارجی کے ادا کرسکے ۔ جنگ سے پہلے معمولاً جرمنی کی درآمد برآمد سے زیادہ تھی۔ ۱۹۲۹ء میں بیشک درآمد سے برآمد کچھ زیادہ رہی لیکن ۳ ارب کا اضافہ قرین قیاس نہیں خصوصاً اس لئے کہ اس کے حریفوں نے اس کے مال کی درآمد پر رکاوٹیں عائد کر رکھی ہیں۔

پھر دور اندیش اور پیش بیں معاشی سمجھ رہے ہیں کہ تاوان کی یہ بڑی بڑی رقمیں وصول کرنا کہیں آگے جا کر نقصان نہ پہنچائے۔ کہ اس کی وجہ سے جرمنی اپنی تجارت برآمد کو بڑھانے پر مجبور ہوگا۔ اس طرح اپنی صنعت کی کارکردگی میں ترقی دے گا اور پھر صنعت و تجارت میں اسکا مقابلہ مشکل ہو جائیگا۔

موجودہ رفتار سے تقریباً ۱۵ سال کے اندر امریکہ اپنے اندرونی قرضہ جنگ کو پورا پورا ادا کر چکا ہوگا۔ اس وقت جو رقمیں اسے اپنے قرضداروں سے ملیں گی وہ خالص بچت ہونگی غالباً اس وقت جرمنی اور دیگر دول کی طرف سے مسئلہ تاوان پر نظر ثانی کی تجاویز پیش ہونگی اور جرمنی کا بار پھر ایک مرتبہ ہلکا کر دیا جائے گا۔ اور ساتھ ساتھ امریکہ اپنے قرضداروں کے ساتھ رعایت منظور کرے گا۔

کتب لغت عربی

اسلامی فتوحات کے ساتھ ساتھ جب عربی زبان بھی دیگر ممالک میں پھیلی اور غیر عرب اقوام دین اسلام میں داخل ہونے لگیں اسوقت عجمیوں کو قرآن سمجھنے کے لئے عربی زبان سیکھنے کی ضرورت پیش آئی۔ اس لئے ایک جماعت صحرائے عرب کی دربدر خاک چھانکر اس زبان کے الفاظ کو قبائل کی بول چال، محاوروں ضرب الامثال اور اشعار سے چن چن کر کتابوں میں مدون کرنے لگی۔

اس جماعت کا مقدم ترین امام خلیل بن احمد عروضی ہے۔

کتاب العین سب سے پہلا لغت عربی میں یہی مدون ہوا جس کو امام اللغویین ابو عبدالرحمٰن خلیل بن احمد فراہیدی ~~سنہ~~ ۱۷۰ھ نے مرتب کیا اس میں اس نے کوشش یہ کی کہ عربی زبان کے جملہ مادوں کو لکھے خواہ موضوع ہوں یا مہمل اس وجہ سے یہ کتاب بڑی ہوگئی اور وہ اس کو مکمل نہ کر سکا۔ اس کے بعد لیث بن مظفر نے جو بنی امیہ کے مشہور صوبہ دار خراسان نصر بن سیار کا پوتا تھا اس کی تکمیل کی

خلیل نے جب اس کتاب کی ترتیب کی بابت سوچا تو اس نے دیکھا کہ پہلا حرف الف ساکن ہے جس سے ابتدا نہیں ہوسکتی اسلئے عین سے اس کو شروع کیا کہ حرف حلقی میں انتہائے حلق سے نکلتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ کتاب کتاب العین کے نام سے مشہور ہوئی۔

کچھ زمانے کے بعد ابو طالب مفضل بن سلمہ بن عاصم کوفی نے کتاب العین پر تنقید لکھی اور اس میں جو غلطیاں اسکو نظر آئیں انکو دکھایا۔ اور اسکا نام استدراک رکھا۔ ابو العباس مبرد ~~سنہ~~ ۲۸۵ھ نے استدراک کا جواب لکھا اور یہ بتایا کہ مفضل نے جو غلطیاں ظاہر کی ہیں حقیقت میں اکثر خود اسکی غلطیاں ہیں۔

مفضل نے البارع نام سے ایک لغت بھی مدون کیا جو علماء میں مقبول ہوا مفضل کے بعد قاضی محمد بن الحسن ابوبکر زبیدی متوفی ۳۷۹ھ نے مختصر العین کے نام سے ایک کتاب لکھی اور خلیل کی غلطیاں نکالیں جس کے بعد امام ابوغالب تمام نے جو ابن التیانی کی کنیت سے مشہور ہے، کتاب العین کے صحیح لغات چھانٹ کر مع شواہد و زیادات کے فتح العین کے نام سے مرتب کیا۔

اس کی دوسری کتاب موعب کے نام سے ہے جو لغت کی عمدہ کتب میں سے خیال کی جاتی تھی مگر اب ناپید ہے۔ یہ کتاب بترتیب حروف تہجی لکھی گئی تھی۔

اسی زمانے میں لغت کی ایک عمدہ کتاب بارع کے نام سے ابوعلی بغدادی نے لکھی تھی۔ وہ بھی زمانے کی دستبرد سے فنا ہوگئی اور اب دنیا میں کہیں اس کا پتہ نہیں۔

کتاب النوادر امام خلیل کے شاگرد ابوالحسن علی بن حمزہ کسائی نے جو شاہزادہ امین عباسی کا اتالیق تھا نادر لغات جمع کئے۔ یہ کتاب اپنی نوعیت کی پہلی کتاب تھی۔ کسائی کا زمانہ ۱۱۹-۱۸۹ھ ہے۔

کتاب النوادر والغریب ۔ کسائی کے بعد اسی نہج پر ابوعمر اسحاق شیبانی متوفی ۲۰۶ھ نے بہت بڑی کتاب لکھی۔ اس نے عمر بھی ۱۱۰ برس کی پائی اور زندگی بھر اس کام میں لگا رہا۔

کتاب النوادر واللغات ۔ امام فراء ابوزکریا یحییٰ بن زیاد ۱۴۴-۲۰۷ھ نے جو کسائی کا شاگرد اور خلیفہ مامون عباسی کے بچوں کا استاد تھا یہ کتاب زیادہ واضح ترتیب کے ساتھ مدون کی۔

کتاب النوادر ۔ فراء کے بعد تقریباً وہی لغات ابوعبیدہ معمر بن مثنیٰ ۱۱۰-۲۱۰ھ نے لکھے۔

الاجناس والنوادر واللغات ۔ ابوزید سعید بن اوس انصاری ۱۱۹-۲۱۵ھ جو اصمعی اور ابوعبیدہ کا ہمعصر گر علم میں ان سے ممتاز تھا یہ لغت مدون کیا۔ علماء اسکو معتمد سمجھتے تھے۔

اس کے بعد اجناس کی جداگانہ کتب مرتب کرنے کا مذاق پھیل گیا۔ چنانچہ ابوسعید عبدالملک باہلی نے جو اصمعی کے نام سے ادبار عرب میں غیر فانی شہرت رکھتا ہے اور جو اخبار

بڑا عالم اور ہارون کے دربار کا ایک معزز رکن ہے حسب ذیل کتابیں مرتب کیں۔
کتاب الاجناس۔ کتاب النوادر۔ کتاب الانواء۔ کتاب النبات۔ کتاب الخیل۔ اور کتاب الامثال
اصمعی کے بعد انساب الخیل۔ اور انساب الاعراب پر ابو عبید قاسم بن سلام ۲۲۴ھ نے جو
ائمہ حدیث میں شمار کئے گئے ہیں عمدہ کتابیں لکھیں۔ انہوں نے اوروں کی غلطیاں بھی ایک
رسالہ میں جمع کیں اور اسکا نام استدراک رکھا اس کے ساتھ کتاب الغریب بھی مرتب کی۔
لیکن نوادر اور اشعار عرب کا سب سے بڑا عالم ابو عبداللہ محمد بن زیاد کوفی ۲۳۱ھ مانا جاتا ہے
یہ ابن سکیت اور ثعلب کا استاد ہے۔ اس نے بھی کتاب النوادر۔ کتاب الانواء۔ کتاب صفۃ النخل
کتاب النخل والزرع اور کتاب النبات وغیرہ لکھیں۔

کتاب الفصیح - ابو العباس احمد بن یحییٰ معروف بہ امام ثعلب ۲۹۱ھ کو لغات کا یہ تشتت پسند نہ آیا
اس لئے اس نے ہر قسم کے فصیح الفاظ کو خواہ وہ نوادر ہوں یا صفات سے تعلق رکھتے ہوں
بہ ترتیب ایک سلک میں منسلک کر دیا۔ اس کی کتاب نے بڑی مقبولیت حاصل کی۔ چھوٹی
تھی اور نہایت مفید۔ کوفہ میں اس کے بعد اس کے درجہ کا کوئی دوسرا لغوی نہ پیدا ہوسکا۔

مجرد - ثعلب کی کتاب کے نمونہ پر ابو الحسن الہنائی کراع متوفی سنہ ۳۱۰ھ نے اپنی کتاب مجرد کے
نام سے لکھی۔ اس میں چونکہ کوئی خاص اضافہ نہیں تھا اس لئے یہ ثعلب کی کتاب سے لوگوں
کو بے نیاز نہ کر سکی۔

مقصد - کراع کے بیٹے سعید نے اپنے باپ کے طرز پر لکھی۔

یواقیت - ابو عمر زاہد مطرز نے جو ثعلب کا غلام تھا لیکن اس کی شاگردی کی بدولت لغت کا امام ہو گیا
تھا۔ یہ کتاب اپنے آقا کے انداز پر لکھی اور ترتیب اچھی رکھی۔ اس کی وفات ۳۴۵ھ میں ہوئی۔

دیوان الادب - اسحاق بن ابراہیم فارابی متوفی ۳۵۰ھ نے ان الفاظ کو جمع کیا جو
ادبا میں مستعمل تھے۔

کتاب الجمہرہ - امام ابوبکر محمد بن حسن بن درید ۳۲۱ھ جن کے بعد علما بصرہ میں سے کوئی

انکے درجہ کا نہ اٹھا کتاب العین کے انداز پر چار جلدوں میں یہ لغت مرتب کیا۔ کامل مگر متوسط۔ اس نے لوگوں کو جملہ کتب لغت سے بے نیاز کر دیا۔ ابو القاسم اسمٰعیل بن عباد نے جسکا لقب صاحب ہے اور جو دیالمہ کے مشہور وزراء میں سے تھا اسکا خلاصہ کرکے جوہرہ نام رکھا۔ اور ایک دوسرا لغت بھی محیط کے نام سے ترتیب دیا۔

اس زمانہ کے بعد سے جو کتابیں لغت عربی میں لکھی گئی ہیں انکی ایک مختصر فہرست ذیل میں درج کرتے ہیں مگر یہ صرف مشہور کتابوں کی فہرست ہے مکمل نہیں ہے۔

کتاب الافعال۔ ابن قوطیہ متوفی ۳۶۷ھ **کتاب الافعال**۔ ابن طریف

تذکرہ۔ ابوعلی حسن بن احمد فارسی متوفی ۳۷۷ھ

کتاب التہذیب (۱۶ جلدوں میں ہے) ابو منصور محمد بن احمد ازہری ہروی ۲۸۲–۳۷۰ھ امام نفطویہ کا شاگرد

مجمل۔ ابو الحسین احمد بن فارس ۳۲۹–۳۹۰ھ

صحاح۔ ابو نصر اسمٰعیل بن حماد جوہری ۳۳۲–۳۹۳ھ۔ فصیح الفاظ کا سب سے بڑا ذخیرہ یہ کتاب زبیدی کی کتاب مختصر العین اور ابو الحسین کی مجمل کے بعد لکھی گئی ہے کیونکہ اسمیں ان دونوں کی عبارتیں منقول ہوئی ہیں۔ اسکی ترتیب حروف معجم پر ہے اور علماء میں سب سے زیادہ آجتک اسکا اعتماد ہے۔ ابو محمد عبد اللہ متوفی ۵۸۲ھ نے اس پر حاشیہ لکھا جو صرف شین تک تھا شیخ عبد اللہ بن محمد نے اس کو پورا کیا۔ پھر امام رضی الدین صغانی ۵۷۷–۶۵۰ھ نے ان صحیح لغات کو جو رہ گئے تھے اس میں بڑھایا اور اس کا نام تکملۃ الصحاح رکھا۔ امام محمد بن ابوبکر رازی متوفی ۶۶۰ھ نے اسمیں سے ان الفاظ کو جو قرآن و حدیث کے سمجھنے میں کام آتے ہیں چنکر جمع کر لیا اور اس کا نام مختار الصحاح رکھا لیکن اسکی ترتیب صحیح نہ تھی اس وجہ سے علامہ محمود آفندی نے نئے سرے سے اس کو مرتب کیا۔

المحکم و المحیط الاعظم۔ امام ابو الحسین علی بن سیدہ اندلسی نے جو نابینا تھے آٹھ جلدوں میں لکھوائی۔

مخصص۔ " "

تہذیب الابنیۃ والافعال۔ ابو القاسم بن قطاع ۴۳۳–۵۱۵ھ یہ کتاب دو جلدوں میں ہے اور اپنے

موضوع پر بے نظیر ہے۔ نایاب تھی مگر ایک نسخہ اس کا ہندوستان میں مل گیا جس کی نقل جامعہ ملیہ کے کتب خانہ نے بھی بصرف کثیر حاصل کر لی۔

مغرب ۔ ابو الفتح ناصر بن عبداللہ متوفی ۶۱۶ھ

تہذیب التہذیب ۔ ابو الثنا تنوخی متوفی ۷۲۳ھ یہ کتاب ۵ جلدوں میں ہے صحاح تہذیب اور محکم تینوں کا مجموعہ ہے۔

علامہ جار اللہ زمخشری ۵۳۸ھ کی خدمات بھی اس فن کی فراموش کرنے کے قابل نہیں ہیں انہوں نے اساس۔ فائق۔ مقدمۃ الادب اور مستقصے الامثال چار کتابیں لکھیں ہیں۔

جامع ۔ ابن قزاز

مفردات ۔ ابو القاسم حسین بن محمد راغب اصفہانی

نہایہ ۔ مجد الدین معروف بابن اثیر جزری

مجمع بحار الانوار ۔ شیخ محمد طاہر۔ یہ کتاب لغات حدیث میں ہے اور اس کا مصنف ہندوستانی ہے۔ اچھی اور مقبول کتاب ہے۔

القاموس المحیط ۔ عربی کا سب سے مشہور لغت ہے۔ فیروزآبادی متوفی ۸۱۷ھ

ابو الفیض سید محمد مرتضیٰ حسینی زبیدی متوفی ۱۲۰۵ھ نے قاموس کی شرح لکھی جسکا نام تاج العروس رکھا قاموس نے لغت میں اس قدر اہمیت حاصل کی کہ بجائے خود بہت سی تصانیف کا مرجع بن گئی۔ اور علما، ادب نے اس پر سب سے زیادہ اعتماد کیا۔

قاموس کے بعد جو لغات لکھے گئے وہ بہت ہیں مگر تمامتر اس سے یا اس سے پہلی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ تاریخ لغت۔ فلسفہ لغت اور فقہ لغت میں بھی بہت کتابیں لکھی گئی ہیں جو نہایت مفید اور محققانہ ہیں۔ انکا کسی دوسرے موقع پر ہم ذکر کریں گے۔ انشاء اللہ۔

باغبان

واجد حسین صاحب اُن لوگوں میں سے تھے جن کی ہمت اور جفاکشی دنیا کی تمام مشکلوں کو آسان کر دیتی ہے۔ گو وہ خاندان کے شریف تھے لیکن باپ دادا کی فضول خرچی نے ساری شرافت خاک میں ملا دی تھی اور انکے بہت سے عزیز اسوقت بھی نسب نامے پر فخر کرتے اور جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔ واجد حسین صاحب کا بچپن آبا و اجداد کی دولت کی داستانیں اور اس دنیا کی شکایتیں سننے میں گذرا جو بنئے کو برکت دیتی ہے اور شرفا کی جائدادیں نیلام کرا دیتی ہے۔ جتنی نصیحتیں ان کے کان میں پڑیں سب اسی کی تعلیم دیتی تھیں کہ حوصلہ کرنا عبث ہے، اور اس دولت سے جو چند روز کی مہمان ہو وہ مفلسی بدرجہا بہتر ہے جو قناعت اور توکل سکھائے لیکن عقلمندوں کی قابلیت کے باوجود وہ اپنے حوصلے پست نہ کر سکے، اپنا وطن چھوڑ کر وہ شہر . . . . احاطہ بمبئی میں جا بسے محنت کی کمایا، اور جب ۵۳ سال کی عمر میں انکا انتقال ہوا تو وہ اپنی بیوی اور بچوں کے لئے اتنا روپیہ چھوڑ گئے کہ وہ شہر کے رئیسوں میں شمار ہوتی تھیں، دولت کے علاوہ وہ ایک خاص قسم کے خیالات بھی ورثے میں چھوڑ گئے تھے جنہیں ترک کرنا انکی بیوہ زیب النسا بیگم اتنا ہی برا سمجھتی جتنا کہ دوسری شادی کر لینا۔ واجد حسین صاحب کا خیال تھا کہ عورتوں کو پردے میں رکھنا ایسا جرم ہے کہ اگر اسکی سزا میں کوئی قوم غلامی اور فاقہ کشی کی مصیبتوں میں مبتلا کر دیجائے تو بھی سمجھنا چاہیئے کہ وہ سستی چھوٹی۔ انہوں نے رفتہ رفتہ اپنی بیوی کو آزاد اور خود مختار بنایا اور مرتے دم وصیت کر گئے کہ انکی بچیوں کی روحانی نشو و نما بیجا پابندیوں سے نہ روکی جائے اور انہیں تعلیم سے اس قابل بنا دیا جائے کہ دنیا میں اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکیں، اور کسی کی دستگیری کی محتاج نہ ہوں۔

واجد حسین صاحب کے انتقال کے وقت انکی بڑی بیٹی نیاز آٹھ سال کی تھی، اور چھوٹی ارجمند چھ سال کی دونوں اسکول میں داخل ہو چکی تھیں اور جب واجد حسین صاحب انہیں نہا دھو کر اور

صاف صاف کپڑے پہن کر اسکول جاتے دیکھتے تو انکا دل خوشی سے متوالا ہو جاتا اور آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ زیب النساء بیگم کو یہ کیفیت یاد تھی، انہوں نے شوہر کی وصیت پر وفاداری سے عمل کیا اور بچیوں کی تعلیم اور تربیت انکی سب سے گہری آرزو بن گئی۔ جب دونوں لڑکیاں بڑی ہوئیں اور اسکول سے فارغ ہوکر کالج میں داخل ہوئیں تو ہر جگہ مشہور تھا کہ انکی لیاقت اور سلیقے کا شہر میں جواب نہیں۔ بعضے کہتے تھے وہ لڑکیاں نہیں پھول ہیں، جنہیں باغبان کی محنت اور محبت نے باغ کی زینت بنا دیا ہے، بعضے کہتے تھے وہ پھول نہیں لڑکیاں ہیں جن میں تعلیم اور تربیت نے وہ حسن اور دلربائی پیدا کر دی ہے جو پھولوں میں ہوا کرتی ہے۔

تعریف لوگ دونوں بہنوں کی کیا کرتے تھے، لیکن انمیں مشابہت بہت کم تھی۔ نیاز گوری تھی اور ذرا لمبی، ارجمند سانولی اور میانہ قد کی۔ نیاز کے ناک نقشے میں کوئی خاص خوبی نہ تھی بلکہ بعض عورتیں یہ بھی کہتی تھیں کہ اسکے منہ کا دہانہ ذرا بڑا ہو گیا ہے، ناک ذرا چھوٹی رہ گئی ہے، مگر یہ نقص صرف انہیں کو نظر آسکتے تھے جن کی نگاہ میں نیاز کی شوخ چمکیلی آنکھیں چکا چوند نہ پیدا کر دیتیں، جنہیں اس کی ابروؤں کے خم میں مصوری کا انتہائی کمال دکھائی نہ دیتا، ایسے لوگ بہت کم تھے، اور وہ بھی نیاز کی ان خامیوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ کیونکہ نیاز کے حسن کا انحصار صرف آنکھوں اور ابروؤں پر نہیں تھا اسکی گرم گفتار، اسکی ہنسی اور سب سے زیادہ اسکی پر درد سریلی آواز، جو کبھی غزل گا کر سننے والے کو رند بنا دیتی تھی، کبھی دوہے گا کر بیراگی، ایسے تیر تھے جن کا نشانہ خطا نہیں کر سکتا تھا، ارجمند ان خوبیوں سے محروم تھی لیکن اسکی آنکھیں آبدار اور نرگسی تھیں، ناک اونچی اور نازک، منہ پھول جیسا، بال لمبے اور گھونگھر والے اور گھنے، جسم نہایت سڈول جس کی ہر جنبش میں ایک ادا تھی، عورتیں تک تسلیم کرتی تھیں کہ حسن کی کوئی صفت نہیں جو اس میں موجود نہیں ہے مگر افسوس ہے یہ حسن، جس پر کسی زمانے میں جاگیریں اور جائدادیں اور اہل نظر کی زندگیاں نثار ہوتی تھیں اب اس قدر وافی کے لائق نہیں سمجھا جاتا، اب لوگ ایسی حسین عورتوں سے شادی کر کے توفیق کے مطابق انہیں کپڑوں اور زیوروں سے سنوارتے ہیں، اور انکے حسن کا کرشمہ صرف یہ ہوتا ہے کہ دوسرے ان کے شوہروں پر رشک

کرتے ہیں۔

نیاز اور ارجمند میں صورت سے زیادہ سیرت کا فرق تھا، نیاز بھولی تھی، مگر تنک مزاج، دل کی اتنی اچھی کہ جس شخص سے سابقہ پڑتا اس کی نسبت بہت سی خوبیاں فرض کر لیتی، اور جب معلوم ہو جاتا کہ اس میں یہ خوبیاں نہیں ہیں تو اس طرح خفا ہوتی گویا اسے جان بوجھ کر دھوکہ دیا گیا ہے، اسکی طبیعت بغض اور کینے سے پاک تھی، لیکن جیسی وہ تعریف کرنے میں جوشیلی تھی ویسی ہی مذمت کرنے میں تیز جو اسے پسند آتا اسے دیوتا بنا دیتی، جو نظر سے گر جاتا اسکے ساتھ اس طرح پیش آتی گویا وہ ایک مجرم ہے جس کی سزا اس کی مجبوریوں کا خیال کر کے معاف کر دی گئی ہے، اسے یقین تھا کہ موسیقی کا ہر دل پر اثر ہوتا ہے، ہر انسان کو ازل سے اس فن کے سمجھنے کی قابلیت ملی ہے، اور ہر شخص کو حسب استعداد اس کی قدر دانی کرنے پر آمادہ ہونا چاہئے، اسکا عقیدہ تھا کہ ہر ذی روح ہستی کو انتہائی کمال حاصل کرنے کی آرزو ہمیشہ بیتاب رکھتی ہے، اور جو کوئی جو کچھ کرے اسکا اصل مقصد اپنا اور دوسروں کا روحانی فروغ ہونا چاہئے ظاہر ہے نیاز مردم شناس نہیں تھی، اس کا دوست بننا معمولی آدمیوں کے لئے بڑی ذمہ داری کا کام تھا۔ تجربہ ہر ہوشیار انسان کو سکھا دیتا ہے کہ اسے بچپن کی سادگی اور سادہ دلی بچپن کی اور یادگاروں کے ساتھ بھول جانا چاہئے، لیکن جس کا دل پاک اور صاف ہو اسے یہ سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے کہ دنیا میں بھلائی کے ساتھ برائی کیوں تسلیم کرنا ہوتی ہے، خصوصاً خود انسان کی فطرت میں ان دونوں عناصر کی ایسی آمیزش کیونکر ہو جاتی ہے کہ ہم انہیں جدا نہیں کر سکتے اور خالص خوبیوں کے مجسمے تلاش کرنا کس لئے بیکار ہے۔ نیاز کے خیر خواہوں نے، نیاز کی ماں نے، نیاز کے اپنے تجربے نے سلامت روی کے بنیادی اصول اس کے ذہن نشین کرنے کی لاکھ کوشش کی، مگر وہ نہ ماننا تھا نہ مانی۔

ارجمند کو ایسی ہدایت کی مطلق ضرورت نہ تھی، اسکی طبیعت بچپن سے شکی تھی، ایسی شکی کہ ماں اور بہن کی محبت پر اسے اعتبار نہ تھا، بچپن ہی سے وہ گھنی اور ضدی تھی، بچپن ہی اس نے دل کی بات دل میں رکھنا، بغض اور کینے اور حسد کا بوجھ سنبھالنا سیکھا، عمر اور تجربے نے اسے اور چالاک

کر دیا، اور اسکی مدھ بھری مسکراہٹ اور رسیلی آنکھوں نے جن لوگوں کو لبھا لیا تھا ان میں بہت کم تھے جو باوجود ثبوت کے یہ ماننے پر تیار ہو جاتے کہ اس کے خمیر میں خالص نسوانی خوبیوں کے علاوہ اور کچھ بھی شامل ہے، ارجمند ایسی سیانی اپنی ہوس کی شدت سے ہو گئی تھی، یہ ہوس کہ دنیا کی کوئی نعمت ہاتھ سے نہ جانے، نہ شہرت نہ دولت نہ سکون اور اطمینان، اسے رفتہ رفتہ معلوم ہو گیا کہ حسن اور چالاکی کے سوا اس کے پاس اپنی ہوس پوری کرنے کے اور ذریعے نہیں ہیں، اور اس نے ان ہتھیاروں کے استعمال میں مہارت حاصل کر لی۔ لیکن اسکا طور طریقہ اتنا صحیح تھا کہ بڑے بڑے نکتہ چیں بھی اس پر کسی قسم کا الزام نہ لگا سکتے۔

نیاز کی سیرت اسکی کشادہ پیشانی پر لکھی ہوئی تھی، اس کی جانچ پڑتال کے لئے کوئی بصری یا کوشش درکار نہ تھی، زیب النسا بیگم اسے ہر مناسب موقع پر ٹوکتی تھیں، اسے بیجا حسن ظن کے خطروں سے آگاہ کرتیں، بیجا بدگمانی سمجھا بجھا کر رفع کرتیں، ہر وقت رواداری کے گن گاتیں اور اس کے دل پر چوٹیں لگتیں انکا محبت سے علاج کرتیں۔ لیکن نیاز کی طبیعت میں ہمواری کسی طرح پیدا نہ ہو سکی۔ اسے ماں سے بہت محبت تھی، ماں سے کوئی بات چھپانا اس کے نزدیک چوری سے بھی برا تھا، مگر یہ خوف کہ ماں کا کہنا ماننے سے اس کی ہمت پست ہو جائے گی۔ رفتہ رفتہ اس کے مضبوط عقیدوں میں شامل ہو گیا، یہ عقیدہ بھی کوئی راز نہ تھا، وہ اکثر ماں سے کہتی رہتی تھی کہ اسے اپنی ہمت اور حوصلے ان تمام نعمتوں سے زیادہ عزیز ہیں جو سلامت روی مہیا کر سکتی ہے اور اس لئے وہ ہر معاملے میں انکی رائے نہیں مان سکتی، زیب النسا بیگم کا اصل مطلب کہ عقل سلیم کے بغیر ہمت اور حوصلے محض سنگ راہ ہیں جن سے آدمی ٹھوکر کھاتا ہے نیاز کے کبھی سمجھ میں نہ آیا پھر بھی زیب النسا بیگم کو نیاز کی طرف سے زیادہ اندیشہ نہیں تھا۔ نیاز کی عداوت اور دوستی، اسکا اچانک بگڑ بیٹھنا اور پشیمان ہونا، ہر ایک کو اپنا بچپن یاد دلا دیتا تھا، اور تجربے نے انسان کو کیسا ہی سخت گیر کیوں نہ بنا دیا ہو، بچوں کو دیکھ کر اس کا دل آپ ہی آپ نرم ہو جاتا ہے، ارجمند کی طبیعت زیب النسا بیگم کے لئے بہت دنوں تک ایک معمہ رہی، اور جب وہ اسکا کسی قدر اندازہ

نگا سکیں تو بہت گھبرائیں۔ نیاز کی خودسری اور خفگی میں بھی ایک وفاداری اور سچی محبت تھی جو انہیں ارجمند کی اطاعت گذاری میں نہیں محسوس ہوتی تھی۔ ارجمند کی ہر بات میں سیان پن ہوتا تھا، ہر بات میں ایک مخفی مطلب، نہ وہ نیاز کی طرح خفا ہوتی، نہ روٹھتی، نہ جی کھول کر ہنستی، نہ جی بھر کر روتی تھی۔ وہ ہر چیز میں دونوں بیٹیوں کو برابر کا حصہ دینا چاہتی تھیں، لیکن تقسیم کرنے کے بعد معلوم ہوجاتا تھا کہ ارجمند کو زیادہ مل گیا ہے، نیاز کو کم، چاہے روپیہ ہو، چاہے زیور ہو، چاہے کپڑے، نیاز بہت سی فرمائشیں کرتی تھی جن کا صاف جواب دیدیا جاتا، لیکن کیا مجال تھی ارجمند جو مانگے وہ نہ ملے، جو چاہے وہ نہ ہو، اس وجہ سے نہیں کہ ماں کو اسکا زیادہ خیال تھا۔ بلکہ محض اس لئے کہ مانگنے اور حاصل کرنے کی ترکیبیں جانتی تھی، اور انکے استعمال کرنے میں مشاق تھی، جیسے جیسے لڑکیوں کی عمر بڑھتی گئی، زیب النسا بیگم کو یقین ہوتا گیا کہ انکی طبیعتیں بدلنا یا ان کی حسب منشا اصلاح کرنا انکے بس کی بات نہیں۔ انہوں نے سوچ لیا کہ وہ دونوں انکے باغ کے پھول ہیں جن کی نگہداشت رکھنا انکا فرض ہے، مگر ان کے رنگ بدلنا نہ انکے امکان میں ہے نہ سچ پوچھئے تو ان کا کام ہے۔ ایک با توکل باغبان کی طرح وہ سب کچھ خدا کی مرضی پر چھوڑ بیٹھیں، مگر دل میں کھٹکا ضرور رہا کہ دیکھئے ہوائیں کیسی چلتی ہیں۔

نیاز اور ارجمند جب کالج میں داخل ہوئیں تو ان کا گھر خوش مذاق اور شائستہ طالبعلموں کا مرجع بن گیا، نیاز کے دل میں بہت سے حوصلے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ ہندوستان کی شریف عورتیں ہمت کر کے گھریلو زندگی کے تنگ حدود سے باہر نکلیں، قومی زندگی کو سدھاریں اور سنواریں، تھیٹروں میں ایکٹ کریں، جلسوں میں گائیں۔ ملک میں فنون لطیفہ کا معیار بلند کریں اور عصمت کا دامن چھوڑے بغیر اس قابل ہوں تو اپنی روٹی بھی کما یا کریں۔ یہ حوصلے صرف اس وقت بار آور ہو سکتے تھے جب کوئی جرأت کر کے پہلا قدم اٹھائے اور پیش قدمی کے نتائج بھگتے۔ نیاز یہ ذمہ لینے پر تیار تھی اور جتنی زیادہ ماں اور جان پہچان کے لوگ اس کی مخالفت کرتے

اتنی ہی اس کے جوش کی آگ اور بھڑک اٹھتی اپنی ماں اور نسوانی "عزت آبرو" کے تمام بزدلانہ قدامت پسند حامیوں کو اس نے اپنے حوصلوں کا دشمن فرض کر لیا، اور اگر اسے "عزت آبرو" کے معیاروں پر حملہ کرنیکا موقع ملتا تو وہ کبھی نہ چوکتی۔ اس قسم کی بغاوت نوجوانوں میں بہت مرغوب ہوتی ہے، نیاز کالج میں بہت جلد ہر دلعزیز ہوگئی، اسے بہت سے ایسے نوجوان مل گئے جنہیں اس کے حوصلوں سے ہمدردی تھی، کچھ ایسے بھی ملے جو عملی امداد دینے پر راضی تھے۔ نیاز نے بھی احسان کے بدلے احسان کیا۔ وہ طالب علموں کے تمام جلسوں میں شریک ہوتی تھی تقریریں کرتی تھی، اور جب کوئی مہم درپیش ہوتی تو کسی محنت اور جفاکشی کے کام سے دریغ نہ کرتی۔ اس کے عوض میں طالب علم اس کے ڈراماؤں میں ایکٹ کرنے پر آسانی سے تیار ہو جاتے، اگر وہ کوئی قومی گیت یا ترانہ سنگت میں گوانا چاہتی تو خوش آواز طالب علموں کی کمی نہ ہوتی، جو مصروف رہنا چاہے اس کے لئے بہت سے کام نکل آتے ہیں۔ نیاز کی طالب علمی کا زمانہ اس کے مشاغل میں دیکھتے دیکھتے گذر گیا۔

جب تعلیم ختم ہوئی اور دنیا کے امتحان گاہ میں قدم رکھنے کا وقت آیا تو یکبارگی نیاز کی آنکھیں کھل گئیں وہ نوجوان کسی زمانے میں اس کے مقاصد کے فدائی معلوم ہوتے تھے اپنے ولولے بھول گئے۔ کسی نے نوکری کر لی، کوئی تجارت میں لگ گیا، کوئی شادی کر کے گرہستی بن بیٹھا۔ نیاز کے یہاں اب بھی بہت سے آیا جایا کرتے تھے لیکن سب کی فکریں انکی پیشانیوں پر ایسی صاف ہوتی تھیں کہ ان سے کسی قسم کی امیدیں رکھنا صریحی ظلم ہوتا نیاز یہ رنگ دیکھکر نوجوانوں کی قوم کی قوم سے خفا ہوگئی۔ اور ماں کے سمجھانے پر بھی اس خفگی کے اظہار میں ذرا بھی تکلف نہیں برتا۔ اسکے طعنے تشنے کا خوف ایسا تھا کہ سب اس کے یہاں آنے سے ڈرنے لگے اور سواد و چار کے جنہیں محبت اور وفاداری کھینچ لاتی تھی، نیاز کے یہاں طالب علموں کی آمدرفت بتدریج بند ہوگئی، نیاز نے اپنی طرف یہ تہیہ کر لیا کہ وہ دنیا سے کنارہ کشی ہو جائے گی، اور کچھ دنوں اس نے اس ارادے پر عمل بھی کیا۔ لیکن زیب النسا بیگم کو یہ کب گوارا ہو سکتا تھا کہ اس کی عمر کے بہترین سال گوشہ نشینی میں گذر جائیں۔ شہر کے اکثر خوشحال خاندانوں سے انکے پہلے سے مراسم تھے، جب نیاز نے

بی۔اے پاس کرلیا تو انہوں نے کثرت سے دعوت دینا شروع کردیا، اور انکے یہاں دوسرے تیسرے مہمان آنے لگے۔ نیاز دنیا داروں کو بہت ترچھی نگاہوں سے دیکھتی تھی، اس کے خیال میں وہ سب کے سب اپنی روٹی کمانے میں ایسے مشغول تھے اور دل کے ایسے ٹھنڈے کہ اسکی ہاں میں ہاں ملانا بھی انکو بڑی ذمہ داری کا کام معلوم ہوتا تھا اور اسو جہ سے وہ ماں کی دعوتوں میں صرف برائے نام شریک ہوتی تھی، اور مہمان نوازی کا سارا بار ارجمند اور زیب النسا بیگم پر پڑتا تھا لیکن جب اسے طالب علم دوستوں سے قطعی مایوسی ہوگئی تو کچھ دنوں بعد وہ انہیں لوگوں میں اپنے ہمدرد تلاش کرنے پر مجبور ہوئی۔ زیب النسا بیگم نے ایک دن کہیں کہہ دیا کہ اسے اب دوستی کے بجائے شادی بیاہ کی فکر کرنا چاہئے تو وہ بہت بگڑی اور کئی روز تک روٹھی رہی۔ لیکن اسے یقین ہوگیا تھا کہ ایسا دوست جو اسی کے سے حوصلے رکھتا ہو، اور ایک اعلیٰ نصب العین کی خدمت کو گھر گرہستی اور اولاد پر ترجیح دیتا ہو اسے ملنے کا نہیں، اس نے شادی کی رسم کی مخالفت کرنا چھوڑ دی، اور امید اس کے دل کو ایک ایسے شوہر کی تصویر دکھا کر بہلانے لگی جو اسکی آرزوؤں پر فدا ہو اور اپنی محبت سے اس کی ہمت افزائی کرے۔ مگر یہ اسکا پختہ رہا کہ مرد ول کو جانچنے میں وہ سب سے زیادہ اسکا خیال رکھے گی کہ انہیں اس کے حوصلوں سے کتنی ہمدردی ہے، اور اگر اسے ہمدرد نہ ملا تو شادی بھی نہ کرے گی۔

اتفاق سے اسی زمانے میں نادر حسین، ایک بیرسٹر کا زیب النسا بیگم سے تعارف کرایا گیا وہ انگلستان سے نیا نیا واپس آیا تھا، اور ہندوستانی زندگی کی پابندیوں اور مجبوریوں سے وہ ابھی تک اچھی طرح واقف نہیں ہوا تھا۔ ایک مرتبہ کھانے کے بعد نیاز کا گانا سنکر اس نے کہا:

"نیاز بہن، آپ کی آواز تو اتنی نفیس ہے کہ میرے خیال میں اگر آپ یورپ کی طرح گانے کے جلسے کرائیں تو بہت کامیابی ہوگی۔ ہندوستان میں خواہ مخواہ موسیقی کا فن بدنام ہوگیا ہے یورپ میں گانا بہت سی شریف عورتوں کا ذریعۂ معاش ہے، اور لوگ انہیں برا کہنے کے بجائے اور الٹی انکی عزت کرتے ہیں، بس آپ ہمت کیجئے اور فن موسیقی کو بدنامی سے بچائیے"

نیاز اچھل پڑی۔ آخر کار وہ شخص مل ہی گیا جس کی اسے تلاش تھی! اس نے نادر حسین کی صورت اور سیرت، مالی حالت اور دنیاوی حوصلوں پر غور کرنا فضول سمجھا۔ اس جانچ پڑتال کی کیا ضرورت تھی جب اسے نیاز کے خیالات سے ہمدردی تھی؟ نادر حسین کی دعوت پر دعوت ہونے لگی، اور نیاز اسکی آؤ بھگت اس جوش سے کرتی تھی کہ وہ خوشی سے پھولے نہ سماتا۔ ہر ملاقات پر دونوں بیٹھ کر مشورے کرتے۔ گانے کے جلسوں کے پروگرام بنتے، آمدنی اور خرچ کا حساب کتاب ہوتا، لیکن امید اور جوش کی یہ آب وتاب صرف چند روز رہی۔ خاندان والوں نے نادر حسین کو وکالت کرنے پر مجبور کیا، وہ آدمی ہوشیار تھا، اور تھوڑے عرصہ میں اس کے پاس مقدمے اس کثرت سے آنے لگے کہ وہ کامیاب وکیلوں اور بیرسٹروں کی طرح روپیہ کمانے کے سوا اور کسی مصرف کا نہیں رہا۔ اسے نیاز اور نیاز کے حوصلوں سے وہی دلچسپی رہی جو پہلے تھی لیکن وقت کی تنگی کا یہ عالم تھا کہ وہ اکثر دعوتوں میں شریک ہونے سے معذرت چاہنے لگا۔ اور جب کبھی آتا تو اپنی مصروفیت کا دکھڑا روتا۔ نیاز پر یہ بہت گراں گذرا، وہ چاہتی تھی کہ نادر حسین کے پاس دوسرے تیسرے دن مشورے کے لئے آئے کیونکہ وہ ایک عظیم الشان جلسے کی تدبیریں سوچ رہی تھی جو اس کے تمام مخالفین کا منہ بند کردے اور اپنی تدبیروں کی سرگرمی میں یہ بھول گئی کہ نادر حسین کے اپنے دنیاوی اغراض بھی ہیں۔ جب نادر حسین نے مجبوراً ہچکچا ہچکچا کر اعتراف کیا کہ وہ اپنے کام میں مصروف ہونے کی وجہ سے فی الحال جلسے کو کامیاب بنانے کے لئے دوڑ دھوپ نہیں کرسکتا تو نیاز کے دل میں مایوسی اور بدگمانیوں نے ہجوم کیا اور اس نے سمجھ لیا کہ نادر حسین نے اسے دھوکہ دیا ہے جس وقت نادر حسین نے قطعی طور پر مدد دینے سے انکار کیا سب کھانے پر بیٹھے ہوئے تھے، نیاز کی آنکھوں سے غم اور غصہ کی بجلیاں گرنے لگیں۔ عذر کچھ اور کیا گیا تھا، اس نے اپنی طرف سے الزام کچھ اور لگایا:

"نادر بھائی، آپ صاف صاف کہہ کیوں نہیں دیتے کہ آپ کو لوگوں نے ڈرا دیا ہے۔ وقت آپ کے پاس بہت کافی ہے، لیکن آپ میری مدد اصل میں کرنا نہیں چاہتے۔"

نادر حسین کو چند لوگوں کے اعتراضات بھی یاد آ گئے، اور اس نے کچھ کمزور لہجے میں جواب دیا،
"جی ہاں، لوگوں کے سمجھانے سے اس معاملے میں میری رائے بھی ذرا بدل گئی ہے"
"تو بس، میری آپ کی دوستی ختم ہو گئی، کاش مجھے پہلے سے معلوم ہوتا کہ آپ پر بھروسہ نہ کرنا چاہئے"

ارجمند چلائی "ارے باجی، آپ یہ کیسی باتیں کرتی ہیں!" زیب النسا بیگم نے نیاز کو خوب للکارا۔ نیاز منہ پھیرے بیٹھی رہی اور نادر حسین سے بات تک نہ کی، کھانے کے تھوڑی دیر بعد وہ اپنا سامنہ لیکر چلا گیا۔

نیاز کے اوپر اس "دغابازی" کا اتنا اثر ہوا کہ وہ کچھ دنوں بیمار رہی اور اچھے ہونے کے بعد بھی اس کے خیالات کا رنگ ماتمی رہا۔ نادر حسین سے اس کی صلح کرا دی گئی لیکن اس کی آنکھیں بتا دیتی تھیں کہ گو وہ دوستانہ برتاؤ کرنے پر راضی ہے، مگر اب اس کے دل میں نادر حسین کی کوئی وقعت نہیں رہی ہے اسکا جی پھر چاہنے لگا کہ دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرے۔ دعوتوں کے دن وہ اکثر طبیعت کی ناسازی کا بہانا کر لیتی یا اگر مجبوراً شریک ہونا پڑتا تو خاموش بیٹھی رہتی، کچھ گانے کی فرمائش کیجاتی تو کہدیتی کہ گلے میں درد ہے۔

کالج کے دوستوں میں سے اب صرف عبداللہ کبھی کبھی ملاقات کو چلا آتا تھا، اس کی عمر قریب تیس سال کے تھی، اس کے غیر معمولی لمبے ڈیل، چوڑے سینے اور دہرے بدن نے اسے طالب علموں کی صحبت کے لئے کچھ ناموزوں بنا دیا تھا اور چونکہ ان اوصاف کے علاوہ اسکے لمبی گھنی داڑھی بھی تھی اس لئے اسے "مولوی" کا خطاب ملا تھا۔ طالب علم اسے بہت چھیڑا کرتے تھے، زیادہ تر اس وجہ سے کہ وہ موقع بے موقع مسخرے پن کی باتیں کیا کرتا تھا، اور انگریزی بہت غلط بولتا تھا۔ نیاز بھی دوسروں کے ساتھ اسکی ہنسی اڑایا کرتی تھی۔ لیکن اسے تجربے سے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ عبداللہ دیکھنے میں چاہے جیسا ہو، دراصل وہ نہایت درجہ محبت کیش، وفادار اور جفاکش آدمی ہے اور اس کے ایثار کی بظاہر کوئی انتہا نہیں نیاز اس کا

ادب کرنے لگی، اور ممکن ہے دونوں میں گہری دوستی ہو جاتی، مگر ایک بدطینت طالب علم نے نیاز سے کہہ دیا کہ عبداللہ کا کچھ عرصہ پہلے ایک بھنگن سے ناجائز تعلق تھا۔ نیاز نے دریافت کیا تو سب نے اس واقع کی تصدیق کی، اور عبداللہ نیاز کی نظروں میں بالکل گر گیا۔ اسکا یہاں تک ارادہ ہوا کہ عبداللہ کو گھر میں قدم رکھنے کی ممانعت کر دے، مگر زیب النسا بیگم نے اسے روک دیا، وہ خود عبداللہ کی خوبیاں معلوم کر چکی تھی، اور جانتی تھیں ایسے آدمی وقت پر بہت کام آتے ہیں۔ اس لئے عبداللہ سے ہمیشہ اچھی طرح پیش آتی تھیں، اور جس طرح ہو سکا ظاہر کرتی رہیں کہ ان کے دل میں اس کی بہت عزت ہے، جب وہ کالج سے فارغ ہوا تو انہوں نے کہہ سن کر اسے ایک دفتر میں نوکر رکھا دیا۔ اور اس کے علاوہ دو تین خاندانوں میں بچوں کے پڑہانے کے لئے بھی مقرر کرا دیا۔ عبداللہ کو معلوم ہو گیا کہ نیاز اور ارجمند نے اس سے کیوں ملنا چھوڑ دیا ہے۔ اس نے انکے رو یہ کی کوئی شکایت نہیں کی، نہ کبھی اپنی صفائی پیش کرنے کی خواہش ظاہر کی، ہفتہ عشرے میں وہ زیب النساء بیگم سے ملاقات کرنے آتا تو نیاز اور ارجمند کی خیر و عافیت پوچھ لیتا تھا۔ اس کے سوا اسے انکے مشاغل سے اور کوئی سروکار نہیں رہتا تھا۔

نادر حسین سے جس روز نیاز خفا ہوئی اس کے دو چار دن بعد ہی عبداللہ سہ پہر کے وقت زیب النسا بیگم سے ملنے آیا۔ وہ ارجمند کو ساتھ لیکر کسی دعوت میں گئی ہوئی تھیں۔ نیاز کو ہلکی سی حرارت تھی اس لئے وہ گھر پر رہ گئی تھی۔ خادمہ نے عبداللہ کو یہ سب بتا دیا، وہ حال دریافت کر کے فوراً چلا جاتا۔ کیونکہ اسے کوئی امید نہیں تھی کہ نیاز اس سے ملے گی، مگر وہ کئی میل پیدل چل کر آیا تھا، اور ذرا سستانے کی غرض سے تھوڑی دیر ٹھہر گیا۔ خادمہ بھی وہ نیاز کے انتظار میں بیٹھا ہے، اور اس نے نیاز کو جا کر اسکی اطلاع کر دی۔ نیاز پلنگ پر لیٹی تھی، یہ خبر سنکر وہ کچھ دیر سوچتی رہی کہ جائے یا نہ جائے، اور پھر جلدی سے اٹھی، کپڑے بدلے اور گول کمرے میں پہنچتی عبداللہ جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا کہ پیچھے سے نیاز کی آواز آئی:

"السلام علیکم، مولوی صاحب کہئے کیسے تشریف لائے؟"

"کوئی خاص وجہ نہیں تھی صرف آپ لوگوں کی خدمت میں سلام عرض کرنے حاضر ہوا تھا"
عبداللہ نے بڑھکر مصافحہ کیا، اور پھر ادب سے ذرا دور ہٹ کر بیٹھ گیا۔

"ابھی خادمہ سے معلوم ہوا کہ آپ کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ بہت افسوس ہوا، آپ تو ایک زمانے میں ماشاءاللہ انتہائی تندرستی کا نمونہ تھیں، یہ بخار کب سے آنے لگا؟"
نیاز نے منہ بنا کر جواب دیا۔

"مولوی صاحب، یہ وہ بخار نہیں ہے جو مچھر کے کاٹنے یا معدے کی خرابی سے ہوتا ہے کبھی کبھی ایک انسان دوسرے کے ایسا ڈنک مارتا ہے کہ وہ برسوں تڑپتا رہتا ہے، میرا بخار اس قسم کا ہے"

عبداللہ کو یاد تھا کہ وہ ابھی تک راندۂ درگاہ ہے، اور اسکی بے تکلفی پر گستاخی کا شبہ ہوگا، لیکن جو سوال زبان پر لانے کی اسے ہمت نہ تھی وہ اس کی آنکھوں نے پوچھ لیا۔ نیاز اس کی آنکھوں میں ہمدردی، محبت اور وفاداری کا جلوہ دیکھ کر اپنی پرانی نفرت بھول گئی اور بے تکلفی سے کہنے لگی:

"جی ہاں میری قسمت میں غالباً لکھا ہے کہ جس شخص سے میں ہمدردی اور دوستی کی امید کروں وہ مجھے آخر میں دھوکا دے۔ پہلے کالج کے دوستوں سے مجھے امیدیں تھیں وہ سب مجھے بھول گئے، ابھی ایک بیرسٹر صاحب نے خود ہی وعدے کئے اور خود ہی دغا دے گئے۔

دونوں کچھ دیر خاموش رہے، عبداللہ کو یکبارگی وہ دن یاد آگئے جب نیاز کی شوخ آنکھیں اور معصوم ہنسی اسے یہاں کی تمام دعوتوں پر کھینچ لاتی تھی، وہ طالب علموں کے فقرے اور گستاخیاں برداشت کرتا تھا، نیاز کی بے پروائی اور دوسروں کی حقارت بھری نظر کے جواب میں خدمت اور ایثار کے تحفے دیتا تھا، اور اس کی محبت مسخرے پن کا بھیس بنا کر آتی تھی کہ کوئی اسے پہچان نہ سکے۔ اسکا جی چاہتا تھا کہ خاموش بیٹھا سوچتا رہے، نیاز بھی اپنی ناکامی کے تصور میں محو تھی، جب خادمہ ٹھنڈے شربت کے گلاس لائی تو دونوں چونک اٹھے۔

عبداللہ نے دو چار گھونٹ شربت پی کر کہا؛

"میرے خیال میں آپ بیکار اس ذرا سے معاملے کو اہمیت دیتی ہیں۔ اگر آپ کی خدمت کے لئے ایک بیرسٹر نالائق ثابت ہوا تو اس پر افسوس کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، آپ کو خدمت اور ایثار کرنے والے خدا کے فضل سے بہت مل جائیں گے"

"آپ کا خیال یہ ہے" نیاز نے مایوسی سے مسکرا کر جواب دیا، "اور میں سمجھتی ہوں کہ مجھے الو کی طرح کسی قبرستان میں پناہ لینا چاہئے جہاں نہ کوئی امیدیں دلا کر بہلا سکے۔ نہ دھوکا دیکر دل کو صدمہ پہنچا سکے"

"آخر کیوں؟ آپ ایسے لوگوں سے امیدیں کیوں کیجئے جن پر آپ کو بھروسا نہ ہو؟"

"تو آپ سمجھتے ہیں یہ پہلے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کون آدمی کیسا ہے؟"

"جی ہاں کیوں نہیں؟ بڑی حد تک آسانی سے معلوم ہو جاتا ہے۔ بنیا اسی شخص کو قرض دیتا ہے جو کچھ رہن یا گروی رکھا سکے۔ اگر کوئی شخص کسی پر اعتماد کرتا ہے تو اسی صورت میں جب اسے اپنے یا دوسروں کے تجربے سے معلوم ہو جائے کہ وہ اسکا مستحق ہے۔ میں ایک دفتر میں نوکر ہوں، اگر میں کسی سے تجارت کے لئے روپیہ مانگنے جاؤں اور اسے معلوم ہو جائے میں تجارت کے ساتھ نوکری بھی کرنا چاہتا ہوں تو وہ مجھے روپیہ نہ دیگا، خواہ وہ مجھے کتنا ہی ایماندار سمجھتا ہو، میں ان بیرسٹر صاحب کے حالات سے واقف نہیں جن کا آپ نے ذکر کیا ہے لیکن غالباً وہ روپیہ کمانے میں مصروف ہیں، اور اسے آپ کی خدمت سے زیادہ ضروری سمجھتے ہیں، آپ کے کام صرف وہی شخص آسکتا ہے جس کے اپنی کوئی ذاتی غرض نہ ہو"

"جی ہاں، یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں" نیاز کچھ سوچکر بولی "مگر ساتھ ہی آپ اگر یہ بھی بتا دیتے کہ ایسے آدمی کہاں ملتے ہیں تو واقعی مجھ پر بڑا احسان ہوتا" نیاز کے الفاظ میں کچھ طنز تھا لہجے میں خلوص، عبداللہ سوا مسکرانے کے اور کچھ جواب نہ دے سکا۔ پھر نیاز یکبار پوچھ اٹھی:

"اچھا آپ کے ذاتی اغراض کیا ہیں؟ اگر آپ سے میں مدد چاہوں تو آپ دینے پر تیار

ہوں گے ؟"

عبداللہ گھبرایا، گھبرا کر مسکرایا، جھوٹ بولنے کے لئے مناسب الفاظ تلاش کرنا چاہے کہ سچی بات زبان سے نکل گئی:

"میں تو دل و جان سے ادنے سے ادنے خدمت کے لئے سب کچھ نثار کرنے پر تیار ہوں، مگر میری حیثیت کیا ہو کہ آپ کی مدد کرنے کا وعدہ کروں مجھے کوئی جانتا نہیں میرا کوئی اثر نہیں، اور آپ جانتی ہیں میں بدنام بھی کافی ہوں "

نیاز کے دل پر اس آخری جملے سے بڑی چوٹ لگی، اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں، عبداللہ یہ دیکھکر بہت پچتایا، مگر بات منہ سے نکل چکی تھی، نیاز نے اس کے دل کا زخم دیکھ لیا تھا، وہ سمجھتا تھا کہ نیاز خفا ہوگی یا روئے گی، مگر کسی امید نے یکبارگی نیاز کے حوصلوں کو پھر جگا دیا تھا، اور وہ کسی نشے سے مست معلوم ہوتی تھی۔

"مولوی صاحب، آپ غریب ہیں اور بدنام ہیں، اگر آپ میری وجہ سے ذرا اور غریب یا بدنام ہو گئے تو آپ کا زیادہ نقصان نہ ہوگا۔ بس اب آپ ہی میرے یار و مدگار و غمگسار بنئے . . . . . . "

زیب النسا بیگم اور ارجمند نے دعوت سے واپس آکر دیکھا کہ نیاز بڑے جوش سے تقریر کر رہی ہے، اس کے منہ پر ہنسی ہے اور آنکھوں میں چمک، اس کے مقابل کچھ دور عبداللہ سر جھکائے بیٹھا ہے، زیب النسا بیگم نے نیاز کی نبض دیکھی تو معلوم ہوا اسے بہت تیز بخار ہے۔

نیاز کا خیال تھا کہ اس کی خفگی کے بعد نادر حسین شرمندہ ہو کر اس کے یہاں رفتہ رفتہ آنا جانا بند کر دیگا، اسے یہ دیکھکر بہت حیرت ہوئی کہ گاہے ماہے آنے کی بجائے وہ پابندی سے ہفتے میں دو بار آنے لگا، اگر اسکی طبیعت نادر حسین سے بالکل ہٹ نہ گئی ہوتی تو وہ اس معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتی اور اسے آسانی سے معلوم ہو جاتا کہ دراصل ارجمند سے

ملنے آتا ہے، یوں بھی وہ زیادہ عرصہ تک مغالطے میں نہیں رہی، تا وقتیکہ حسین نے زیب النسا بیگم کی موجودگی میں ارجمند کو دو چار تحفے دیئے، اور ایک دن نیاز کو ارجمند کی انگلی پر انگوٹھی دکھائی دی اب سارا معاملہ صاف ہو گیا۔

ارجمند کی طبیعت میں وہ بے تکلفی نہیں تھی جس نے اسکول اور کالج میں نیاز کی واقفیت کا دائرہ اس قدر وسیع کر دیا تھا۔ ارجمند اپنی اس خصوصیت سے بہت نالاں تھی، کیونکہ اس کی وجہ سے اسے ہر جگہ، ہر مجمع میں نیاز کی ماتحتی اختیار کرنی پڑتی تھی، اسے نہ گانے کا شوق تھا نہ ڈراما کا، نہ طالب علموں کی صحبت سے کوئی دلچسپی مگر محض اس خوف سے کہ کہیں ساری شہرت اور ہر دلعزیزی نیاز کے حصہ میں نہ چلی جائے، وہ ہر چیز میں شریک ہوتی تھی، اور نیاز کے مقابلے میں ذہانت اور جوش کی جو اس میں کمی تھی اسے اپنے حسن اور مدھ بھری مسکراہٹ اور ہوشیاری کو کام میں لا کر پورا کرتی تھی، اس کے منہ سے نیاز کے خلاف کبھی کوئی لفظ نہیں نکلا لیکن دیکھنے والا دیکھ سکتا تھا کہ وہ نیاز سے بازی لیجانے کی جی توڑ کوشش کر رہی ہو، جب زیب النسا بیگم نے دعوتیں دینا شروع کیا تو اسے اپنے داؤں پیچ دکھانے کا بہتر موقع ملا۔ نیاز کی طبیعت ان خوشحال مردوں اور عورتوں کو کبھی نہیں پسند آ سکتی تھی جو اپنی زندگی آسودگی سے بسر کرنا چاہتی تھیں جیسے خرانٹ مینڈک ان بچوں کی شرارت نہیں پسند کر سکتا جو اس کی گڑھیا میں گھس کر سبز کائی کی چادر پھاڑ ڈالتے ہیں اور پانی میں ایسی اُدھم مچاتے ہیں کہ اسے اپنے مسکن سے جان لیکر بھاگنا پڑتا ہے۔ لیکن ہنر کہاں چھپ سکتا ہو، وہی لوگ جو نیاز کی طبیعت سے گھبراتے تھے۔ اس سے بڑی لجاجت سے گانے کی فرمائشیں کیا کرتے تھے اور جب وہ گاتی تھی تو ایسے متاثر ہوتے کہ ارجمند کے تکلفات اور میٹھی نگاہوں اور مدھ بھری مسکراہٹ کی جادوگری اسکے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھی۔ ارجمند کا یہ دیکھکر بہت جی جلتا تھا، اس لئے جب کبھی نیاز دعوت میں شریک نہ ہوتی تو اسے بیحد خوشی ہوتی، اگر کبھی نیاز بے وقت روٹھ کر مہمانوں کی طرف پیٹھ پھیر لیتی تو اسکا دل باغ باغ ہو جاتا، مگر حاسد کی قسمت میں کڑھنا کچھ لکھا ہی ہوتا ہو

ارجمند کے حسن کے سب گرویدہ تھے، اس کے مزاج اور اخلاق کی سب تعریف کرتے تھے لیکن جس لہجے میں نیاز کے گن گائے جاتے تھے وہ کچھ اور ہی تھا۔

جان پہچان کے نوجوانوں میں بہت سے ارجمند کی نظر سے گذرے۔ جن کے پاس اتنا روپیہ جن کے مستقبل میں اتنی چمک تھی کہ وہ ان سے شادی کرنے پر راضی ہو جائے، اس کا خیال تھا کہ اسکی اپنی جھجک انہیں دور رکھتی ہے، دراصل اس کا حسن اور وہ توجہ جو وہ اپنی آرائش کیطرف کرتی تھی انہیں بھڑکا دیتی تھی اور اسکی آنکھوں میں ایک خود غرضی کی جھلک بھی تھی جو سمجھدار نوجوانوں کو سلطنتوں کا حسن کے فریب میں آکر برباد ہونا، جائدادوں کا نیلام ہونا اور بھلے آدمیوں کا تباہ ہونا یاد دلا دیتی تھی۔ نیاز خوبصورت نہیں تھی، اسے لباس اور زیور کا کوئی شوق نہ تھا، وہ نازک مزاج بھی تھی، مگر اس کی سادگی، بے تکلفی، سریلی پر درد آواز اور جوش بھری آنکھیں ہر شخص کو اپنی طرف کھینچتی تھیں، اور ارجمند کو دنیاداروں کے حلقے میں بھی مجبوراً دلربائی کی مسند نیاز کے لئے خالی کرنا پڑا۔

نادر حسین بھی ان لوگوں میں تھا جنہیں ارجمند نے اپنے لئے موزوں قرار دیا تھا۔ شروع میں وہ اس طرح نیاز کے قبضے میں تھا کہ ارجمند ڈورے ڈالنے کی ہمت نہ کر سکی، اور اس کے علاوہ وہ اسوقت تک محض ایک خوشحال آدمی کا لڑکا تھا اور اس نے اپنی کمائی سے خاندانی دولت میں کوئی اضافہ نہیں کیا تھا۔ لیکن ارجمند کی نظر اس پر رہی، اور جب اس نے دیکھا کہ وہ وکالت میں مصروف ہے، خوب کما رہا ہے اور آئندہ اور بھی کمائے گا تو اس میں مالدار بیرسٹر کی بیوی بننے کی ہوس نے زور باندھا، اسکی خوش قسمتی تھی کہ نیاز اسی زمانے میں نادر حسین سے خفا ہو گئی۔ اس نے موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا، اور جس شام کو نیاز کی دوستی ختم ہوئی اس نے اپنی دوستی کی بنیاد ڈال دی۔ اسے نادر حسین سے مطلق محبت نہیں تھی لیکن عاشقانہ گفتگو کی اصطلاحیں سب کے کانوں کو بھلی معلوم ہوتی ہیں، اور ارجمند اپنے دل کی کیفیت چھپانا جانتی تھی اس نے جو انداز اختیار کیا اس سے نادر حسین کو یقین ہو گیا کہ اسے بہت اچھا مال دستیاب رہا ہے

اور اسے نہ کسی رقیب کا مقابلہ کرنا ہوگا نہ کسی چور کا اندیشہ رہے گا، ارجمند کی آنکھیں اسے کبھی کبھی ڈرا ضرور دیتی تھیں، اس کے دل میں کچھ کھٹکا سا تھا جسے اسکی عقل سمجھا نہ سکی، مگر دوسرے زیادہ قوی جذبات اس کی طبیعت پر حاوی ہو گئے، اس کے اندیشے دور کے بادلوں کی گرج بن گئے جن کے برسنے کا خوف رفتہ رفتہ جاتا رہا۔

ارجمند اور نادر حسین میں جو تعلقات قائم ہو گئے تھے ان سے نیاز کو کوئی شکایت نہیں تھی، نادر حسین سے وہ مایوس ہو چکی تھی، ارجمند سے اسے ہمدردی یا مدد کی کوئی امید نہیں تھی اس کا دل کینے سے بالکل پاک تھا، اور اس لئے وہ دونوں اپنی زندگیوں کے بارے میں جو کچھ طے کرتے اسے وہ خلوص سے تسلیم کرنے پر تیار تھی، اسے اس زمانے میں ایک دوست بھی مل گیا تھا جس کی وہ دل سے عزت کرتی تھی، جو اس کے تصور میں ان تمام خوبیوں کا مجسمہ بن گیا تھا جو کسی انسان میں پائی جا سکتی تھیں۔ خود عبداللہ اس اتفاقی ملاقات کے بعد جب نیاز نے انتہائی سادہ دلی اور جوش سے اسے اپنا دوست اور مددگار بنا لیا تھا بہت پریشان رہا، وہ اس ذمہ داری سے نہیں گھبراتا تھا جو نیاز نے اس پر ڈالدی تھی اسے اسکا یقین نہیں تھا کہ نیاز وہ صدمے برداشت کر سکے گی جو دنیا انقلاب کے ہراولوں کو ہمیشہ پہنچاتی ہے۔ نیاز سے اسے جو محبت تھی اس کا یہی تقاضا تھا کہ کسی طرح نیاز اپنے حوصلوں کو عملی صورت دینے سے روکی جائے، اس لئے اس نے نیاز کو بدنامی سے، لوگوں کی تحقیر سے، بے غرتی سے بہت ڈرایا، مگر یہ سب تدبیریں بیکار ثابت ہوئیں۔ نیاز سب کچھ سن کر آخر میں پوچھتی تھی:

"میں نے مانا آپ جو کچھ کہتے ہیں وہ ہوگا، مگر کیا آپ اسکی وجہ سے میرا ساتھ چھوڑ دینگے؟"

اور عبداللہ اپنی زبان کو جھوٹ بولنے پر آمادہ نہیں کر پاتا تھا۔ لطور آخری کوشش کے اس نے سارا معاملہ زیب النساء بیگم کے سامنے پیش کر دیا۔ زیب النساء بیگم دل میں تو ہرگز نہیں چاہتی تھیں کہ نیاز مفت میں مصیبتیں اٹھائے، لیکن وہ یہ بھی گوارا نہیں کر سکتی تھیں کہ محض انکی مخالفت اسکے حوصلوں کی کمر توڑ دے۔ انہیں امید تھی کہ نیاز کو بہت جلد ایک ہمدرد شوہر

مل جائیگا، اور اگر وہ اپنے حوصلے پورے نہ کر سکی تو شوہر اور اولاد کی محبت ناکامی کی یاد بھلا دے گی۔ نادر حسین اور نیاز کی دوستی کا رنگ پہلے ایسا تھا کہ وہ سمجھیں نیاز اس سے شادی کرے گی، انکے ایک دوسرے سے خفا ہونے کا رنج سب سے زیادہ انہیں کو ہوا، اور ارجمند نے جس خود غرضی سے ان دونوں کو پھر میل ملاپ کرنے کا موقع نہیں دیا وہ انہیں بہت ناگوار معلوم ہوئی۔ نیاز کا مایوس ہو کر اپنے آپ کو یا اپنی نیک نامی کو صدمہ پہنچانا کوئی ناممکن بات نہ تھی۔ اس لئے وہ نیاز کی ہر کیفیت پر غور کرتی جاتی تھیں، مگر اس کے معاملات میں دخل دینا انکے اصول کے خلاف تھا۔ عبداللہ نے جب ان کو بتایا کہ نیاز اس سے کیا چاہتی ہے تو انہوں نے پہلے اسی کے ذریعے سے نیاز کو سمجھانا چاہا، اور پھر ایک بار اس کی موجودگی میں انہوں نے نیاز سے کہا:

"بیٹی تم نے اپنا دل تو مضبوط کر لیا ہے، مگر یہ بھی تو سوچو میرے کمزور دل پر کیا گذرے گی جو تمہاری طبیعت کی ذرا سی ناسازی تک نہیں برداشت کر سکتا۔ تم اگر بدنام ہوئیں تو مجھے قبر میں بھی چین نصیب نہ ہوگا۔ اور پھر یہ بھی تو سوچو تم نے اپنے حوصلے پورے کرنے کا سامان کتنا کیا ہے۔ ایک بیچارہ عبداللہ جو اپنی روٹی کمانے کے لے سارا دن محنت کرتا ہے تمہارے واسطے کیا کیا کریگا؟ تمہیں بہت سے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانا چاہئے، تمہارے ساتھ دو چار شریف اور خوشحال لڑکیاں شریک ہونا چاہئیں جس سے لوگوں پر کچھ رعب جمے، سب تمہاری کوششوں کو ایک آوارہ لڑکی کا بکھیڑا نہ سمجھ لیں جو گھر میں بھلے مانسوں کی طرح رہنے کی بجائے جلسوں میں گاتی پھرتی ہے۔ اگر دس آدمی تمہارے اوپر انگلیاں اٹھائیں تو دو چار ایسے ہونا چاہئیں جو تمہاری طرف سے کچھ کہنے پر تیار ہوں اور تمہیں مردوں سے کیا کام۔ تم کو تو عورتوں پر اثر ڈالنا چاہئے۔ اگر تم نے اپنے عقیدوں کی پیروی کرکے بدنامی اٹھائی اور دنیا کی نظروں میں ذلیل ہوئیں تو شریف لڑکیاں ڈر جائیں گی، کوئی تمہاری تقلید نہ کرے گی، اور تمہاری محنت اور جفاکشی اور رسوائی سے کسی خدا کی بندی کو کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔ میں نے آجتک تمہاری مخالفت نہیں کی ہے، لیکن سچ پوچھو تو تم نے ذرا بھی دور اندیشی سے کام نہیں لیا۔ سب سے لڑتی جھگڑتی ہو، اور تمہاری بدمزاجی سے سب نالاں ہیں۔ ٹھیک طریقہ تو

یہ ہے کہ تم اپنے جان پہچان کے لوگوں کو خوش کرو، سب کے دلوں میں اپنی محبت پیدا کرو پھر وہ آپ ہی تمہاری مدد کریں گے، تمہیں کامیابی کی دعائیں دیں گے۔ اور تمہارے بعد اگر کوئی غریب اور شریف لڑکی گانے کا پیشہ اختیار کرے گی تو اسے معلوم ہوگا کہ واقعی کوئی خدا کی بندی اس کی مشکلیں آسان کر گئی ہے، میں برسوں سے اس فکر میں ہوں کہ تم نام پیدا کرو، مگر بیٹی تمہاری سمجھ کچھ ایسی الٹی ہے کہ تم مجھے اپنا دشمن سمجھتی ہو اور جن لوگوں سے میں تمہاری تعریف کرانا چاہتی ہوں انہیں کے منہ سے تم مجھے گالیاں سنواتی ہو۔"

زیب النسا بیگم کی تقریر میں بے ترتیبی بہت تھی، مگر وہ کارگر ہوئی، نیاز اس وقت کچھ نہیں بولی شام کو جو مہمان آئے ان سے خوب میٹھی میٹھی باتیں کیں اور انہیں جی بھر کر گانا سنایا، مگر اسکی سادہ دلی کا اندازہ ابھی تک زیب النسا بیگم کو نہیں ہوا تھا، رات کو گیارہ بجے کے قریب وہ سونے کے لئے لیٹیں تو نیاز کمرے میں آئی انکے گلے سے لپٹ گئی اور چپکے چپکے رونے لگی، انہوں نے پیار کیا، سر سہلایا، رونے کی وجہ پوچھتی رہیں، مگر نیاز کے منہ سے آواز ہی نہ نکلی، آخر کار اس نے تکیہ میں منہ چھپا کر کہا:

"اماں ہم مولوی صاحب سے شادی کرینگے"

یہ سنتے ہی معلوم ہوتا تھا کسی نے زیب النسا کا گلا گھونٹ دیا۔ انکے دل کا دھڑکنا بند ہوگیا۔ آنکھیں حلقوں سے نکلی پڑتی تھیں حواس گم تھے۔ تھوڑی دیر بعد جب صدمہ کا اثر کچھ کم ہوا تو انہوں نے نیاز کی بانہہ اپنے گلے سے ہٹائی اور کچھ مایوسی، کچھ غصے کے لہجے میں بولیں:

"نیاز کیا بالکل ہی دیوانی ہوگئی ہے؟ اچھے بھلے نوجوانوں سے جو تجھے کھلا پلا سکتے ہیں ذرا ذرا سی بات پر روٹھ جاتی ہے، کبھی کہتی ہے گانے والی کا پیشہ اختیار کرے گی، کبھی ایک غریب آدمی سے شادی کرکے اس کی جان مصیبت میں ڈالنے پر تل جاتی ہے، اری ذرا ہوش حواس درست کر، تجھے ہو کیا گیا ہے؟"

نیاز نے تکیہ میں اور منہ چھپا کر جواب دیا:

"اماں ہم کو امیر آدمی نہیں چاہئے، ہمارے حوصلے صرف غریب آدمی پورے کر سکتا ہے"

"ہاں غریب اور کیسا غریب! بیچارے پر کسی نے الزام لگا دیا کہ بھنگن سے تعلق رہ چکا ہے تو ایسی بگڑی کہ گتے کی طرح ڈکارنے پر تیار ہو گئی، اب خدا جانے کیسے اس سے شادی کرنا چاہتی ہے، تو تو اپنی زندگی بگاڑ کر چھوڑے گی، تجھے میں کیا سمجھاؤں، مجھے اس بیچارے پر ترس آتا ہے اس میں کہاں بوتا ہے کہ تیرے ناز نخرے برداشت کرے، تو اس سے دو چار دن میں خفا ہو کر کہدے گی کہ جائیے ہماری دوستی ختم ہو گئی اور اپنے گھر بھاگ آئے گی، اس بیچارے پر مفت میں ایک شریف زادی کے بہکانے کا الزام لگے گا، لوگ کہیں گے اس نے تجھے دھوکہ دے کر تیری زندگی برباد کی . . . . تو تو ایسی خود غرض نہیں ہے، ذرا دوسرے کی نیک نامی کا خیال کر"

نیاز نے تکیہ پر سے سر نہیں اٹھایا، وہیں روتے روتے سو گئی، سویرے جب اس کی آنکھ کھلی تو زیب النسا بیگم اسے بڑی محبت سے پیار کر رہی تھیں۔

اس دن سے زیب النسا بیگم سے زیادہ نیاز کے حوصلوں کا ہمدرد اور خیر خواہ کوئی نہ تھا نیاز منہ ہاتھ دھو کر ناشتے کے لئے آئی تو انہوں نے کہا:

"دیکھ لڑکی تو سمجھتی ہے میں سٹھیا گئی ہوں، اب میں تجھے بتاؤں گی کہ سمجھدار آدمی اپنا مطلب کیسے حاصل کرتے ہیں۔ ناشتے کے بعد تجھے بٹھا کر ڈیڑھ سو دعوت نامے لکھاؤں گی، دعوت نامے لکھ کر تجھے جتنی غزلیں اور گیت یاد ہیں سب سنوں گی، اور جو مجھے پسند آئے ان کی روزانہ دعوت کے دن تک مشق کراؤں گی، جب تو دعوت میں سب کو غزلیں سنا کر خوش کر چکے گی تو تیری ہمدردی میں ایک تقریر کروں گی اور پھر دیکھیں گے گانے کا عام جلسہ کرنے کا کون مخالف ہوتا ہے۔ جب تو نے ایک جلسہ کامیاب کر دیا اور تمام اخباروں نے تیری تعریف کر دی تو پھر کیا باقی رہے گا، تیرا جی چاہے باپ کی کمائی پر بسر کر، جی چاہے اپنی روٹی کما۔ تو ایسی ضدی اور بیوقوف نہ ہوتی تو یہ سب کب کا ہو گیا ہوتا"

نیاز کی طبیعت میں شک بالکل نہیں تھا، ماں کی باتیں سنکر خوشی سے پھول گئی، اور جلدی جلدی ناشتہ کرکے دعوت نامے شروع کئے۔

"دیکھو نیاز" زیب النسا بیگم نے اچانک کہا "عبداللہ کو ضرور بلانا"

نیاز نے ماں کی طرف غور سے دیکھا۔ دیکھتے دیکھتے اسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اور وہ ماں سے جاکر بڑی محبت سے لپٹ گئی۔ انہوں نے شادی کی مخالفت کی تھی تو کیا ہوا، نیاز کو یقین ہو گیا کہ انہیں اس سے اور عبداللہ سے سچی محبت ہے۔ بڑی دعوت کے دن تک نیاز کے دل میں یہ یقین پختہ ہوتا گیا، اور ماں کا اصل منشا بھی اس کی سمجھ میں آگیا، اس نے عبداللہ سے شادی کرنے کا خیال تو چھوڑ دیا مگر وہ الفت جس نے یہ خیال پیدا کیا تھا اس کے جذبات کا جوہر بن گئی، ایک زیور جس نے اس کے حسن کو دوبالا کر دیا، ایک خوشبو جس میں اسکا جسم ہر وقت بسا رہتا تھا۔ جب دعوت کا دن آیا تو نیاز ایک نئی زندگی شروع کرنے پر تیار تھی۔

زیب النسا بیگم نے مہمان بہت چن چن کر بلائے تھے، صرف ایسے نہیں جو محض امیر تھے یا ایسے جو ہر تجویز کی تائید کرنے پر راضی ہوں، اور تائید کے سوا اور کسی قسم کی مدد دینے میں سستی یا غفلت کریں، نیاز کی آواز بھی خوب رنگ پر تھی، غزلوں اور گیتوں کے بیچ بیچ میں زیب النسا بیگم نے مہمانوں کو اس کے ارادے سمجھائے۔ جو اختلاف رائے انکی تقریریں نہیں مٹا سکیں وہ نیاز کے نغموں نے خاموش کر دیا، اور جب مجلس برخاست ہوئی تو سب نے نیاز کی ہمت افزائی کی اور حتی الامکان مدد کرنے کا وعدہ بھی کیا۔

مہمانوں کے ہجوم میں نیاز ایک نوجوان کی طرف زیادہ توجہ نہیں کر سکی جسے نادر حسین ساتھ لایا تھا، اسکا نام ہدایت اللہ تھا اور وہ اسی صوبے کے ایک بڑے شہر کا رہنے والا تھا، انگلستان میں نادر حسین اور وہ قریب ایک سال کے ساتھ رہے تھے اور دونوں میں بہت دوستی ہو گئی تھی وہاں سے واپس ہونے پر وہ اس کوشش میں مبتلا رہا کہ اپنی محنت سے کمائے کھائے اور آبائی جائداد کی آمدنی کا سہارا نہ لے، نادر حسین کی طرح وہ بھی بیرسٹر تھا، مگر کچھ دنوں وکلا، کی صحبت

اور مقدمہ بازی کی فضا میں رہنے کے بعد اس نے طے کیا کہ اس پیشے کی کمائی مفت خوری سے بھی بدتر ہے، اور اسے چھوڑ کر تجارت کے ارادے سے دو چار دوکانیں اور کارخانے قائم کئے، مگر اسے معلوم ہو گیا کہ لوگ اسے طرح طرح کے سبز باغ دکھاتے ہیں، دوکان یا کارخانے کا معائنہ کرا کے یا سنجیدہ چہرہ بنا کر اسے یقین دلا دیتے ہیں کہ اسے عنقریب دس بارہ فیصدی کا منافع ہونے والا ہے مگر اسے کسی قسم کا فائدہ نہیں ہوتا۔ وہ ہوشیار آدمی تھا اور صرف چند ہزار کا نقصان اٹھانے کے بعد اس نے یہ "پیشہ" بھی ترک کر دیا۔ پھر قبل اس کے کہ وہ اور کوئی شغل تجویز کرے، دولت اور فراغت نے اس پر جادو کر دیا، اور اپنے اچھے ارادے بھول کر وہ آوارہ میموں اور طوائفوں کے پھندے میں پڑ گیا۔ اس راستے پر اسکی روک ٹوک کرنیوالا بھی کوئی نہیں تھا والدین نے اس کے ولایت جانے سے پہلے جائداد کے لالچ میں اس کی ایک مدقوق لڑکی سے شادی کر دی تھی جو بہت جلد مر گئی، اور اس سے جو ایک بچی ہوئی وہ صرف چند دن کی مہماں رہی، ہدایت اللہ جب ولایت سے واپس آیا تو اس کے پاس بہت سی دولت تھی جسے خرچ کرنے کے علاوہ اس کی زندگی کا بظاہر اور کوئی مصرف نہ تھا، پھر میمیں اور طوائفیں اپنے نصیب کو کیوں دعائیں نہ دیتیں۔

نادر حسین کی جب منگنی ٹھہر گئی تو اس نے ہدایت اللہ کو ارجمند سے ملنے کے لئے بلایا، ہدایت اللہ پر اسی زمانے میں عیاشی کی ایک موج گذر چکی تھی اس زندگی سے اس کی طبیعت سیر ہو گئی تھی اور ایک میم جس کی آشنائی اس کے خیال میں محبت کے درجے تک پہنچ گئی تھی اسے چھوڑ کر کسی راجہ کے پاس چلی گئی تھی۔ ہدایت اللہ نے کچھ اس غرض سے کہ کرنی کا ماجرا بھول جائے کچھ عیاشی کا خمار اتارنے کے لئے نادر حسین کی دعوت منظور کر لی۔ اتفاق سے وہ ایسے وقت پہنچا کہ زیب النسا بیگم کی بڑی تقریب میں بھی شریک ہو سکا، ارجمند سے مل کر وہ بہت خوش ہوا، لیکن ارجمند جیسی لڑکیاں اس نے بہت دیکھی تھیں، کبھی شریف خاندانوں میں، کبھی آوارہ عورتوں کے حلقوں میں نیاز کی سی صورت اور سیرت سے اسے ابھی تک سابقہ نہیں پڑا تھا، اور اس کی ذہنیت پر عیاشی

کا زنگ اس طرح لگ گیا تھا کہ وہ ایسی عورتوں کے وجود ہی کا قائل نہیں رہا تھا، نیاز کو دیکھ کر اس کے دل میں نئے ولولے پیدا ہوئے، اسے اپنی گذشتہ زندگی یاد کر کے شرم آنے لگی، اور اس کے دل میں ایک امید جاگ اٹھی کہ شاید نیاز کا اثر اس کی بری عادتیں چھڑا کے اسے ہوس کے گرداب سے نکال لے اور پھر ایک مہذب انسان بنا دے اس لئے نادر حسین کے ذریعہ سے اس نے دوسرے دن چائے پر اپنی دعوت کرالی اور دل کا پیمانہ امیدوں سے لبریز کر کے گھر واپس ہوا۔

اس کی نیاز سے دوسرے دن ملاقات ہوئی، تیسرے دن وہ بن بلائے پہنچ گیا اور چوتھے دن بھی۔ اسے معلوم تھا کہ یہ رویہ درست نہیں ہے، اس سے خواہ مخواہ بدگمانی ہوتی ہے۔ مگر اسے خوف تھا کہ اگر نیاز کی دوستی کا سہارا نہ ملا تو پرانی صحبت میں جا کر وہ پھر عیاشی میں مبتلا ہو جائیگا اپنی کشمکش سے نجات پانے کے لئے اس نے چوتھی ملاقات پر نیاز کو اپنی ساری سرگذشت سنا دی اپنی مجبوریاں سمجھادیں، اور نیاز جیسی پاک دل عورت کا اس کے اخلاق پر جو اثر پڑ سکتا تھا وہ بھی تبلا دیا۔ ہدایت اللہ نے عیاشی سیکھ لی تھی، مگر عیاری اور مکاری سے ابھی تک بالکل بیگانہ تھا، اور نیاز سے باتیں کرتے وقت اس کے چہرے اور لہجے سے اتنا خلوص ظاہر ہوتا تھا کہ اگر نیاز نے اپنے عام قاعدے پر عمل کیا ہوتا تو وہ ہدایت اللہ کو ایک فرشتہ سمجھ لیتی جو دنیا کے فریب میں آگیا ہے اور اس کے ہمراہ فلک پیمائی کرنے کے خواب دیکھنے لگتی، مگر پچھلے دنوں وہ اپنی ماں کی تجربہ کاری کی بہت قائل ہو گئی تھی، اور اسے اپنی غلطیوں کا بھی کچھ احساس ہو گیا تھا، اس موقع پر اس نے اپنے جوشش کی لگام تھامی، ہمدردی اور افسوس کا اظہار کیا، لیکن کسی قسم کا قطعی وعدہ کر کے اپنے آپ کو پابند نہیں کر لیا۔ زیب النساء بیگم کو معلوم تھا کہ ازدواجی زندگی میں بیوی اگر چاہے تو کتنا اثر ڈال سکتی ہے، اور اس لئے جب نیاز نے انہیں ہدایت اللہ کا سارا قصہ سنایا تو انہوں نے اسے ایک ناقابل رحم مجرم قرار دے کر نیاز کو اس سے دور دور رہنے کی تاکید نہیں کی، ہدایت اللہ کی صورت میں شائستگی اور شرافت کے آثار ابھی اس قدر باقی تھے کہ اس کے سدھرنے کی امید کیجا سکے، اور اگر انکو یقین ہو جاتا کہ اس نے اپنا چال چلن درست کر لیا ہے تو وہ نیاز کی اس سے شادی کر دیتی

بھی مخالفت نہ کرتیں، اس لئے انہوں نے ہدایت اللہ کو تین چار روز بعد چائے پر بلایا اور باتوں باتوں میں اسے مشورہ دیا کہ انکے شہر میں مکان لیکر دو چار مہینے رہے۔ یوں وہ اپنی صحبت سے پیچھا چھڑا سکے گا، اور وہ سب بھی اس سے اکثر مل سکیں گے۔

ہدایت اللہ نے اس تجویز پر عمل کیا، اور شہر میں مکان لیکر رہنے لگا، اسکا زیب النسا بیگم کے یہاں کثرت سے آنا جانا ہوتا تھا، زیادہ تر اس وجہ سے کہ وقت کاٹنے کے لئے وہ نیاز کے گانے کا جلسہ کرانیکے دھندے میں پڑ گیا، شہر میں سکونت اختیار کرنے کے ایک مہینہ بعد ہی اس نے بڑے اہتمام سے جلسہ کرا بھی دیا، جلسے میں بہت لوگ آئے ٹکٹ بہت بکے، نیاز کی تین سو روپے نقد آمدنی ہوگئی اور اخباروں میں اسکی خوب تعریف بھی چھپی، نیاز اپنی کامیابی پر بہت خوش ہوئی اور ہدایت اللہ کے سلیقے اور حسن انتظام اور پاک نیتی پر اسے اتنا اعتماد ہوگیا کہ جب اس نے کوشش جاری رکھنے کی صلاح دی تو وہ فوراً راضی ہوگئی اور ہدایت اللہ نے اپنے شہر میں بھی اسی اہتمام اور کامیابی سے جلسہ کرا دیا۔ نیاز کے حوصلے پورے ہو رہے تھے، اور ہدایت اللہ سے اسکی وہ گہری دوستی ہوگئی جس کی دونوں کو اتنی تمنا تھی، اس عرصہ میں زیب النسا بیگم نے یہ بھی دیکھ لیا کہ ہدایت اللہ پھر شریف اور خوش اخلاق لوگوں کی زندگی بسر کرنے لگا ہے، اس نے بدچلنی کے داغ اپنی طبیعت اور اپنے دل سے بالکل مٹا دیئے ہیں، اور اب اس کے خلوص اور نیت میں شک کرنا بیجا ہوگا۔ ایک اور خوشی کی بات یہ بھی تھی کہ اس نے نیاز کے مزاج کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا، اور اس سے امید کیجا سکتی تھی کہ بغیر نیاز کا دل دکھائے وہ اسے سادہ دلی کی حماقتوں سے بچاتا رہے گا۔

لیکن زیب النسا بیگم کو مسرت کے زیادہ دن نصیب نہیں ہوئے، ارجمند کی شادی تین مہینے بعد ہونے والی تھی، ایک روز نادر حسین نے ان سے شکایت کی کہ ارجمند نے تاریخ ملتوی کرنے کو کہا ہے اور یہ نہیں بتایا کیوں، زیب النسا بیگم نے بھی ارجمند سے پوچھا، مگر کچھ صاف صاف معلوم نہ ہو سکا۔ ارجمند ایسی بیوقوف نہیں تھی جو اپنے ارادوں کا اعلان کرتی۔ ادھر ہدایت اللہ نیاز

رائنر ماریا رلکے

(گذشتہ جلدوں میں ڈاکٹر سلیم الزمان صاحب صدیقی اس جرمن شاعر کی زندگی اور اسکے کلام سے ناظرین "جامعہ" کو روشناس کر چکے ہیں۔ اس پرچہ میں اسکی چند منتخب نظموں کا ترجمہ پیش کرتے ہیں)

بیوہ کا گیت

شروع شروع زندگی میں ایک مزہ تھا،
ایک امنگ تھی، ایک ڈھارس تھی۔
یہ کہ جوانی میں یونہی ہوتا ہے۔
ان دنوں کیا معلوم ہوتا۔
نہ معلوم تھا کہ زندگی کیا چیز ہے،
اور دفعتاً زندگی یہ ہوگئی۔
کہ سال آیا اور سال گیا۔
نہ امیں مزا رہا، نہ تغیر، نہ تحیر؛
جیسے کوئی بیچ سے دو ٹکڑے کردے۔
اس میں نہ اسکی خطا تھی نہ میری،
ہم دونوں صابر تھے اور صبر بھی کرتے رہے،
لیکن موت کو صبر نہیں۔
میں نے اس کو آتے دیکھا (کیا ہی برا آنا تھا اس کا آنا)
اور میں اسکو تکتی رہی اور وہ سمیٹی گئی سمیٹی گئی۔

کچھ میری تھوڑی ہی تھی، میری!
پھر تھا کیا میرا؟ میری، میرا؟
کیا میرا سوگ تک مانگے کا نہ تھا،
قسمت کا دیا قرض؟
تقدیر نصیب ہی نہیں لیتی
دل کا ریح اور جگر کے نالے تک لوٹ لیتی ہے۔
اور پھر اجڑے کھنڈل کو گدڑی کے داموں خرید لیتی ہے۔
ہاں! تقدیر آئی اور ایک نہیں کے بدلے سب کچھ لے گئی،
میرے چہرے کی ہر ہر بات،
میری چال، ڈھال،
سب،
جیسے روز کے روز کا نیلام،
اور جب کچھ نہ رہا تب اپنے حالوں چھوڑ دیا۔ ۔ ۔ ۔
خالی ہاتھ کھڑی ہوں!

سڑان کا گیت

لوگ مجھے روکتے نہیں، پتانے دیتے ہیں۔
کہتے ہیں کچھ ہو نہیں سکتا۔
قرنٹ(1) لے ہیں۔

(1) تشدید "م" پر ہے "ز" پر نہیں

کچھ ہو نہیں سکتا! ایک دنیا آتی ہے
اور چکر پر چکر لگاتی ہے،
بار بار روح القدس کے گرد،
اَرمہ ایک روح ہے روح القدس،
(سمجھے!)۔
قرنے ہیں۔
نہیں، سچ مچ کوئی یہ نہ سمجھے،
اس میں کوئی ڈر کی بات ہے،
یہ خون ہے خون۔
اور خون کا بوجھ سارے بوجھوں پر بھاری ہے
میاں بڑا وزن ہوتا ہے خون کا۔
اور اب تو اکثر یوں لگے ہے۔
کہ بھئی اب تو اپنوں سے یہ نہیں سدھنے کا۔
قرنے ہیں۔
ارے، یہ کیا ہے، گیند کہ غبارہ!
لال لال، گول گول، جیسے سارا سنسار
بھئی اچھا کیا لوگو اسے بنایا۔
مگر یہ آئے گا بھی جو اسے بلائیں؛
کیسی ہر چیز لایعنی لاثانی ہے
ایک دوسرے میں گھسی جاتی ہے
ایک دوسرے سے نکلی آتی ہے!

کچھ مزے مزے، کچھ ڈھل مل یقین،
بھئی تو مزے ہیں لوگو، تو مزے ہیں (۱)

یتیم کا گیت

میں نہ کچھ ہوں، نہ کچھ ہوں گا۔
ابھی تو خیر ہونے کو عمر ہی کیا ہے،
لیکن آئندہ بھی۔

ماں باپو۔
رحم کرو مجھ پر رحم۔

(۱) ہمارے گاؤں میں بادن دین نامی ایک سڑی رہتا تھا۔ میری عمر اس زمانے میں چار پانچ سال کی ہو گی۔ جب کبھی وہ اپنی چٹ بھر لنگوٹی باندھے گھر کے پاس سے گذرتا میں اسکے ہونق چہرے سے ڈر کر بھاگ جاتا۔ وہ نہ کسی کو مارتا نہ پیٹتا صرف سر اٹھا کر چاروں طرف گردن کو آہستہ سے گردش دیتا اور دبی آواز سے بڑبڑاتا " یوسب ہمار آسے " قارئین میں سے ہر ایک کو کسی نہ کسی ایسی ہی ہستی کا تجربہ ہوا ہوگا رسکے کی اس نظم کو پڑھکر اس سڑی کی شکل سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہے۔ ہر سڑی کی بڑ میں کچھ نہ کچھ دل کو لگتا ہوا فلسفہ ہوتا ہے اور ایسا نہ ہوتا تو مجذوب مجذوب کیوں کہلاتے۔ رسکے کے سڑی میں اس کی خاص شہرت ہے۔ وہ کبھی اپنے خون کے بوجھ سے عاجز ہو کر چیختا ہے کہ اب یہ بار نہیں اٹھتا کبھی قلانچ مار کر کہتا ہے کہ " مزے ہیں " کبھی اس دنیا کو بجھتے یا نکلتے ہوئے آفتاب کو لال لال غبارہ قرار دیتا ہے اور انگلی کے اشارے سے بلاتے ہوئے کہتا ہے کہ " مگر یہ آئیگا جواب بلائیں " رسکے کی ایک ایک تحریر آنکھوں کے سامنے ایک ایک تصویر پیش کر دیتی ہے اور تصویر بھی ایسی تصویر کہ نہایت شدید اور جامہ دریدہ جسے دیکھکر انسان کچھ دنوں تک تو آنکھوں سے محو نہ کر سکے۔ واللہ اعلم بالصواب

مگر عبث ہے میرا پالنا پوسنا ؛
میری بنیاد بے بود۔
میرا کون اور میں کس کا ؟
آج ابھی بہت سویرا ہے ،
اور کل ہو جائے گی بہت دیر
میرے صرف یہی ایک تن کا جامہ ہے
گھستا ہے، بیرنگ ہوتا ہے۔
مگر کٹنے نہیں آتا ،
شائد یہ ابد ابد کا ساتھی خدا کے گھر تک جائے۔
میرے صرف یہی سر کے چند بال ہیں۔
(نہ کبھی کٹے نہ بنے)
کبھی کسی کے پیارے تھے ،
اب کسی کے نہیں۔

باونے کا گیت

میری روح شائد سیدھی اور ثابت ہو
لیکن اس سے میرا دل، میرا ٹیڑھا خون،
میری ٹیڑھی رگیں، میرے ٹیڑھے عضو،
(یہ میری کوفت کے نشان)
سیدھے نہیں ہوئے
اس کے لئے نہ باغ ہیں نہ کیاریاں ،

میری نکیلی ہڈیوں کے نکیلے ڈھانچے پر لٹکی
دہشت کے مارے پر پھڑپھڑا رہی ہے
میرے ہاتھوں سے بھی کچھ نہیں ہونے کا۔
کیسے مار گئے ہیں، یہ دیکھو:
چپڑے چپڑے، بھیگے بھیگے، بھاری بھاری،
پھدکتے ہیں جیسے برساتی بوٹ۔
اور تن بدن میں اور جو کچھ ہے
سب پھٹا پرانا افسوسناک،
پھر تجھے کاہے کی دیر ہے۔
کیوں ان لتوں کو کوڑے کے ڈھیر میں نہیں کر دیتا۔
یا شائد وہ میرے اس چہرے پر خفا ہے
میرے بھوسلے منہ پر؟
ہاں یہ منہ بار ہا تیار تھا کہ بالکل ہلکا۔
اور دل میں صاف ہو جائے
لیکن کتوں کے سوا کوئی پاس نہ پھٹکا۔
اور کتوں میں وہ بات کہاں

کوڑھی کا گیت

دیکھو میں وہ ہوں جس کو سب نے چھوڑ دیا ہے۔
شہر میں کسی کو میری خبر نہیں
مجھ پر کوڑھ چڑھا ہے۔

اور میں اپنی ڈگڈگی[1] بجاتا ہوں،
(اپنی آفت کا نشان)
کہ سب سن لیں۔
اور کہیں پاس نہ آجائیں
اور اونچے کانوں سننے والے ہیں
کہ اس طرف نظر تک نہیں کرتے
کہ دیکھیں تو سہی کسی پر کیا مصیبت آئی ہے۔
اُنکی بلا سے۔
(میرے بھی مزے ہیں)
جہاں تک اپنی ڈگڈگی کی آواز جائے اپنا گھر ہے
لیکن شائد تو اس ڈگڈگی کی آواز اتنی کردے
کہ اب پاس سے کترا جانے والے پھر کوسوں دور پر گھبرائیں۔
اور میں دیر دیر تک دور دور چلا جاؤں
اور نہ کوئی لڑکی دکھائی دے
نہ عورت
نہ مرد
نہ کوئی بچہ
جانور شائد نہ بھاگیں سہم کر۔

---

(۱) پرانے زمانے میں یہ دستور تھا کہ کوڑھی شہر سے باہر رکھے جاتے۔ ور انکو شہر کے نزدیک آتے وقت ایک ڈگڈگی بجانی پڑتی تاکہ لوگ ہوشیار ہوجائیں اور انکے سامنے سے ہٹیں۔

شذرات

۱۳ اپریل قومی ہفتہ کا آخری دن ہے اور یہ دن جس طرح ہندوستان کے ہر حصہ اور ہر ہر گوشہ میں منایا جاتا ہے، جامعہ میں بھی اس دن کی یادگار منائی گئی، لیکن جامعہ میں یہ یادگار ایک خاص طریقہ سے منائی جاتی ہے۔ اس دن یہ ہوتا ہے کہ بھنگی، بہشتی، خدمتگار اور تمام دوسرے ملازمین کو چھٹی دیدی جاتی ہے اور انکا تمام کام لڑکے خود اپنے ہاتھ سے ملکر کرتے ہیں جس میں اساتذہ بھی شریک ہوتے ہیں۔ غرض اس کی یہ ہے کہ لڑکوں میں ادنے سے ادنے کام کرنے سے بھی کبھی عار نہ پیدا ہو اور ضرورت پڑے تو نہ صرف اپنا بلکہ دوسروں کا بھی معمولی سے معمولی کام کرنے میں تامل نہ ہو اور اسکا مشاہدہ اس دن صاف طور پر ہوتا ہے۔ لڑکے اپنے کمرہ اور گرد وپیش کی صفائی کے لئے تو فی الفور تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب دوسروں کا سوال آتا ہے تو اسوقت کسیقدر پس وپیش کرتے ہیں۔ لیکن جب اس رسم کی غرض وغایت اور اس کام کا اصل مقصد ان کو بتایا جاتا ہے تو پھر وہ بلا تامل اسکے لئے آگے قدم بڑھاتے ہیں اور پھر من وتو کی تفریق نہیں رہتی۔

'بڑوں' کو 'چھوٹوں' کے درجہ پر لانے کا تو یہ حال ہوتا ہے لیکن 'چھوٹے' جب 'بڑے' رتبہ پر آگے کئے جاتے ہیں تو اس وقت کا نظارہ اس سے بھی زیادہ قابل دید ہوتا ہے۔ دوپہر کے وقت جب تمام لڑکے اور استاد اپنے اپنے کام سے فارغ ہو چکتے ہیں تو اس وقت کا کھانا طلبہ واساتذہ مع تمام دیگر ملازمین ایک ہی دسترخوان پر بیٹھکر کھاتے ہیں۔ اس موقع پر خدمتگاروں اور نوکروں کو اساتذہ اور طلبہ کے ساتھ بیٹھنے میں جو گریز اور تامل ہوتا ہے، وہ اس ذہنیت کو مٹانے کا سب سے کھلا ثبوت ہے۔ حیرت ہے کہ بنی آدم نے جو ایک ہی جسم کے مختلف اعضا ہیں، رسم ریت آپس میں ایک دوسرے سے اس درجہ بیگانہ اور ناآشنا ہو گئے ہیں کہ 'بڑے' کو 'چھوٹے'

کے کام سے اس درجہ ننگ و عار آے اور چھوٹے کو بڑے کے قریب سے اس قدر بعد اور گریز ہوا۔ سچ تو یہ ہے کہ 'بڑائی' اور 'چھوٹائی' کا یہ تخیل خود ہمارا پیدا کردہ ہے، جبتک ہم ہی اس کو دور نہ کریں گے یہ لعنت ہم سے دور نہیں ہو سکتی، جامعہ اپنی اس چھوٹی سی برادری کے اندر اور ۳۶۵ دن میں کم سے کم ایک دن عملاً یہ بتانا چاہتی ہے کہ انسان انسان برابر ہیں اور کام اور فرائض کے اختلاف سے انسانیت کے درجہ میں کوئی تفاوت نہیں ہے۔

لیکن اس سال جامعہ نے ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے اور اپنے کام کا دائرہ نہ صرف جامعہ کے اندر محدود رکھا ہے بلکہ اپنے گردوپیش کے انسانوں کی خدمت اور ہمدردی بھی اس نے اپنے ذمہ لی ہے، بعض حضرات کی تحریک سے یہ طے پایا ہے کہ خدمت خلق و رفاہ عام کے اس قسم کے کام بھی کافی نہیں کہ صرف سال میں ایک دن یا دو دن کئے جائیں بلکہ انہیں مستقل اور متواتر جاری رہنا چاہئے تاکہ دوسروں کو نفع بھی پہنچے اور کرنے والوں میں اس جذبہ اور خواہش کی استقلال کے ساتھ پرورش اور نشو و نما ہو۔ چنانچہ اس غرض کے لئے جامعہ نے سردست دو کام اپنے ذمہ لئے ہیں، ایک قرول باغ میں صفائی اور حفظان صحت کا انتظام اور دوسرے بے کار مرد اور عورتوں کے لئے تھوڑی بہت معاش کا انتظام۔ اول الذکر کام تو ایک جماعت "ریٹ پیرز ایسوسی ایشن" کے نام سے انجام دے رہی ہے جس کے ناظم بھی ہماری جامعہ ہی کے ایک کارکن ہیں لیکن موخر الذکر کام کے لئے البتہ کوئی جماعت کام نہیں کر رہی تھی اور اس کے لئے طلبہ اور چند اساتذہ کی ایک جماعت تیار ہو گئی ہے جو عنقریب اس کام کو شروع کرنیوالی ہے۔ سردست معاش کا انتظام اس کے سوا اور اس سے بہتر اور کوئی دوسرا نظر میں نہیں آیا ہے کہ ان سیکڑوں بیواؤں اور غریب بوڑھیوں کو چرخہ اور روئی فراہم کیجائے اور اس کے عوض مناسب اجرت دیکر ان سے سوت لیا جائے۔ اس سوت سے اگر خود اہل بستی میں ایسے بننے والے نکل آئے تو انہی سے اجرت دیکر کپڑا تیار کرایا جائے، ورنہ فی الحال دوسری جگہ بھیجکر بنوایا جائے۔ یہ کام نہ صرف

نت کا ایک اہم ترین کام ہے بلکہ اپنے اندر ایک مستقل اور دیرپا نفع رکھتا ہے اور اس سے علاوہ
س سکے گا کہ ایک طرح سے ملک کے اقتصادی پروگرام کی تعمیل ہو گی۔ خود طلبہ میں مفلس اور نادار لوگوں
کی خدمت کا جذبہ پیدا ہو گا جن کے اندر رہ کر انہیں آئندہ بہت کچھ کام کرنا ہے۔

کسی نے سچ کہا لوگ فرعون کو ناحق بدنام کرتے ہیں۔ اس میں اور ہماری سرکار میں فرق صرف یہ ہے کہ اُس غریب کو "کالج کی نہ سوجھی"، ورنہ تعلیم کا وار تلوار سے کسی طرح بھی کم کارگر نہیں ثابت ہوا۔ یہ سچ ہے کہ مقتولین تعلیم کے جان و تن کا رابطہ قائم ہے مگر وہ آج اپنے لئے، اپنی قوم کے لیے، اپنے دین و ایمان کے لئے بالکل مردہ ہیں۔

سمیات ذہنی کے یہ عظیم الشان معمل جو سرکاری مدارس کہلاتے ہیں اپنا کام حسن نظم و اہتمام سے کر رہے ہیں۔ اس پر ارباب نظر کو سنجیدہ توجہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ تدارک کی معقول صورتیں نکالی جاسکیں۔ ہم یہاں صرف ایک واقعہ بیان کرتے ہیں جو صورت حال پر بخوبی روشنی ڈالتا ہے۔

محکمہ تعلیم کی جانب سے دلی کے منتظمین۔ مدارس امدادی کو ایک گشتی چٹھی کے ذریعہ دھمکی دی گئی ہے کہ اگر مدرسہ کا منیجر یا کوئی رکن مجلس انتظامیہ حکومت کے خلاف سیاسی سورشوں میں حصہ لیگا تو حسب دفعہ قانون گرانٹ ان ایڈ بلا اطلاع مدرسہ کو سرکاری امداد دینا بند کر دیا جائیگا۔ گویا سرکار کا روپیہ تعلیم کے لئے نہیں رعیت کی آزادی عمل خریدنے کے لئے ہے!

جب سے ہندوستان میں قومی تحریک کا زور ہوا ہے مدرسہ کے لڑکوں کو سیاسیات سے الگ رکھنے میں سرکار و حامیان تعلیم سرکاری نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ بلاشبہ اس معاملہ میں انکے عذر کے اندر ایک معقولیت تھی، سیاسی تحریکوں کی تخریبی ذہنیت اس سکون و اطمینان کی دشمن ہے جو نوعمر لڑکوں کی تربیت کے لئے ضروری ہے۔ اگرچہ اس اعتراض کا جواب کسی کے پاس نہیں کہ

سرکاری تعلیم بذات خود ایک مضر شے ہے جس سے اجتناب ہی کرنا بہتر ہے [illegible]
گذر کر مدرسہ کے ممبروں اور اراکین مجالس انتظامیہ کو سیاسی تحریکوں میں شرکت سے روکنا [illegible]
غیر معقول اور استبدادی طرز عمل ہے جس کی ہر طرح مخالفت کرنی چاہیے۔

اسوقت کہاں ہیں وہ لوگ جو مدارس کے لئے سرکاری امداد نہ لینا حماقت تصور کرتے تھے اور جن کو سرکاری و نیم سرکاری تعلیمگاہوں کی پیدا کردہ غلامانہ ذہنیت، انکے خودغرضی و لادم فرقی سکھانیوالے ماحول، ان کی فرقہ وارانہ جذبات کو برانگیختہ کرنیوالی کتب تواریخ، انکی سلی اور قومی کلی کو مفلوج کرنیوالی تعلیم سے اس سوال کا جواب نہ ملتا تھا کہ "گورنمنٹ سے اپنا ہی روپیہ تعلیم کے لئے ہم کیوں نہ لیں؟" آئیں اور محکمہ تعلیم کی اس گشتی چٹھی میں اپنے سوال کا جواب لکھا ہوا دیکھ لیں۔ کیا اب بھی انہیں شبہ ہے کہ حکومت تعلیمی اداروں سے اپنا استحکام چاہتی ہے نہ کہ رعیت کا فائدہ؟۔

بلاشبہ بے حسوں کی تشفی اس چٹھی سے بھی نہ ہوسکے گی۔ انکے نزدیک تو یہ ایک برمحل ہدایت نامہ ہے جو ملکخواران حکومت کو انکے فرائض منصبی سے آگاہ کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ لیکن جن کے دلوں میں غیرت قومی ہے وہ جانتے ہیں کہ جس قانون کے ماتحت یہ چٹھی بھیجی گئی ہے اس کا وجود اور استعمال ملک کے لئے ایک اہانت آمیز چیلنج ہے جس کا صرف ایک ہی جواب ہوسکتا ہے۔ وہ یہ کہ سرکاری امداد واپس کر دیجائے اور مدارس کو حکومت کے اغراض نہیں بلکہ قوم کا فائدہ مدنظر رکھکر چلایا جائے، خواہ اس کوشش میں کچھ مدرسے ٹوٹ ہی کیوں نہ جائیں۔

رسالہ ادب

[illegible] ادب کی خدمت [illegible]

[illegible] بہترین رسائل میں کیا ہے اور آئندہ [illegible]

[illegible] یہ وہ [illegible] تنگ نظری۔ مذہبی

[illegible] اس کی تنقیدیں بے لاگ ہوتی

[illegible] نہیں ہوتیں۔ ادب کسی خاص جماعت کا نقیب نہیں ہے

[illegible] شامل ہیں۔

[illegible] کہا جاتا ہے کہ موجودہ صحافتی طوفان بے تمیزی میں بھی ادبی خدمات کو

[illegible] رکھا جا سکتا ہے۔ مذاق عام کی پیروی کے سانچے میں پروان

[illegible] ادب کا مطمح نظر اس سے بلند ہے۔ وہ مذاق عام کی اصلاح اور ادبیت

[illegible] کرنا چاہتا ہے کیا اردو سکریٹری خواہ اس مقصد مقاصد کے

[illegible]

[illegible] کی شان۔ بلند نگاہی۔ اور متانت کا اندازہ کرنا چاہتا ہیں کے چند

[illegible] کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ حجم کم از کم [illegible] صفحے چندہ [illegible] سالانہ

[illegible]

[illegible] ادب متصل چوراہا یحییٰ گنج لکھنؤ

[illegible]

[illegible] مذاہب کا مطالعہ نیک نیتی اور انصاف پسندی سے کریں اور اظہار [illegible] ات میں فریق ثانی کے جذبات و احساسات کا احترام کرنا اپنا فرض سمجھیں مذہبی مناقشات [illegible] ب یہی ہے غلط بیانی اور بدگمانی ہے ہندو مسلم فسادات کا سبب بھی یہی ہے اسلئے [illegible] من و صلح کل زندگی بسر کرنے کیلئے مذہبی معلومات کا حاصل کرنا نہایت ضروری ہے یہ مقصد صرف

اخبار پیغام صلح

کے مطالعہ سے پورا ہو سکتا ہے جو لاہور کا ایک سہ روزہ مذہبی اخبار اور اسلامی و غیر اسلامی معلومات کا مخزن ہے پیغام صلح تمام دنیا کے مذہبی پیشواؤں کے ادب و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے غیر مسلموں کو اسلام کی حقیقت سے آگاہ کرتا ہے اور انہیں صلح کا پیغام پہنچاتا ہے ہر مذہب و ملت کے اردو خواں سنجیدہ اور مذہبی مذاق رکھنے والے اصحاب اسکے بصیرت افروز مضامین سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں کتابت اور طباعت کے اعتبار سے بھی پیغام صلح ایک اعلیٰ حیثیت رکھتا ہے

شرح چندہ سالانہ (چھ روپے) ششماہی (تین روپے) سہ ماہی (دو روپے) طلباء سے سالانہ (چار روپے) ممالک غیر سے سالانہ (پندرہ شلنگ) نمونہ کا پرچہ مفت۔

منیجر اخبار پیغام صلح لاہور